ماہنامہ سرگزشت
فروری 2017
Rs 60/=
FEB 2017
www.paksociety.com

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد 27 ❖ شمارہ 01 ❖ فروری 2017ء

ماہنامہ کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

قارئین کرام!
السلام علیکم!

کمہار مٹی کو نرم کرنے کے لیے پیروں سے کچل رہا تھا کہ مٹی بولی' میں بھی کتنی بدنصیب ہوں کہ ہمیشہ سب کے پیروں میں ہی رہتی ہوں جب کہ میرے سینے سے اُگے اناج کو لوگ اس طرح چومتے ہیں جیسے وہ متبرک ترین شے ہے پھولوں کو گلے میں پہن کر عزت دی جاتی ہے اور میں..... میں صرف پیروں تلے ہی رہتی ہوں۔ کمہار کو رحم آ گیا اور اس نے کہا' تم فکر نہ کرو میں تمہیں سر پر رکھنے کے قابل بنا دوں گا۔ اس نے اسے مزید نرم کرنے کے لیے پیروں کی رفتار بڑھا دی۔ مٹی نے کراہتے ہوئے کہا' اب اور کتنی تکلیف دو گے۔ کمہار نے کہا' بس تھوڑا سا انتظار کر لو۔ مٹی نرم کر کے اس نے چاک پر چڑھایا اور ایک مٹکا بنا لیا۔ پھر اسے سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھ دیا۔ سورج کی تپش سہتے سہتے مٹی بولی' کب میں سر پر چڑھنے کے لائق بنوں گی؟ کمہار بولا' بس تھوڑا اور انتظار کر لو' سونا آگ پر تپ کر ہی کندن بنتا ہے۔ پھر اسے آگ پر چڑھایا۔ اب مٹکا تیار تھا اور مٹی بھی خوش کہ عورتیں اسے سر پر رکھ کر کنویں سے گھر تک لاتی لے جاتیں۔ اگر مٹی آگ پر نہ تپتی تو اسے یہ عزت کبھی نہ ملتی۔ جو لوگ وقت کی آگ سے ڈر جاتے ہیں انہیں بھولنا نہیں چاہیے کہ کندن بننے کے لیے آگ پر تپنا ضروری ہے۔

زندگی اس کے اور سوا کیا ہے
رقص فرما حباب پانی میں

معراج رسول

شعبہ اشتہارات

| | | |
|---|---|---|
| انچارج اشتہارات | محمد شہزاد خان | 0333-2256789 |
| نمائندہ کراچی | محمد عثمان خان | 0333-2168391 |
| | راؤ محمد حمید | 0323-2895528 |
| نمائندہ لاہور | فرازعلی بخش | 0300-4214400 |

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرسالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہائی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com
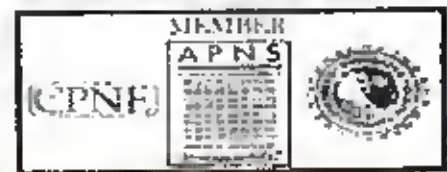
# افسانہ نگار

14 جولائی کو اس نے بدایوں (یوپی) کے معروف شاعر حیرت بدایونی کے گھر جنم لیا۔ وہ لڑکی تھی اس لیے گھر والوں نے اتنی خوشی کا اظہار نہیں کیا، جتنا لڑکے کے جنم پر کیا جاتا ہے۔ اس وقت تو اسے خود اپنا ہوش نہ تھا۔ کمی خوشی کیا ہوتی ہے اسے پتا نہ تھا لیکن جب وہ لڑکپن میں داخل ہوئی اور اسے احساس کی دولت ملی تو وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اس دنیا میں بیٹے اور بیٹی میں فرق کیا جاتا ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس نے خود سے عہد کیا کہ وہ ثابت کرے گی کہ وہ لڑکے سے زیادہ اہمیت کی حقدار ہے۔ گھر میں ادبی ماحول تھا۔ گاہے بگاہے ادبی نشست بھی ہوتی۔ وہ ابھی بہت چھوٹی تھی اس لیے بے دھڑک مردانہ حصے میں چلی جاتی۔ دروازے سے لگ کر شعراء کا کلام سننے لگتی۔ شعراء کی پذیرائی دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ بھی شعر کہے گی لیکن اسے شعر کہنے میں دشواری محسوس ہوئی۔ اس کے گھر میں ہندوستان بھر کے ماہنامے، اخبارات آتے تھے۔ وہ انہیں بھی پڑھتی، ایسے پرچے بھی آتے جس میں بچوں کے لیے کہانیاں ہوتیں، ایسی کہانیاں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس نے سوچا کہ جب دوسرے کہانیاں لکھ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں لکھ سکتی۔ اس نے کاغذ قلم سنبھالا اور لکھنے بیٹھ گئی۔ یہ کام اسے شعر کہنے سے زیادہ اچھا لگا۔ ایک ہی نشست میں اس نے کہانی مکمل کرلی اور اسے ایک پرچے میں بھیج دی۔ وہ کہانی مدیران کو پسند آگئی اور وہ شائع بھی ہوگئی۔ پرچہ جب ڈاک سے آیا تو اپنی کہانی کو چھپا ہوا دیکھ اسے بہت خوشی ہوئی اس نے وہ کہانی ہر ایک کو دکھائی۔ لوگ پڑھ کر صرف اتنا کہتے "ہاں اچھی کہانی ہے" لیکن اسے وہ پذیرائی نہیں مل رہی تھی جس کی وہ متلاشی تھی۔ یہ بات اسے کھل رہی تھی۔ اس نے ایک اور کہانی لکھی وہ بھی چھپ گئی لیکن اس کی بھی پذیرائی نہیں ملی۔ تب اس نے سوچا کہ اب میں اپنی کہانی کسی کو دکھاؤں گی نہیں۔ ایک کے بعد ایک کہانی لکھتی گئی اور وہ کہانیاں چھپتی رہیں لیکن گھر والے اسے کہانی نویس ماننے پر تیار ہی نہیں تھے۔ تنقید زیادہ ہوتی۔ اس کے سات بہن بھائی تھے۔ ان کے سنگی ساتھی تھے۔ کل ملا کر اس کے ہم عمروں کی ایک پوری بٹالین تھی۔ وہ ان سب میں خود کو لیڈر ثابت کرتی۔ وہ صدا کی بیمار تھی، ذرا سی ٹھنڈک اترتی اور اسے بخار، نزلہ، زکام گھیر لیتا۔ اس کے لاغر ہونے کی وجہ سے مزاج میں تیزی تھی۔ چڑچڑا پن تھا لیکن وہ اپنے ابا کی لاڈلی تھی اس وجہ سے سب اس سے دبتے تھے لیکن اس کے بغیر کسی کو چین نہ تھا۔ وہ جس کو جو کہہ دیتی سب کو ماننا پڑتا۔ وہ بچوں کے عام سے کھیل کبھی نہ کھیلتی۔ کبھی وہ سب کو جمع کر کے تصویر بنانے کا مقابلہ کراتی کبھی بیت بازی تو کبھی الٹی سیدھی نظمیں کہنے کا مقابلہ منعقد کراتی۔ اس چھوٹی سی عمر میں بڑوں جیسا کام کرتی، پابندی سے ایک قلمی اخبار چلاتی جس میں محلے بھر کے بچوں کے نگارشات شامل کرتی۔ مسلسل ادبی کام کرتے رہنے کی وجہ سے اس کی اپنی تحریر میں پختگی آتی جا رہی تھی۔ کم عمر ہوتے ہوئے بھی رسالے اخبارات والے اسے اہمیت دینے لگے تھے جس کی وجہ سے اس کے گھر والے بھی اسے اہمیت دینے لگے تھے۔ اسی دوران 1959ء میں ڈاکٹر انور معظم کا اس کے لیے رشتہ آگیا۔ وہ بدایوں جیسے ادب پرور شہر کی تھی تو رشتہ بھیجنے والے بھی اس دور کے اردو مرکز حیدرآباد دکن کے تھے۔ وہ شادی ہوتے ہی حیدرآباد آگئی۔ سسرال کا ماحول بھی ادبی تھا اس لیے وہاں بھی اس کے لکھنے لکھانے کے شوق کو اچھی نظروں سے دیکھا گیا۔ شادی کے بعد وہ دو برس تک علی گڑھ میں رہی۔ اب وہ آہستہ آہستہ مشہور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے افسانے ادبی دنیا میں اپنی پہچان بنتے جا رہے تھے۔ انعامات اور اسناد سے گھر بھرا جا رہا تھا کیونکہ وہ عوام کے دل میں گھر کر جانے والے افسانے لکھ رہی تھی۔ اب وہ برصغیر کی نمائندہ افسانہ نگار بن چکی تھی۔ اس افسانہ نگار کو دنیا جیلانی بانو کے نام سے پہچانتی ہے۔

☆☆☆

☆ سید مسرت حسین رضوی کا نامۂ خاص کراچی سے۔ ''عمر رفتہ کا ایک اور سال بیت گیا۔ کسی کے یہاں ماتم ہوا کسی کا سہاگ اجڑا کوئی یتیم ہوا کوئی آہوں سسکیوں میں ڈوب گیا۔ آنے والے وقت کا کوئی پتا نہیں۔ یہاں بجھتی ہے کہ نہیں دشمن کی طرف سے دھمکیاں مل رہی ہیں۔ پانی بند کرنے کی۔ دشمن یہ چاہتا ہے کہ مسلمان پیاسے رہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ دشمن دھمکیاں دیتا رہے اور ہم دوستی کا مطالبہ کرتے رہیں، نام لینے سے کچھ نہیں ہوگا کھلے دشمنوں کو سارے پاکستانی پہچانتے ہیں کہ ہمارا اور یہ دشمن کون ہے جو نہیں چاہتا کہ پاکستان ترقی کرے اور خوش حال ہو۔ طرح طرح کے حربے آزما رہا ہے اور ہمارے اندر کے میر جعفر جیسے غدار ہی ہمارے دشمنوں کے سہولت کار بن جاتے ہیں، ایسے میں اگر مسجدوں کے حصے ہوئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، لوگ مسجد کی طرف جانے والے راستوں کو ایک کیسے ہونے دیں گے؟ اپنی اسلام دشمنی کو کیسے تسکین پہنچائیں گے۔ رب جو کل کائنات کا مالک ہے ہر چیز اس کے تابع ہے اگر ان لوگوں میں طاقت ہوتی تو ضرور رب ذوالجلال کو بانٹنے کی کوشش کرتے ایسے ہی لوگوں کے لیے رب ذوالجلال نے جہنم بنائی ہے تاکہ منکرین کو اس میں رکھا جائے جو صالحین ہیں تو ان کو چپ تو لگے گی یہی رب کی عبادت کی راہ ہے کہ ہر چیز ہر فرقہ بندی کو بالائے طاق رکھ کر رب کے آگے جھک جائے جس کو رب توفیق دے۔ ''شہر خیال'' میں ہر پروانے نے اپنے تبصروں سے سرگزشت کی رونق بڑھائی ہے۔ دردمند دل رکھنے والے ہی دوسروں کے سوز دل کو سمجھتے ہیں یا وہ جو درد سہہ چکے ہیں، محفل میں شریک پروانہ اپنے خیال کے مطابق ہی تبصرہ کرتا ہے۔ میرے درد کو طاہرہ گلزار نے محسوس کیا۔ دل کو ایک سکون سا محسوس ہوا۔ بعض حالات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان بیان نہیں کر سکتا اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے۔ اظہار کرنے کی طاقت جو نہیں ہوتی یہ تو سرگزشت کی محبت ہے جو اس کی بزم محفل میں ساتھیوں اور غمگساروں کی تسلی دلاسے مل جاتے ہیں مگر پھر معراج رسول صاحب کی کوئی اور کہانی سامنے آجاتی ہے اور دل کے زخم جو مندمل ہونے لگتے ہیں پھر سے کھل کر رسنے لگتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں ہمیں متحد رہنا چاہیے تاکہ دشمن ہمارا شیرازہ نہ بکھیر سکے مگر افسوس کہ ہم ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر تقسیم در تقسیم ہو رہے ہیں۔ ''اعلیٰ حضرت'' ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر دلچسپ روح پرور ایمان افروز ثابت ہوئی۔ ''تم ہو کہ چپ'' زویا اعجاز کی کشمیر پر لکھی تحریر دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ ''شمشال سے نورستو'' اس مرتبہ کی قسط بہت ہی دلچسپ رہی اور معلومات میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ نیز جن بھوت کا خوف بھی اس دفعہ شامل تھا جس کی وجہ سے ہنسی بھی بہت آئی واقعی پردیس پھر پردیس ہے۔ ''جھوٹے لوگ'' راحیلہ کاشف کی تحریر اچھی تھی اس میں ایک جواب بہت پسند آیا کہ تم کس قوم پر مبعوث ہوئے ہو مجھے انسانوں پر مبعوث نہیں کیا گیا بلکہ شیطان پر کیا گیا۔ ''فلم نگری'' میں سنگیتا اور سید سلمان کے فلم بنانے میں ان کے اناڑی پن کا کہیں کوئی شائبہ تک نہیں ملا بلکہ فلم ''گمنام'' بہت بہترین ثابت ہوئی جس کو دیکھے زمانہ بیت گیا مگر اس کی اسٹوری اور گانے آج بھی مشہور ہیں۔ ''جانور بچے'' معلوماتی واقعہ ہے اکثر ایسے قصے بزرگوں سے بھی سنے گئے ہیں۔ ''جنوری کی شخصیات'' اس حوالے سے مشہور سیاستداں بھٹو قابل داد تھے۔ جب ان کو پھانسی ہوئی تو کئی نوجوانوں نے اپنے سر گنجے کرا لیے تھے۔ گریبان چاک کرالیے تھے کسی کو یقین ہی نہیں تھا مختلف افواہیں گردش کر رہی تھیں ملک سوگ میں رہا۔ آج بھی بھٹو کی یاد میں نوجوان آہیں بھرتے ہیں۔ تنظیم لیڈر تھے۔ ایاز مشہور تاریخی نام ہے اس پر ایک فلم بھی اسی نام سے بنی تھی جو بہت مشہور ہوئی تھی۔ ''سراب'' اس ماہ اس کی آخری قسط بھی آگئی کہانی اختتام پذیر ہوئی۔ بڑی دلچسپ چل رہی تھی مگر کاشف زبیر کے انتقال نے بڑا دکھ دیا اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں رکھے۔ ''سنگدل'' نادیہ کی سچ بیانی اچھی لگی۔ آنکھیں خوشی سے اشکبار ہوگئیں اگر اس طرح ہر باپ ماں بھائی عفو و درگزر کریں تو کبھی معاشرے میں کاروکاری کا مسئلہ کھڑا نہ ہو اور نوجوان لڑکی یا لڑکے قتل ہونے سے بچ جائیں۔ کہانی

پسند آئی۔ ''سچا آدمی'' کہانی چونکہ پرانی ہے مگر ڈگر سے ہٹی ہوئی ہے اس دور میں ہاشمی صاحب جیسے لوگ نہیں ملتے۔ ''کولہو کا بیل'' جیسی کرنی ویسی بھرنی والی بات آگئی۔ شاداں کی بے وقوفی اور جہالت نے خود اس کی زندگی تباہ کی یہ سب شاداں کی ماں کے انتقال کی وجہ سے ہوا اگر ماں زندہ ہوتی تو شاید شاداں بے راہ نہ ہوتی۔ کہانی میں عبرت ہے مگر عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے۔ ''ان دیکھا سودا'' کسی کے بارے میں پہلے ہی سے کوئی خاکہ بنالینا حماقت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ جس کی سزا بھی یقینی تھی جو انجم جمال کو ملی۔ ''خادم'' فضول اور وقت برباد کرنے والی کہانی ثابت ہوئی۔ ''درست فیصلہ'' کہانی کوئی تاثر قائم نہ کرسکی۔ ''وقت کا قتل'' یہ بھی کہانی ایویں ہی تھی۔ ''مسافت'' اس سچ بیانی میں بشیر کا کردار بہت مضبوط رہا۔ ایسے ہی دوستوں کو ہونا چاہیے جو بجائے دوستی کے مظلوم کی مدد کریں۔ کہانی اچھی تھی۔''

☆ فقیر غلام حسین ضیاء کا خلوص نامہ بھکر سے۔ ''مشیرِ خیال کے دوستوں کی طرف سے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کا احسانِ عظیم ہے کہ آپ نے مضمون ''اعلیٰ حضرت'' کو سرگزشت بنا کر نئے سال 2017ء کا عظیم تحفہ پیش فرمایا ہے۔ جنوری کا شمارہ اس لحاظ سے باعثِ صد احترام ہے کہ جی چاہتا ہے یہ مضمون ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے۔ ''خدا رحمت کنند ایں عاشقانِ پاک طینت'' ڈاکٹر ساجد امجد نے اس ناچیز کی فرمائش پر یہ تحقیقی مقالہ لکھنے کی جو سعی و کوشش و محنت فرمائی ہے اس کے لیے دلی دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے دینی و دنیاوی اور روحانی درجات بلند فرمائے، آمین۔ جنوری 2017ء کا شمارہ طویل سلسلہ وار کہانی ''سراب'' کی آخری قسط لایا۔ بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی یہ تہلکہ خیز کہانی آخر ختم ہوگئی۔ ہر ایک نے آخر ایک دن ختم ہو جانا ہے مگر آہ! کاشف، بیرم یاد آئے اور بہت یاد آئے۔ پہلی سچ بیانی ''سنگ دل'' سرورق کی زینت پکار کر کہہ رہی ہے کہ سنگ دل باپ کو آخر اپنی ہٹ دھرمی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایسے والدین جو گھر میں ہلاکو خان بنے ہوتے ہیں ان کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ اولاد تو جانوروں کو بھی پیاری ہوتی ہے لیکن اجڈ اور سنگ دل والدین ہر بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔ انسانیت سے عاری، جاہل اور ضدی۔ اولاد کے لیے عذاب۔''

☆ قیصر عباس خان کی آمد بھکر سے۔ ''انکل جی! آپ کا اداریہ بہت دل سوز تھا۔ سال 2017ء کے پہلے پرچے کا اداریہ بہت نازک مسئلہ تھا۔ اللہ کے گھر کی تقسیم تو اب عام ہے۔ ایک فرقے کو دوسرے فرقے کی مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر بھول سے نماز پڑھ لی جائے تو محسوس بھی ہوتا ہے اور منع کردیتے ہیں۔ آج کل مسجد جس کو اللہ کا گھر کہتے ہیں۔ اسے اللہ تعالیٰ کا گھر کوئی نہیں سمجھتا۔ یک ملکی شخصیت مسعود حسن رضوی کے بارے میں پڑھ کر معلوم ہوا کہ ہم قومی ہیرو کو بھول چکے ہیں۔ 'مشیرِ خیال' میں انکل اشرفی صاحب سال کے پہلے پرچے میں کرسیٔ صدارت پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سال کی پہلی مبارک باد وصول کریں ان کے علاوہ تمام تبصرہ نگار بہت خوش اسلوبی کے ساتھ حاضر تھے پڑھنے میں مزہ آیا۔ کچھ نئے دوست تھے اور بہت سے دوست تاخیر والی لسٹ میں تھے جن میں بھکر والے بھی تھے۔ 2017ء کی شخصیت میں مولانا اعلیٰ حضرت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے خوب صورت انداز میں لکھا۔ کافی عرصے سے انتظار تھا۔ اعلیٰ حضرت کے بارے میں پہلے بہت کم پڑھنے کو ملا تھا۔ یہ کافی تسلی بخش مضمون تھا۔ کشمیر کی تاریخ پر بہت افسوس ہوا اتنے مظالم اور اتنی خوب صورت سرزمین پر لیکن ہم بے بس ہیں۔ رضیہ خالد کا مضمون دلچسپ تھا۔ عادتیں عجیب تو ہوتی ہیں کیونکہ وہ لوگ ہم سے منفرد ہوتے ہیں۔ ندیم اقبال صاحب کا سفرنامہ بہت اچھا جارہا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد دیجیے گا۔ انور فرہاد کا مضمون فلمی حوالے سے بہت معلوماتی تھا۔ ضروری نہیں بالی ووڈ والے ہم سے آگے ہوں۔ صائمہ اقبال بھی بھرپور مضمون کے ساتھ حاضر تھیں۔ ایاز کے متعلق مضمون ناکافی تھا۔ ''سراب'' اپنے اختتام کو پہنچی۔ سنگ دل کی نادیہ کا پیار معاشرہ کی عکاسی تھا۔ ماں باپ کے غلط فیصلے اب قبول نہیں اور گھر سے بھاگنا بھی اب بہت ہوتا جارہا ہے۔ غلط فیصلہ کو قبول نہ کرو۔ ''کولہو کا بیل'' دونوں میاں بیوی غلط سوچ کے حامل تھے۔ دونوں کا انجام بھی برا ہوا۔ ناظم بخاری صاحب بہت اعلیٰ سچ بیانی لے کر آئے۔ ''مسافت'' میں بہت کمینہ ذہن کا بندہ تھا مجھے افسوس ہوتا ہے جب ایسے مردوں کے بارے میں پڑھتا ہوں۔ مجبوری سے فائدہ اٹھانے والے لوگ یہودی سوچ کے ہوتے ہیں انسانیت پر داغ ہوتے ہیں۔''

☆ وہاب احمد نے لاڑکانہ سے لکھا ہے۔ ''معراج رسول صاحب نے چھوٹی سی کہانی میں اپنے ملک کے موجودہ حکمرانوں کے بارے میں جو لکھا وہ بہت پسند آیا۔ ایسے حق پسند، حقیقت پسند رائٹر بہت کم ہوتے ہیں۔ جون کے مہینے میں سلمٰی اعوان کی جوار خاں پڑھی تھی۔ سلمٰی اعوان کے لکھنے کا انداز پیش منظر، پس منظر خاص کر تشبیہ، وضاحت کرنا، مثالیں دینا کرداروں پر گرفت رکھنا خوب ہے۔ نومبر میں سومیتا دیوی پڑھی جس میں فارسی لفظ تھے جس کی وجہ سے تسلسل ٹوٹ جاتا تھا۔ دسمبر میں وقت کا قتل منصور احمد کا آفس میں ملنے کا منظر شاندار جاندار تھا۔ ندیم اقبال اور ڈاکٹر ساجد امجد دونوں بہت اچھے لکھتے ہیں۔ سرگزشت کی جان ہیں۔ جنوری کی شخصیات میں قرۃ العین حیدر، آصف علی آصف، عبدالستار ایدھی پسند آئے۔ باقی سیاستدانوں سے مجھے نفرت ہے۔''

☆ غلام سبحانی نے نوشہرو سے لکھا ہے۔ ''ڈاکٹر ساجد امجد نے سب کا حساب بے باق کردیا۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت کی

شانِ اقدس میں ایسا پیارا نکھرا نکھرا مہز دلعزیز نذرانہ عقیدت پیش کیا کہ روح وجگر کو بخدا قرار آ گیا۔ مسلکی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جو بھی امام امت کی سوانح کا مطالعہ کرتا ہے اسے ان کا مذہبی خلوص نبی محترمؐ سے والہانہ عشق ومحبت کا سمندر ٹھاٹیں مارتا نظر آتا ہے۔ دل وزباں پر لرزہ سا طاری ہو جاتا ہے جب اس حقیقت پر غور کرتا ہوں کہ ایک ہی درخت کی شاخ پر پھول بھی موجود اور کانٹا بھی۔ جب کہ اندرون نہ کانٹا موجود نہ پھول موجود۔ زدیا اعجاز کی ''تم ہو کہ چپ'' میں وقت کی داستان بھی خوب رہی۔ البتہ صفحہ نمبر 64 پر یہ جملہ درست اور جائز نہیں 'روح اللہ کے مصلوب ہونے اور آسمان پر اٹھائے جانے کے منظر نے مجھے لرزا دیا تھا۔ اس لیے کہ قرآن گواہ ہے عیسٰی روح اللہ کو یہودیوں نے نہ تو مصلوب کیا اور نہ ہی قتل کیا بلکہ انہیں اللہ نے محفوظ و مامون اپنی طرف اٹھا لیا تھا۔''

☆ محمد احمد رضا انصاری کی آمد کوٹ ادو سے۔ ''جاسوسی میں ایک اشتہار دیکھا تھا جس میں لکھا ہوا تھا کہ سرگزشت نئے سال سے ہر ماہ کی بیس تاریخ تک مارکیٹ میں آجایا کرے گا۔ بس جناب پھر کیا تھا ہم نے بیس کیا انیس تاریخ ہی سے کتابوں والی دکان کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ آخر 24 تاریخ کو سرگزشت آ ہی گیا۔ نئے سال کا پہلا شمارہ دلکش سرورق کے ساتھ ملا۔ اداریہ میں پھر ایک تلخ حقیقت منتظر تھی۔ واقعی اب بس خدا ہی تقسیم ہونے سے رہ گیا ہے۔ مسلمان فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک قرآن کو ماننے والے پتا نہیں کیوں جدا جدا ہیں؟ ''شہر خیال'' میں اپنا خط نہ دیکھ کر دکھ ہوا۔ انکل جی میں نے تو خط دس تاریخ سے پہلے ہی بھجوا دیا تھا۔ تاخیر سے موصول ہونے والوں میں بھی میرا نام نہیں تھا (شومئی قسمت کہیے)۔ ''اعلیٰ حضرت'' یہ کیا وہی ہیں احمد رضا بریلویؒ (جی ہاں)۔ ''شمشال سے نورنو'' کی یہ قسط بھی بہترین رہی۔ ''سراب'' کی آخری قسط تھی۔ پلیز جو اگلی کہانی لگائیں وہ زیادہ طویل نہ ہو۔ بس بیس یا پچیس اقساط ہوں۔ اس ماہ کچھ تحریریں زیادہ متاثر کن نہیں تھیں جیسے کہ ڈڈ ڈز، بال چین، جھوٹے لوگ، تو آموز اور جانور بچے۔ پلیز کچھ نئے موضوعات پر مضمون دیں۔ ''بیت بازی'' میں اس ماہ بہت اچھے شعر پڑھنے کو ملے۔ عشرت علی، محمد نعیم، یاسر منیب، رضا احمد اعوان، زاہد ندیم، عبدالحکیم شمر، فریدہ بٹ، سعید احمد، ضیاء السلام اور ادیب علی کے شعر ٹاپ آف دی لسٹ تھے۔ پہلی سچ بیانی ''سنگ دل'' اچھی لگی۔ سچا آدمی، کولہو کا بیل، ان دیکھا سودا، خادم، وقت کا قتل، درست فیصلہ اور مسافت بھی خوب تھیں۔''

☆ انور عباس شاہ کا خلوص نامہ بھکر سے۔ ''28 دسمبر کو بے دلی کے ساتھ جب بک اسٹال پر سرگزشت کا پتا کرنے پہنچے تو معلوم ہوا کہ سرگزشت تو 20 تاریخ سے آیا ہوا ہے لہٰذا آیندہ 20 تاریخ سے پتا کیا کریں۔ ہماری حیرت اس وقت دور ہوئی جب اس کے اندرونی صفحات میں آپ کے اعلان پر ہماری نظر پڑی اب جب کہ آپ نے اس کی نئی تاریخ کا اعلان کر ہی دیا ہے تو یہ بھی بتا دیں کہ ہمارے خط سرگزشت کے لیے کون سی تاریخ تک پہنچنے چاہئیں۔ (10 تک پہنچ جانا ضروری ہیں)۔ نیز یہ بھی بتا دیں کہ سرگزشت ہر ماہ کی 20 تاریخ سے آپ کی طرف سے جاری کر دیا جائے گا یا 20 تاریخ تک ہمیں مل جایا کرے گا (جاری کر دیا جائے گا)۔ مسجدوں کے بٹوارے کے علاوہ آج کل ایک اور بات بھی دیکھنے میں آرہی ہے کہ نماز کے بعد مسجدوں کو تالے لگا دیے جاتے ہیں حالانکہ اس سے پہلے ہم نے مسجدوں یا عبادت گاہوں کو تالا لگتے نہیں دیکھا تھا۔ اب تالے لگانا مجبوری بن چکا ہے کیونکہ دہشت گردی کے ساتھ ساتھ چوری چکاری کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ نشئی حضرات مسجدوں سے پنکھے سمیت دیگر قیمتی اشیاء چرا کر لے جاتے ہیں۔ ''شہر خیال'' میں آفتاب احمد نصیر اشرفی کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ اعجاز حسین سٹھارا اپنے دلکش تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ حکیم سید محمد رضا شاہ بھی اپنے عمدہ تبصرے کے ساتھ شامل محفل تھے۔ سید مسرت حسین رضوی خوب بچی اور کھری کھری باتیں کر رہے تھے۔ نزاہت افشاں اب تو پابندی سے اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ ''شہر خیال'' کی زینت بنتی چلی آرہی ہیں۔ خدا کرے عام زندگی میں بھی اسی طرح مہکتی رہیں۔ ''شہر خیال'' کی رونق، باوقار، نڈر اور ہردلعزیز باجی طاہرہ گلزار اپنے جامع اور خوب صورت تبصرے کے ساتھ شامل محفل تھیں۔ باجی ہم دعا گو ہیں خداوند کریم بھائی عمران جونانی کی والدہ ماجدہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، (آمین)۔ اس دفعہ ڈاکٹر روبینہ نفیس تاخیر سے ملنے والے خطوط کی لسٹ میں چلی گئیں جس کا ہمیں افسوس ہے خیر حاضری تو لگ ہی گئی ہے۔ ''سراب'' خیر سے 117 اقساط مکمل کرنے کے بعد اختتام پذیر ہوئی۔ یہ تقریباً نو سال اور نو ماہ ہمارے درمیان رہی۔ خادم ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی ہوئی ایک لاجواب تحریر تھی، ہمارے اردگرد اس قسم کے کردار اب بھی موجود ہیں اور نہایت دھڑلے سے اپنا اپنا نیٹ ورک چلا رہے ہیں اور ضعیف الاعتقاد لوگ ان کی درندگی کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ''ان دیکھا سودا'' ایک نصیحت آموز تحریر تھی کسی کو بھی دھوکا دے کر اس کے جذبات سے کھیلنا کہاں کا انصاف ہے۔ ''جانور بچے'' ایک نہایت ہی دلچسپ واقعات سے بھرپور جاندار تحریر تھی۔ اس قسم کی تحریریں تفریح کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے مفید معلومات کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔ بال چین کے بارے میں پڑھ کر ہمیں اس کے بارے میں بہت کچھ آگاہی حاصل ہوئی۔ ''شمشال سے نورنو'' حسب معمول نہایت دلچسپی سے اپنے سفر کی طرف گامزن ہے لیکن آج کل ندیم اقبال صاحب ''شہر خیال'' کی زینت نہیں بن رہے۔ ''اعلیٰ حضرت'' ڈاکٹر ساجد امجد کی عمدہ اور اعلیٰ تحریر تھی۔''

☆ امیر حمزہ اشرف نے بستی کوٹ رب نواز ملتان سے لکھا ہے۔ ''اور نیہ میں انکل نے خوب افسانچہ سنایا۔ 'معمہ خیال' میں اپنا خط دیکھ کر بک ڈپو پر ہی بھنگڑا ڈالنے کو جی چاہا۔ بھائی آفتاب نصیر احمد اشرفی کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ بھائی حکیم سید محمد رضا آپ نے ٹھیک کہا سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ باجی طاہرہ گلزار خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ اس کے علاوہ اعجاز حسین سنجرانی، سدرہ بانو ناگوری، انور عباس شاہ، مزابت انشاپل، اویس شیخ، غلام مرتضیٰ سب کے تبصرے زبردست تھے۔ بھائی عمران جونانی کی ماں کو اللہ جنت میں اعلیٰ مقام دے، (آمین)۔ ناصر حسین رند، منشی عزیز مئے، احمد خان توحیدی اور بشریٰ افضل سے حاضری کی درخواست ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد ''اعلیٰ حضرت'' لے کر حاضر تھے۔ ''جنوری کی شخصیات'' ہم پچھلے سال پڑھ چکے ہیں پلیز صائمہ اقبال ہر ماہ نئی شخصیات کے بارے میں لکھا کریں (اب تک شخصیات کا تکرار نہیں ہوا ہے)۔ منظر امام کی ''جانور بچے'' عجیب کہانی ہے، اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ سچ بیانی ''سنگ دل'' پڑھی۔ والدین کو رشتے طے کرتے وقت بچوں سے پوچھ لینا چاہیے یہ ان کا حق ہے۔ ''مسافت'' زبردست سچ بیانی تھی۔ ''درد محبت'' پڑھی انجام برا ہوا کنول اور محمد علی کی لو اسٹوری کا۔ ''ان دیکھا سودا'' اور ''سچا آدمی'' ان ٹاپک پر ہم پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ علمی آزمائش والا سلسلہ ختم کریں۔ اس کی جگہ کوئی اور سلسلہ شروع کریں۔ ''سراب'' انجام کو پہنچی۔ نئی سلسلہ وار کہانی کا اسٹیج ذرا منفرد سا دیجیے گا۔ ''بیت بازی'' میں فہیم الدین، اشرف حسن، رضا احمد اعوان اور نوید اصغر کے اشعار ٹاپ پر تھے۔ شعر لکھ کر کیا ایک ہی لفافے میں خط اور شعر بھیج سکتے ہیں؟ (جی ہاں)۔ کیا خط صفحے کے ایک سائیڈ پر لکھنے کے بعد دوسری سائیڈ بھی لکھ سکتے ہیں یا دوسرا صفحہ لینا ضروری ہے؟ (بالکل ضروری ہے)۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''خالق کائنات کی محبوب ترین ہستی ہونے کے باوجود عبدیت کی ہر بلندی کو چھو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہر امتی پر واضح کر دیا کہ محبوبیت کا تقاضا ہے کہ حب کرنے والے کی خاطر راضی بالرضا رہنا ہی بندگی ہے اور اعلیٰ حضرت محمد احمد رضا خانؒ نے آقائے دو جہاں کے عشق میں ڈوب کر اپنے ہر پیروکار پر یہ ثابت کیا کہ آپ کی شفاعت برحق لیکن بے عملی کا اعمال نامہ بالکل سادہ ہونا آپ کا اپنے آقا کے سامنے شرمندگی کا باعث ہوگا اور اعلیٰ حضرت کی عملی زندگی جو عملی جدوجہد سے عبارت ہے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ سنت ہے جو نبی ہونے کے باوجود ریاضت عبادت سے کبھی غافل نہیں ہوئے اور کائنات کے بڑے شکر گزار کہلائے۔ ہر امتی کے لیے اپنا محاسبہ اور اعلیٰ حضرت کے ہر پیروکار کا اپنا عملی جائزہ حق تقلید کے لیے بہت ضروری ہے اور ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب آپ اور ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا شکریہ ہی ادا نہ کریں بلکہ آپ لوگوں کے لیے دعا بھی کیا کریں کہ خدا صحت و تندرستی کے ساتھ آپ لوگوں کو سلامت رکھے، (آمین) سالنامہ 2017ء کا آغاز بہت ہی خوبصورت اور ایمان افروز ہے اور آپ کی گفتگو تو ایمانی رمق کے حامل دلوں کو لرزا رہی ہے کہ ہم مذہبی فرقوں میں تو بٹ چکے اب خدا کی تقسیم ہی باقی رہ گئی ہے۔ محسن اردو ادب کا جائزہ لیا اور ''معمہ خیال'' کی ادبی خلافت سے خود کو سرفراز پایا تو بشری غرور سا آ گیا جو فوراً ہی اعلیٰ حضرت کی شاندار سوانح پڑھ کر بلکہ نام دیکھ کر ہی رفع ہو گیا۔ عجیب عادتیں تھیں مشہور ادیبوں کی اور بعض کی تو بے ادبی بھی کہ بھلا شور و غل اور افراتفری کے دوران کوئی یکسوئی سے کیسے لکھ سکتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے بے ادب ماحول ہی کا شاخسانہ ہے کہ ان کی تحریریں بھی کہیں کہیں بے ادب ہو گئیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' تو ہے ہی ہماری فیورٹ۔ آگے چلے تو جھوٹے لوگوں سے واسطہ پڑا نبوت کے دعویٰ خلیفہ مامون الرشید کے دور میں زیادہ ہوئے۔ اگر وہ سنجیدگی سے ایک دو کو کڑی سزائیں دے دیتے تو ان کو فضول بازیاں کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔ ''بال پین'' اور ''ڈراؤز'' عرق ریزی سے تیار کی گئی تحقیقی معلومات پر مبنی تھیں۔ شکیل ادریس اور شکیل صدیقی کی محنت کو سلام۔ فلم ''مٹھی بھر چاول'' اور ''باجی کو بنیاد بنا کر'' اداکارہ سنگیتا اور الیس سلمان کا موازنہ تحریر میں نیا پن لے آیا۔ اتفاق سے دونوں فلمیں ہماری دیکھی ہوئی ہیں لہٰذا انور فرہاد صاحب کے موازنے سے ہم متفق ہیں اور اس بات سے بھی کہ سنگیتا جیسا زرخیز ذہن حالات کی چکی میں پس کر ضائع ہو گیا۔ ''جانور بچے'' بہت ہی منفرد تھی منظر امام صاحب کی ''تاریخ عالم'' کی طرح۔ صائمہ اقبال نئے سال میں شاہ جہاں، واصف علی واصف، اصغر خان، احمد فراز، عبدالستار ایدھی، احمد حسن رانی کے ساتھ آئیں اور خوب آئیں۔ مانسہرہ والے ہمارے ساتھی ایاز راہی، محمود کے ایاز کی جلوہ خیزیاں بکھیر رہے تھے اگر ان کی لو اور تیز کر دی جاتی تو ایاز اور زیادہ نمایاں نظر آتا لیکن شاندار انداز تحریر نے ہر کمی پوری کر دی۔ ''سراب'' کی آخری قسط نے کاشف زبیر کی اس تخلیق کو مکمل کر دیا اور مکمل کرنے والے زین مہدی تھے جنہوں نے حق دوستی اور حق قلم انصاف کے ساتھ ادا کر دیا۔ 'معمہ خیال' کے کسی ساتھی نے زین مہدی کی شخصیت نہیں پوچھی اور یہ کوتاہی ہم سے بھی ہوئی بہر حال انعام پانے والوں کو مبارک باد۔ اب آتے ہیں زویا اعجاز کی ''تم ہو کہ چپ'' ہماری شہ رگ کی کہانی تھی۔ کشمیر پر بھارتی تسلط اور مظالم اب احاطہ تحریر سے بھی ماورا ہو گئے ہیں۔ بھارتی مودی سرکار نے گجرات کی مودی سرکار کی طرح کشمیر میں بھی مسلمانوں کے خون کی ہولی شروع کر رکھی ہے اور ایسا صرف اور صرف ہمارے رہبر و رہنماؤں کی بھارت سے نیازمندیوں کا مرہون منت ہے۔ بیان بازیاں اور بے عملیاں اور غلط حکمت عملیاں اس کی وجوہات ہیں اور دیکھا جائے تو کشمیر صرف... بھارتی سیاستدانوں کی

سیاست کا محور بن کر رہ گیا ہے۔ ''مشہرِ خیال'' میں بڑے نامی گرامی نام انتظار گاہ میں بیٹھے دیکھ کر بہت دل گرفتہ ہوئے۔ کاش کوئی ایک ادارہ ہی ہم عوام کی مشکلات اور نقصان کا اندازہ کرے۔ محکمہ ڈاک تو بنایا ہی دلوں اور ذہنوں کو جوڑنے جیسے نیک مقاصد کے لیے تھا وہ بھی سب اداروں کی طرح ہمارے احساسات کا قاتل نکلا۔ سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سٹھار اور انور عباس شاہ بالترتیب چھائے ہوئے تھے۔''

☆ رانا محمد شاہد کی تشریف آوری بورے والا سے۔ ''حسبِ معمول معراج رسول صاحب کا اداریہ فکر انگیز تھا۔ ہمارا سب سے بڑا المیہ ہی فرقہ واریت ہے۔ ایک اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والوں نے اپنے اپنے عقیدے اور اپنی اپنی مسجدیں بنا رکھی ہیں اور کسی دوسرے کو برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ مولانا طارق جمیل کا ایک بیان پڑھ رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں'' میں علماء سے کہتا ہوں، اللہ کے واسطے امت کو دین سمجھاؤ، فرقے نہ سمجھاؤ، اس منبر سے نفرتوں کی آگ نہ بھڑکاؤ۔ ایسی کتابوں اور تقریروں سے بچو جن سے تم دوسرے مسلمان کے لیے نفرت لے کر اٹھو۔ ہر وقت دوسروں پر چڑھائی، کبھی اپنے اوپر بھی چڑھائی کیا کرو۔ ''مشہرِ خیال'' میں آفتاب نصیر اور اعجاز حسین سٹھار کا تبصرہ اچھا لگا۔ نزابت افشاں! اگر کوئی اردو ادب میں ماسٹرز ہو تو کیا اس پر تنقید نہیں ہو سکتی۔ آپ نے ناصر کاظمی کا لکھا، جون ایلیا کی پیدائش بھی دسمبر کی ہی ہے۔ ان کا تذکرہ بھی نہیں تھا۔ طاہرہ گلزار آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ والدہ کی تعزیت کے لیے شکریہ۔ آپ نے میری کوئی بات محسوس کی ہے تو معذرت ہر انسان کو اپنی زندگی، اپنی سوچ اور مرضی کے مطابق گزارنے کا حق ہے۔ ''مشہرِ خیال'' میں اگر ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے خیالات کے حوالے سے۔ مقصد ہلکے پھلکے انداز میں گپ شپ ہے۔ ورنہ ''جیو اور جینے دو'' کی پالیسی سب سے اچھی ہے۔ انور عباس شاہ! میں جب زندگی میں بہت زیادہ پریشان ہوتا ہوں تو اپنی ماں کو یاد کر لیتا ہوں۔ انہوں نے مشکل حالات میں زندگی گزاری۔ یہ سوچ مطمئن کر دیتی ہے۔ ماں جیسا بے لوث رشتہ میرے اللہ نے بنایا ہی نہیں۔ دعاؤں کے لیے شکر گزار ہوں۔ اویس شیخ آپ کشمیر میں بھارتیوں کے ظلم کے حوالے سے بات کر رہے ہیں، مسلمان تو دنیا بھر میں ظلم کا شکار ہے۔ سدرہ بانو ناگوری کا خط بھی دلچسپ تھا۔ انٹرنیٹ اور موبائل نے تو جوان نسل کو تباہ کر دیا۔ ان دو ایجادات نے برائی کو آسان اور اچھائی کو مشکل بنا دیا۔ تبصرے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے ربیع الاول کے مہینے کی مناسبت سے امام اہلِ سنت امام احمد رضا خان پر تفصیلی مضمون تحریر کیا۔ روحانی مضبوطی کے لیے ایسے انسانوں کی زندگی مشعلِ راہ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو دنیا بھر میں پھیلایا۔ وادیٔ کشمیر پر ذیبا اعجاز کی تحریر ''تم ہو کہ چپ'' متاثر کن اور معلوماتی تھی۔ تاہم اگر یہ فروری میں یوم کشمیر کی مناسبت سے لگتی تو زیادہ بہتر تھا۔ ''عجیب عادتیں'' رئیسہ خالد نے ادیبوں کی دلچسپ عادتوں سے آگاہ کیا۔ تحریر مختصر تھی کیونکہ اس موضوع پر میں نے بھی ایک تحریر لکھی تھی جس میں زیادہ ادیبوں کا تذکرہ تھا۔ سادہ اور دلچسپ انداز میں ندیم اقبال کا سفرنامہ جاری و ساری ہے۔ راحیلہ کاشف، شکیل صدیقی، شکیل اویس، منظر امام اور ایاز راہی کی تحریریں مختصر مگر معلومات سے بھرپور تھیں۔ اس دفعہ سرگزشت میں دلچسپ اور معلوماتی تحریریں زیادہ پڑھنے کو ملیں تو اچھا لگا۔ صائمہ اقبال کی تحریر میں نیا انداز دل کو بھایا جیسے ایک میز دو وزرائے اعظم، دو فلشن نگار اور باپ بیٹا وغیرہ۔ ''سراب'' اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس تحریر کے ساتھ کاشف زبیر کی یادیں وابستہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ کاشف زبیر کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)۔''

☆ اویس شیخ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے۔ ''محسن اردو ادب کی کاوش پسند آئی۔ ''مشہرِ خیال'' میں اشرفی بھائی نے ''ترپ کا پتا'' پر جو خیالات ظاہر کیے! بھائی یہ دوستیاں ملکی مفاد میں ہرگز نہیں بلکہ یہ سیاست دان خاندانی دوستیاں پروان چڑھا رہے ہیں۔ مسندِ صدارت مبارک ہو۔ سٹھار صاحب کا خط پسند آیا۔ اس کے علاوہ ''مشہرِ خیال'' کے بھی دوستوں نے اس محفل میں رنگ بکھیرے۔ نزابت افشاں کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے ان کو شاعری پر اچھی گرفت ہے۔ جونانی بھائی کی والدہ کی رحلت کا سن کر افسوس ہوا۔ خدا انہیں جنت میں اعلیٰ مقام دے، (آمین)۔ مرتضیٰ صاحب! مجھے بھی سلمیٰ اعوان کے لکھنے کا انداز بہت پسند ہے۔ ''اعلیٰ حضرت'' پر لکھنے کے لیے الفاظ نہیں۔ لوگ اپنے اپنے مسالک کے علاوہ کے علاوہ دوسری روحانی بزرگان شخصیات کے متعلق جاننے کی سعی نہیں کرتے، یہ ولایت و کرامات کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کے مختلف ادوار میں نماز کی ادائیگی کے لیے گاڑی تین بار نہیں چل سکی۔ خدا کے ہاں ایسی بلند مرتبہ دل آویز شخصیت کا کیا مقام ہوگا؟ ''تم ہو کہ چپ'' وادیٔ کشمیر کی آپ بیتی کو کتنی عمدگی اور خوب صورتی کے ساتھ لفظوں کے پیرہن دیا۔ ''جھوٹے لوگ'' کمال کی کہانی تھی۔ اس دلیل کا تو کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ ''کسی بھی لڑکی سے میری شادی کرادو، وہ لڑکی ایک سال کے اندر بچے کو جنم دے گی'' ہے ناں جواب شگوفہ۔ ''بال چین'' نایاب تحریر تھی۔ بلند پایہ ایجاد کی کہانی غضب کی تھی۔ ''ڈرا ڈز'' کی داستان دلچسپ تھی مگر اس کا بھیانک پہلو یہ بھی ہے کہ دورِ جدید میں اس کا استعمال دشمنوں اور خصوصاً مسلمانوں پر قہر بن کر ٹوٹ رہا ہے۔ ''جانور بچے'' حیرت انگیز تحریر تھی، جن جانوروں کا نام سن کر انسان کا دل دہل جاتا ہے ان کی بچوں کے ساتھ مہر و مروت کے قصے؟ دل نہیں مانتا۔ ''جنوری کی شخصیات'' نے تو مزہ دوبالا کر دیا۔ بے انتہا خوب صورت شعروں کے خالق احمد فراز کا تذکرہ تو بہت پسند آیا۔ ایاز کا تذکرہ بے

مشکل تھا۔ تحریر پڑھ کر اندازہ ہوا مختصر مضمون خاصا وقت طلب تھا۔ ایسی شخصیات کو کھنگالنا آسان کام نہیں ہوتا۔ سچ بیانیوں میں "سنگ دل" پڑھی۔ نادیہ کا فیصلہ بالکل درست تھا کیونکہ اس کا فیصلہ اکیلی کا نہیں بلکہ اس میں اس کی بہن اور سسرال شریک تھا۔ خاندان کے سربراہ کا ایک غلط فیصلہ کتنے بھونچال کھڑا کرسکتا ہے؟ یہی سبق اس کہانی میں پوشیدہ تھا۔ "سچا آدمی" پڑھی۔ کیا یہ بات پائے یقین نہیں کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں؟ ضعیف الاعتقادی میں بھی ہمارا کوئی ثانی نہیں۔ اس لیے دربدر کی ٹھوکریں ہمارا نصیب ٹھہری ہیں۔ "کولہو کا بیل" پڑھ کر ایک جملہ یاد آیا، جو شاید برٹینڈرسل کا ہے "انسان بوقت دسترس جتلائے گناہ ہوتا ہے اور بوقت افلاس جتلائے آہ ہوتا ہے۔" نازو کو محبت بھری ازدواجی زندگی راس نہیں آئی اور درماندگی اس کا مقدر ٹھہری۔ "ان دیکھا سودا" پڑھی۔ کمال ہے انجم صاحب آپ کی حسن پرستی کے کیا کہنے؟ اس تہامہ جبین نے صرف ایک ملاقات کا وقت مانگا تھا۔ کوئی شادی وغیرہ کی آفر تھوڑی کی تھی اور آپ سدا کے حسن پرست ٹھہرے۔ دلچسپ کہانی تھی۔ "درد محبت" پڑھی۔ ایسی محبتوں کو محبت کہنا محبت کی توہین ہے۔ یہ کہانی جس محبت کے گرد گھوم رہی تھی۔ وہ خالصتاً جوا تھی۔ دوسرے لفظوں میں جو جیتا وہ سکندر اور جو ہارا زمانے بھر کی ٹھوکریں یا پھر گولی اس کا مقدر۔ "درست فیصلہ" کہانی پڑھ کے تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غربت میں انسان کی بس قیمت لگنا باقی رہ جاتی ہے۔ یہ ایسی اندھیر نگری ہے جس میں انسان کی خواہشات، خواب اور عزت داؤ پر لگ جاتی ہے اور بے بسی کے سوا اور کچھ بھائی نہیں دیتا۔ "وقت کا قتل" بھی لاجواب تھی۔ "مسافت" پڑھی۔ یہ کہانی پڑھ کر میری نظروں میں پٹھان قوم کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی۔ ان میں سیکڑوں خامیاں ہوں گی لیکن عزت غیرت اور کردار پر وہ لوگ جان دے دیتے ہیں۔ حرف برگز نہیں آنے دیتے۔ رفعت کے کردار سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ایسی عورتیں خاندان ہی نہیں قبیلے کا بھی فخر ہوتی ہیں۔"

☆ نزاہت افشاں کا مہورہ فتح جنگ سے تبصرہ۔ "سال 2016ء اردو ادب کے لیے بہت بھاری رہا۔ ہمارے کئی معروف لکھاری دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اللہ پاک ان کو اپنی رحمت خاص سے نوازے اور جنت الفردوس عطا کرے۔ اداریہ اس بار جرس کارواں کی طرح تھا۔ کاش کہ ہم لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ فرقہ بندی کے ذریعے ہمارے دشمن ہم میں پھوٹ ڈال رہے ہیں۔ محسن اردو ادب مختصر تعارف خوب رہا۔ "شعیر خیال" میں نصیر احمد اشرفی، اعجاز حسین سحقار، سید مسرت حسین رضوی، انور عباس شاہ، اویس شیخ، فقیر غلام حسین ضیاء، آپا گل اور سدرہ بانو ناگوری سب بھرپور تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ جن لوگوں نے مجھ ناچیز کو یاد رکھا۔ ان کا بھی اور جنہوں نے یاد نہیں رکھا ان کا بھی شکریہ۔ "اعلیٰ حضرت" امام احمد رضا خان بریلوی کی داستان حیات بہت موثر انداز میں لکھی گئی۔ "تم ہو کہ چپ" وادی کشمیر کے حوالے سے بہت منفرد تحریر تھی۔ ہمیں تاریخ میں کئی مواقع ملے جب ہم بزور قوت کشمیر پر قبضہ کرسکتے تھے لیکن ہمارے حکمران سفید حویلی (وائٹ ہاؤس) کے احکامات پر عمل پیرا رہے اور یوں ہم نے کشمیر کھو دیا۔ اس بات کا تفصیلی ذکر شہاب نامہ میں ملتا ہے۔ عجیب عادتیں مختلف فنکاروں کی عادات سے متعلق اچھی تحریر تھی۔ "شمشال سے تورغنو" بہت زبردست انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ جھوٹے لوگ، دبال جین، ڈزاؤز، جانور، بچے، طنز آمیز، دلایاز، سنگ دل اور کولہو کا بیل سب بھرپور تحریریں تھیں۔ ناظم بخاری اس بار بھی اک منفرد کہانی کے ساتھ حاضر تھے۔ "مسافت" بھی اچھی تحریر تھی۔ اب بات ہو جائے۔ "جنوری کی شخصیات" پر۔ حسب روایت اردو ادب کی کئی معروف ہستیاں جگہ نہ پاسکیں۔"

☆ اعجاز حسین سحقار نور پور تھل سے لکھتے ہیں۔ "اعلیٰ حضرت" پر مضمون دے کر اس فقہ کے پیروکاروں پر احسان عظیم ہے، کوئی جلسہ، محفل میلاد اور نعت خوانی کا پروگرام ہو آخر میں ان کا لکھا سلام ضرور پڑھا جاتا ہے۔ آپ عاشق رسول تھے اور تمام زندگی خدمت اسلام میں گزار دی وہ عالم اسلام کے لیے قابل فخر ٹھہرے۔ "جنوری کی شخصیات" میں پہلے والا دھوم دھڑ کا نہ تھا۔ شاید ہماری کوئی خاص پسندیدہ شخصیت نہ تھی پھر جو احوال دیا گیا وہ بھی قدرے مختصر تھا۔ آخر "سراب" کا اختتام ہو گیا۔ شہباز کو کتنے صدمات سہنے اور مشکلات سے نبرد آزما رہنے کے بعد سویرا مل گئی تو یوں جانیے زندگی مکمل ہو گئی۔ جتنے کٹھن دن گزارے، گھر سے دوری اختیار کیے رکھی اور لمحہ بہ لمحہ موت سے پنجہ آزمائی میں گزرا تو اس کی قیمت وصول ہو گئی تو درمیانی وقت کی صعوبتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ شہباز سے دس سال تک ساتھ رہا۔ اب بچھڑنا کسی صدمے سے کم نہیں۔ ایک اجنبی کے ساتھ چند گھنٹے ایک سیٹ پر اکٹھے بیٹھ کر سفر کرلیا جائے تو موبائل نمبر کے تبادلے کے علاوہ پورا تعارف حاصل کرنے کے ساتھ آئندہ رابطہ کی یقین دہانی کے بعد جدائی کا مرحلہ آتا ہے لیکن یہاں ایک سو بیس ماہ کی رفاقت رہی۔ ایک مدت تک کسک محسوس ہوتی رہے گی۔ زین مہدی نے کامیابی سے ذمہ داری نبھاتے ہوئے طویل سرگزشت کو انجام تک پہنچایا حالانکہ انہوں نے کئی ایسے الفاظ استعمال کیے جو پڑھے اور سنے نہ تھے جیسے "نگلیارا" کا ہر قسط میں استعمال ہوا (کوری ڈور کو اردو میں نگلیارا کہتے ہیں) اس کے باوجود بھی میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ

تمام قارئین سے التماس ہے کہ خطوط جلد پوسٹ کر دیا کریں محکمہ ڈاک کی کارکردگی کو ذہن میں ضرور رکھیں۔
خط مختصر لیکن جامع ہو۔ غیر ضروری باتوں کو شامل کر کے خط کو طویل نہ کریں۔

بکھرے حالات، واقعات اور کرداروں کو سمیٹ کر انجام تک پہنچایا۔ اب ''ناسور'' کی بند پٹاری سے کیا برآمد ہوتا ہے۔ نئے خیالات کی گٹھڑی اٹھائے اونٹ کس راہ کو سدھائے اور کس کروٹ بیٹھے، کوئی پیش گوئی مناسب نہیں ہے۔ ''سنگ دل'' کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسے نادیہ نے گھر چھوڑنے کا جو فیصلہ کیا اس میں وہ حق بجانب تھی' یہاں والدین کے حقوق اور بھائیوں کی عزت کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ''سچا آدمی'' میں خلاف توقع واقعات سامنے آئے ہیں۔ ہم نے پیروں کی دھوکا دہی خواتین کی عزت لوٹنے، جھوٹی تسلی دلاسوں سے مجبور لوگوں کی پریشانی میں اضافہ اور رقم ہتھیانے کی کہانیاں پڑھنے، سننے اور ذاتی مشاہدہ میں آتی رہی ہیں لیکن یہاں ہاشمی صاحب جنت سے اتری مخلوق ہیں جو خلوص نیت اور سچائی سے سیدھی راہ کی نشاندہی کررہے ہیں۔ معاملات کو الجھانے کی بجائے سلجھانے کا کام کررہے ہیں۔ ''کولہو کا بیل'' میں نازدنے ناانصافی، بے وفائی، بے قدری اور ظلم کا سارا بوجھ مرد ذات پر ڈال دیا ہے جو موجودہ واقعات کے پس منظر میں کسی حد تک درست ہے لیکن کیا حیا اسی کا نام ہے کہ غیر مرد سے رات کے اندھیرے اور تنہائی میں ملاقاتیں کی جائیں اور تمام حدود و قیود کو پار کرلیا جائے۔ پہلے خاوند کو چھوڑنے اور نیا گھر بسانے کے وعدے کرلیے جائیں حالانکہ اسے اکرم کی زیادتیوں کی شکایت لگانی چاہیے تھی۔ ''آن دیکھا سودا'' واقعی کبھی لمحوں میں جنت میں پہنچادیتا ہے۔ صدیوں پہلے خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے بہلول دانا سے کیا اور کوڑیوں کے مول میں جنت میں گھر لے لیا یہ اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے پھر اللہ نے دو نیک دلوں کو دنیا میں نوازا تنہائیوں دونوں نے ایک دوسرے کو پاکر دنیا میں ہی جنت کا ماحول دیکھ لیا۔ ''خادم'' میں ہماری مجبوری اور ضرورت مندی کا دخل ہے ہم اپنی خواہشات کے مطابق کردار تخلیق کرتے ہیں۔ یوں دوسروں کو بھی تحریک ملتی ہے اور یہ سلسلہ چل نکلتا ہے کام تو ہندوؤں، عیسائی اور یہودیوں کے بھی ہورہے ہیں اسی طرح یہاں بھی جس کی مراد برآتی ہے وہ اشتہار بن کر بات بڑھا چڑھا کر پھیلا دیتا ہے۔ بس جہاں جاؤ جس کا در کھٹکھٹاؤ لیکن اپنے سچے رب سے مانگو کیونکہ پوری کائنات اسی کے اشارہ پر چل رہی ہے اور وہی حاجتیں پوری کرتا ہے۔ ''درد محبت'' کو افسانوی رنگ دے کر حقیقت سے دور ہٹادیا گیا ہے۔ ''درست فیصلہ'' میں عاصم نے وقت اور حالات کے عین تقاضوں کے مطابق فیصلہ کیا یہ بجا ہے کہ اپنی تخلیق کردہ کوئی مصنوعات ہو یا کوئی لفظ اسے خون جگر جیسی حیثیت حاصل ہوتی ہے اسے ہمیشہ کے لیے کسی کے نام کرنا دل گردے کا کام ہے۔ بھلا کتنا جلدی اسے اپنی قربانی اور محنت کا صلہ مل رہا ہے۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خط کراچی سے۔ ''اعلیٰ حضرت'' پر کیا تبصرہ کریں ڈاکٹر صاحب نے اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ اس کے بعد ہمارے کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہتی اچھی تحریر تھی۔ مشہور ادیبوں کی عجیب عادتوں کا تذکرہ خوب رہا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں برف باری کا سہانا موسم، شہباز کے نت نئے سیاپے اور سرجی کی معصومیت کے کیا ہی کہنے۔ ندیم بھائی، سنا ہے کہ آج کل وہاں سردیاں عروج پر ہیں۔ میری بڑی آپا کینیڈا میں اور دوسری آپا نیویارک میں ہوتی ہیں۔ پاکستان میں کبھی بھولے بھٹکے ٹھنڈی لہر بھی آجائے کارن سوپ، گاجر کے حلوے، تیکھی شکر قندیاں، مونگ پھلیاں اور خشک میوے مزہ دوبالا کردیتے ہیں۔ یہاں موسموں کا لطف اٹھانے والے بستے ہیں۔ اگر یہی زندہ دلی کینیڈا اور امریکا والے دکھانے لگے تو شاید ان کی ساری کامیابیاں اور ترقیاں دھری کی دھری رہ جائیں۔ ''سراب'' بھی اختتام کو پہنچی یوں لگا جیسے کاشف زبیر ابھی ابھی ہم سے بچھڑے ہوں۔ جب تک سراب تھی کاشف زبیر کی یادیں پرچھائیوں کی طرح سایہ کرتی رہیں اب نہ کاشف ہوں گے اور نہ سراب صرف یادیں ہوں گی۔ زندگی شاید اسی کا نام ہے مگر کاشف زبیر کا ہیرو جو قدم قدم پر مشکلوں سے دوچار ہوا اس کی منزل خوشگوار ٹھہری۔ (ادیب کبھی مرتا نہیں، اپنی تحریروں میں زندہ رہتا ہے) منظر امام کی اس بار مختصر تحریر پڑھ کر مزہ نہیں آیا۔ اپنے منفرد انداز میں کوئی وہ نیا سلسلہ شروع کریں ہوسکے تو دنیا بھر کے مشہور ادیبوں پر کچھ لکھیں۔ ''جنوری کی شخصیات'' میں واصف علی واصف پر پڑھنے کی خواہش پوری ہوگئی۔ صائمہ اقبال اچھا لکھ رہی ہیں اور ہماری معلومات کو وسیع کررہی ہیں۔ شکریہ صائمہ جی انور فرہاد نے فلم نگری کے گزرے دنوں کی داستان کو بخوبی لکھا اپنے نام کی طرح خوب صورت اور نوخیز سی سنگیتا اب بڑھاپے کی طرف بڑھ رہی ہے مگر اس کے حوصلے اب بھی جوان ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ''مٹھی بھر چاول کی طرح'' ''تم ہی تو ہو'' بھی کامیابی سے ہمکنار ہو۔ خبروں سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی اس فلم پر بہت زیادہ محنت کررہی ہیں۔ سچ بیانی میں اکرم کا جملہ ہی اس پر تبصرہ ہے کہ اگر نادیہ نے بولڈ اسٹیپ نہ لیا ہوتا تو وہ خون تھوک تھوک کر مرچکی ہوتی۔ ''خادم'' ہلکی پھلکی تفریح سے بھرپور رہی۔ خادم کی خدمتوں نے خوب ہنسایا تو ''درد محبت'' نے رلا دیا۔ کس کردفر سے یہ بڑے وڈیرے محبتوں کی پاکیزگی کو نفرتوں میں بدل کر اپنے خون کی پہچان ہی بھول جاتے ہیں۔''

☆ ندیم اقبال کا ای میل مشی گن امریکا سے۔ ''سب سے پہلے ان دوستوں کا شکریہ جو اس حقیر کی تحریر ''شمشال سے ٹورنٹو تک'' کو پسندیدگی کی سند عطا کررہے ہیں۔ یہ سند مجھے مہمیز کررہی ہے۔ ورنہ قلمکاری تو میرا شعبہ نہیں تھا۔ یہ آپ سب کی عنایت ہے کہ میں مسلسل لکھے جارہا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد صاحب کتاب بھی بن جاؤں گا کیونکہ کتاب پریس میں جاچکی ہے۔ یہ

آپ سب لوگوں کی محبت ہی ہے کہ میں مصنف کی قطار میں آ چکا ہوں۔ خاص کر میں قیصر خان بھکر، رانا شاہد بورے والا، نزاہت افشاں فتح جنگ، اویس شیخ ٹوبہ ٹیک سنگھ، انور عباس شاہ بھکر، سلیم رشید لاہور، سدرہ بانو ناگوری کراچی، آفتاب احمد نصیر اشرفی، سیف اللہ ملک وال، عبدالجبار روحی لاہور، اعجاز احمد سحار۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے قارئین جن کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا ان سب کا مشکور ہوں۔''

☆ **عبدالجبار رومی انصاری کا تجزیہ۔** ''نئے سال کے پہلے شمارے میں دین اسلام کی اعلیٰ ترین شخصیت اعلیٰ حضرت پر ایمان افروز تحریر ان کی زندگی کے بیش قیمت لمحات کو اجاگر کر کے دل و دماغ کو روشن کر دیا۔ اس تحریر کی بدولت اس شمارے کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی۔ ہے جب کہ سرگزشت کا ہر شمارہ خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اداریے کا افسانچہ بھی دل کو چھو لینے والا تھا الگ الگ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں اپنے قائد محمد علی جناح کا قول یاد رکھنا چاہیے کہ سب پاکستانی ایک قوم ہیں کوئی سندھی، بلوچی، پنجابی یا پٹھان نہیں اور دینی لحاظ سے سب مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ فرمان خداوندی بھی ہے کہ سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور تفرقہ میں نہ پڑیں اس لیے الگ الگ رہنے کا جواز ہی پیدا نہیں ہوتا (بہت خوب) محسن اردو اب مسعود حسن رضوی کی سرگزشت اچھی لگی۔ ''عنبر خیال'' کے باسیوں میں ہم تو اس دفعہ لیٹ ہوگئے۔ باقی آفتاب احمد نصیر اشرفی نے شروع سے اب تک مطلب دسمبر تک کا مختصر سا احوال بیان کر دیا۔ بہت اچھا لگا اور مبارک ہو 2017ء کی پہلی صدارت آپ کے حصے میں آ گئی۔ اعجاز حسین سحار حکیم سید محمد رضا شاہ نے بھی عمدہ تبصرہ کیا۔ سید حسرت حسین رضوی آپ کا تبصرہ نگاری کی طرف راغب ہونا بہت ہی خوش آیند ہے اسی طرح لکھتے رہیں۔ فقیر غلام حسین نزاہت افشاں اور طاہرہ گلزار کی آمد نے خوش کر دیا۔ بہت ہی زبردست تبصرہ تھا۔ انور عباس، خاموشی توڑتے غلام سبحانی اویس شیخ اور سدرہ بانو ناگوری کی حالات کا پوسٹ مارٹم کرتی تبصرہ نگاری خوب رہی۔ ساتھ میں امیر حمزہ اور غلام مرتضیٰ کا پیام بھی اچھا لگا۔ ''سنگ دل'' میں ناویہ نے مجبوراً غلط قدم اٹھایا اور پھر صبر کرتے ہوئے پھر سے اپنوں میں واپس آ گئی۔ مولوی برکت اللہ اک احسان کی وجہ سے اپنی بیٹی کو پچاس سالہ شخص سے بیاہنا چاہتا تھا۔ وجہ صرف اس کے احسانات کی وجہ سے اسے انکار نہیں کر سکے اور کہیں بھی نفع یا نقصان یا احسانات میں صرف ہاں ہاں ہی نہیں کرنی چاہیے اپنی اولاد کی خاطر یا نفع نقصان میں اگر ناں کرنا ضروری ہو تو ناں بھی کر دینا چاہیے۔ تاکہ کل آنے والے بھیانک حالات سے واسطہ نہ پڑے۔ رفعت نے چادر اور چار دیواری کا تقدس سنبھالے رکھا اور جھوٹ کا پہاڑ کھڑا کرنے والے کو منہ کی کھانا پڑی۔ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ بعض اوقات انسان اتنا مجبور ہو جاتا ہے یا مجبور کر دیا جاتا ہے تو اسے نا کردہ فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں ایسے عاصم نے بھی درست فیصلہ کیا تھا اپنے بیٹے کی خاطر زندگی کے سہانے خواب اور خواہشات کو قربان کر دیا تھا۔ عاصم واقعی عظیم انسان تھا۔ ایاز اپنے وقت کا عظیم انسان تھا جس نے غلامی سے حکمرانی تک اپنی حیثیت کو خود ہی اجاگر کر دکھا۔ ''شمشال سے نورننو'' کا سحر خوب جما ہوا ہے۔ مغرب کی مشینی اور سہل زندگی وہاں اگر مشکلات آتی ہیں تو قدرت کی طرف سے موسمی صورتِ حال یا زمینی آفات کی صورت ورنہ انہوں نے تو اپنی آسان زندگی کے لیے ہر چیز ایجاد کر رکھی ہے، جیسے مشین میں پیسے ڈالو اور کافی یا من پسند چیز باہر۔''

☆ **از سعید احمد چاند کا مشورہ کراچی سے۔** ''جنوری 17ء کا سرورق خوب تھا۔ معراج رسول صاحب نے گاؤں کی مسجد کے حوالے سے افسانچے کے ذریعے جس طرف اشارہ دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یک ٹکی سرگزشت میں محسن اردو ادب کو پڑھا۔ محسن حسن رضوی کا نام تو اب کچھ لوگوں کو چھوڑ کر شاید ہی کسی کو یاد ہو۔ اب آتے ہیں ''شہر خیال'' میں۔ آفتاب احمد نصیر اشرف کا تبصرہ ان کا نام زندہ کر گیا۔ جن لوگوں کے تبصرے پسند آئے ان کے نام یہ ہیں۔ حکیم سید محمد رضا شاہ، انور عباس شاہ، اویس شیخ، سدرہ بانو ناگوری، امیر حمزہ اشرف، رب نواز، غلام مرتضیٰ، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کا خط دیر سے آنے والوں کی فہرست میں دیکھ کر افسوس ہوا کہ انہوں نے اس خط میں اس ناچیز کے بارے میں کیا کچھ نہ لکھا ہوگا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا ''اعلیٰ حضرت'' زویا اعجاز کا ''تم چپ چاپ'' ندیم اقبال کا ''شمشال سے نورننو'' انور فرہاد کا ''نو آموز تخلیق کار'' صائمہ اقبال کی ''جنوری کی شخصیات'' ایاز راہی کا ''ایاز'' شہباز ملک کا ''سراب'' سچ بیانیوں میں جو پسند آئیں وہ یہ ہیں۔ مسز اکرم لاہور کا ''سنگ دل'' تبسم عرفان کا ''سچا آدمی'' ناز وکا ''کولہو کا بیل'' انجم جمال کا ''ان دیکھا سودا'' جلال اصغر کا ''خادم'' ارشد علی ارشد کا ''دردِ محبت'' ناظم بخاری کا ''درست فیصلہ'' سلمیٰ اعوان کا ''وقت کا تیشہ'' محمد فاروق انجم کی ''مسافت''۔ جن قارئین کے تبصرے دل کو لگے سید حسرت حسین رضوی، نزاہت افشاں، انور عباس شاہ۔''

تاخیر سے موصول خطوط

اشفاق احمد، زاہد علی خان لاہور۔ عباس میمن، میر پور خاص۔ رضوانہ قریشی، راولپنڈی۔ امتیاز بھایانی، کراچی۔ آنند جیٹھے ملانی، سکھر۔ اشرف علی خان، حیدر آباد۔ امروز حسن، لیہ۔ زینب جوکھیو، ننڈو الہ یار۔ ثاقب علی، مہ جبیں، فیصل آباد۔ وسیم بٹ، سرگودھا۔ لیلیٰ مشتاق، ویینہ۔ محمد یار لاشاری، لاڑکانہ۔ شہاب حسن، پشاور۔ ملک زین چنیوٹ۔ گل فشاں، جہلم۔ ناصر حسین ناصر، ملتان۔ سید عنایت حسن زیدی، بہاولپور۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، بھکر۔ برکت اللہ، اوسلو، ناروے۔ اسماعیل شاہ، ساہیوال۔

# ادیب صحافی

ڈاکٹر ساجد امجد

اردو ادب و صحافت کی تاریخ مرتب کرنے پر ایک نام بہت اوپر نظر آتا ہے لیکن افسوس اسے وہ مقام نہ ملا جس کا وہ حقدار تھا۔ اس نے اپنی زندگی سچ بولنے کی صحافت کے نذر کردی لیکن اسے ملا کیا؟ تا عمر وہ زندگی کی جنگ گاہ میں زباں، قلم کی حرمت بھی قائم رکھی۔ اس نے قدم قدم پر ثابت کیا کہ وہ اپنی نوعیت کا منفرد قلم کار ہے اسی لیے جیل کی سلاخیں اس کی منتظر رہیں زندگی کے سنہرے ایام قید و بند میں گزرے لیکن اس نے پروا نہ کی۔

## ایک معروف ادیب وصحافی کا زندگی نامہ

حافظ جی نے اسے مرغا بنایا اور کمر پر دو اینٹیں رکھ دیں۔

یہ حافظ جی کی مرغوب سزا تھی۔ جب بھی کوئی بچہ سبق یاد نہ کرتا یا فجر کی نماز قضا کر بیٹھتا تو اسے اس سزا کا سامنا کرنا پڑتا۔

سردیوں کی صبح تھی۔ اس دن سردی بھی کچھ معمول سے زیادہ تھی۔ نماز سے زیادہ اسے وضو کرتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے ہمت کی اور دوبار انگڑائیاں لے کر بستر سے نکل آیا۔ انگڑائیاں شاید کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئی تھیں کہ جب تک بھاگم بھاگ مدرسے کی طرف دوڑتا نماز قضا ہو چکی تھی۔ حافظ جی نے اسے دیکھتے ہی ہانک لگائی۔ ''اختر علی، ادھر آؤ۔''

''جی حافظ صاحب۔''

''حافظ صاحب کے بچے نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔''

''حافظ صاحب، سردی بہت تھی۔ دیر سے آنکھ کھلی۔ نماز نکل گئی۔''

''اس نے جواب دینے کا تو ہاتھ بھی نہیں ہے۔''

''مرغا بن جاؤ۔''

اختر علی نے یہ حکم سنا ضرور لیکن مرغا بننے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ اس نے اس سزا کے مظاہرے دیکھے ضرور تھے لیکن وہ اس پل صراط سے پہلی دفعہ گزرنے کو تھا۔

''سنا نہیں، مرغا بنو۔'' حافظ جی کی آواز گونجی۔ ''یہ مت سمجھو کہ تم مالکوں کے بیٹے ہو تو معاف کر دیے جاؤ گے۔ نماز قضا کرنے والے سب برابر ہیں۔ بنو مرغا ورنہ میں اس سے بھی زیادہ بری طرح پیش آؤں گا۔''

اختر علی کے سامنے اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جھٹ مرغا بن گیا۔ حافظ صاحب نے دو بڑی بڑی اینٹیں اٹھائیں اور اس کی کمر پر رکھ دیں۔ یہ اینٹیں اس کام کے لیے ایک طرف رکھی رہتی تھیں۔

اختر علی مرغا بنا ہوا تھا اور حافظ جی بچوں کو سبق سنا رہے تھے۔

دو بچے حافظ صاحب کے سبق سے بے نیاز کھسر پھسر کر رہے تھے۔

"ہاں یار، جن کے باپ نہیں ہوتے وہ کتنے غریب ہوتے ہوں گے۔"

"میرے ابا بتا رہے تھے کہ یہ مدرسہ جس میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں اختر علی کے دادا نے گاؤں کے بچوں کے لیے بنوایا تھا۔"

"نہیں بھائی۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے ابا بتا رہے تھے۔"

"اختر علی تو پھر اس مدرسے کا مالک اور حافظ جی اس کے نوکر ہوئے۔"

"اور نہیں تو کیا، تم نے سنا نہیں حافظ جی اسے مرغا بناتے ہوئے کیا کہہ رہے تھے۔"

"کیا کہہ رہے تھے۔"

"کہہ رہے تھے یہ مت سمجھو کہ تم مالکوں کے بیٹے ہو تو معاف کر دیے جاؤ گے۔"

"ارے ہاں کہہ تو یہی رہے تھے۔ اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر اب آ گیا۔"

کچھ دیر بعد اختر علی کی سزا کی مدت ختم ہو گئی۔ اینٹیں ہٹا دی گئیں جیسے قیدی کی بیڑیاں کھول دی جاتی ہیں۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا آیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ خاموشی سے سبق نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کی اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ساتھیوں سے آنکھ ملاتا۔

وہ گھر آیا تو اس کا سارا بدن بخار کی آگ سے جل رہا تھا۔ اس نے گھر آ کر کسی کو کچھ نہیں بتایا کہ اسے کیا سزا ملی تھی۔ دوسرے دن وہ مدرسے بھی نہیں گیا لیکن اس کا ذہن برابر یہ سوچ رہا تھا کہ اس سزا سے کیسے بچا جائے۔ بس ایک ہی ترکیب سمجھ میں آتی تھی کہ وضو کے بغیر ہی مسجد پہنچ جائے کیونکہ وضو کرنے ہی سے اس کی جان جاتی تھی۔ حافظ جی اسے دیکھ کر خوش ہو جائیں گے کہ وہ نماز میں شامل ہے۔ اسے کیا خبر کہ اس کا وضو ہے یا نہیں۔ دوسرے دن اس نے یہی کیا۔ منہ پر الٹے سیدھے چھینٹے مارے اور مسجد چلا گیا۔ نماز کے بعد وہ مدرسے پہنچا۔ سزا پھر اس کی منتظر تھی۔

"کل کیوں نہیں آئے تھے۔"

"مجھے بخار تھا۔"

"میں ابھی بخار اتارے دیتا ہوں۔" حافظ صاحب نے حکم نادر شاہی جاری کیا۔ "فوراً مرغا بن جاؤ۔"

"حافظ صاحب سردی بہت ہے۔"

"تو پھر گدھے بن جاؤ۔ گدھے کو سردی نہیں لگتی۔"

گدھے کا مطلب یہ تھا کہ اسے چاروں ہاتھ پاؤں پر کھڑا کر دیا گیا۔ گدھے کو مارا بھی جاتا ہے لہٰذا تھوڑی تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب اس کی کمر پر بید برساتے جا رہے تھے، گدھا کمزور تھا لہٰذا تھوڑی دیر میں اس کی ٹانگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ زمین پر گر گیا۔ حافظ صاحب کو بھی رحم آ گیا۔ اس کی جان بخشی ہو گئی۔

"آئندہ اگر چھٹی کی تو کھال اتار کر زمین پر رکھ دوں گا۔"

گدھے نے جھرجھری لی اور سبق یاد کرنے بیٹھ گیا۔

حافظ صاحب کے ستم کا نشانہ ایک وہی نہیں بن رہا تھا بلکہ ہر بچے کو غلطی پر یہی سزائیں ملتی تھیں۔ یہ سزائیں سب کے سامنے تکمیل پذیر ہوتی تھیں جس سے بچوں کی عزت نفس بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

حافظ صاحب خود زمانے کے ستائے ہوئے تھے۔ اپنے بچپن میں انہیں اپنی سوتیلی ماں کے ظلم سہنا پڑے تھے۔ ظلم اس حد تک بڑھے کہ ایک روز وہ گھر سے فرار ہو گئے۔ گھومتے پھرتے ایک خیراتی مدرسے پہنچے۔ یہاں بھی خوب مار کھائی اور بالآخر حافظ قرآن بن کر نکلے۔ ان حالات کا ردعمل تھا کہ جب یہ خود حفظ قرآن کی تعلیم دینے کے لیے اس مدرسے سے وابستہ ہوئے تو ان کا سارا غصہ معصوم بچوں پر نکلنے لگا۔

دوسرے بچوں کے احساسات کا علم نہیں لیکن اختر علی کے دل میں بغاوت کے احساسات جنم لینے لگے۔

☆......☆

اختر علی نسب کے اعتبار سے نہایت قابل فخر تھا۔ اس کا تعلق پیروں کے سادات خاندان سے تھا جن کا سلسلہ عہد وسطیٰ کے مشہور صوفی بزرگ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے جا ملتا ہے۔

اس کے دادا نے نہ جانے کیوں یہ وصیت کر دی تھی کہ ان کی آنے والی نسلیں پیری مریدی کا خاندانی پیشہ ترک کر کے خود محنت کر کے کمائیں اور کھائیں چنانچہ ان کے بعد اختر علی کے والد اور پھر ان کی اولاد کام پر لگ گئی۔ یہ بھی فیصلہ تھا کہ نام کے ساتھ سید نہیں لکھیں گے۔ اس وصیت کے بعد اس کے والد اور تایا نے سرکاری ملازمت کر لی۔

اختر علی کی پیدائش لدھیانہ کے ایک گاؤں "تہاڑا" میں ہوئی تھی لیکن والد کی ملازمت "فرید کوٹ" میں ہوئی تھی لہٰذا اس کی والدہ بھی بچوں کو لے کر فرید کوٹ چلی گئیں۔

اختر علی ابھی محض تین سال کا تھا کہ اس کے والد رحمت علی کا انتقال ہو گیا۔ والدہ فرید کوٹ میں رہتیں تو کھاتیں کیا۔ اس کے دونوں بڑے بھائی گھر کا خرچ پورا کرنے کے لیے ملازمت کے سلسلے میں گاؤں سے باہر گئے اور والدہ اختر علی کو لے کر پھر تہاڑا آ گئیں۔

بڑے بھائی کی ملازمت، گھر کی سبزیوں اور اجناس سے حاصل ہونے والی آمدنی، والدہ کی کفایت شعاری ان سب کو ملا کر گھر چل رہا تھا۔

اختر علی پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو اسے گھر کے پیچھے واقع مدرسے میں داخل کرا دیا گیا تاکہ اسے حافظ قرآن بنایا جا سکے یہ مدرسہ بھی خود ان کے بزرگوں نے بنایا تھا۔

یہ وہی مدرسہ تھا جس میں اختر علی کو کبھی مرغا کبھی گدھا بننا پڑ رہا تھا۔ اس کی رگوں میں بغاوت تو بہت تھی لیکن ایک تو حافظ صاحب کا خوف دل میں بہت بیٹھ گیا تھا اور دوسرے اسے اپنی ماں کا بہت خیال تھا۔ وہ پٹتا رہا اور سبق یاد کرتا رہا۔

دس سال کی عمر میں وہ حافظ قرآن ہو گیا۔ پورا گاؤں مبارک باد دینے کے لیے امڈ آیا۔ ماں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ اس کے بیٹے نے وہ کارنامہ انجام دیا تھا کہ بخشش کا سامان ہو گیا تھا۔

اس کے تایا مبارک باد دینے آئے تو انہوں نے اس کی تعلیم کا ذکر چھیڑ دیا۔

''اختر کی ماں، یہ تو تم نے اچھا کیا کہ اسے حافظ قرآن بنا دیا لیکن اب وقت بدل رہا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے اسکول کی تعلیم بڑی ضروری ہے۔ میٹرک کرے گا تو کسی نہ کسی دفتر میں لگ جائے گا۔ اس کی تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے۔''

''میں گھر میں بیٹھنے والی، مجھے کیا معلوم اب کیا کرنا ہے۔''

''تم کہو تو میں اسے اس کے بڑے بھائی کے پاس لدھیانہ بھیج دوں۔ وہ شہر ہے وہاں بہت سے اسکول ہیں کہیں نہ کہیں داخل کرا دیا جائے گا۔''

''جو تم لوگ بہتر سمجھو۔''

جب اچھی طرح طے ہو چکا تو ماں نے بڑے ارمانوں کے ساتھ اسے بڑے بھائی کے پاس لدھیانہ بھیج دیا۔ مدرسے کی تلخ یادیں اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ نہ جانے اسے یہ وہم کیوں ہو گیا تھا کہ وہ اختر علی کے نام کے ساتھ جہاں جائے گا اسے اسی طرح سزا ملے گی جیسے مدرسے میں ملتی تھی۔ اس سے بہتر ہے نام ہی بدل لیا جائے۔ یہ بغاوت تھی مدرسے سے بغاوت، حافظ صاحب سے بغاوت، اپنے نام سے بغاوت۔ اس نے شرط عاید کر دی کہ اگر اسکول میں اس کا نام حمید اختر لکھوایا جائے تو وہ اسکول جائے گا ورنہ نہیں۔ یہ عجیب ضد تھی۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حمید اختر ہی کیوں۔ کوئی اور نام کیوں نہیں لیکن وہ اڑ گیا کہ نام ہو گا تو یہی ہو گا۔ حمید اختر کی ترکیب نہ جانے کیسے اس کے ذہن میں آ گئی تھی۔ کہیں سنا تھا یا کہا تھا کسی کو معلوم نہ ہو سکا اور اس نے اپنا نام حمید اختر رکھ لیا۔ اس نام کے ساتھ وہ پہلے دن اسکول گیا۔

مدرسے میں رہ کر اس کی عمر کا بہت سا حصہ گزر گیا تھا اسے جب اسکول کی تیسری جماعت میں داخل کرایا گیا تو وہ اپنے ہم جماعتوں سے عمر میں بڑا تھا۔ قدرتی طور پر طویل قامت تھا اس لیے اور بھی بڑا نظر آتا تھا۔

اسکول اور مدرسے کے ماحول میں بڑا فرق تھا۔ یہاں آزادی ہی آزادی تھی۔ یہاں کوئی حافظ جی نہیں تھے۔ گدھا بننا پڑتا تھا نہ مرغا۔ اسے وہ اپنے نام کی تبدیلی کا اثر سمجھ رہا تھا۔

اسے اسکول میں آ کر آزادی تو نصیب ہوئی تھی لیکن ایک اور مصیبت کا سامنا ہو گیا تھا۔ وہ اسکول پہنچتے ہی اپنے سے چھوٹے بچوں کے مذاق کا نشانہ بن گیا۔ اسے دیکھ کر بچے ہنستے تھے کوئی اس کے ساتھ کھیلنے کو تیار نہیں تھا۔

وہ اسی افسردگی کے عالم میں پانچویں جماعت تک پہنچ گیا لیکن چھٹی جماعت میں ہم جماعتوں کی طرف سے ''لمبو'' کا خطاب سامنے آیا تو اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔

اس نے دوسری بغاوت کا اعلان کر دیا۔

''میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں نہیں جاؤ گے؟''

''انگریزی تعلیم مجھے زیب نہیں دیتی۔ میں دیوبند جا کر مولوی بنوں گا۔''

''مولوی بننے کی کیا سوجھی ہے۔''

''مجھے صحیح وقت پر اسکول میں داخل کرانے کی بجائے مسجد میں قرآن حفظ کرانے بٹھا دیا تھا تو اب انگریزی تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ بہتر یہی ہے کہ مجھے مولوی بنا دیا جائے۔''

"صحیح بتاؤ بات کیا ہے۔"

"میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور کلاس کم۔ میں اپنی کلاس کے سب بچوں سے بڑا ہوں۔ سب مجھے لمبو کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان کے ساتھ کھیلوں تو کہتے ہیں اپنے برابر والوں کے ساتھ کھیلو۔ اپنے برابر والوں کے ساتھ کھیلوں تو کہتے ہیں تم چھوٹی جماعت کے ہو ہم تمہیں نہیں کھلاتے۔ اگر میں صحیح وقت پر اسکول میں داخل ہو جاتا تو یہ مصیبت نہ ہوتی۔"

یہ دلیل گھر والوں کی سمجھ میں آگئی۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ اسے اسکول سے اٹھا لیا جائے۔ اسکول سے اٹھا لیا گیا لیکن دیوبند نہیں بھیجا گیا بلکہ گھر میں تیاری کرائی گئی تاکہ اسے ایک سال میں تین سال کا فاصلہ طے کرا کے اگلی کلاس میں داخل کرا دیا جائے جہاں اس کے ہم عمر طلبہ ہوں اور مدرسے میں رہ کر جو سال اس نے گزار دیے ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔ وہ انگریزی تعلیم سے بالکل ناواقف تھا لیکن اس نے غیر معمولی محنت کی اور صرف ایک سال بعد پرائیویٹ طور پر آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر کے لدھیانہ ہائی اسکول میں ساتویں جماعت کے طالب علم کے طور پر نئے سفر کا آغاز کیا۔

اس اسکول میں آئے اسے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس کی ملاقات شیر محمد خان سے ہو گئی جو ان سے ایک سال آگے تھے۔ حمید اختر نے ابھی تک لکھنے کا آغاز نہیں کیا تھا لیکن اس کے اندر چھپا ہوا ادیب اسے شیر محمد خان کے قریب لے گیا۔ الجھے بالوں والا یہ لڑکا اسے بے حد پسند آیا اور وہ اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ یہ لڑکا اسے ہمیشہ لائبریری میں ملتا تھا۔ حمید اختر کی خود اعتمادی نے آخر اسے ایک دن اس کے قریب پہنچا ہی دیا روحیں روحوں کو پہچانتی ہیں۔ ابن انشاء نے بھی اس کی طرف گرمجوشی سے ہاتھ بڑھایا۔

"تم شاعر ہو؟"

"شاعری بھی کرتا ہوں۔"

"بھی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ نثر بھی لکھتا ہوں۔"

"مجھے یاد آ رہا ہے میں نے تمہارا قلمی نام کسی رسالے میں پڑھا ہے شاید "ہمایوں" میں۔ ابن انشاء کے نام سے وہ تمہی ہو نا؟"

"ہاں کبھی کبھی میری کوئی چیز میرے قلمی نام سے شائع ہو جاتی ہے۔" شیر محمد ابن انشاء نے کہا۔ "میرے خیال میں تو تم بھی لکھ سکتے ہو۔"

"یہ تمہارا خیال ہو گا میں نے تو آج تک کچھ نہیں لکھا۔"

"کوشش کرو تو لکھ سکتے ہو۔"

کچھ لکھنے کے لیے کچھ پڑھنا بھی پڑتا ہے۔ اس نے بھی ابن انشاء کی دیکھا دیکھی خود کو کتابوں کے سپرد کر دیا۔

وہ دسویں جماعت میں تھا کہ اس کا ذوق مطالعہ دیکھ کر اس کے ماسٹر نے اسے ریلوے اسٹیشن پر مضمون لکھنے کو کہا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اور موضوع دیا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس موضوع پر پہلے بھی لکھ چکا ہے لیکن ماسٹر صاحب بضد تھے کہ اسی موضوع پر لکھا جائے گا۔

"آدمی ذہین ہو تو پرانے موضوع میں بھی جان ڈال سکتا ہے۔ تم اسی موضوع پر لکھو۔"

اس نے مضمون لکھا اور ماسٹر صاحب کو پیش کر دیا۔

حمید اختر نے اس مضمون میں ریلوے اسٹیشن پر بسنے والی مختلف آوازوں کو یکجا کر دیا تھا۔ بس غلطی یہ ہو گئی کہ اس مضمون میں اس نے نہ صرف مسافر خواتین کا ذکر کیا بلکہ ان کے نقش و نگار پر بھی رواں تبصرہ کرتا چلا گیا۔ ماسٹر صاحب غیر ادیب روایتی ذہن کے مالک۔ انہوں نے اسے فحاشی سے تعبیر کیا اور اسے دس میں سے صرف چار نمبر دیے اور اس کی اس حرکت پر اسے ڈانٹا بھی۔

"برخوردار یہ کیا حرکت ہے۔ تم بالغ ضرور ہو گئے ہو لیکن اس مضمون میں تو ساری حدیں پھلانگتے ہوئے نظر آ رہے ہو۔ پرائی مستورات کا کوئی اس طرح ذکر کرتا ہے۔"

"ماسٹر صاحب یہ سب خیالی عورتیں ہیں ان کا کوئی وجود نہیں۔"

"یہ اور بھی بری بات ہے۔ تمہارے خیالات اتنے آوارہ ہو گئے ہیں۔"

"جناب یہ منظر نگاری ہے۔ اس کے بغیر مضمون میں جان نہیں پڑ سکتی تھی۔"

"آپ نے جان ڈال دی بڑا اچھا کیا لیکن نمبر تو چار ہی ملیں گے۔"

وہ گھر آ کر بڑی دیر تک روتا رہا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ دس میں سے نو نمبر ملا کرتے تھے اور اب چار نمبر ملے تھے۔ بے عزتی الگ ہوئی تھی۔

اسی شام شیر محمد ابن انشاء اس سے ملنے اس کے گھر

آیا۔ زخم تازہ تھا۔ دوست کو دیکھتے ہی ہرا ہو گیا۔ اس نے پوری روئیداد بیان کر دی۔
شیر محمد ابن انشاء اس کی شکایتوں کو سنتا رہا اور بیچ بیچ میں تسلی بھی دیتا رہا۔ جب دونوں طرف سے شکایتوں کے دفتر بیان ہو چکے تو ابن انشاء نے اس سے وہ کاپی مانگی جس پر مضمون لکھا گیا تھا۔
''اپنی وہ کاپی مجھے دو جس پر تم نے مضمون لکھا ہے۔''
حمید اختر اس وقت یہی سمجھا تھا کہ وہ اس کاپی کو دکھا کر ماسٹر صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کرے گا اور نمبر بڑھوادے گا۔ اسی لیے کاپی مانگ رہا ہے۔
دوسرے روز وہ کاپی اس نے واپس کر دی۔ حمید اختر نے پوچھا بھی لیکن ابن انشاء ٹال گیا۔
اس کے بعد کوئی ایک مہینا گزرا ہوگا کہ ابن انشاء ہمایوں کا پرچہ لے کر آیا۔ اس نے بڑی شان سے وہ صفحہ کھولا جس پر حمید اختر کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اب یہ عقدہ کھلا کہ ابن انشاء نے یہ مضمون نقل کر کے ہمایوں کو بھیج دیا تھا۔ یہ اس کا پہلا مضمون تھا جو کسی ادبی رسالے میں شائع ہوا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا لیکن یہ غصہ بھی تھا کہ اس مضمون کو اس کے اسکول ماسٹر نے کسی قابل نہیں سمجھا تھا اور دس میں سے صرف چار نمبر کا حق دار قرار دیا تھا۔ وہ اگلے ہی روز ہمایوں کا پرچہ لے کر ماسٹر صاحب کے پاس گیا۔
''جس مضمون کے آپ نے چار نمبر دیے تھے وہ ہمایوں جیسے معیاری ادبی رسالے میں شائع ہو گیا۔'' ماسٹر صاحب نے صرف اتنا کہا۔
''اپنا اپنا معیار ہوتا ہے۔''
**1943ء** میں اس نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔
یہ جنگ آزادی کا زمانہ تھا۔ قرارداد پاکستان پیش ہو چکی تھی۔ سیاسی میدان میں ہلچل تھی۔ کانگریس صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے کر آزادی کی تحریک کو تیز تر کر رہی تھی۔ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ حمید اختر کی نوجوانی ان سب تحریکوں سے بہ یک وقت متاثر ہو رہی تھی۔ صرف ملکی حالات ہی دگرگوں نہیں تھے ملک سے باہر کے حالات بھی انتشار کی لپیٹ میں تھے۔ جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تھا۔ سوویت یونین اب تک جنگ سے باہر تھا اور اسے سامراجی جنگ قرار دیتا تھا۔ حملے کے بعد مادر وطن کے دفاع کے لیے سوویت یونین نے برطانیہ،

## آہ...... سلیم فاروقی

فنکار کبھی مرتا نہیں اپنی تحریر میں زندہ رہتا ہے۔ جاسوسی ڈائجسٹ گروپ میں فنکاری سے قارئین کو اپنا بنائے رکھنے والے سلیم فاروقی کو بھی فرشتۂ اجل نے اپنی گود میں سمولیا ہے۔ وہ ایک اچھا قلم کار تو تھا ہی، ایک اچھا انسان بھی تھا۔ ہر وقت ہنستا ہنساتا رہتا۔ اس ہنسنے والے پیارے انسان کے لیے صیغۂ ماضی استعمال کرتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے لیکن مشیت ایزدی میں کسی کا دخل بھی تو نہیں۔ اس لیے اپنے تمام قارئین سے استدعا کرنی پڑ رہی ہے کہ وہ مرحوم کو سورۂ فاتحہ میں یاد رکھیں۔ ادارہ ان کے گھر والوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

فرانس اور امریکا وغیرہ کے ساتھ مل کر نازی ملکوں کے خلاف اتحاد قائم کرلیا۔

اسی دوران وہ گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخل ہو گیا۔ یہ کالج ان دنوں انقلابی اور ادبی ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سوویت یونین پر جرمن حملے کے بعد دوسری عالمی جنگ میں شدت آگئی تھی جس کے اثرات ہندوستان پر بھی مرتب ہو رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک جو 1936ء ہی میں فعال ہو چکی تھی۔ اب حالات اس کے حق میں جا رہے تھے نوجوان اہل قلم اس کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ جنگ نے ہندوستان کی عوام کی غربت، مہنگائی، بے روزگاری اور بھوک میں بے پناہ اضافہ کیا تھا۔ بنگال کا قحط اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ جاری تھا۔ ترقی پسند ادیب و شاعر اسے اپنی تحریروں کا موضوع بنا رہے تھے۔ ان موضوعات میں نوجوانوں کے لیے بڑی جاذبیت تھی۔ کمیونسٹ پارٹی اب نسبتاً آزاد فضا میں کام کر رہی تھی۔

وہ لدھیانہ کالج پہنچا تو اس کالج میں پڑھنے والے انقلابی نوجوانوں سے اس کا سامنا ہوا۔ ساحر لدھیانوی، سید انور، ظہور نظر، احمد ریاض وغیرہ سب اسی کالج کے طالب تھے۔

ساحر لدھیانوی سے حمید اختر کا بچپن کا تعلق تھا۔ کالج پہنچ کر یہ تعلق مزید گہرا ہو گیا۔ ساحر لدھیانوی ترقی پسند شاعر تھا۔ اس نے حمید اختر کو بھی ترقی پسندی کی طرف گھسیٹ لیا۔ ہر طرف آزادی اور انقلاب کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ساحر کی محبت میں ان تصورات نے رومانس کی شکل اختیار کرلی۔ انقلاب کے خواب، عوام کی بھوک ننگ سے نجات کے لیے جدوجہد یہ سب تصورات اس کے شعور کا حصہ بننے لگے۔

☆......☆

حمید اختر جب بھی کچھ لکھنے بیٹھتا، اسے اپنے دوست ابن انشاء کی یاد آتی جس نے اس کا ایک مضمون "ہمایوں" میں شائع کروا کے اسے مصنف بنا دیا تھا یا کم از کم اس کے اندر یہ اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ وہ لکھ سکتا ہے اور اس معیار کا لکھ سکتا ہے کہ کسی ادبی پرچے میں جگہ پا سکتا ہے۔

ابن انشاء لاہور چلا گیا تھا اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ حمید اختر کو صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ وہ بیڈن روڈ پر واقع "نوائے وقت" کے دفتر میں رہ رہا ہے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی کہ حمید نظامی اس کے سرپرست کا کردار ادا کر رہے تھے۔ اس رہائش کے صلے میں وہ "نوائے وقت" کا بہت سارا کام بھی نمٹا دیتا تھا۔

ایک روز ایسی ترنگ آئی کہ حمید اختر اس سے ملنے کے لیے لاہور پہنچ گیا۔ اس کے بھائی ریلوے میں تھے لہٰذا ان کا نام ہی اس کا ٹکٹ ہوا کرتا تھا۔ اس لیے مفت میں لاہور دیکھنا ذرا بھی برا نہیں لگا۔

وہ پہلی بار لاہور آیا تھا۔ کسی رستے گلی سے واقف نہیں تھا لیکن "نوائے وقت" کا دفتر تلاش کرنا کیا مشکل تھا۔ یہ شہر لاہور تھا۔ قدم قدم پر کسی نہ کسی اخبار کا دفتر تھا۔ اسی جنگل سے گزرتے ہوئے تانگے والے نے اسے "نوائے وقت" پہنچا دیا۔

"لو جی آگیا دفتر۔"

"دفتر کہاں ہے۔ یہاں تو سب مکان بنے ہوئے ہیں۔"

"یہ جو سامنے مکان بنا ہوا ہے۔ اس کی اوپری منزل پر نوائے وقت کا دفتر بنا ہوا ہے۔" تانگے والے نے کہا اور پیسے لے کر تانگہ موڑ لیا۔

حمید اختر نے مزید تحقیق کے لیے ایک راہگیر سے مزید پوچھا اور تصدیق کے بعد وہ بتائے گئے مکان کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ ابن انشاء اس وقت نوائے وقت کے فولڈ کیے ہوئے پرچوں پر ٹکٹ چسپاں کر رہا تھا۔ حمید اختر پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اوئے توں پڑھا کو لڑکا۔ کہاں لدھیانہ کہاں لاہور۔ یہاں کیسے آیا۔"

"بس تمہاری یاد ستائی، ریلوے اپنے گھر کی ہے۔ سوچا لاہور ہو آؤں۔"

"کچھ دیر بیٹھو پھر نکلتے ہیں تمہیں لاہور بھی تو دکھانا ہے۔"

کچھ دیر بیٹھنے کا تو بہانہ تھا۔ وہ اسی وقت اٹھا اور حمید اختر کو لاہور دکھانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ چائے خانوں اور مختلف ٹھکانوں کی سیر کراتے ہوئے وہ اسے راجندر سنگھ بیدی سے ملوانے کے لیے ان کے اشاعتی ادارے سنگم پبلشرز لے گیا۔ راجندر سنگھ بیدی اس کا ایک آدھ مضمون پڑھ چکے تھے۔ اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کی عمر بھی سترہ اٹھارہ سے زیادہ نہیں تھی، کون مان سکتا تھا کہ اس کے قلم میں کتنی جان ہے۔ اس کا مطالعہ کس بلا کا ہے اور انگریزی دانی کس

درجے کی ہے لیکن ابن انشاء نے اس کا تعارف اس انداز میں کرایا کہ راجندر سنگھ بیدی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ موجودہ سیاسی حالات کا تذکرہ چھیڑا تو اس کی معلومات حوصلہ افزا تھیں۔

ابن انشاء اسے یہاں لائے ہی اس لیے تھے کہ اس کے لیے کوئی کام نکالا جائے لہٰذا انہوں نے بیدی صاحب کے سامنے اس کے گھریلو حالات اور مالی پریشانیوں کا ذکر کیا اور یہ درخواست بھی کی کہ اس کے لیے کوئی کام نکالا جائے۔

''میرے پاس ایک کام ہے تو اب یہ نہیں معلوم کہ یہ کرسکیں گے یا نہیں۔''

''کیسا کام ہے۔''

''چیکوسلواکیہ کا ایک ناول نگار ہے۔ اگنات ہرمین۔ اسے اگر یہ اردو کا روپ دے سکیں۔''

''مجھے یقین ہے کہ یہ کام یہ کرلیں گے۔''

''دیکھ لیں معاملہ ترجمے کا ہے۔''

''اس شرط پر یہ ترجمہ کرالیں کہ اگر پسند نہ آئے تو نہیں چھاپیں گے۔''

''یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔''

''پھر یہ کریں کہ چند صفحات ترجمہ کرا کے دیکھ لیں۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔''

راجندر سنگھ بیدی نے چند صفحات میں بلکہ ایک پیرا گراف اسے ترجمے کے لیے دے دیے۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ترجمہ کردیا۔ بیدی کو یہ ترجمہ پسند آیا اور انہوں نے ناول نکال کر اس کے حوالے کردیا۔

یہ اس کا پہلا ترجمہ تھا لیکن اس میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک اچھے ترجمے میں ہونی چاہییں۔

اس ترجمے کا معاوضہ اسے سو روپے منی آرڈر کی صورت میں ملا۔ یہ معاوضہ اس وقت اور اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

☆......☆

ساحر لدھیانوی تعلیم کی طرف سے ہمیشہ غافل ہی رہا تھا اور اب تو شاعری میں اس کی مقبولیت عروج پر تھی۔ وہ تیزی سے ہردلعزیزی کی منزلیں طے کررہا تھا۔ اس کی نظم ''تاج محل'' نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ ایسے میں کالج کی پابندی اسے اور بھی بری معلوم ہونے لگی۔ وہ اچانک انگریزی تعلیم کے بالکل ہی خلاف ہوگیا۔ اس کے پاس دلیلوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ انہی دلیلوں سے دوستوں کو قائل کررہا تھا۔

''ہمیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں انگریزوں کی نوکری کرنی ہی نہیں ہے بلکہ اس ملک کو آزاد کرانا ہے۔ ہمیں انگریزی تعلیم کی بجائے سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہے۔''

ان دلیلوں میں حمید اختر کے ذاتی حالات بھی شامل ہوگئے۔ جنگ کی وجہ سے گرانی نے ملازم پیشہ لوگوں کی زندگی اجیرن کی ہوئی تھی۔ اس کے بڑے بھائی ملازمت ضرور کررہے تھے لیکن اب ان کی تنخواہ میں گزارہ نہیں ہورہا تھا۔ کچھ یہ حالات کچھ ساحر کی دلیلوں کا اثر۔ اس نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ سیاسی تحریکوں میں حصہ لے گا اور ادیب بنے گا۔

قحط بنگال کے موضوع پر کرشن چندر کا افسانہ ''ان داتا'' شائع ہوا تو ہر طرف دھوم مچ گئی۔ ساحر نے پڑھا تو اس کے دل میں نئے خیالات نے جنم لیا۔ اس کے لیے حمید اختر کو اپنے ساتھ ملانا ضروری تھا۔

''حمید تونے کرشن چندر کا ''ان داتا'' پڑھا؟''

''کل ہی تو پڑھا ہے۔''

''اگر اسے ٹیبلو کی شکل میں پیش کیا جائے تو لوگوں میں بہت مقبول ہوگا۔ اس سے جو آمدنی ہوگی وہ ہم بنگال ریلیف فنڈ میں جمع کرادیں گے۔''

''یہ ہے تو بڑے ثواب کی بات اور ہمارے مقصد کے قریب بھی لیکن تمہارے نزدیک اسے پیش کرنے کی صورت کیا ہوگی۔''

''ڈائیلاگ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پردے کے پیچھے یہ افسانہ کمنٹری کی صورت میں پڑھا جائے گا۔ اسٹیج پر جو اداکار ہوگا وہ اس افسانے پر خاموش اداکاری کرے گا۔ افسانے میں دو کردار اور ہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی یہ بھی اسی طرح خاموش اداکاری کریں گے۔''

''سوال یہ ہے کہ پس پردہ افسانہ پڑھے گا کون؟''

''یہ کام میں سرانجام دوں گا۔''

''سوال یہ بھی ہے کہ یہ ٹیبلو یا ڈراما پیش کہاں کیا جائے گا؟''

''کوشش کریں تو کوئی نہ کوئی مناسب جگہ مل ہی جائے گی۔''

تیاری مکمل تھی اب ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں اسے پیش کیا جائے۔ لدھیانہ کے معروف سینما ریکھی تھیٹر

والوں سے بات ہوئی تو انہوں نے اس نیک مقصد کے لیے ''ہال'' مفت دے دیا۔

ہفتے بھر کی ریہرسل کے بعد جب مقررہ دن یہ ڈراما اسٹیج کرنے کا وقت آیا تو وقت سے پہلے ہی تمام ٹکٹ فروخت ہو چکے تھے۔

ساحر کو پس پردہ افسانہ پڑھنا تھا اور بھوکے بنگالی کا کردار ان کے ایک ساتھی فیض الحسن نے ادا کیا جو نہایت کمزور اور دبلا پتلا تھا۔

ساحر نے پردے کے پیچھے سے ''ان داتا'' افسانہ پورے کا پورا پڑھا اور اپنی آواز کے زیر و بم سے لوگوں کو رلا دیا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک پورا ہال دم سادھے بیٹھا رہا اور جب روشنی ہوئی تو ہر آنکھ نم دیکھی گئی۔ ڈراما دیکھنے والوں نے ٹکٹ کی رقم کے علاوہ نقد رقم بھی جمع کرائی اور اس طرح قحط بنگال کے لیے اچھا خاصا فنڈ جمع ہو گیا۔

ابھی اس ڈرامے کو پیش کیے ہوئے تین چار دن ہی ہوئے تھے کہ ان سب کے نام سمن جاری ہو گئے جنہوں نے اس ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔ جرم یہ بتایا گیا تھا کہ آپ نے حکومت وقت کے خلاف باغیانہ ڈراما اسٹیج کیا لہٰذا ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہو کر صفائی پیش کریں۔

جرم ثابت ہونے پر کارروائی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہونا تھی۔

ان نوجوان طالب علموں پر نہ جانے کیا گزر جاتی لیکن ریگل تھیٹر کے مالکان کا اثر رسوخ کام آ گیا کیونکہ اس کی زد میں وہ بھی آ رہے تھے۔ انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے اپنی جان بھی بچالی اور جن جن کے نام سمن میں آئے تھے انہیں بھی بچالیا۔

حمید اختر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ مکمل طور پر خود کو سیاست کے سپرد کر دیتا۔ ملازمت اس کے مزاج کے خلاف تھی لیکن بھائیوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور تھا۔ وہ نوکری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ چند مہینوں میں کئی نوکریاں کر ڈالیں لیکن نوکری کا مزاج نہیں تھا۔ کہیں سے نکالا گیا کہیں خود چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ سات آٹھ ماہ کی مشقت کے بعد ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ پھر پنجاب چھوڑ کر دہلی چلا گیا۔ وہاں ٹیلی فون ریونیو اکاؤنٹس آفس میں ملازمت کر لی۔

وہ اسی ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں مقیم تھا۔

ملازمت کو صرف تین مہینے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ قدم جم جائیں گے لیکن اس کی باغیانہ طبیعت میں یہاں بھی رنگ دکھایا۔ کسی مسئلے پر ہنگامہ کرا کے ہڑتال کرا دی۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ یہ قانون پاس ہو چکا تھا کہ ہڑتال کرنے والوں کو ڈیفنس آف انڈیا کے تحت گرفتار کیا جائے گا۔ اسے اسی قانون کا علم ہڑتال کرانے کے بعد ہوا لہٰذا اب بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے پچیس دن کی تنخواہ بھی چھوڑی اور دلی بھی۔ گھر جاتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ ایک دوست کی یاد آئی جو شملہ میں تھا۔ وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ اس نے بھیس بدلا اور شملہ پہنچ گیا۔ دوست کے دروازے پر دستک دی وہ اس حلیے میں اسے کیونکر پہچانتا۔ جب پہچان گیا تو ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔

''کیا کر کے آئے ہو جو حلیہ بدلنا پڑا۔''

''گھبراؤ نہیں۔ کسی کا خون کر کے نہیں آیا ہوں۔ نوکری چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''نوکری چھوڑنا کوئی جرم نہیں۔ حلیہ بدلنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔''

''میں نے ہڑتال کرا دی تھی بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی سزا گرفتاری ہے۔''

''تمہاری نگرانی یقیناً کی جا رہی ہو گی۔''

''اگر تم ڈر رہے ہو تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔''

''ڈر نہیں رہا ہوں۔ تمہیں احتیاط کے لیے کہہ رہا ہوں۔ تم یہاں چھپے رہو۔ باہر نکلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

وہ اپنے دوست کے گھر میں خفیہ قیام کرتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ معاملہ دبا دیا گیا تو وہ گھر سے باہر نکلنے لگا۔ ایک دن ایک دفتر کے سامنے کچھ لوگوں کو قطار میں کھڑے دیکھا، معلوم کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ نوکری کے لیے انٹرویو دینے آئے ہیں۔ اس نے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ نوکری کس قسم کی ہے۔ اسے تو بس نوکری چاہیے تھی وہ بھی قطار میں کھڑا ہو گیا۔

یہ امریکیوں کا ریسٹ کیمپ تھا۔ اس کیمپ میں امریکی سپاہی محاذ جنگ سے پندرہ روز کے لیے لائے جاتے تھے تاکہ یہاں رہ کر آرام کریں اور پھر محاذ پر چلے جائیں۔

وہ انٹرویو کے لیے ایک کرنل کے سامنے پیش ہوا۔ امیدوار بہت سے تھے۔ ان میں اسے منتخب کر لیا گیا اور شملے سے کچھ فاصلے پر ایک مقام ''سباتھو'' بھیج دیا گیا۔ یہاں بھی امریکی ریسٹ کیمپ تھا۔ اسے یہاں بطور سپروائزر متعین

کردیا گیا۔ محاذ سے جو سپاہی آرام کی غرض سے آتے تھے ان کے خوردونوش کا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء کی فراوانی تھی جس کا چارج اس کے ہاتھ میں تھا۔ کسی قسم کی جواب دہی کا خطرہ بھی نہیں تھا۔

جب اس کے قدم اچھی طرح جم گئے تو اس نے ساحر لدھیانوی کو خط لکھا۔ ''یہاں چلے آؤ۔ چند روز قیام کرو۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ خوب عیش کرائیں گے۔ سب کچھ میرے ہاتھ میں ہے۔ ساتھ جگہ بھی اچھی ہے۔ بڑا لطف رہے گا۔''

ساحر آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ شورش کاشمیری بھی تھا۔ اس وقت حمید اختر کو یہ خیال بھی نہیں ہوا تھا کہ شورش کاشمیری کی میزبانی کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔

تین روز کے قیام کے بعد جب وہ دونوں رخصت ہو گئے تو حمید اختر کو کیمپ کے دفتر میں طلب کیا گیا۔

''تم نے شورش کاشمیری جیسے خطرناک آدمی کو بلایا اور اپنا مہمان رکھا۔ تم بھی کسی وقت خطرناک ثابت ہو سکتے ہو لہٰذا تمہیں نوکری سے نکالا جاتا ہے، اپنے واجبات وصول کرلو۔''

شورش کاشمیری انگریزوں کے خلاف تقریروں کے جرم میں تین چار برس کی سزا بھگتنے کے بعد کچھ عرصہ قبل ہی رہا ہوئے تھے۔

ساحر لدھیانوی لاہور چلا گیا جہاں اسے ادب لطیف کی ادارت مل گئی۔ حمید اختر بے کاری کے دن کاٹ رہا تھا لہٰذا وہ بھی ساحر کے پاس لاہور چلا گیا۔

وہ صرف ملنے گیا تھا لیکن لاہور کی رونقیں ایسی بھائیں کہ وہ بے کاری کے باوجود وہیں ٹک گیا۔ انارکلی میں نگینہ بیکری میں واقع ہوٹل ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ باری علیگ، گوپال فضل، میاں طفیل محمد، چراغ حسن حسرت، ظہور نظر اور بہت سے لوگ ہر وقت جمع رہتے۔ ادبی اور سیاسی بحثیں چھڑی رہتیں۔ حمید کو فرصت ہی فرصت تھی۔ کچھ وقت ادب لطیف کے دفتر میں گزارنے کے بعد نگینہ بیکری پہنچ جاتا۔

ان دنوں ساحر پر فلمی گیت لکھنے کا جنون سوار تھا۔ اٹھتے بیٹھتے یہی باتیں رہتی تھیں۔ دونوں کا ٹھکانہ ادب لطیف کے دفتر میں تھا۔ وہ دونوں دفتر کی چھت پر سوتے تھے۔ سوتے کیا تھے دیر تک جاگتے تھے اور مستقبل کے منصوبے بناتے تھے۔

ساحر تیزی سے شہرت و مقبولیت کا زینہ چڑھ رہا تھا۔ آخر اس کی شہرت نے رنگ دکھایا۔ اسے بمبئی کی فلمی دنیا سے بلاوا آگیا۔ ایک قوم پرست فلم ساز کلونت رائے ''آزادی کی راہ پر'' کے نام سے فلم بنا رہے تھے۔ اس فلم کے گیت لکھنے کے لیے انہوں نے ساحر کو بمبئی بلایا تھا۔

یہ 1945ء کے آخر کا زمانہ تھا۔

اس کی دیرینہ آرزو پوری ہو رہی تھی لیکن وہ جانے سے کترا رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ ساحر میں خود اعتمادی کی بے حد کمی تھی۔ اسے اس سفر کے لیے کسی بیساکھی کی ضرورت تھی۔ حمید اختر سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ حمید اختر کو اپنا مستقبل لاہور میں روشن نظر آ رہا تھا۔ وہ بمبئی جا کر انسانوں کے سمندر میں گم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ لاہور کی آبادی صرف تین لاکھ تھی۔ وہ اس صاف ستھرے شہر کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ ساحر نے اس کی ترکیب بھی نکال لی۔ اس نے فلم ساز کو خط لکھا کہ اگر حمید اختر کو بطور مکالمہ نویس بلایا جائے تو وہ آنے کو تیار ہے یعنی کہانی ساحر لکھے اور مکالمے حمید اختر۔

جنوری 46ء میں وہ دونوں بمبئی جا پہنچے۔

حمید اختر کو بجلی کے محکمے میں نئی نئی نوکری ملی تھی۔ ساحر کے اصرار پر اس نے یہ نوکری چھوڑ دی اور بمبئی چلا گیا۔

ساحر کی یہ پہلی فلم تھی جس کے لیے وہ گیت لکھ رہا تھا۔

اس فلم کا مرکزی خیال خلافت تحریک آل انڈیا کانگریس اور اس عہد کی اہم سیاسی شخصیات کے گرد گھومتا تھا، ہندوستان کے آئینی مستقبل کو زیر بحث لاتے ہوئے ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

مکالمہ نگاری کے عمل میں حمید اختر کے ساتھ ساتھ ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور اور محمود بریلوی بھی شامل تھے۔ حمید اختر نے اس فلم میں ایک مختصر کردار بھی ادا کیا۔ اس نے یہ کردار اس خوبی سے ادا کیا کہ پرتھوی راج جیسے اداکار نے نہ صرف اس کی تعریف کی بلکہ اداکاری جاری رکھنے کی تلقین کی۔ اسے دو نئی فلموں میں اداکاری کی پیشکش بھی ہوئی لیکن وہ اس طرف مائل نہیں ہوا۔ وہ خود کو بطور ادیب منوانے کے حق میں تھا نہ کہ بطور اداکار۔

فلم کمپنی سے وابستگی کے چند ماہ اس نے نہایت آرام سے گزارے اور پھر وہ فلمی چمک دمک کو چھوڑ کر انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔

یہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور اس

## حدیث پاک

"جب لوگوں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ برائی دیکھیں اور اسے روکنے کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرتے ہوئے پائیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم تم کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو ورنہ اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکلیف دیں گے۔ پھر تمہارے نیک لوگ خدا سے دعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔"

(ترمذی۔2178، ابوداؤد......4338)

تحریک سے متعلق تقریباً تمام بڑے نام اس وقت بمبئی میں موجود تھے۔ ہر ہفتے ادبی جلسہ منعقد ہوتا تھا جس میں بڑے بڑے نام موجود ہوتے۔ حفیظ جالندھری، یاس یگانہ چنگیزی، پطرس بخاری وغیرہ۔

ترقی پسندوں کے حلقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ سجاد ظہیر جس نے نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیں وہ گھر بار، بہن بھائی، بیوی بچوں کو چھوڑ کر انہی کا ہو رہتا ہے یا پھر کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی رکن بن جاتا ہے۔ سجاد ظہیر نے اس کے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا اور پھر وہ انہی کا ہو کر رہ گیا۔ اس نے اپنی رہائش گاہ ترک کی اور سجاد ظہیر کے ساتھ رہنے لگا۔

حمید اختر کی تنظیمی صلاحیتوں اور خلوص کو دیکھتے ہوئے اسے انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سیکریٹری بنا دیا گیا۔ اس نے دیگر خدمات کے علاوہ ایک نئے طریقہ کار کی بنیاد یہ ڈالی کہ انجمن کے تحت ہونے والے جلسوں کی باقاعدگی سے روئیداد لکھنے لگا۔ یہ رپورٹیں ہفتہ وار "نظام" میں شائع ہوتی تھیں۔ کس نے کس جلسے میں کیا تحریر پڑھی، کس ادبی موضوع پر بحث ہوئی اس بحث میں کون کون شریک ہوا۔ ان روئیدادوں سے وہ لوگ باخبر رہتے تھے جو ان جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔

یہ رپورٹیں مرتب کر کے بعد میں اس نے "روداد انجمن" کے نام سے شائع کرا دیں۔ اس طرح یہ مستند تاریخی ریکارڈ محفوظ ہو گیا۔

روداد انجمن گزرے ہوئے زمانے کی بازگشت ہے جس میں چند لوگوں نے کچھ خواب دیکھے تھے۔ اپنے عہد کے ادب سے بغاوت کر کے ایک نئے ادب کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ اس میں کامیاب ہوئے یا نہیں یہ الگ بحث ہے لیکن اس کے اثرات آج تک محسوس کیے جا رہے ہیں۔

نامکمل ہونے کے باوجود یہ روداد تحریک آزادی کے سبب سے نازک اور حساس دور کی ترقی پسند تحریروں پر ہونے والی مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔

روداد انجمن ایک دستاویز ہے جس کے ذریعے ترقی پسند مصنفین اور دیگر ادبی دھاروں کی فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حمید اختر کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ بمبئی کے علاوہ کسی اور شہر میں انجمن کی سرگرمیوں کی روداد اس تسلسل اور ترتیب سے نہیں لکھی گئی۔

بمبئی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں کی فکری رہنمائی سجاد ظہیر نے کی تو حمید اختر کو بلاشبہ ان سرگرمیوں کا قائد کہا جا سکتا ہے۔

اس عرصے میں ادب تخلیق کرنے کے مواقع کم ملے۔ پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ ساحر لدھیانوی کی فرمائش پر اس نے 1944ء میں شائع ہونے والے افسانوں کا ایک مجموعہ ترتیب دیا جو "دھرتی کے آنسو" کے نام سے لاہور سے شائع ہوا۔ اس کا دیباچہ ساحر نے لکھا۔

بمبئی میں ادیبوں، شاعروں کی کہکشاں اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ انجمن ترقی پسند کے جلسے بھی پوری آب و تاب سے جاری تھے۔ حمید اختر کی قلمی معروفیات بھی جاری تھیں۔ اسے دو فلموں میں بطور سائیڈ ہیرو لے لیا گیا تھا۔ اس نے کچھ رقم بطور ایڈوانس لے بھی لی تھی کہ اچانک ادیبوں کی کہکشاں گم ہو گئی۔ انجمن کے جلسے ماند پڑ گئے۔ فلم کمپنیوں میں تالے پڑ گئے شہر میں فسادات پھوٹ پڑے۔ اگست کا مہینا آ گیا تھا۔ قیام پاکستان کی منزل قریب تھی۔ یہ فسادات اس کا شاخسانہ تھے۔ وہ تو خیر ایک نسبتاً خوش حال علاقے میں رہ رہا تھا۔ یہاں حالات پُرسکون تھے لیکن شہر کے گنجان آباد علاقوں میں جہاں متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ رہائش پذیر تھے، ہندو اور مسلمان ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ جہاں "پارٹی" کا دفتر تھا اور اس سے ذرا آگے "بھنڈی بازار" میں وارداتیں زیادہ ہو رہی تھیں۔ پارٹی دفتر کی وجہ سے اس کا ان علاقوں میں روز کا آنا جانا تھا۔ پھر ایک روز اسے فون پر ہدایت ملی کہ بھنڈی بازار کی طرف بالکل نہ آئیں۔ اس کا مطلب ہے پارٹی دفتر میں ہرگز قدم نہ رکھیں۔ اس کڑی ہدایت کے بعد اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ جب دوسرے شہروں سے

بھی فسادات کی خبریں آنے لگیں تو اسے لدھیانہ یاد آیا، گھر والوں کی یاد آئی۔ یوں بھی اب وہ فارغ تھا تمام ادبی و فلمی سرگرمیاں معطل ہو گئی تھیں۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ لدھیانہ چلا جائے۔ وہاں سے گاؤں جائے اور گھر والوں کی خیریت دریافت کرے۔

بمبئی چھوڑتے ہوئے اسے قطعی احساس نہیں تھا کہ آگ کے شعلے کس قدر بلند ہو چکے ہیں۔ فسادات کس طرح لوگوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ لدھیانہ جانے سے پہلے دہلی پہنچ گیا جہاں اس کا دوست ابن انشاء تھا۔ ابن انشاء سے ملنے کے بعد اسے لدھیانہ جانا تھا۔

دہلی کے اسٹیشن پر اترنے کے بعد اس نے تانگے میں سامان رکھا اور سیدھا ہارڈنگ لائبریری پہنچ گیا۔ لائبریری اجاڑ پڑی تھی۔ صرف چوکیدار گویا دیواروں کی حفاظت کر رہا تھا۔ ابن انشاء بھی نہیں تھا۔

''صاحب تو انبالہ چلے گئے۔''

''انبالہ چلے گئے؟''

''وہاں سے پاکستان چلے جائیں گے۔''

''ابھی تو پاکستان بنا بھی نہیں ہے۔''

''پتا نہیں صاحب۔''

حمید اختر کو اچانک ڈر لگنے لگا۔ اسے لگا جیسے دہلی خالی ہو گئی ہے۔ وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ ابھی کسی گلی سے کوئی ہندو آئے گا اور اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دے گا۔ وہ جس تانگے میں آیا تھا۔ وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ حمید اختر اسی تانگے میں بیٹھ گیا۔ ''اسٹیشن چلو۔''

وہ انبالہ جانے والی ٹرین میں بیٹھ گیا۔ اس گاڑی نے اسے صبح چار بجے انبالہ اسٹیشن پر اتار دیا۔

اس نے ابن انشاء کے انبالہ والے مکان پر دستک دی۔ کسی نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر وہ سامنے آ گیا۔ یہ ابن انشاء تھا۔ حمید اختر کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

''کیسے پہنچے؟ کیوں آ گئے؟ غضب خدا کا دہلی سے یہاں تک ٹرین میں آ گئے۔'' اس نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''یار تجھ سے ملنے آیا ہوں۔'' حمید اختر نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ کوئی وقت ہے ملنے کا، ٹرینیں کٹ رہی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور تو مجھ سے ملنے چلا آیا۔ تہاڑہ جا اور اپنے گھر والوں کی فکر کر۔''

حمید اختر کو حالات کا صحیح اندازہ نہیں تھا لیکن ابن انشاء کو اندازہ تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ انبالہ میں تھا۔ یہاں سکھوں کی تیاریاں دیکھ رہا تھا اور افواہیں سن رہا تھا۔

''ٹرین تو اب صبح ہی کو ملے گی۔''

وہ دونوں رات بھر باتیں کرتے رہے۔ فسادات کی باتیں، ہندو مسلمانوں کے خون سفید ہو جانے کی باتیں۔ حال سے مایوسی مستقبل کی امیدیں۔

دوسری .... صبح احتیاط کی تاکید کے ساتھ ابن انشاء نے اسے لدھیانہ جانے والی گاڑی میں سوار کرا دیا۔

پاکستان کے قیام سے دو تین روز قبل وہ اپنے گاؤں تہاڑہ پہنچا۔ یہاں ہندوؤں کے ساتھ ستر گھر تھے جب کہ مسلمانوں کی آبادی پندرہ ہزار تھی۔ یہاں صرف ایک سکھ گھرانا آباد تھا البتہ اردگرد کے دیہات میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ مسلمان یہاں محفوظ ضرور تھے کہ اکثریت میں تھے لیکن اردگرد کے دیہات کی طرف سے خوف زدہ تھے کہ نہ جانے کب حملہ ہو جائے۔ ہر مسلمان خاندان یہ چاہتا تھا کہ کسی ممکنہ حملے سے قبل ہی وہ گاؤں کو چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ منتقل ہو جائے۔ بہت سے لوگ گاؤں چھوڑ کر جا بھی چکے تھے۔ ہر رشتہ ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کو تیار تھا۔ ہندو صرف ہندو تھے مسلمان صرف مسلمان۔

وہ اپنے گھر پہنچا تو سب نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس لیے بھی کہ وہ زندہ تھا اور اس لیے بھی کہ وہ آ گیا تھا۔ اس وقت گھر میں عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ مرد کوئی بھی نہیں تھا۔ حمید اختر کے تینوں بڑے بھائی سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے لاہور جا چکے تھے۔ خواتین کو حفاظت کی غرض سے گاؤں میں چھوڑ دیا گیا تھا کیونکہ پیری مریدی کی وجہ سے پورا گاؤں اس خاندان کا احترام کرتا تھا۔ اس گھر پر کوئی آنچ آئی تو پورا گاؤں سینہ سپر ہو جاتا لیکن اس کے بھائیوں کو صورت حال کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا۔ جب دیواریں گر جائیں تو مکینوں کی حفاظت کون کرے۔ اس کا احساس تو حمید اختر کو اس وقت ہوا جب آدھے سے زیادہ گاؤں خالی ہو گیا اور اندازہ یہی تھا کہ باقی لوگ بھی چلے جائیں گے۔ حملوں کے خطروں کی وجہ سے جب گاؤں کے مرد رات بھر جاگتے تھے اور آپس میں باتیں کرتے تھے تو ان عزائم کا

اظہار ہوتا تھا کہ کسی طرح پاکستان جانا چاہیے تاکہ جان کی حفاظت ہو اور ایمان بھی سلامت رہے۔ حمید اختر کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ گھر کی باپردہ خواتین کو کس طرح لے کر بھاگے۔ یہ سوچنے کی بات تھی کہ ۔ جس طرح دوسرے لوگ بھاگ رہے تھے۔ وہ بھی بھاگ سکتا تھا لیکن اس کے خاندان کی عورتیں دوسری عورتوں سے مختلف تھیں۔ اس کے خاندان میں پردے کی سخت پابندی تھی۔ ان خواتین نے گھر کی چار دیواری سے کبھی باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ پیدل بھی کبھی نہیں چلی تھیں۔ انہیں باہر لے کر نکلنا اور نامعلوم منزل تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ خود یہ عورتیں بضد تھیں کہ وہ گھر میں مر جانے کو فوقیت دیں گی بہ نسبت اس کے کہ گھر سے باہر نکلیں اور بے پردہ ہوں۔

وہ اسی کشمکش میں تھا۔ گاؤں میں بس اب چند ہی خاندان رہ گئے تھے۔ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اس گاؤں میں ایک پٹھان خاندان آباد تھا جس کی عورتیں بھی اس کے خاندان کی عورتوں کی طرح پردے کی سخت پابند تھیں۔ اس خاندان کے چند معزز افراد اس کے پاس آئے اور اپنی پریشانی سے اسے آگاہ کیا۔

''حمید صاحب، آپ نے سنا برابر کے گاؤں میں رات ہندو غنڈے چڑھ دوڑے۔ پورے گاؤں کو آگ لگا دی اور عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔ کئی عورتوں نے تو اپنی عزت بچانے کے لیے کنوؤں میں چھلانگیں لگا دیں۔ لوٹ مار تو ہم برداشت کرلیں گے لیکن یہ برداشت نہیں کہ ہماری عورتیں بے عزت ہوں۔''

''شکر ہے ابھی کسی نے ہمارے گاؤں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ہے۔'' حمید اختر نے کہا۔

''کسی دن اس گاؤں کا نمبر بھی آجائے گا ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔'' پٹھانوں نے کہا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''کچھ نہیں کر سکتے تو یہ تو کر سکتے ہیں کہ اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کردیں اور خود لڑتے ہوئے جان دے دیں۔''

یہ تجویز بڑی ظالمانہ تھی لیکن کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور حملہ آوروں سے مقابلے کی ٹھان لی۔

اس نے دو کنستر مٹی کا تیل منگوا کر رکھ لیا کہ اگر ایسا موقع آیا تو وہ ان عورتوں کو ایک کمرے میں بند کرکے ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دے گا اور پھر حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان بھی دے دے گا۔

اس تجویز پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ کرنے کے بعد وہ دیوان خانے سے اٹھ کر زنان خانے میں گیا۔ اس کی نظر اپنی بڑی بہنوں پر پڑی۔ آٹھ سال کی بھتیجی کو دیکھا۔ سات برس کے بھانجے نے اسے ماموں کہہ کر بلایا۔ تایازاد بہن کی بیٹی کی گود میں پندرہ دن کی بچی کو سوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ذہن میں ان سب کو مار دینے کی تجویز گردش کر رہی تھی لیکن انہیں ہنستے بولتے دیکھ کر پہلی مرتبہ یہ سوال اس کے ذہن میں آیا۔ میں انہیں کیسے ختم کر سکتا ہوں؟ نہیں میں یہ نہیں کر سکتا۔ پھر میں کیا کروں۔ اب جو ہو سو ہو۔ فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ جس کی قسمت میں ہوگا وہ زندہ بچ کر

منزل تک پہنچ جائے گا۔ یہ سوال اب بھی موجود تھا کہ کہاں جائے۔ اس نے گاؤں پر نظر ڈالی۔ لوگ بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر بہتے ہوئے دریائے ستلج کا رخ کر رہے تھے۔ وہاں سے دریا پار کر کے وہ "نکودر" تحصیل کے علاقے میں داخل ہو سکتے تھے جو مسلم آبادی کی غالب اکثریت کا علاقہ تھا۔

دو تین دن اور نکل گئے اور جب گاؤں میں آٹھ دس خاندانوں کے سوا کوئی نہ رہا سب کے سب دریا پار چلے گئے تو اس نے بھی وہاں سے نکلنے کا ارادہ کر لیا۔

بیس پچیس عورتوں اور بچوں کا قافلہ لے کر وہ گھر سے نکلا۔ گھر کا کوئی سامان کسی نے نہیں اٹھایا تھا۔ تن کے کپڑے تھے یا چند کپڑے اور ساتھ لے لیے تھے۔

راستے میں گاؤں کے گاؤں خالی پڑے تھے۔ مویشی مرے پڑے تھے۔

وہ ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کر کے دریا کے کنارے پہنچے تھے۔ پلٹ کر دیکھا تو "تہاڑہ" کی طرف آگ کے شعلے نظر آئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بروقت گاؤں سے نکل آئے۔ ان کے نکلتے ہی حملہ ہو گیا۔ اب یہ امید بھی جاتی رہی کہ جو سامان گھر میں چھوڑ آئے تھے وہ بچ گیا ہوگا۔

دریا پر موجود ملاحوں نے اس لٹے پٹے قافلے کو فوراً کشتی میں بٹھایا اور دریا پار کرا دیا۔ یہاں اسی کی طرح سیکڑوں بے خانماں افراد کھلے آسمان تلے پڑے تھے اور سوچ رہے تھے، اب کدھر کا رخ کریں کہاں جائیں۔ اس کا حال یہ تھا کہ بہن بھانجیوں کو جھوٹی تسلیاں دے رہا تھا۔ پاکستان پہنچنے کی نوید سنا رہا تھا حالانکہ اسے یقین تھا کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ پھر اسے اندھیرے میں جگنو کی طرح "مرگاہ" گاؤں کی شکل ابھری۔ اس گاؤں میں ان کے کچھ مرید خاندان آباد تھے۔ اسے امید تھی کہ وہاں ان کی حفاظت ہو سکے گی۔ ان کے وہاں پہنچتے ہی دھوم مچ گئی کہ پیروں کے خاندان کی خواتین نے گاؤں کو عزت بخشی ہے۔ خوب تواضع ہوئی لیکن یہ آؤ بھگت دو دن ہی قائم رہ سکی۔ خطرہ بڑھا تو یہاں سے بھی کوچ کرنا پڑا بلکہ پورا گاؤں ان کے ساتھ "نکودر" کی طرف چل پڑا۔ مریدوں کا ایک اور گاؤں راستے میں پڑا۔ دو دن بعد یہ گاؤں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ ایک جگہ کھلے کھیتوں میں لاکھوں انسان بیٹھے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا یہی "نکودر" ہے جسے نکودر کیمپ کا نام دیا گیا ہے۔ وہ راستے بھر نکودر کیمپ کا ذکر سنتا آیا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک ایسے کیمپ کی تصویر ابھری تھی جہاں انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کا اہتمام کیا گیا ہوگا لیکن یہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ انسانوں کا سمندر سات میل لمبی سڑک کے دونوں طرف واقع کھیتوں میں بہہ رہا تھا۔ حفاظت کے لیے پولیس یا فوج کا کوئی اہل کار موجود نہیں تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ اس حال میں یہاں کب تک رہنا ہوگا۔ یہاں سے سڑک یا ریل کا سفر غیر محفوظ تھا۔ یہیں پڑے رہنے میں عافیت تھی۔ اس وقت تک یہاں رہنا تھا، جب تک کوئی مدد کو نہیں آجاتا، جو لوگ قریب کے دیہات سے آئے تھے ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ اس کے علاوہ وہ کھانا پکانے کا بہت سارا سامان اپنے ساتھ لے آئے تھے جن سے مانگ مانگ کر دوسرے لوگ بھی کام چلا رہے تھے۔ حمید اختر کے پاس سامان نہیں تھا لیکن بمبئی میں فلم سے کمائی ہوئی نقد رقم موجود تھی۔ وہ قریب کے دیہات میں گیا اور آٹا، دالیں، چاول وغیرہ خرید لایا۔ ایک چولہا بھی خرید لایا اور کھانا پکنے لگا۔ اسی طرح دوسرے لوگوں نے بھی اپنے طور پر سامان مہیا کر لیا تھا۔

کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ بیرونی دنیا سے رابطہ بالکل منقطع ہو گیا تھا۔ اتنا بڑا ہجوم صرف اسی امید میں بیٹھا ہوا تھا کہ یہاں سے لے جانے کا کچھ نہ کچھ انتظام تو ضرور ہوگا۔

تین چار ہفتے گزر گئے تھے۔ کیمپ کی گندگی اور ناقص خوراک کی وجہ سے کیمپ میں پیچش کی بیماری پھیل گئی۔ اکثر لوگ اس کا شکار ہو گئے۔ اس کی تایازاد بہن فاطمہ بھی اس بیماری کا شکار ہوئی۔ یہاں علاج معالجے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بس جن کو یہ بیماری لاحق ہو جاتی تھی وہ موت کا انتظار کرتے تھے۔

بہت سی فکروں کے ساتھ یہ فکر بھی لگ گئی کہ اگر فاطمہ کو کچھ ہو گیا تو اس جنگل میں اس کے کفن دفن کا انتظام کیسے ہوگا۔ خود فاطمہ کو اس کی فکر ہونے لگی تھی۔ بہرحال اس نے ایک دن حمید اختر سے وعدہ لیا۔ "میرے بعد میرے بچوں کا خیال رکھنا اور حالات جو بھی ہوں اس کے انتقال کی صورت میں اسے باقاعدہ غسل دلا کر دفن کیا جائے۔"

اس نے ایک نہیں کئی بار یہ وعدہ لیا اور حمید اختر نے وعدہ کر لیا۔ "میری بہن، اگر یہ وقت آ ہی گیا تو میں ہر حالت میں اس وعدے کا پاس کروں گا۔"

وہ یہ وعدہ کر ضرور رہا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ ایسا

وقت نہیں آئے گا۔ وہ بیمار حالت میں پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھے گی اور وہاں پہنچتے ہی اس کا علاج ممکن ہو جائے گا۔ وہ نئی زندگی شروع کرے گی۔

ان دعاؤں کے ساتھ پاکستان سے بسوں اور ٹرکوں کا ایک کانوائے فوجی جوانوں کی حفاظت میں یہاں پہنچا تا کہ بچے جوانوں کو یہاں سے نکالا جا سکے۔

اس کانوائے کے ساتھ حمید اختر کے بڑے بھائی اصغر علی بھی تھے۔ انہیں حمید اختر کے بمبئی سے آنے کی اطلاع نہیں تھی۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ گھر کی عورتیں ماری جا چکی ہوں گی۔ پھر بھی ایک موہوم سی امید میں چلے آئے تھے۔ یہ بھی اتفاق ہی ہوا تھا کہ اس ہجوم میں ان کی نظر حمید اختر پر پڑ گئی۔ پھر تمام گھر والوں سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے جلدی جلدی تمام گھر والوں کو بس میں سوار کرا دیا۔ بیمار فاطمہ کو بھی بس میں سوار کر دیا گیا۔

بسوں کے نیچے مسافروں کے سامان کا ڈھیر لگا ہوا تھا کیونکہ سامان لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ کانوائے انسانوں کو لینے آیا تھا سامان کو نہیں۔

یہ کانوائے روانہ ہونے ہی والا تھا۔ بسیں اسٹارٹ ہونے ہی والی تھیں کہ اچانک بس میں بیٹھے ہوئے مسافر چیخنے لگے۔

''یہ عورت مر چکی ہے۔ اسے بس سے نیچے اتارو بلکہ پھینک دو۔ یہ بس زندوں کو لینے آئی ہے مُردوں کو نہیں۔''

''بھائی یہ مری نہیں ہے سو رہی ہے۔''

''ہمیں اندھا سمجھتے ہو۔'' کئی لوگ ایک ساتھ اٹھے اور فاطمہ پر جھک گئے۔

''کیا کر رہے ہو تم لوگ۔ میری بہن باپردہ خاتون ہے۔''

''یہ مر چکی ہے۔'' لوگوں نے اس کی نبض ٹٹول کر فیصلہ دے دیا۔

اب حمید اختر کو بھی ہوش آیا۔ اس کی بہن واقعی مر چکی تھی۔ وہ بس میں گونجتی ہوئی آوازوں کو سن رہا تھا۔ ''یہ بس مُردوں کو لینے نہیں آئی۔ ہم اسے پاکستان نہیں لے جا سکتے۔''

حمید اختر اس گھبراہٹ میں بھی سوچ رہا تھا انسانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اس مصیبت میں بھی کسی کے کام آنے کے روادار نہیں۔ اتنی دیر میں بس کا ڈرائیور اور کنڈیکٹر بھی آ گیا انہوں نے فاطمہ کے بے جان جسم کو بس سے اتار کر زمین پر لٹا دیا۔ حمید نے ایک چادر سے اس کے جسم کو ڈھانپ دیا۔

وہ اس کی لاش کے سرہانے بیٹھا تھا کہ اس کا بھائی اس کے پاس آیا۔

''بہتر ہے ہم اسے اللہ کے حوالے کر کے یہاں سے روانہ ہوں۔ اب ہم اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔''

''نہیں بھائی، آپ عورتوں کو لے کر پاکستان چلے جائیں۔ میں فاطمہ سے کیا گیا وعدہ پورا کر کے بعد میں چلا آؤں گا۔''

''کیسا وعدہ۔''

''میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے باقاعدہ غسل دے کر دفن کروں گا۔''

''اس جنگل میں تم یہ وعدہ کیسے پورا کرو گے۔''

''اللہ سب کر دے گا۔''

''تم پہلے ہی بہت مصیبت جھیل چکے ہو، تم بس میں بیٹھ جاؤ تمہارا وعدہ میں پورا کروں گا۔''

''آپ کی ملازمت کا سوال ہے آپ چلے جائیں۔'' اس نے اپنے بھائی کو زبردستی بس میں بٹھا دیا۔

بسیں حرکت میں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے لاہور جانے کے لیے پختہ سڑک پر پہنچ گئیں۔

جہاں کچھ دیر پہلے بسیں کھڑی تھیں اب وہاں لوگوں کا سامان بکھرا پڑا تھا جسے بسوں والوں نے لے جانے سے انکار کر دیا تھا کچھ فاصلے پر فاطمہ کی لاش پڑی تھی اور اس کے سرہانے اس کا بھائی بیٹھا تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کے خاندان کے تمام افراد بہ حفاظت پاکستان پہنچ جائیں گے۔

جب آخری بس بھی روانہ ہو گئی۔ فوج کے ٹرک بھی چل دیے تو اس نے آس پاس نظر دوڑائی کہ شاید کوئی نظر آئے اور اسے مدد کے لیے پکاروں۔ کھیتوں کی طرف دیکھا تو اس کی روح بدن سے نکلنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ مکئی، گنے اور مرچوں کے کھیتوں میں جا بہ جا نیلی پگڑیاں نظر آئیں۔ اس نے دھندلی آنکھوں کو دونوں ہتھیلیوں سے رگڑا۔ غور سے دیکھا تو وہ صرف پگڑیاں نہیں تھیں جیتے جاگتے سکھ تھے جو تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھے۔ وہ دراصل کانوائے کے رخصت ہونے کا انتظار کر رہے تھے تا کہ فوجی روانہ ہوں اور وہ اس سامان کو لوٹیں جو بسوں کے مسافر اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ کیا یہ مسلمان دشمن سامان کے ساتھ ساتھ اس کے پیٹ میں خنجر نہیں اتار دیں گے؟ اسے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ اگر میری موت اسی

طرح لکھی ہے تو کون روک سکتا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ کھیتوں میں چھپے ہوئے سکھ آہستہ آہستہ میدان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کی تلواریں اور نیزے چمک رہے ہیں۔ اس نے کلمہ پڑھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ابھی کوئی تلوار اٹھے گی اور میرا سر میرے تن سے جدا ہو جائے گا۔ میں پھر بھی سرخرو ہوں گا کہ مرحوم بہن سے کیا ہوا وعدہ پورا کررہا ہوں۔ اسے سامان سمیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سکھوں کی آوازیں بھی سن سکتا تھا۔ یہ عمل دس پندرہ منٹ تک جاری رہا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ کسی نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ سکھوں کو صرف بکھرے ہوئے سامان سے غرض تھی۔ انہوں نے وہ سامان اٹھایا اور میدان خالی کردیا۔

حمید اختر نے آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی بندۂ خدا آئے اور اس کی مدد کرے۔ قدرت بار بار اس پر مہربان ہورہی تھی۔ اسے سائیکل پر جاتا ہوا ایک آدمی نظر آیا۔

''میں اپنی بہن کی لاش کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ تم کیمپ میں جاکر یہ کہہ دو کہ حیدر علی شاہ کی بیٹی فوت ہوگئی ہے۔ اس کے کفن دفن کے لیے مدد کی ضرورت ہے۔ وہاں میرے گاؤں کے کچھ لوگ ضرور ہوں گے۔ وہ میری مدد کو ضرور آئیں گے۔''

کیمپ اس مقام سے دور تھا جہاں حمید اختر بیٹھا ہوا تھا۔ جب فوجی کانوائے آیا تھا تو لوگ کھیتوں سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے تھے۔ جتنے لوگ بسوں میں سما سکتے تھے، سما گئے باقی لوگ کیمپ میں واپس چلے گئے۔ اسی عرصے میں یہ حادثہ پیش آگیا کہ فاطمہ فوت ہوگئی۔

اس سائیکل والے کو گئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کیمپ سے کچھ لوگ آگئے۔ یہ اسی کے گاؤں کے لوگ تھے۔ یہ لوگ نہ جانے کہاں سے بالٹیاں اور تختے وغیرہ بھی لے آئے تھے۔ دو عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں۔

فاطمہ کو غسل دیا گیا۔ نماز جنازہ کے بعد اسی خاک کا رزق بنانے کے لیے اسے لحد میں اتار دیا۔

حمید اختر نے وعدہ پورا کردیا۔ وہ پھر پاکستان جانے کے ارمان میں نکودر کیمپ کی طرف لوٹ گیا۔

کیمپ کی زندگی اب اور بھی اجیرن ہوگئی تھی۔ مختلف بیماریوں نے سر اٹھا لیا تھا۔ علاج معالجے کا کوئی انتظام تھا نہیں لہٰذا لوگ روز مر رہے تھے۔ حمید اختر اب پھر مرنے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ مجھے سکھوں کی تلواریں نہیں مار سکیں لیکن شاید کوئی بیماری مجھے ماردے۔ شاید میری موت اسی طرح لکھی ہو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے اپنی بہن سے کیا ہوا وعدہ تو پورا کردیا۔

دو مہینے مزید گزر گئے تھے۔ اس مدت میں کوئی کانوائے ان مہاجرین کو لینے نہیں آیا۔

نومبر کا آخر ہورہا تھا جب بسوں اور ٹرکوں کا ایک بھولا بھٹکا کانوائے نکودر پہنچا۔

اس نے لاہور میں قدم بعد میں رکھا اس کے مرنے کی خبر پہلے پہنچ گئی۔ ہندوستان کے کسی اخبار نے فسادات میں اس کے انتقال کی خبر شائع کردی تھی۔ ترقی پسندوں کے حلقے میں اس نوجوان افسانہ نگار کی موت کی خبر تشویش اور دکھ کے ساتھ سنی گئی تھی۔

وہ جب مکتبہ اردو پہنچا تو اسے دیکھ کر چودھری نذیر احمد کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی میز پر حمید اختر کی جواں مرگی پر رضیہ سجاد ظہیر اور کرشن چندر کے تعزیتی خط پڑے ہوئے تھے۔

''حمید اختر تم زندہ ہو۔'' چودھری نذیر نے ڈرتے ڈرتے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''تم نے کیا سمجھا تھا میں مرگیا ہوں۔''

''میں نے نہیں سمجھا تھا۔ تمہارے دوستوں نے سمجھ لیا تھا۔ یہ دیکھو رضیہ سجاد ظہیر اور کرشن چندر کے تعزیتی خط۔''

موت سے بچ کر نکل آنے والا شخص اپنے بارے میں تعزیتی خطوط بہ نفس نفیس پڑھ رہا تھا۔

لاہور شہر میں ایسی افراتفری مچی ہوئی تھی کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ساحر اس سے پہلے لاہور پہنچ چکا تھا لیکن دونوں کی ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ پھر اس ملاقات میں اس کی بیماری نے رخنہ ڈال دیا۔

چودھری نذیر مالک مکتبہ اردو کی زبانی یہ تو بہت سوں کو معلوم ہوچکا تھا کہ حمید اختر زندہ ہے لیکن کس حال میں ہے کہاں ٹھہرا ہوا ہے کسی کو معلوم نہیں تھا۔

وہ دو تین ماہ اِدھر اُدھر گھومنے اور خاصی دیر تک بیمار رہنے کے بعد منٹگمری (ساہیوال) اپنی بہن کے پاس چلا گیا۔ یہاں کی خاموش زندگی اسے ایسی پسند آئی کہ یہیں رہنے کا ارادہ کرلیا۔ شاعر تو ہر جگہ ہوتے ہیں یہاں بھی تھے۔ سب سے پہلے اس کی ملاقات منیر نیازی سے ہوگئی۔ اس کے ذریعے کچھ دیگر شاعروں سے ملاقاتیں ہو

گئیں۔ یہ ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہو گئیں۔ منیر نیازی ان دنوں آٹا پیسنے کی چکی چلا رہے تھے۔ یہ سارے دوست یہیں جمع ہو جاتے۔ شعر و ادب کی محفلیں جماتے۔ ادبی بحثیں ہوتیں۔

وہ منٹگمری ہی میں تھا کہ ایک دن رؤف ملک اسے ڈھونڈتے ہوئے پہنچ گئے اور اسے بتایا کہ اس کے کوئی دوست بمبئی سے آئے ہوئے ہیں اور اس سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔

''مگر میں تو یہاں منٹگمری میں ہوں۔''

''اسی لیے تو میں آیا ہوں کہ آپ کو لاہور لے چلوں۔''

''لاہور سے بھاگ کر تو میں یہاں آیا ہوں۔ تم پھر مجھے لاہور لے جا رہے ہو۔ جو دوست بھی ہیں ان سے کہو مجھ سے ملنے یہاں چلے آئیں۔''

''بات کچھ ایسی ہے کہ وہ یہاں آنے سے قاصر ہیں۔''

''کیا بیمار ہیں۔''

''بیمار ہوتے تو پھر بھی آ جاتے دراصل وہ روپوش ہیں فی الحال باہر نہیں نکل سکتے۔''

اس اطلاع پر اس کے کان کھڑے ہوئے۔ ادھر ادھر کئی طرف خیال گیا اور پھر وہ رؤف ملک کے ساتھ لاہور چلنے کو تیار ہو گیا۔

رؤف ملک اسے انارکلی اور وسطی رام روڈ کے عقب میں واقع ان تاریک اور پرپیچ گلیوں میں سے گھماتے ہوئے ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ دستک دینے پر دروازہ کھلا تو سامنے سجاد ظہیر کھڑے تھے۔ وہ انہیں پہچان تو گیا لیکن اس حلیے میں اس نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی ہمیشہ کھلا کرتہ پاجامہ پہنتے تھے۔ کلین شیو رہتے تھے مگر اس وقت وہ دھوتی اور بنیان پہنے ہوئے تھے۔ چہرے پر نہایت رعب دار مونچھیں تھیں۔ اندر گئے تو کمرا تاریک اور خستہ حال تھا۔ سخت گرمی میں ایک چھوٹا سا ٹیبل فین آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ حمید اختر کو انہیں دیکھ کر خوشی تو بہت ہوئی لیکن اسے نہ تو پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری منتخب ہونے کا علم تھا اور نہ ہی ان کے مقاصد۔ جب بیٹھے اور گفتگو کا آغاز ہوا تو کچھ باتیں انہوں نے خود بتائیں۔

''فروری 1948ء میں کلکتہ میں ہماری دوسری پارٹی کانگریس میں جو متحدہ ہندوستان کی آخری کانگریس تھی پاکستان میں ایک علیحدہ کمیونسٹ پارٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مجھے مرکزی کمیٹی کا ممبر چنا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ میں پاکستان جاؤں اور وہاں کمیونسٹ پارٹی کو منظم کرنے کا کام سنبھالوں۔ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن میں پارٹی کے فیصلے سے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے روپوش رہ کر کام کرنا پڑے گا۔ میں نے حلیہ بدلا۔ لاہور آ گیا۔ اب پارٹی کے لوگ مجھے ''مولانا'' کے نام سے جانتے ہیں۔ سجاد ظہیر ہندوستان ہی میں رہ گیا۔ میری بیوی رضیہ سجاد بھی وہیں رہ گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اب اس سے کب ملاقات ہو۔

میں پنجاب میں کسی کو نہیں جانتا۔ پارٹی کی تنظیم کے لیے زیر زمین رہ کر کام کرنا ہے اور اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے گھر بار لٹنے اور نئی جگہ آنے کی وجہ سے تمہارے گھر والوں کے لیے پریشانی کے دن ہیں۔ ایسے حالات میں تمہارا گھر والوں سے الگ ہونا بھی مشکل ہے۔ تاہم پارٹی کا کام زیادہ اہم ہے اور یہ تمہاری مدد کے بغیر ممکن نہیں۔''

حمید اختر کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کر چکا تھا اور اس لیے بھی کہ وہ سجاد ظہیر کی شخصیت سے محبت کرتا تھا۔ اس محبت کا تقاضا تھا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں وہ کیا جائے۔

سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ انجمن کی لاہور شاخ کو منظم کیا۔ اس دوران انجمن کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔ صوبائی انجمن کو چلانے کے لیے ساحر لدھیانوی کو جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ انہیں یہ اختیار دیا گیا کہ وہ صوبے بھر کے ترقی پسند مصنفین کو نئی بنیادوں پر منظم کریں۔ اس غرض کے لیے قرار پایا کہ بدلے ہوئے حالات کے تحت انجمن کا نیا منشور اور آئین تیار کیا جائے۔ اس کی تیاری میں حمید اختر پیش پیش رہا۔

یہ بھی محسوس کیا گیا کہ پارٹی کی باضابطہ تنظیم کے لیے ایک باقاعدہ جریدے کی اشاعت ضروری ہے چنانچہ ہفت روزہ ''نیا زمانہ'' کے اجراء کا فیصلہ کیا گیا۔

حمید اختر کو اخبار کا منیجر مقرر کیا گیا۔ اس کے فرائض میں اخبار چھپوانے اور ڈاک یا ریل کے ذریعے اس کی ترسیل کا انتظام کرنا تھا۔

اسی طرح دوسرے ارکان کو مختلف کام سونپے گئے۔

یہ اخبار چھپنے سے پہلے ہی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ حالات غیر یقینی تھے۔ نئے ملک میں اسلامی ادب کی تحریک چلی تو ادیبوں کی بڑی تعداد کمیونسٹ پارٹی کے خلاف ہو گئی۔ حکومت بھی اسے شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ یہ اخبار اسی پارٹی کا ترجمان تھا۔ لہٰذا حکومتی دباؤ کے باعث کوئی پریس اسے چھاپنے کو تیار نہیں تھا۔ پارٹی جس پریس میں جاتی پرچے کی چھپائی سے انکار کر دیا جاتا۔ مجبور ہو کر سائیکلو اسٹائل کا سہارا لیا گیا۔ ''سیاست نامہ'' کے عنوان سے دس شمارے شائع کیے گئے۔ سائیکلو اسٹائل کا اہتمام بھی حمید اختر کے سپرد رہا۔

یہ سہارا کب تک قابلِ عمل رہتا جب کہ زیادہ پر اثر بھی نہیں تھا۔

ڈیکلریشن خرید کر یکے بعد دیگرے کئی پرچے نکالے لیکن سی آئی ڈی پیچھے لگی ہوئی تھی۔ چند اشاعتوں کے بعد یہ پرچہ بند کر دیا گیا۔

☆.....☆

سجاد ظہیر روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے اور ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ حمید اختر سے ان کی ملاقات انارکلی کے قریب ایک مکان میں ہوئی تھی۔ پھر وہ انارکلی سے اٹھ کر ڈیوس روڈ پر ایک دوست کے ہاں قیام پذیر ہو گئے۔ تین چار ماہ بعد وہاں سے جیل روڈ چلے گئے۔ حمید اختر خفیہ پولیس سے بچتا بچاتا ہر دوسرے تیسرے دن ان کے ہاں جاتا۔ ان سے ہدایات لیتا اور اشاعتی کاموں کو آگے بڑھاتا۔

اپریل 1948ء تک ان کی سرگرمیاں لاہور تک محدود رہیں لیکن پھر حمید اختر اور سجاد ظہیر خفیہ طور پر لاہور سے باہر نکلے۔ یہ نکلنا بھی پارٹی کے لیے تھا اور سجاد ظہیر کی ہدایت پر تھا۔ ایک روز وہ حسبِ معمول سجاد ظہیر کے پاس گیا۔ سجاد ظہیر نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کراچی چلنے کا عندیہ دیا۔

''کراچی میں پارٹی کا اپنا پریس تھا، فنڈز بھی تھے اور بہت سا سامان بھی۔ وہاں جو ہندو کامریڈ تھے ان میں سے اکثر ہندوستان چلے گئے۔ معلوم نہیں یہ سامان وغیرہ اب کس کے پاس ہے۔ وہاں جا کر یہ بھی معلوم ہو گا اور وہاں رہ کر پارٹی کو منظم کرنے کا بھی موقع ملے گا۔''

''مگر آپ روپوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سی آئی ڈی آپ کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کسی اسٹیشن پر بھی دھر لیے جائیں گے۔ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دیجیے۔ آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ اللہ مالک ہے۔ خطرے تو مول لینا پڑتے ہیں۔ تمہاری تلاش تو نہیں ہو رہی ہو گی۔ تم لاہور اسٹیشن سے سوار ہو جانا۔ میں رائے ونڈ اسٹیشن پہنچ کر تم سے مل جاؤں گا۔''

ایک ہمدرد نے انہیں رائے ونڈ اسٹیشن پہنچا دیا۔ وہ بھی ڈبے میں سوار ہو گئے۔ یوں یہ دونوں ''جون'' کی گرمی میں جھلستے ہوئے کراچی پہنچ گئے۔

کراچی پہنچ کر انہیں کمیونسٹ پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے کو نئے سرے سے قائم کرنا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے مختلف لوگوں سے خفیہ ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران انہیں پتا چلا کہ پریس کے کاغذات، فنڈز اور دیگر معلومات کامریڈ جلال الدین بخاری کے پاس ہیں۔ بخاری کہاں ہیں؟ وہ تو حیدر آباد جیل میں ہیں (اراکین کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا)۔

حمید اختر کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ حیدر آباد جا کر جیل میں بخاری سے ملاقات کریں اور ان سے اس سامان کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کریں۔ مزید چھان بین کی تو معلوم ہوا سیاسی قیدیوں سے ملاقات پر پابندی ہے۔ صرف قریبی رشتہ دار ہی ملاقات کر سکتے ہیں۔ حمید اختر کو ایک ترکیب یہ سوجھی کہ وہ ان کا رشتہ دار بن کر ملاقات کرے۔ یہ ملاقات اس لیے بھی مشکل تھی کہ کامریڈ بخاری اس سے واقف نہیں تھے۔ ملاقات کے وقت پولیس کا ایک افسر بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ انہیں پوری بات بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ وہ کامریڈ بخاری کی بیوی سے ملے یا تو مطلوبہ کاغذات گھر پر ہوں گے یا وہ ملاقات کی کوئی ترکیب نکال لیں گی۔ وہ ان کی بیوی سے ملا اور تمام بات بتائی۔ انہوں نے مطلوبہ کاغذات سے تو لاعلمی ظاہر کی البتہ یہ وعدہ کر لیا کہ جب وہ ملاقات کے لیے جائیں گی تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں گی۔

وہ اگلے ہی دن ان کے ساتھ حیدر آباد چلا گیا۔ جیل کے دروازے پر جب ملاقات کا فارم بھرنے کا وقت آیا تو اس نے فارم پر اپنا نام کمال الدین بخاری لکھا۔

''آپ گھبراتی ہیں۔'' حمید اختر نے بخاری صاحب کی بیوی سے کہا۔ ''میں نے اس فارم میں خود کو بخاری

صاحب کا بھتیجا ظاہر کیا ہے۔ آپ ملاقات کے وقت گجراتی زبان میں بخاری صاحب سے کہہ دینا کہ یہ تمہارا بھتیجا بن کر آیا ہے۔ کہیں وہ وہاں بیٹھے ہوئے افسر کے سامنے مجھے پہچاننے ہی سے انکار کردیں۔"

ملاقات کے وقت بخاری صاحب کی بیگم نے گجراتی زبان میں بتادیا کہ میں ان کا بھتیجا بن کر آیا ہوں اور آنے کا مقصد بھی سمجھا دیا۔ انہوں نے میری آمد کا مقصد سمجھ لیا اور باتوں باتوں میں ساری معلومات فراہم کردیں۔

اس ملاقات کے بعد پریس کے کاغذات، فنڈز، کتابیں اور دوسرا سامان ان کے قبضے میں آگیا۔

حمید اختر کے کراچی جانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ساحر پاکستان چھوڑ کر ہندوستان واپس چلا گیا۔ حمید اختر حیران تھا کہ ساحر تو اس کے بغیر قدم نہیں اٹھاتا تھا اس کے بغیر اسے بتائے بغیر چلا کیسے گیا۔ اپنی والدہ تک کو ساتھ نہیں لے گیا۔ وہ تو پاکستان میں ہمیشہ رہنے کے ارادے سے آیا تھا اور جس دن سے آیا تھا تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لے رہا تھا۔ ترقی پسندوں کے مخالفین کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کررہا تھا۔ پھر ایسی کیا افتاد پڑی؟ ساحر اپنی تحریروں میں تند وتیز لہجے میں للکارتا تھا لیکن فطری طور پر بزدل تھا۔ سنگین خطرات کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا۔ ساحر سمیت اکثر ترقی پسند ریاستی تشدد کا براہ راست نشانہ بن رہے تھے۔ مخالفین انہیں برداشت کرنے پر قطعی تیار نہیں تھے۔ حمید اختر کراچی روانہ ہوا تو مخالفین کو موقع مل گیا۔ یہ خبر اڑادی گئی کہ حمید اختر کو گرفتار کرکے کال کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا ہے۔ نادان دوستوں نے ساحر کو یہ کہہ کر بھی ڈرایا کہ پولیس اسے گرفتار کرکے شاہی قلعے میں لے جائے گی۔ یہ چال کام کرگئی۔ ساحر اس قدر گھبرایا کہ ایک دن اس نے اچانک دہلی جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ان دنوں پاسپورٹ ویزا وغیرہ کی تو پابندی بھی نہیں۔ اس نے فرضی نام سے ٹکٹ خریدا اور جہاز میں سوار ہوگیا۔ بعد میں پرکاش پنڈت کو لاہور بھیجا جو اس کی والدہ کو ساتھ لے گیا۔

حمید اختر اور ساحر نے ایبٹ روڈ پر ایک مکان الاٹ کروالیا تھا جہاں ساحر اس کی والدہ اور حمید اختر مل کر رہتے تھے۔

حمید اختر کراچی سے واپس آیا تو مکان خالی تھا۔ گھر کا سامان کچھ مہربان اٹھا کر لے گئے۔

وہ نئے سرے سے مہاجر ہوگیا۔ اس نے گھریوں ہی کھلا چھوڑا اور باہر نکل آیا۔

کوئی اور مہاجر اس میں آباد ہوگیا۔

1950ء کے آتے آتے حکومتی تشدد کی لہر نے پوری تحریک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ پورا سال پُرتشدد رہا۔ دوسری طرف کمیونسٹ مہم جوئی میں بھی کمی نہیں آئی۔ حمید اختر اس دور ابتلا کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا۔ وہ لاہور شاخ کے سیکریٹری کے طور پر ہفت روزہ تنقیدی جلسوں کو منظم کرنے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ طور پر سجاد ظہیر سے رابطے میں بھی تھا۔ پارٹی کے پرچے "نیا زمانہ" کو مختلف ناموں سے جاری رکھے ہوئے تھا۔ ادب لطیف کی ادارتی نیم اعتدال کی راہ پر گامزن ہوچکی تھی۔ "انجمن" کو ادبی نہیں بلکہ "سیاسی" قرار دے دیا گیا۔ ریڈیو پاکستان کے دروازے ترقی پسند مصنفین پر بند کردیے گئے۔

ترقی پسند ادیبوں کے گھروں پر چھاپے مارے جانے لگے۔ سجاد ظہیر پر یہ الزام آیا کہ انہوں نے وزیراعظم لیاقت علی خاں کے قتل کی سازش میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کیس راولپنڈی سازش کیس کے نام سے مشہور ہوا اور ترقی پسندی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ اسی کیس میں فیض احمد فیض، اس کے بعد سجاد ظہیر اور حسن عابدی وغیرہ گرفتار ہوگئے۔

حسن عابدی گرفتار ہوگئے تھے۔ سجاد ظہیر کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جارہے تھے لیکن ان کے ٹھکانے کا کسی کو علم نہیں تھا۔ خفیہ رپورٹ یہ تھی کہ حسن عابدی ان کا ٹھکانا جانتا ہے لہٰذا پولیس نے بدترین تشدد کر کے ان سے سجاد ظہیر کے بارے میں اگلوانا چاہا۔ وہ بار بار لاعلمی کا اظہار کرتا تھا اور ہر بار تشدد کی مقدار میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ وہ پانچ روز تک پولیس کا بدترین تشدد برداشت کرتا رہا۔ اس کے بعد انہوں نے یہ سوچ کر کہ اب میری گرفتاری کو پانچ دن گزر چکے ہیں، سجاد ظہیر احتیاط کے طور پر کہیں اور منتقل ہوچکے ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے اس جگہ کی نشاندہی کردی جہاں سجاد ظہیر کا قیام تھا اور وہ گرفتار کرلیے گئے۔

سجاد ظہیر کی گرفتاری کے بعد تو جیسے بند ٹوٹ گیا۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہونے لگیں۔ اس کی لپیٹ میں حمید اختر بھی آیا۔ وہ اپنی بیمار بہن کے ساتھ مقیم تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی بلکہ صبح نزدیک تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اسے اصولاً معلوم ہونا چاہیے

تھا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے لیکن وہ دروازے پر چلا گیا۔ ''کون؟''

''پولیس دروازہ کھولو۔''

اب کوئی جائے فرار نہیں تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''ہم آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔''

''وارنٹ کے بغیر آپ مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔''

''آپ باعزت آدمی ہیں۔'' ایک پولیس والے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ہم آپ کو وارنٹ کے بغیر کیسے گرفتار کر سکتے ہیں۔ آپ خود ملاحظہ کر لیں۔''

''گورنر پنجاب کو اطمینان ہے کہ حمید اختر کی حرکات اس قسم کی ہیں کہ وہ کچھ گڑبڑ کرنے والا ہے۔ اس لیے سیفٹی ایکٹ کی دفعہ 3 کے تحت اسے احتیاطی نظر بندی میں رکھا جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ کپڑے تبدیل کرلوں اور اپنی بیمار بہن کو تسلی دے آؤں۔''

''اس گھر کا کوئی پچھلا دروازہ تو نہیں ہے۔''

''اطمینان رکھیں۔ اگر دروازہ ہوتا بھی تو میں فرار ہونے کے حق میں نہیں۔''

''ہم آپ پر بھروسا کرتے ہیں لیکن جلدی آجایئے گا ورنہ ہم گھر میں داخل ہونے اور آپ کی بہن کو حراست میں لینے سے گریز نہیں کریں گے۔''

وہ گھر میں چلا گیا۔ بہن بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ''باہر پولیس کیوں آئی تھی؟''

''کچھ نہیں تھوڑی سی پوچھ گچھ کے لیے تھانے لے جا رہے ہیں۔ ابھی جاتا ہوں۔''

اس نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے۔ بہن کو ایک مرتبہ پھر تسلی دی اور باہر آگیا جہاں تانگہ اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

''ہم آپ کو انارکلی تھانے لے چلیں گے کیوں کہ آپ کا محلہ سنت نگر اسی تھانے کی حدود میں ہے۔ وہاں سے آپ کو سینٹرل جیل پہنچا دیا جائے گا۔'' سی آئی ڈی انسپکٹر نے کہا۔

''بدترین مجرموں کی کوٹھریوں سے گزر کر ان سے بھی آگے موت کے مسافروں کے عین درمیان اس احاطے میں بالکل تنہا رہ کر میں کتنے دن زندہ رہ سکتا ہوں۔ یہ سوال پہلی بار میرے دل میں پیدا ہوا مگر دل ہی میں رہ گیا۔ اس لیے کہ جمعدار نے تالا کھولا۔ میں دروازے سے گزرتا ہوا احاطے میں داخل ہوا۔ ایک مٹکا پانی، ایک مٹی کا لوٹا، ایک پیالہ اور کھجور کی ایک چٹائی میرے حوالے کر کے جمعدار نے دروازہ بند کر دیا اور باہر سے تالا لگا دیا۔ احاطے میں ایک چھوٹا کمرا تھا۔ لطف یہ کہ اس کمرے میں سلاخوں والے جنگلے کا دروازہ تھا مگر احاطے کا دروازہ لکڑی کے دو پٹ کا دروازہ تھا جس میں سے کچھ دکھائی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس چار دیواری میں چٹائی بچھا کر مٹی کے لوٹے کو سامنے رکھ کر جب میں لیٹا تو پہلی بار اس تنہائی کے احساس نے مجھے ڈس لیا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔''

یہ اس کی کتاب ''کال کوٹھری'' کا اقتباس ہے جو اس نے جیل سے باہر آکر تحریر کی۔

اسے سیاست خانہ نامی وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ اپنی ایک اور تحریر میں اس نے اس وارڈ کی تفصیل بیان کی۔ ''یہ وارڈ اخلاقی بلکہ خطرناک اخلاقی قیدیوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں ہم دس بارہ سیاسی قیدیوں کو بند کر دیا گیا۔ ان میں منٹو، ٹریڈ یونین رہنما محمد افضل، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری اور متعدد دوسرے کامریڈ تھے۔ یقین مانیے اسیری کے یہ دن ہماری زندگی کے سنہری دن تھے جہاں ہم سب دوست کمبل بچھا کر تاش کھیلتے، لطیفے سناتے۔ آنے والے اچھے دنوں کے بارے میں سوچتے۔ حکمرانوں کو گالیاں دیتے اور خوش رہتے۔''

تین مہینے اسی ڈھنگ سے گزر رہے تھے کہ تبادلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک ایک کر کے ساتھی دوسری جیلوں میں بھیجے جا رہے تھے بالآخر حمید اختر کے تبادلے کا حکم بھی آگیا۔ اسے ملتان جیل بھیجا جا رہا تھا۔

جیل سے ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے اس نے دوبارہ تین مہینے بعد لاہور کو دیکھا اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں لیکن آنکھوں پر ٹھیکریاں تو نہیں تھیں۔

اب وہ ملتان جیل کا آہنی پھاٹک عبور کر رہا تھا۔

''جولائی کی اس اجلی صبح کو ڈیوڑھی میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے میں نے کئی بار سوچا کہ میں یہاں کیوں لایا گیا ہوں؟ یہ سب لوگ کیا کر رہے ہیں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ کیسی عجیب بات ہے کہ اس دنیا میں جہاں ہم سب رہتے ہیں ہم ایک چار دیواری کھڑی کر لیتے ہیں پھر اس کے باہر ایک ڈیوڑھی بنا کر ایک آہنی پھاٹک تعمیر کرتے ہیں اور پھر چند انسانوں کو اس چار دیواری میں بند کر کے ان پر سپاہی مقرر کر دیتے ہیں۔ یہ سارا سلسلہ مجھے بہت ہی عجیب و غریب معلوم ہوا اور میں دیر تک سوچتا رہا کہ وہ کون سا پہلا انسان تھا جس نے یہ

سوچا ہوگا کہ انسانوں کو اس طرح بند بھی کیا جاسکتا ہے۔'' (اقتباس کال کوٹھڑی)

''دوم تنہائی'' اس وارڈ کا نام تھا جہاں حمید اختر کو رکھا گیا۔ اس وارڈ میں دو رویہ کوٹھڑیاں تھیں جن میں بڑے بڑے ڈاکو اور مجرم بند تھے۔ ان کوٹھڑیوں کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے تین طرف چار چار کوٹھڑیوں کے تین بلاک تھے۔ یہ تینوں بلاک پھانسی کی سزا پانے والوں کے لیے مخصوص تھے۔

پھانسی والوں کی کوٹھڑیوں کے تین بلاکوں کے عین درمیان میں ایک چھوٹے سے احاطے کی چار دیواری کے لکڑی کے دروازے پر پہنچ کر جمعدار رک گیا۔

''یہ لیجیے آپ کے لیے ڈپٹی صاحب نے یہ جگہ مقرر کی ہے۔''

کمرے کے دروازے پر ایک موٹا سا تالا ڈال دیا گیا۔ وہ کسی لاش کی طرح فرش پر گر گیا۔

چاروں طرف پھانسی کے قیدی تھے اور ان کی درد بھری آوازیں۔ اسے اسی قید تنہائی میں ایک سال رہنا تھا۔

ان راتوں کے روبرو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے اکثر ساتھی پنجاب کی جیلوں میں قید تھے۔

ایک سال بعد وہ رہا ہوکر جیل سے نکلا تو تنگ دستی اس سے پہلے باہر نکل آئی۔ گھریلو حالات بہت خراب تھے۔ سب کچھ لٹ چکا تھا۔ پیٹ کی آگ نے پارٹی کے کام کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اب نوکری کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پارٹی کے جرائد میں کام کرنے کی وجہ سے اسے صحافتی تجربہ ہوچکا تھا۔ لہٰذا اس نے اخباروں کے دفاتر کے چکر کاٹنا شروع کردیے۔ ''امروز'' کا اجراء ہوچکا تھا۔ کئی مرتبہ نوکری کی تلاش میں وہاں بھی جانا ہوا لیکن کوئی صورت بنتی نظر نہ آئی۔

ایک مرتبہ میاں افتخار الدین سیڑھیوں پر مل گئے انہوں نے خیر و عافیت کے بعد روزگار کا پوچھا۔ ''آج کل کیا کررہے ہو؟''

''نوکری کی تلاش میں ہوں۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' انہوں نے اپنی کار میں بٹھایا اور گھر لے گئے۔

''میں اپنے اخبار میں تمہیں رکھ لیتا لیکن فی الحال تمہارے شایانِ شان ہمارے ہاں کام نہیں ہے۔''

''مجھے اس وقت شان نہیں صرف نوکری درکار ہے۔''

''اداریہ نویسی وغیرہ کا کام ابھی نہیں ہے اس لیے فی الحال سب ایڈیٹر ہوجاؤ۔''

اس نے یہ پیشکش فوراً قبول کرلی کیونکہ یہ اخبار اس کے نظریات سے بہت قریب تھا۔ ترقی پسند ساتھیوں کی رفاقت میں اور مکمل آزادی کے ساتھ کام کرنے کے باعث اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

پارٹی کے تمام سرکردہ لوگ جیل میں تھے۔ پارٹی کے جرائد کی اشاعت اور ترسیل بری طرح متاثر تھی۔ اس کے ایک دوست امتیاز علی خاں نے اسے اپنے دفتر میں زبردستی

## دنیا سے بیزاری

میں نے مصنوعی ہاتھوں کی تربیت لی جو کہ کافی صبر آزما کام تھا اور ہاتھوں کو چڑھانے کے لیے تقریباً آدھا گھنٹا لگ جاتا تھا۔قصہ کوتاہ میری زندگی میں کافی مشکلات نے گھیراؤ کرلیا۔میرے ایک دوست چشتی صاحب جو کہ بڑے مرنجاں مرنج اور زندہ دل انسان تھے۔انہیں میں نے کہا کہ میرا دل اس دنیا میں نہیں لگتا اور مجھ پر اکثر مایوسی کا دورہ طاری ہوجاتا ہے۔ایسے عالم میں وہ مجھ سے اپنے معاشقوں کا ذکر چھیڑ دیتے اور مجھے خوش رکھنے کے لیے لطیفے وغیرہ سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے میری انتہائی مایوسی کی کیفیت کو محسوس کرکے کہا کہ یار! فکر نہ کرو میں تمہارا علاج کرتا ہوں، پھر جھٹ سے اپنی جیب سے کیپسول نما چیز نکال کر مجھے دی اور کہنے لگے پارٹنر! اسے سونے سے پہلے کھالینا پھر مایوسی تمہارے قریب سے بھی نہیں پھٹکے گی۔بہر حال میں نے وہ کیپسول استعمال کیا تو بالکل فریش ہوگیا۔اگلے دن وہ مجھے کہنے لگا۔یہ بہت خطرناک قسم کا کیپسول تھا اور اس کو سوڈیم سکسینیٹ یا عرف عام میں راکٹ کہتے ہیں۔انہی دنوں میرے ایک دوست جو شنکیاری میں تھے، بریگیڈیئر الطاف جو کہ چودھری محمد علی (پاکستان کے سابق پرائم منسٹر) کے داماد تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ میں کورس پر جارہا ہوں اور میری بیگم بھی اپنے میکے چلی جائے گی۔تم اپنی بیگم کو میرے گھر میں لاکر رکھو، میں نے اپنی بیگم اور بیٹی کو لاہور بلالیا اور لمبر سینٹر میں ایک دو گھنٹے رپورٹ کرنے کے بعد ان کے گھر میں رہنے لگا۔وہاں میں کچھ عرصہ تو ٹھیک ٹھاک طریقے سے رہتا رہا لیکن پھر مجھ پر مایوسی کے سائے چھانے لگے اور مجھے اتنا پریشان کردیا کہ مستقبل کے متعلق سوچ سوچ کر خوف زدہ سا رہنے لگا۔غالباً ایک مہینے یا اس سے کم و بیش عرصے کے بعد زندگی سے بالکل مایوس ہوگیا اور اپنے اوپر مجھے رحم آنے لگا۔دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے اور باقی ماندہ زندگی بھی بڑی مشکل سے گزرے گی۔خودکشی کرنے کا ارادہ کرلیا اور اپنی جان لینے کی ٹھان لی۔ایک دن میرے اردلی نے کہا کہ وہ کہیں کھانا کھانے جارہا ہے وہ کافی دیر تک واپس نہ لوٹا، میرے اوپر مایوسی کا دورہ پڑا۔میں نے اس مایوسی کو ختم کرنے کے لیے باہر گھومنے کا ارادہ کرلیا۔اس وقت مجھے بہت کم نظر آتا تھا۔میں نے مصنوعی ہاتھ کسی نہ کسی طرح فٹ کیے اور کوٹ پینٹ پہن کر بڑی شان سے بن ٹھن کر گھر سے نکلا اس وقت میں نے (مصنوعی ہاتھوں سے) کوٹ پینٹ وغیرہ پہننا سیکھ لیا تھا۔اس وقت مجھے کچھ ایسے نظر آتا تھا کہ سڑک کا کنارہ تو کسی نہ کسی طور نظر آتا لیکن پوری طرح سڑک نظر نہیں آتی تھی، میرے پیچھے ایک بڑی بس ہارن دے کر مجھے راستہ دینے کی دہائی دیتی رہی لیکن میں زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا، اس لیے ہارن کا چنداں جواب نہیں دیا اور سڑک پر چلتا رہا شاید بس نے مجھ سے ایک دو فٹ کے فاصلے پر بریک لگائی اور کافی شور و غوغے کی آوازیں مجھے سنائی دیں۔پھر اچانک کنڈیکٹر میرے پاس آیا اور زور سے کہنے لگا۔''آج دن میں بھی چڑھائی ہوئی ہے!'' لیکن جب اس نے میرا بازو پکڑا جو کہ لکڑی کا تھا، اسے اصل صورت حال کا علم ہوا۔پھر اس نے زبردستی مجھے سڑک کے ایک کنارے کیا اور خاموشی سے اپنی راہ لی۔اس کے بعد تو میرے اوپر مایوسی نے مکمل ڈیرے ڈال دیئے۔ میری بیگم نے چھاؤنی میں اپنی سہیلیاں بنالیں۔وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک دن کسی فنکشن کے لیے گئی۔میں اگرچہ

بٹھالیا۔یہی دفتر آہستہ آہستہ اس کا مستقل ٹھکانا بن گیا۔ اخبار میں نائٹ شفٹ کرنے کے بعد وہ اسی دفتر میں آکر پڑ جاتا۔

ملک کے سیاسی حالات تیزی سے بگڑ رہے تھے۔ انہی حالات کا شاخسانہ تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ترقی پسند مصنفین کے بھی بیشتر ارکان کو گرفتار کرلیا گیا۔

حمید اختر امروز میں کام کررہا تھا اور براہ راست پارٹی کی سرگرمیوں میں فعال نہیں تھا وہ بھی گرفتاری کی زد میں آگیا۔

اسے ایک مرتبہ پھر گرفتار کرلیا گیا۔اس مرتبہ اسے لاہور سینٹرل جیل میں جس جگہ رکھا گیا، وہ بم وارڈ کہلاتا تھا۔ یہ وارڈ اس لحاظ سے اس کے لیے خوش قسمت تھا کہ اس کے ساتھ کئی ترقی پسند ساتھی یہیں قید تھے۔ان میں سبط حسن بھی تھے۔

بم وارڈ کے دو ڈھائی ماہ اس کے لیے یادگار بن گئے۔تمام ساتھی ایک جگہ جمع ہوگئے تھے۔دن بھر گپ شپ

ریڈیو لگا کر دل بہلایا کرتا تھا اور پاؤں سے بٹن وغیرہ دبالیا کرتا تھا۔ بیگم کے جانے کے بعد تو میں بہت مایوس تھا اور سوچنے لگا کہ میں نے تو اپنی بیگم اور بچوں کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے اور میرے بچوں کا بھی وہ مقام نہیں ہوگا جو کہ ایک عام اور صحت مند والدین کے بچوں کا ہوتا ہے غرض یہ کہ مایوسی کی انتہا تھی، میں نے کوٹ سے تقریباً ڈیڑھ شیشی خواب آور گولیاں بستر پر گرائیں اور منہ سے ڈھکن کھولا اور تقریباً اٹھارہ گولیاں بغیر پانی کے کسی نہ کسی طرح نگل لیں اور ساتھ ہی کلمہ شریف بھی پڑھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ جب میری بیگم واپس لوٹیں تو خانساماں نے بتایا کہ صاحب خوب گہری نیند سو رہے ہیں اور عجیب طریقے سے خراٹے لے رہے ہیں اور ساتھ ساتھ منہ سے جھاگ بھی نکل رہی ہے۔ اللہ پاک نے کرم کیا، میں نے ناشتا وغیرہ خوب اچھی طرح کیا ہوا تھا، اگر خالی پیٹ ہوتا تو زندگی یار تھی۔ بیگم نے مجھے کسی نہ کسی طرح سے سی ایم ایچ پہنچایا۔ اس نے شیشی بھی وہاں دکھائی۔ سی ایم ایچ کے سارے افسروں کو مصیبت پڑ گئی کیونکہ سرکاری طور پر اصولاً ان کے کاغذوں میں، میں وہاں داخل تھا۔ ڈاکٹروں نے میرے اوپر بہت محنت کی اور میرا معدہ صاف کیا اور مجھے دو دن کے بعد ہوش آیا۔

اس کے بعد سی ایم ایچ والوں نے مجھے عملی طور پر اپنی حراست میں رکھ لیا۔ ایک اٹنڈنٹ (جو کہ پٹھان اچمن زئی تھا۔ راکٹ بھی استعمال کرتا تھا اور غالباً مشہور سیاستدان ولی خان مرحوم کے علاقے کا تھا) مجھے مل گیا۔ ایک دن مجھے کہنے لگا کیپٹن صاحب آپ بہت خطرناک آدمی ہیں اور حکومت نے آپ کے لیے چار پہرے دار یا سنتری لگائے ہوئے ہیں۔ پھر کہنے لگا کہ آپ غصے میں پتا نہیں کیا اول فول بکتے رہتے ہیں۔ کبھی اللہ سے گلہ کرتے ہیں اور کبھی فارسی کا شعر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ (حقیقتاً مجھے غشی کا دورہ پڑتا تھا) پھر میرے ارادہ خودکشی والے واقعہ کا بھی فوج نے سنجیدگی سے نوٹس لیا اور اس کے لیے ایک انکوائری کرائی، جس کے لیے ایک بورڈ بیٹھا جس میں کافی افسر تھے۔ بڑے عجیب و غریب سوال، جواب ہوئے۔ میں بھی خار کھائے بیٹھا تھا اور ہر سوال کا جواب ترکی بہ ترکی دیتا تھا۔ بورڈ نے مجھے پاگل سمجھ کر ذہنی امراض کے وارڈ کے لیے بھیج دیا۔ کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے مجھے فٹ قرار دے دیا۔ میرے ایک عزیز جو کہ رینجرز میں کمانڈنٹ تھے انہوں نے مجھے کہا کہ بھائی کیسے ہو؟ میں نے کہا کہ مجھے سکون نہیں ملتا۔ انہوں نے مجھے قرآن پاک کی آیت رب انی مغلوب فانتصر کا وظیفہ کرنے کی تلقین کی۔ میرا دل تو یہ کہتا تھا۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

روحانیت پر بھی میرا اعتبار واجبی سا تھا لیکن میں نے پھر بھی ان کے اصرار پر مندرجہ بالا آیات کریمہ کا ورد شروع کر دیا۔ یقین کریں اس آیت کریمہ کے ورد نے مجھے بہت سکون عطا فرمایا اور میری زندگی میں جوش اور جذبہ بھی کارفرما ہو گیا۔ اب بھی جب کوئی مصیبت یا آزمائش آتی ہے تو میں اسے پڑھتا ہوں اور اللہ کریم اپنا فضل فرماتے ہیں۔

(بریگیڈیئر ڈاکٹر محمد اشرف کی تصنیف ''ہمت مرداں مدد خدا'' سے اقتباس)

کرتے، تاش کھیلتے دھوم مچاتے۔

دو ڈھائی مہینوں کی یہ آزادی حکمرانوں کو پسند نہ آئی۔ ان دوستوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ حمید اختر کے حصے میں میانوالی جیل آئی۔ میانوالی جیل قیدیوں کے ساتھ اپنی بدسلوکیوں کے لیے بہت مشہور تھی۔ وہ اس جیل میں جاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بہن ہر پندرہ روز بعد ملاقات کے لیے آجاتی تھی۔ وہ اس سے بھی محروم ہو جاتے لیکن اس بلا سے فرار بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے میانوالی جیل جانا پڑا۔ وہ تین چار قیدی تھے۔ جیل کے تین افسروں نے ان کا استقبال کیا اور پھر اچانک حمید اختر کے بارے میں پوچھا۔ ''آپ میں سے حمید اختر کون ہے۔''

حمید اختر اپنا نام سن کر چونکا۔ اسے یاد آیا کہ اس کی کتاب ''کال کوٹھری'' شائع ہو کر بازار میں آئی ہے۔ اس کتاب میں جیل حکام کے مظالم کی داستانیں بیان کی گئی ہیں لہٰذا اب جو پوچھ گچھ کی جا رہی ہے وہ اس لیے کی جا رہی ہے کہ ایسی کتاب لکھنے کی سزا دی جائے۔ وہ اپنا نام چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے سامنے آنا پڑا۔ جیل افسر اسے لے کر تنہائی میں چلا گیا۔ ''اس جیل کی شہرت تو آپ نے بہت سی

ہو گی۔‘‘

’’جی ہاں میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔‘‘

’’ہم آپ کو سزا نہیں دینا چاہتے آپ کا خیال رکھنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’مجھ پر یہ مہربانی کیوں۔‘‘

’’اگر آپ ’’کال کوٹھڑی‘‘ جیسی کتاب اس جیل کے بارے میں نہ لکھنے کا وعدہ کریں تو آپ کا ہر طرح خیال رکھا جائے گا۔‘‘

’’اگر مجھ پر عتاب نازل نہیں ہوگا تو ثواب ہی ثواب لکھوں گا۔‘‘

’’تو پھر میرے ساتھ آیئے۔‘‘

جیل افسر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔’’جمعدار، اختر کو اسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ اس کی خوراک میں روزانہ ایک ڈبل روٹی، ایک مرغی، ایک سیر دودھ، چار انڈے دیئے جائیں۔‘‘

ابھی وہ کچھ اور بھی کہنے والے تھے کہ حمید اختر نے ان کی بات کاٹ دی۔’’میں بیمار نہیں ہوں اور اسپتال میں رہنے کی بجائے اپنے دوستوں کے ساتھ وارڈ میں رہنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’آپ وارڈ ہی میں رہیں گے صرف دکھانے کو اسپتال میں داخل کیا جا رہا ہے۔‘‘

’’ہم ’’اے‘‘ کلاس قیدی ہیں ہمارے لیے جیل کی مقررہ خوراک ہی بہت کافی ہے۔‘‘

’’آپ سب لوگ مل جل کر کھائیں اور عیش کریں البتہ کال کوٹھڑی جیسی دوسری کتاب تحریر نہیں کریں گے۔‘‘

’’آپ بھی ہم سے وہ سلوک نہ کریں۔‘‘

’’ایسا ہی ہوگا۔‘‘

اس وعدے کے بعد اس کے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جاتا رہا۔

حمید اختر اور اس کے ساتھیوں نے اپنی نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کر رکھی تھی چنانچہ چھ ماہ بعد اس کیس کی سماعت کے لیے اسے لاہور جیل لایا گیا اور ہائی کورٹ کے حکم سے وہیں سے رہا کر دیا گیا۔

اسی سال سجاد ظہیر اور راولپنڈی سازش کیس کے دوسرے مجرم بھی رہا کر دیئے گئے۔

سجاد ظہیر کی بیوی ہندوستان ہی میں تھیں۔ وہ چھ سال سے اس دوری کا صدمہ سہہ رہے تھے۔ یہ عرصہ جیل میں گزرا تھا۔ وہ اب بیوی اور ماں سے ملنے ہندوستان جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے پاکستانی شہری کے طور پر پاسپورٹ کے لیے درخواست دی تاکہ ہندوستان جا کر اپنی بیمار والدہ کو دیکھ سکیں۔ اسکندر مرزا اس وقت پاکستان کے وزیر داخلہ تھے۔ انہوں نے پاسپورٹ جاری کرنے کی بجائے انہیں بغیر دستاویزات کے سرحد پار بھجوانے کی ہدایات جاری کیں تاکہ وہ دوبارہ پاکستان نہ آسکیں۔ یہ ایک طرح کی ملک بدری تھی اور وہ ملک بدر ہو گئے۔

حمید اختر دوبارہ ’’امروز‘‘ سے وابستہ ہو گیا۔

1956ء میں اس نے شادی کر لی۔ شادی کے بعد اس کی زندگی میں توازن آ گیا۔ اب وہ اور بھی توجہ اور دلچسپی سے صحافتی ذمہ داریاں نبھاتا رہا۔

اس کی نظریاتی پوزیشن سب پر واضح تھی لیکن اب وہ عملی سیاست سے دور تھا۔ پارٹی کی زیرِ زمین سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے رہا تھا۔ البتہ نظریاتی مضامین ضرور لکھ رہا تھا۔ اس کی افسانہ نگاری سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ پارٹی اور اس کے تمام اداروں پر پابندیاں عائد تھیں۔

وہ امروز میں کام کر رہا تھا۔ یہ ادارہ ملک کا ایک مثالی ادارہ تھا۔ یہاں کا ماحول بھی اس کے حسب منشا تھا۔ ترقی پسندانہ رفاقت میسر تھی۔

’’امروز‘‘ اس وقت کی سیاست میں ایک اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ اسی ادارے کے تحت ہفت روزہ ’’لیل و نہار‘‘ کا بھی اجراء ہوا جس کا ایڈیٹر سبطِ حسن کو بنایا گیا۔

اکتوبر 1958ء میں جب ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو ’’امروز‘‘ کی سرگرمیاں اہل اقتدار کو پسند نہ آئیں۔ پاکستان ٹائمز، امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ سبطِ حسن ’’لیل و نہار‘‘ کے ایڈیٹر تھے۔ انہیں برطرف کر دیا گیا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ’’امروز‘‘ کے مدیر احمد ندیم قاسمی اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خاں نے استعفے دے دیے۔

حمید اختر اور دوسرے کئی ارکان جیسے تیسے اپنے آپ کو گھسیٹتے رہے لیکن مارشل لاء حکومت کے حالات روز بروز ابتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اخبار کے حالات بھی دگرگوں تھے۔ 1962ء میں میاں افتخار الدین کا اچانک انتقال ہو گیا۔ جما ہوا اخبار تھا پھر بھی چلتا رہا۔

جب ایوب خاں کی کشتی ڈانواڈول ہونے لگی تو انہوں نے اقتدار دوسرے فوجی آمر کے حوالے کر دیا۔ حمید

اختر ابھی تک اسی اخبار میں اپنا وقت گزار رہا تھا۔ اس کے اخبار کی اور خود اس کی ہمدردیاں پیپلز پارٹی کے ساتھ تھیں۔ یحییٰ خاں کو یہ منظور نہیں تھا حمید اختر سمیت درجن بھر صحافیوں کو امروز اور پاکستان ٹائمز سے نکال دیا گیا۔ نکالنے کے لیے صرف ایک نوٹس کافی تھا۔ ''نوٹس ملا اور چند ہزار کی رقم گریجویٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کی ہمارے ہاتھ میں تھما کر وہاں سے فارغ کر دیا۔''

اس طرح نکالے جانے پر اس نے اور دوسرے صحافیوں نے مل کر ایک آزاد اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اخبار ''آزاد'' کے نام سے نکلنا شروع ہو گیا۔

انہیں بھٹو کی حمایت کرنے کے الزام میں نوکریوں سے نکالا گیا تھا لہٰذا اس اخبار نے یہ پالیسی اختیار کر لی کہ زور قلم پیپلز پارٹی اور بھٹو کی حمایت میں سرف کیا جائے گا۔

اس اخبار کی اشاعت ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ بھٹو صاحب نے اس موقع پر ڈھائی لاکھ کا چیک بھیجا تاکہ اخبار کے مالی معاملات درست ہوں۔ حمید اختر اور اس کے دیگر دو ساتھیوں نے کہا۔ ''ہم یہ رقم صرف اس صورت میں قبول کر سکتے ہیں کہ ہم پارٹی ڈسپلن کے تحت حکومت کے ہر اقدام کی حمایت نہیں کریں گے۔ کل آپ کی حکومت بن جائے گی اور ہر حکومت کی طرح آپ بھی زیادتیاں کریں گے، پھر ہم آپ کے خلاف بھی لکھیں گے۔''

بھٹو صاحب نے ہاتھ کھینچ لیا۔

اخبار پھر بھی چلتا رہا۔

سانحہ مشرقی پاکستان پیش آیا۔ سقوط ڈھاکا کے بعد مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر اقتدار سنبھال لیا۔ یحییٰ خان کو ذلت و رسوائی کے ساتھ نکلنا پڑا۔ پھر سرمائے کی کمی نے اخبار بند کرنے پر مجبور کر دیا۔

☆......☆

سن ساٹھ کی دہائی میں وہ ایک فلمی وفد کا حصہ بن کر افغانستان گیا تھا۔ اس سفر کا مقصد افغانستان کی مارکیٹ میں پاکستانی فلموں کی جگہ بنانا تھا۔ اس وفد میں اس کے علاوہ قتیل شفائی، سیف الدین سیف، حسنہ، سنتوش کمار وغیرہ شامل تھے۔

وہاں فلمی وفد میں ستاروں کے جھرمٹ میں رہ کر اسے خیال آیا کہ وہ ایک فلم بنائے چنانچہ اس سفر سے آتے ہی اس نے اپنی پہلی فلم ''سکھ کا سپنا'' پر کام شروع کر دیا۔ فلم بن بھی گئی لیکن بدقسمتی سے یہ فلم لوگوں کے ذہنوں کو متاثر نہ کر سکی۔ اس کے فلاپ ہونے میں کچھ حصہ سازشوں کا بھی تھا۔ ساری انڈسٹری مقابلے پر آ گئی تھی۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ پڑھے لکھے لوگ انڈسٹری میں آئیں۔

کچھ عرصے بعد اس نے ایک اور فلم ''پرائی آگ'' شروع کی۔ یہ فلم بھی سیاسی حالات کی نذر ہو گئی۔ جو سرمایہ لگایا تھا وہ سب ڈوب گیا۔ فائدہ تو کیا ہوتا الٹا نقصان ہو گیا تو وہ پھر صحافت کی طرف لوٹ گیا۔

☆......☆

اسے ''امروز'' سے ریٹائر کر دیا گیا تھا لیکن اس نے خود کو ریٹائر نہیں کیا۔ روزنامہ ''دن'' اور روزنامہ ''ایکسپریس'' میں اس نے سیکڑوں کالم لکھے۔ بعد میں اس کے کالموں کے دو مجموعے ''پرسشِ احوال'' اور ''احوالِ واقعی'' شائع ہوئے۔

1981ء میں حمید اختر کو ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔ ضیاء الحق کا دورِ حکومت تھا جب پی آئی اے کا ایک جہاز اغوا ہوا تھا۔ اغواکاری اور سازش کے شبے میں ہر قابلِ ذکر شخص کو گرفتار کر لیا گیا۔

ان دنوں حمید اختر کوئی سیاسی کام نہیں کر رہا تھا پھر بھی اسے کوئی پرانی فائل دیکھ کر گرفتار کر لیا گیا۔ اسے گرفتار کر کے ریس کورس روڈ کی پولیس چوکی لے جایا گیا۔

چار چھ مہینوں کی خفیہ رپورٹوں کے تبادلے کے بعد فیصلہ کن نوٹ یہ لکھا گیا کہ حمید اختر کی سرگرمیاں مشکوک ہیں اس لیے اس کی دونوں بیٹیوں صبا پرویز اور ہما حمید کے ٹی وی ڈراموں میں حصہ لینے پر پابندی عائد کی جائے۔ اس مرتبہ کی قید اس اعتبار سے اس کے لیے خوشگوار تھی کہ برسوں بعد اس کے نئے پرانے ساتھی، سیاسی مدبر اور شاعر ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔

کوئی قیدی ہمیشہ کے لیے جیل میں نہیں رہ سکتا۔ کبھی نہ کبھی رہا ہو ہی جاتا ہے۔ وہ بھی رہا ہو گیا۔ ''امروز'' سے تو وہ ریٹائر ہو ہی چکا تھا۔ خالی بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر صحافت کی دنیا کی طرف لوٹ گیا۔ انگریزی روزنامہ ''دی مسلم'' اسلام آباد کے ساتھ لاہور کا بیورو چیف مقرر ہو گیا لیکن ''مسلم'' کے ایڈیٹر سے نہ بن سکی اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔

1988ء کے دوران اس نے لاہور سے ایک سوسائٹی میگزین ''جلوہ'' جاری کیا۔ یہ پرچہ بھی مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہوگیا۔

روزنامہ مساوات میں بطور ایڈیٹر کام کیا لیکن یہ تجربہ خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ 1990ء میں اس نے روزنامہ ''صداقت'' کے ساتھ بطور اداریہ نویس وابستگی اختیار کی۔
ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کی آواز اس کا ساتھ چھوڑنے لگی۔ معلوم ہوا اسے گلے کا کینسر ہے۔ اس کے بعد وہ شوکت خانم اسپتال میں داخل ہوگیا۔

صحافتی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔

اس نے جس بہادری سے زندگی کا مقابلہ کیا تھا اسی بہادری سے بیماری کا مقابلہ کرتا رہا۔

صحت کی بحالی کے بعد روزنامہ ''ڈان'' میں بطور اداریہ نویس اور کالم نگار کام کرنے لگا۔

2001ء میں وہ روزنامہ ''ایکسپریس'' سے بطور کالم نگار وابستہ ہوگیا اور آخری دم تک لکھتا رہا۔

اس نے جب صحافت کا آغاز کیا تھا تو صحافت ایک مشن کا درجہ رکھتی تھی۔ اکیسویں صدی کے آتے آتے یہ ایک صنعت بن گئی۔ وہ اس صنعت کے لیے مس فٹ تھا لیکن لکھتا رہا۔

اس عرصے میں یہ سوال برابر گردش کرتا رہا کہ وہ ادیب ہے یا صحافی؟ کچھ لوگوں نے ادیب تسلیم کیا کچھ نے صحافی۔ کچھ اعتدال پسندوں نے یہ کہہ کر اس کی حیثیت کو تسلیم کیا کہ وہ ادیب ہے لیکن غلطی سے صحافت میں چلا گیا۔

ادیب کی حیثیت سے اس کے مختلف روپ ہیں۔
بنیادی حیثیت ایک کہانی کار کی ہے لیکن دیگر اصناف میں بھی جم کر لکھا۔ ''کال کوٹھڑی'' جیسی کتاب لکھی۔ سوانحی تحریروں میں ''احوال دوستاں'' اور ''آشنائیاں کیا کیا'' اس کے ادیب ہونے کا مسلم ثبوت ہے۔

اس کی تحریریں اس اعتبار سے بھی معنی خیز ہیں کہ ان میں ترقی پسند تحریک کی پوری تاریخ رقم ہوگئی ہے۔

اس کی نمایاں خصوصیت مترجم کی بھی ہے۔

اس نے ابتداء افسانہ نگار کے طور پر کی تھی لیکن وہ اپنی طویل زندگی میں اپنے پڑھنے والوں کو صرف ایک مجموعہ ''لامکاں'' دے سکا۔

اس کی ادبی زندگی چند افسانوں تک کیوں محدود رہی۔ اس کا سبب اس نے تو یہی بتایا کہ ادب تخلیق کرنے سے ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے اس نے روزی روٹی کے لیے صحافت کا سہارا لیا۔ سوال پھر بھی یہ اٹھتا ہے کہ کیا وہ لوگ بھوکے مرگئے جنہوں نے صرف ادب تخلیق کیا کوئی اور کام نہیں کیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس نے جس قسم کی زندگی گزاری اس میں ادب تخلیق کرنے کی گنجائش کم ہی تھی۔

اس کی ادبی زندگی خاکہ نگاری کی صنف میں کروٹیں لیتی نظر آتی ہے۔ اس نے قریبی دوستوں کے خاکے لکھنے شروع کیے اور کمال کے خاکے لکھے۔ خاکوں پر مبنی اس کی کتاب ''احوال دوستاں'' سامنے آئی تو لوگوں نے اسے اہم خاکہ نگار تسلیم کیا۔ اس کا دوسرا مجموعہ ''آشنائیاں کیا کیا'' شائع ہوا جس کا عنوان اس نے ''بے وقوف'' رکھا اور اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا کہ رحلت کے بعد اشاعت کے لیے لکھا گیا مگر دیر ہونے کی وجہ سے قبل از وقت شائع کیا جارہا ہے۔

''خوش پوش، خوش گفتار، نیک نفس مگر کم عقل بلکہ بے وقوف نہ تھے حمید اختر عمر بھر توہمات تعصبات اور مذہبی جنون پرستوں کے خلاف سینہ سپر رہے۔''

وہ پرانی یادوں کو زندہ کرتا رہا اور پاکستان پہلے سے زیادہ انسانی خون کی ارزانی کا شکار ہوگیا۔ وہ زندگی بھر انسانی خون کی حفاظت کے لیے کام کرتا رہا تھا مگر اب عمر عزیز 80 سے تجاوز کرچکی تھی۔ وہ صرف اپیل کرسکتا تھا۔ روزنامہ ایکسپریس نے اس کا بیان شائع کیا۔

''نامور صحافی، ادیب اور سیکریٹری جنرل انجمن ترقی پسند مصنفین نے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے اپیل کی ہے کہ وہ ملک اور اس کے عوام کو دہشت گردوں اور انتہا پسندوں سے بچانے کے لیے اپنی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے سرگرم عمل ہوں۔''

کینسر نے پھر سر اٹھایا۔ اسے پھر شوکت خانم اسپتال میں داخل کرادیا گیا جہاں اس نے 18 اکتوبر 2011ء کو آخری سانس لی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

**ماخذات**

حمید اختر، احمد سلیم، سجاد ظہیر۔ شخصیت اور فکر
مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

# قسمت گزیدہ

زویا اعجاز

وہ غربت کی گود میں پل کر جوان ہوا اور اپنے حوصلے کو مہمیز کر کے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا۔ اپنے منفرد انداز کی وجہ سے سب کا چہیتا بنا لیکن قسمت اسے ہرگام پر چرکے لگاتی رہی۔

**کرکٹ کی دنیا کے نامور کھلاڑی کی سرگزشت**

بارش کے بعد آسمان خوب صاف شفاف سا تھا۔ ہوا میں رچی بسی نباتات کی خوشبو طبیعت کو عجب سی ترنگ میں جتلا کر رہی تھی۔ درختوں کے پتے دھل کر نکھر گئے تھے۔ سینٹ لوشیا کے جنوب مشرقی ساحل پر واقع 'میکوڈ' Micoud نامی اس گاؤں میں زندگی اپنی جولانی پر تھی۔ بچے بالے کبھی لکڑی کے ناتراشیدہ بلے اور گیند لیے اپنے جنون کی تسکین میں مشغول تھے۔ اسی اثناء میں ایک بچہ دور سے بھاگتا ہوا آیا۔ اس کی زرد آنکھوں میں جوش کے

ساتھ کچھ شکوے بھی جھلک رہے تھے۔ بحث بے ربط تھا لیکن سبھی ساتھی اسے نظر انداز کیے اپنے کھیل میں مگن رہے۔ وہ ان کی بے رخی پر کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے ان کی توجہ کے حصول کا منتظر رہا لیکن جب بات بنتی نظر نہ آئی تو ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے کیوں نہیں بلایا کھیلنے کے لیے؟'' وہ اداسی سے بولا۔

''ہم نہیں کھیلنا چاہتے تمہارے ساتھ۔ اس لیے نہیں بلایا۔'' ایک غصیلا لڑکا اسے کڑے تیوروں سے گھورتا ہوا بولا۔

''مگر کیوں نہیں کھلانا چاہتے؟ میں تمہارا دوست ہوں۔'' اس کا ذہن ان کی بے رخی کا جواز تلاش کرنے سے قاصر تھا۔

''تم ہمارے دوست ہوتے تو ہمیں دھوکا نہ دیتے۔'' ایک اور لڑکے نے بلا زمین پر پٹختے ہوئے کہا۔

''میں نے کیا دھوکا دیا ہے؟'' وہ یہ الزام سہہ نہ پا رہا تھا۔

''ہماری اسکول کی چھٹی کا ذکر گھر میں کیوں کیا؟ اگر ہمارے دوست ہوتے تو اس چھٹی میں ہمارا ساتھ دیتے۔''

''میں نے تو صرف سچ بولا تھا۔ میں جھوٹ کیسے بول سکتا تھا؟''

''اگر تم ہمارے لیے جھوٹ نہیں بول سکتے تو ہم تمہیں اپنے ساتھ کھیل میں بھی شریک نہیں کر سکتے۔ اب جاؤ یہاں سے، ہمارا وقت برباد مت کرو۔'' وہ اس کے ایک بے ضرر سچ سے ملنے والی سزا کا مکمل انتقام لینے پر تلے تھے۔

وہ اپنے دوستوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی اپنے تئیں تمام کوششیں کرتا رہا لیکن وہ اس سے واقعی بہت خفا ہو چکے تھے۔ وہ اداس دل اور ڈھیلے قدموں سے اپنے گھر چلا آیا اور خاموشی سے ماں کے پاس چھوٹے سے باورچی خانے میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔

''کیا ہوا بیٹا؟ آج کھیلنے نہیں گئے؟'' ماں کی نظروں سے اس کی اداسی پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''گیا تھا لیکن انہوں نے مجھے کھلانے سے انکار کر دیا۔'' اس کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

''کیوں انکار کر دیا؟'' اس کے والد 'ڈلسن سیمی' نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''وہ سب مجھ سے ناراض ہیں۔ انہوں نے ناغہ کر کے کھیلنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن میں نے چھٹی نہیں کی۔ ان کے گھر والوں کو علم ہو گیا۔ اب وہ مجھ سے خفا ہیں۔'' وہ آزردگی سے بولا۔

''اگر آپ بھی جھوٹ بولتے تو ہم بھی یونہی ناراض ہو جاتے آپ سے۔ خداوند بھی آپ سے ناراض ہو جاتا۔'' ماں نے اس کے زخموں کو دھیرے سے سہلانا شروع کیا۔ ''وہ تو نادان ہیں۔ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''کیا واقعی؟ وہ مجھے اپنے ساتھ کھلایا کریں گے؟''

''بالکل کھلائیں گے، سچ بولنے والے پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ اس لیے کسی کی ناراضگی کے ڈر سے سچ بولنا ترک مت کرنا میرے بچے!'' ڈلسن نے شفقت سے کہا۔

اسی پل دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے دو دوست اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

''ہم تمہیں لینے آئے ہیں ڈیرن! سب تمہیں یاد کر رہے ہیں۔'' وہ ان کی اس چھوٹی سی ٹیم کا بہترین کھلاڑی تھا لہٰذا اس کی غیر حاضری میں انہیں بھی کھیل کا مزہ کیسے آ سکتا تھا۔

اس نے اجازت طلب نظروں سے اپنی والدہ کو دیکھا جس کی مسکراتی نگاہیں اسے مثبت جواب دے چکی تھیں۔

''جلدی واپس آنا ڈیرن! میں تمہاری پسندیدہ پکوڑیاں، مرغ دال اور مٹر بنا رہی ہوں کھانے میں۔'' ڈلسن سیمی نے اسے یاددہانی کروائی۔

''یس مام! جلد آ جاؤں گا۔'' وہ دوستوں کی ناراضگی کے خاتمے کو اپنی سچائی کی رحمت سمجھتا خوشی سے نہال اچھلتا کودتا چلا گیا۔

☆.....☆

سینٹ لوشیا کے عوام علاقائی و جغرافیائی اعتبار سے مختلف 'چوتھائیوں' میں منقسم تھے۔ میکوڈ گاؤں بھی اسی ایک چوتھائی کا ایک حصہ تھا۔

ڈیرن کی پیدائش بیس دسمبر 1983 'ویکس فورٹ' کے 'وکٹوریہ اسپتال' میں ہوئی۔ والدین کیلے کے باغات میں معمولی کارکن تھے۔ ڈیرن نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گرد دو چیزوں کی فراوانی پائی تھی۔

غربت اور کرکٹ کے لیے عوام کا جنون۔

عوام کا سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، ہنسنا رونا، کھانا پینا۔ صرف کرکٹ تھا۔

میکوڈ کے اردگرد ہر سو خوبصورت قدرتی نظارے بکھرے ہوئے تھے۔ بحر اوقیانوس کی حدود میں کیریبین سمندر کی مشرقی سمت میں واقع سینٹ لوشیا سیاحوں کے لیے بے پناہ کشش کا حامل تھا۔ مونگے کی چٹانیں، جوالا مکھی

ساحل، پُرآسائش ہوٹلز اور آب و ہوا انہیں بہت لبھاتی تھی۔
آب و ہوا کے اعتبار سے سینٹ لوشیا منطقہ حاری سے منسلک تھا۔ اکتیس دسمبر سے اکتیس مئی کے دوران موسم خشک رہتا تھا جبکہ یکم جون سے تیس دسمبر کے درمیانی عرصہ میں خوب بارشیں برستی تھیں۔ خطِ استوا کے قریب ہونے کی وجہ سے موسم گرما اور موسم سرما میں درجہ حرارت زیادہ اتار چڑھاؤ کا شکار نہیں ہوتا تھا بلکہ معتدل مزاجی ہی کی راہ اپنائے رکھتا۔
ڈیرن بچپن ہی سے ان موسموں اور خوبصورتی کا دلدادہ تھا۔
سیاحوں کی جانب سے حاصل ہونے والی آمدنی کے ثمرات عوامی سطح پر کم ہی پہنچتے تھے اس لیے غربت کا دور دورہ تھا۔ تاہم حکومتی پالیسیوں کے تحت وہاں پانچ تا پندرہ سالہ بچوں کے لیے تعلیم مفت اور لازم تھی۔ ڈیرن نے بھی اس سہولت سے خوب استفادہ کیا۔
علم کی روشنی نے ذہن منور کیا تو اسے اپنے گرد پھیلی خوبصورتی میں پنہاں ایک 'بدصورتی' نظر آنے لگی۔ ڈیرن کے لیے اپنے علاقوں میں آنے والے سیاحوں کا رویہ بہت تکلیف دہ تھا۔ سنہری بالوں، بلوری آنکھوں اور سفید چمڑی والے یہ سیاح سیاہ فام، سخت گھنگریالے بالوں اور زرد آنکھوں والے ڈیرن کو بہت پیارے لگتے تھے۔ وہ ان کے قریب جانا چاہتا لیکن ان کی زبانوں سے نکلے نوکیلے الفاظ اس کا ننھا سا دل زخمی کر دیتے۔
سفید فام افراد اس سمیت سبھی مقامی افراد کی سیاہ آبنوسی رنگت اور پھیلے ہوئے نقوش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور انہیں 'کالے دیو' کہہ کر پکارتے۔ اس کی روح میں اداسی کا موسم اترنے لگتا اور احساسِ کمتری کی ایک لہر اس کا وجود ڈھانپ لیتی۔
ایک روز ایسے ہی الفاظ کی کاٹ سے اپنے زخمی دل کی تکلیف سہتا وہ شام سے پہلے ہی گھر آ گیا۔ آج اس کا دل کھیلنے کو بھی نہ چاہ رہا تھا۔ کلارا نے اس کی یہ حالت دیکھی تو اپنی ماں تا کی آغوش میں سمیٹ لیا اور اس کی پیشانی چوم کر بولی۔ ''کیا بات ہے؟ آج پھر سے یہ اداسی کیوں؟''
''کیا میں بہت بدصورت ہوں مام؟'' ڈیرن نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں میرے بچے! ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟'' ماں تا تڑپ اٹھی۔
''سفید فام سیاح ہمیں کالے دیو اور بدصورت، بے ڈھنگے کہہ کر پکارتے ہیں۔''
''ان کے پاس خوبصورتی ناپنے کے اصل پیمانے کہاں؟''
''تو کیا میں بھی خوبصورت ہوں؟ لیکن میں تو 'سیاہ فام' ہوں۔''
''ڈیرن میرے بچے! تم ایک بہت خوبصورت، پرکشش بلیک بوائے ہو۔'' ماں نے اپنی محبت اس کی پیشانی پر ثبت کرتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔
ممتا کا خالص، بے ریا اور ٹھنڈک بھرا لمس اس کی روح پر لگے ان زخموں کے لیے اکسیر ثابت ہوا اور وہ پُرسکون ہو گیا۔

☆......☆

ڈیرن کے والدین کا ذریعہ معاش کیلوں کی شجرکاری تھا۔ انہوں نے غربت کے باوجود اپنے تینوں بچوں کو ہر ممکن آسائش فراہم کی۔ حکومتی سہولت سے قطع نظر انہوں نے اولاد کی تعلیم کی ذاتی سطح پر بھی انتھک کوششیں جاری رکھی تھیں۔ ان کی پرورش ایمانداری، قناعت پسندی، محبت، خودداری، سچائی اور حق گوئی کے اصولوں پر ہو رہی تھی۔
مسیحی عقائد سے تعلق رکھنے والے اس کے والدین نے اپنے اصول و نظریات اور مذہبی اقدار اوائل عمری ہی سے اپنے بچوں میں پروان چڑھانا شروع کر دی تھیں۔ ڈیرن کے اندر ایک 'سیمابی روح' تھی جو اسے آسمانوں کی تسخیر پر مائل کرتی تھی۔ ان سیاہ فام میاں بیوی کے اجلے دلوں اور روشن ضمیری نے بیٹے کی اس خواہش کو خبطی جنون میں ڈھلنے سے روک رکھا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے ایک الگ راہ متعین کر دی تھی اسے ذاتی زندگی کے لیے صبر و شکر کا درس دیتے اور دوسروں کی زندگیوں میں موجود آسائشات سے حسد و بغض سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی بہت تکالیف برداشت کرتے۔
انہی عقائد کے پیشِ نظر اسے بچپن میں پادری بننے کا شوق بھی چرایا تھا۔ چرچ سے وہ کبھی غیر حاضر نہیں ہوتا تھا بلکہ اسے اپنا 'دوسرا گھر' سمجھتا۔
کام کاج کے آداب سے بھی بچپن ہی سے آشنا کیا جا رہا تھا۔ وہ محنت کش خاندان کے بچے تھے اس لیے سستی اور بے پروائی ان کے لیے مہلک ثابت ہوتی۔ ڈیرن اسکول

سے فراغت کے دنوں میں والد کا ہاتھ بٹا دیا کرتا تھا۔ اسے اپنے والد کا پسینے سے چمکتا جسم زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے تحریک دیتا تھا۔ خون اور پسینے سے عظمت کی معراج چھونے کا سادہ سا فلسفہ اس کے ذہن میں بچپن ہی سے راسخ ہو چلا تھا۔

زبانی پند و نصائح کی نسبت والدین اپنی عملی کوششوں سے اپنے گلشن کے ان پھولوں کو کلیوں ہی کی مانند پروان چڑھا رہے تھے تا کہ ان کی معطر خوشبو سے ان سب کی زندگیاں مہک سکیں۔

☆......☆

سینٹ لوشیا جزائر غرب الہند کا اہم ترین حصہ ہونے کی بدولت کرکٹ کے آسیب میں بری طرح جکڑا تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں سبھی اس آسیب میں جکڑے ہوئے تھے۔

ڈیرن نے بھی بچپن ہی سے اپنے گرد کرکٹ دیوانگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ سینٹ لوشیا کے کئی عوامی مقامات پر ایک عرصہ تک پہلے (1975) اور دوسرے (1979) عالمی کپ کے میچ دکھائے جاتے تھے۔ اپنی قوم کو عالمی حکمران بنتے دیکھنے کا یہ تجربہ اس کے لیے بہت سنسنی خیز اور مسحور کن تھا۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیروں خواب نمو پانے لگے۔ ان خوابوں کے زیر اثر اس نے پادری بننے کی خواہش ترک کر کے کرکٹ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

وہ اپنی پچھلی ہوئی، عسرت زدہ قوم کو خوشیوں سے مالا مال دیکھنا چاہتا تھا۔

نوّے کی دہائی میں اس کی ٹیم قدرے زوال کا شکار ہو رہی تھی۔ 1996 کے عالمی کپ میں رچی رچرڈسن کی کپتانی میں جزائر غرب الہند کی ٹیم ایشیا میں ایک کٹھن جنگ سے دوچار تھی۔ جنوبی افریقا کے خلاف برائن لارا کی سنچری اور افریقی باؤلر پال ایڈمز کی عجیب و غریب باؤلنگ نے اسے کئی دنوں تک سرشاری میں جکڑا رکھا تھا۔

ٹیم کی ناکام واپسی کے باوجود اس کے خوابوں کی نمو پر کوئی فرق نہ پڑا۔ اس نے اپنے ذاتی کھیل پر مزید لگن اور توجہ سے محنت شروع کر دی۔

اسکول کی تعلیم سے فراغت کے بعد اس نے والدین کا معاشی سہارا بننے کی غرض سے 'وزارت تجارت' میں ایک 'معاون افسر' کی نوکری کا آغاز کر دیا۔ اس کے ذمے وہاں موجود سرکاری خطوط کے ریکارڈ کی دیکھ بھال تھا۔ اپنے فرائض کو مکمل دیانتداری سے سرانجام دیتے ہوئے اس نے اپنے جنون سے منہ نہیں موڑا تھا۔ کرکٹ کے لیے اس کے جذبات ہر گزرتے دن کے ساتھ شدید سے شدید تر ہو رہے تھے۔

اور پھر بالآخر اس کے خوابوں کی تکمیل کا پہلا مرحلہ آن پہنچا۔

ڈیرن سیمی نے 12 اکتوبر 2001 میں کرکٹ کا باقاعدہ آغاز سترہ سال کی عمر میں کیا۔ ایک مقامی ٹورنامنٹ ریڈ اسٹرپ باؤل میں وہ Northern Windward Islands کی جانب سے 'جمائیکا' کی ٹیم کے خلاف منتخب کیا گیا۔ اپنے اس میچ میں سیمی کو 9 اوورز کے عوض کوئی بھی وکٹ نہ مل سکی۔ بیٹنگ میں وہ صرف پچیس رنز ہی بنا سکا تھا۔

اس ٹورنامنٹ میں تین میچ کھیلنے کے بعد وہ نوّے اسکور بنا کر دوسرا کامیاب ترین کھلاڑی ثابت ہوا لیکن بدقسمتی سے وہ صرف ایک ہی وکٹ حاصل کر پایا۔

ڈیرن سیمی کی تمام تر پیشہ وارانہ زندگی کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو بلاشبہ وہ "قسمت گزیدہ" ہی ہوگا۔

اس کی محنت، لگن، جنون اور تمام تر کوششوں کے آڑے ہمیشہ اس کی قسمت آتی رہی۔ اس کا آغاز ناکامیوں ہی سے ہوا کرتا۔ اپنے جذبہ تعمیر کی بدولت وہ زندگی کے اگلے موڑ پر کامیابی سمیٹ لیتا تھا لیکن قسمت کسی نہ کسی روپ میں اسے پھر آزمائش میں جکڑ دیتی تھی۔

پہلے ٹورنامنٹ کی معتدل کارکردگی کے بعد 2002 میں اسے نیوزی لینڈ میں ہونے والے انڈر 19 عالمی کپ کے لیے ویسٹ انڈیز ٹیم میں منتخب کر لیا گیا۔

اس عالمی کپ کی ایک الگ تاریخی حیثیت بھی رہی ہے۔ اس میں حصہ لینے والے کئی کھلاڑی بعد ازاں کرکٹ کے افق پر ایک ماہتاب بن کر چمکے۔ ڈیوائن براوو، نرسنگھ دیو نارائن، لنڈل سمنز، روی رام پال، شین سیلنگ فورڈ کے علاوہ کئی کھلاڑی ایسے بھی تھے جنہیں اپنی قومی ٹیموں کی کپتانی کا اعزاز حاصل ہوا۔ روس ٹیلر، ہاشم آملہ، محمد اشرفل، ہملٹن مسکدزا، اظہر علی، جارج بیلی اور خود ڈیرن سیمی بھی۔

ویسٹ انڈیز سیمی فائنل تک رسائی حاصل کر پایا تھا۔ آسٹریلیا سے شکست کے بعد سیمی کا یہ سفر بھی تمام ہوا۔

نیوزی لینڈ سے واپسی کے بعد اسے کرکٹ انتظامیہ کی جانب سے "نیشنل کرکٹ اکیڈمی" میں بنیادی تکنیکی

تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ یہ اکیڈمی کیریبین کھلاڑیوں کی صلاحیتیں چمکانے اور ان میں پیشہ ورانہ مہارتوں کی افزائش کے لیے خاصی شہرت کی حامل تھی۔

31 جنوری 2003 میں سیمی نے اپنے فرسٹ کلاس کرکٹ سفر کا آغاز کیا اور حسب سابق اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ونڈ ورڈ آئی لینڈز کی جانب سے بارباڈوس کے خلاف کھیلے جانے والے میچ میں وہ ساتویں نمبر پر بیٹنگ کے لیے بھیجا گیا اور بغیر کوئی اسکور بنائے ہی آؤٹ ہو گیا۔ دوسری اننگز میں وہ 25 اسکور ہی بنا پایا۔ اس میچ میں اسے چھ اوورز میں کوئی بھی وکٹ نہ مل سکی۔

اسی ٹورنامنٹ کے دوسرے میچ میں وہ پھر صفر کے پھیرے سے آگے نہ بڑھ پایا لیکن ہمت ہارنا اس کی سرشت میں شامل ہی نہ تھا ان ناکامیوں کے بعد اس نے اپنی پہلی فرسٹ کلاس ففٹی اسکور کی۔

اس فرسٹ کلاس میچ کے بعد 4-2003 میں اسے ونڈ ورڈ آئی لینڈز ہی کی جانب سے ایک مقامی چار روزہ مقابلوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ اس ٹورنامنٹ میں قسمت اس کے حق میں مکمل طور پر موافق رہی۔ 22 کھلاڑیوں کے شکار کے علاوہ وہ 261 اسکور بنا کر ٹورنامنٹ کا کامیاب ترین کھلاڑی ثابت ہوا۔

اس بہترین کارکردگی کے بعد اسے ایک روزہ کرکٹ کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ 2004 میں انگلینڈ میں ہونے والے ایک سہ ملکی (نیوزی لینڈ، انگلینڈ، ویسٹ انڈیز) ٹورنامنٹ کے لیے اپنی نامزدگی پر سیمی خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ 8 جولائی کو اپنے پہلے میچ کے لیے اس نے اپنی متوقع کارکردگی کے حوالے سے ذہن میں بے شمار خاکے مرتب کر لیے۔ لیکن اپنی ان منصوبہ بندیوں میں وہ اہم ترین پہلو پر غور و فکر کرنا تو بھول ہی گیا تھا۔ اپنی قسمت جو ہمیشہ ہی اس کی تمام تدابیر پر خندہ زن رہا کرتی۔

'روز باول' میں ہونے والا ڈیرن سیمی کا وہ پہلا ایک روزہ بین الاقوامی میچ ٹاس کے بعد شدید ترین بارش کی نذر ہو گیا۔ وہ ایک اور موقع کی تلاش میں کمر کسے محنت میں جت گیا۔

اس بار اس کا انتظار جلد ہی ختم ہو گیا۔ ستمبر میں ہونے والی چیمپئنز ٹرافی کے لیے اسے بائیس سالہ جمائیکن تیز رفتار باؤلر جرمین لاسن کے زخمی ہونے کے بعد ٹیم میں شمولیت کا اذن مل گیا۔

بیس سال کی عمر میں وہ سینٹ لوشیا کی جانب سے ویسٹ انڈیز کی قومی ٹیم میں کھیلنے والا پہلا اور کم عمر ترین کھلاڑی بن گیا تھا۔

بنگلہ دیش کے خلاف اپنے اس پہلے میچ میں اس نے چھ اوورز میں انیس رنز کے عوض ایک کھلاڑی کو آؤٹ کیا اور تین اہم کیچز بھی لیے۔ ویسٹ انڈیز یہ میچ 138 رنز سے جیت گیا۔ اس کے بعد سیمی کو ٹورنامنٹ میں مزید کوئی میچ کھیلنے کا موقع تو نہ مل سکا لیکن ویسٹ انڈیز ٹیم فائنل میں انگلینڈ کو شکست دے کر ٹرافی جیتنے میں کامیاب رہی۔

ایک روزہ میچز کی طرح ٹیسٹ کرکٹ میں اس کی آمد بھی جزوی تاخیر کا شکار ہو گئی۔ جنوری 2007 میں بھارت کے دورہ کے لیے اسے بھی منتخب کیا گیا لیکن روانگی سے کچھ عرصہ پہلے وہ زخمی ہونے کی وجہ سے ٹیم کے ساتھ نہ جا سکا۔

اس حادثے کے بعد وہ انگلینڈ میں اپریل اور مئی میں منعقد ہونے والی ''سینٹرل لنکا شائر لیگ'' کھیلنے کے لیے روانہ ہوا۔ اس دورہ کے بعد ویسٹ انڈین قومی ٹیم کو گوروں کی سرزمین پر ایک مکمل سیریز بھی کھیلنا تھا۔ سیمی کی کارکردگی اس لیگ میں بہت اچھی رہی اور اسے قومی ٹیم کے لیے نامزد کر لیا گیا۔

ٹیسٹ کرکٹ میں شمولیت کسی بھی کھلاڑی کا سب سے بڑا خواب ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے میں ٹیسٹ کرکٹ کی خوبصورتی تیز رفتار کرکٹ کے باعث قدرے گہنا چکی ہے لیکن اس کا وقار، مستقل مزاجی، ٹھہراؤ اور محنت ایک ایسا امتحان ہوتی ہیں جو ہر سنجیدہ مزاج اور پیشہ ورانہ قابلیت کے حامل کھلاڑیوں کو بہت بھاتی ہیں۔

سیمی بھی انہی کٹھنائیوں سے گزر کر اپنی اہلیت کا بھرپور لوہا منوانا چاہتا تھا۔

7 جون 2007 میں اولڈ ٹریفورڈ کے میدان پر کھیلے جانے والے تیسرے ٹیسٹ میچ کے لیے اس 23 سالہ سینٹ لوشیائی کھلاڑی کو ٹیسٹ میچ کرکٹ میں داخلے کا پروانہ تھما دیا گیا۔ اس کی آنکھیں مسرت سے لبریز اور خوابوں کے بوجھ سے لدی ہوئی تھیں۔ قسمت اور محنت ایک بار پھر ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے بے تاب تھیں۔

اس ٹیسٹ میچ کی پہلی اننگز میں سیمی صرف ''ایلسٹر کک'' کی وکٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ سترہ اوورز میں 1.88 کی رنز ایوریج بھی کافی متاثر کن تھی۔ دوسری اننگز میں اس کی محنت اور لگن نے اپنا رنگ

ایسا جمایا کہ نامور کرکٹ جغادری بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔اس کی تلی تلی باؤلنگ نے گوروں کی کمر توڑ دی۔ 66 رنز کے عوض 7 وکٹس حاصل کر کے 1988 میں میلکم مارشل کی اسی میدان میں تباہ کن باؤلنگ (7/22) کے بعد دوسری بہترین کارکردگی تھی۔

اس کی محنت نے ۶۷ سال بعد اپنے پہلے ہی ٹیسٹ میچ میں کسی بھی ویسٹ انڈین باؤلر کی بہترین کارکردگی کی صف میں لا کھڑا کیا۔اس سے قبل ''الف ویلنٹائن'' نے 1950 میں 102 رنز کے عوض 8 کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا تھا۔

محنت ولگن اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور و نازاں تھیں اور قسمت اپنے ترکش میں مزید تیر اکٹھے کرنے میں مگن تھی۔

☆......☆

ڈیرن سیمی کے والدین نے اس کی تربیت جن خطوط پر کی تھی، یہ اسی کا اعجاز تھا کہ وہ انتہائی عملی سوچ کا حامل تھا۔اس کے دوست احباب اس کی تعریفوں کے پل باندھتے تو وہ گہری متانت سے سر جھکا کر کہتا۔''ویسٹ انڈین کرکٹ نے سینکڑوں ذہین، باصلاحیت اور تیکھے کھلاڑی دیکھے ہیں۔میری ذات میں ایسی کوئی خوبی ہی نہیں، میں صرف محنتی ہوں اور اسی صفت کی بنا پر اپنے ملک کو فیض پہنچاتا رہوں گا۔''

وہ اس کی ذات کے مزید اسیر ہو جاتے۔

محنت ولگن کے علاوہ اس کی کچھ شخصی و ذاتی خوبیاں ہی اس کی کامیابی کا اہم جزو تھیں۔

بہترین کارکردگی کے باوجود وہ تشنگی اور کمی کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ ہی لیا کرتا تھا۔اس کی سیمابی روح بہتر سے بہترین کی جانب گامزن تھی۔آل راؤنڈر کھلاڑی ہونے کی وجہ سے اس پر دہری تہری ذمہ داریاں عائد تھیں۔وہ نہ تو مکمل باؤلر تھا، نہ ہی مستند بیٹسمین۔لیکن وہ 'اصیل گھوڑے' کی مانند اپنی ٹیم کے لیے مشکلات سے نکلنے کے رستے تلاش کرنے کا ماہر بننا چاہتا تھا۔

اس کی ایک بڑی خوبی یہی تھی کہ عام کھلاڑیوں کی نسبت وہ باؤلنگ میں میڈن اوورز بنا تھکتے یا اپنے مکمل کروا دیتا تھا اور بیٹسمین اس کی تلی تلی باؤلنگ کے سامنے بالآخر کسی نہ کسی غلطی کا شکار ہو کر اسے اپنی وکٹ تھما دیتے تھے۔

''مسکراہٹ'' اس کی شخصیت کا ایک جادوئی پہلو تھی۔

بچپن میں جب بھی کبھی وہ آزردہ حال، منہ بسورتا ہوا گھر میں داخل ہوتا تو اس کی والدہ اسے آغوش محبت میں بھرنے کے علاوہ ایک ''جادوئی نسخہ'' بھی سکھایا کرتی۔اس کی زود رنجی اور حساسیت کو اس عظیم خاتون نے مسکراہٹ کے پردے میں چھپانے کا گر سکھا دیا۔

سیمی کی یہی مسکراہٹ اس کا بہت بڑا ہتھیار ثابت ہونے لگی۔مخالفین کو اعصابی و ذہنی دباؤ میں لینا مزید آسان ہو گیا۔اسے زندگی میں مکمل خودداری سے جینے کی آرزو تھی۔

اپنی پریشانیاں اور ذہنی تناؤ اسی مسکراہٹ میں چھپائے وہ مقابل کے لیے اچھا خاصا 'امتحان' ثابت ہونے لگا۔

پریشانیاں اور تفکرات جب اس کا ذہن بوجھل کرنے لگتے تو وہ ایک بار پھر ماں کی آغوش میں سمٹ جاتا جس کا محبت بھرا لمس اور شیریں لہجہ کسی اسفنج کی طرح اس کے وجود سے سب منفی خیالات جذب کر لیتے۔ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی۔''ڈیرن میرے بچے! مسکراتے ہوئے تم اپنی عمر سے کہیں چھوٹے لگنے لگتے ہو اور تمہارے یہ خوبصورت موتیوں کی لڑی جیسے سفید دانت بہت بھلے لگتے ہیں۔''

اور ڈیرن سیمی ایک بار پھر کسی ''تازہ دم اصیل گھوڑے'' کی مانند کرکٹ کے میدان کو اپنے سموں تلے روندنے کے لیے بھرپور توانائی سے تیار ہو جاتا۔

اپنی ذات پر اس کا اعتماد کبھی کسی لمحہ بھی نہ ڈگمگاتا تھا۔وہ ہر نئے دن کا آغاز ایک نئے جذبے اور ایمانداری سے کرتا۔ 2007ء کے اس دور میں اسے ناقدین کی جانب سے خاصی تنقید کا سامنا رہتا تھا۔وہ اس کی کارکردگی کے اتار چڑھاؤ سے نالاں رہتے ہوئے اسے اپنے طنز و تشنیع کی زد میں رکھتے تھے لیکن وہ اس تنقید کو اپنے اعصاب پر بھی حاوی نہیں کرتا تھا۔

اس کی ذاتی رائے اور سوچ میں یہ تنقید قطعی اہم نہ تھی بلکہ اہمیت اس بات کی تھی کہ وہ ''ڈیرن سیمی'' ہے 'ایک منفرد شخصیت و قابلیت کا حامل۔اس روئے کائنات میں یقیناً کوئی دوسرا ڈیرن سیمی نہ تھا۔یہی جذبہ اور ہمت تنقید سے حاصل ہونے والی وقتی اداسی مٹا کر اسے 'اگلی جنگ' کے لیے تازہ دم کر دیا کرتی۔

2008-09ء اس کے لیے ڈومیسٹک کرکٹ کے

حوالے سے بہت یادگار ثابت ہوا۔ چار روزہ کرکٹ کے ایک ٹورنامنٹ میں اس نے ونڈ ورڈ آئی لینڈز کی جانب سے سات میچ کھیلے اور 27-43 کی ایوریج سے 476 رنز بنائے۔ اپنے کلب کی طرف سے وہ اس وقت دوسرا کامیاب ترین بیٹسمین تھا۔ اسی دوران اس نے اپنی پہلی فرسٹ کلاس سنچری کر کے ایک اور خواب کو سہانی تعبیر کا پیرہن اوڑھا دیا۔

2,000 فرسٹ کلاس رنز کا سنگ میل عبور کرنے کے علاوہ اس نے 21.65 کی ایوریج سے اس ٹورنامنٹ میں 23 وکٹیں اپنے نام کیں۔

اس کی بھرپور محنت رنگ لانے لگی تھی۔

☆......☆

سیمی کی پیشہ وارانہ زندگی پر سال 2009 نے بہت دوررس اثرات مرتب کیے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ویسٹ انڈین کرکٹ کی موجودہ منتشر حالت کا آغاز اسی سال ہوا تھا جس سے واقفیت کے لیے ماضی کے کچھ اوراق پلٹنا اب لازم ہے۔

ویسٹ انڈیز میں کرکٹ کا آغاز بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے اختتام پر ہوا تھا۔ ابتدائی چند سالوں کی مشکلات کے بعد یہ سیاہ فام قوم جس جنون اور جارح مزاجی سے اس کھیل پر حادی ہوئی تھی، اس کی نظیر دنیائے کرکٹ میں کہیں بھی نہیں ملتی۔

'جارج ہیڈلی جیسے بیٹسمین کو' بلیک بریڈ مین' کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ آئندہ چار سے پانچ عشروں میں ان کا شمار دنیا کی بہترین ٹیموں میں ہوتا رہا۔ ابتدائی دو عالمی کپ جیت کر کرکٹ پر ان کا تسلط غیر متزلزل تھا لیکن اسی کی دہائی کے اختتامی سال ان کے عروج کو بتدریج زوال کی جانب دھکیلنے لگے۔ صورتِ حال اتنی بدتر ہوتی گئی کہ 2005 میں معاشی کمتری کی وجہ سے ویسٹ انڈیز، آسٹریلیا میں ہونے والے سہ ملکی ٹورنامنٹ میں حصہ ہی نہ لے سکا۔

زوال کی ایک بڑی وجہ ماہرین کے مطابق یہ بھی تھی کہ ویسٹ انڈیز ایک ''مملکت'' نہیں بلکہ سولہ ریاستوں کی تھی ایک مربوط ہیئت ہے۔ ان بھی ریاستوں کا سب سے بڑا مسئلہ 'سرمایہ کاری کی کمی' ہے۔ حکومتی وسائل میں کمی کے باعث کرکٹ بورڈ کے پاس اتنے ''فنڈز'' ہی نہیں ہوتے کہ عوام کے پسندیدہ ترین کھیل کی بہبود پر خرچ کیے جاسکیں۔

دنیائے کرکٹ میں جہاں انگلینڈ، آسٹریلیا، بھارت اور جنوبی افریقا جیسے ممالک اپنی ٹیمز پر بھاری بھرکم سرمایہ خرچ کر کے انہیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر رہے ہیں، ویسٹ انڈیز معاشی اعتبار سے بدترین جمود کا شکار ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اعلیٰ عہدیداران اس جمود، تنزلی اور جگ ہنسائی میں بھی بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ کرکٹ کے مقتدر ممالک صاحب استطاعت ہونے کے باعث انہیں اس دلدل سے بخوبی نکال سکتے ہیں، لیکن نسلی تعصب اور کرکٹ پر ذاتی اقتدار کی ہوس نے ویسٹ انڈیز کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

یہ تو رہے خارجی عوامل، غرب الہند کی اس تنزلی میں داخلی عوامل نے بھی دیمک کا کردار ادا کیا ہے۔

مختلف جزائر سے ٹیم میں آنے والے کھلاڑی ریاستی نااتفاقی، سیاسی کشیدگی اور حکومت پر ذاتی غیظ و غضب بھی اپنے ساتھ کھیل کے میدان میں لے آئے۔ کرکٹ بورڈ مالی اعتبار سے تقریباً دیوالیہ تھا۔ کھلاڑیوں کو ان کے مطالبات کے مطابق ''سینٹرل کانٹریکٹ'' نہیں ملتا۔ اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے اور خاندان کی کفالت کے لیے وہ غیر ملکی لیگز کھیلنے کو ترجیح دیتے اور بورڈ کی نظروں میں معتوب قرار پاتے۔

2009 میں یہ چپقلش اس قدر زور پکڑ چکی تھی کہ کھلاڑی اور کرکٹ بورڈ واضح طور پر سرد جنگ کا شکار ہو گئے۔ کھلاڑیوں نے قومی ٹیم سے علیحدگی اختیار کرلی۔ بورڈ کے انا پرست ممبران نے انہیں مزید اذیت دینے کے لیے ٹیم میں نئے اور ناتجربہ کار کھلاڑیوں کی بھرتی کا آغاز کر دیا۔

اس سال بنگلہ دیش کے خلاف ہونے والی ہوم سیریز میں جس پندرہ رکنی اسکواڈ کا اعلان ہوا، ان میں نو کھلاڑی پہلی دفعہ قومی ٹیم کے لیے منتخب کیے گئے تھے اور ڈیرن سیمی کو اس ٹیم کی نائب کپتانی سونپی تھی۔

اپنی زندگی کے اس اہم موقع پر اس عہدے کا حصول اسے خوشی سے کہیں زیادہ فرائض و ذمہ داریوں کے بارے بوجھل کر رہا تھا۔ سات عدد نئے کھلاڑیوں کے ساتھ اپنی ہی سرزمین پر وہ بنگلہ دیش جیسی نوآموز ٹیم سے دو ٹیسٹ میچ ہار کر سیریز گنوا بیٹھے تھے۔ ڈیرن سیمی کے لیے ٹیم کی یہ ہیئت کذائی ناقابلِ برداشت تھی۔ اس سیریز میں اس کی 12 وکٹیں اور 90 اسکور پانی پر لکھی ہوئی تحریر ثابت ہوا۔

نومبر 2009 میں کرکٹ بورڈ نے نئے سینٹرل کانٹریکٹس کا اعلان کرتے ہوئے سیمی کو ''گریڈ بی'' میں

شامل کر لیا جس کی رو سے وہ 80,000 امریکی ڈالرز کے حصول کا مجاز قرار پایا۔ آلام و مصائب کے اس دور میں امید و خوشی کی ننھی کرنیں ہی اس کا حوصلہ توانا رکھے ہوئے تھیں۔

☆......☆

سال 2010 اپنا چوتھائی سفر طے کر چکا تھا۔ مختصر ترین کرکٹ کے تیسرے عالمی کپ کی میزبانی اس بار ویسٹ انڈیز کے سپرد تھی۔ عوام میں کرکٹ کا جنون سر چڑھ کر بولتا تھا۔ ڈیرن سیمی اس روز اپنی کچھ ذاتی خریداری کے لیے ایک شاپنگ سینٹر میں موجود تھا۔ عوامی مقامات پر قومی کھلاڑیوں کو دیکھ کر جوش و محبت کا اظہار اس کے لیے کوئی نئی بات تو نہ تھی لیکن اس بار عوام کا جذبہ کچھ نئے ہی رنگوں میں ڈھلا نظر آ رہا تھا۔

''ورلڈ ٹی ٹوئنٹی کی تیاریاں کیسی ہیں سیمی؟''

''اس بار ورلڈ کپ کہیں اور نہیں جانا چاہیے!''

''اس بار ٹائٹل پہ ہمارا نام ہونا چاہیے۔''

اس کی سماعت میں ہر سمت سے یہی آوازیں اور نعرات گونج رہے تھے۔ اور پھر تو گویا حد ہی ہو گئی۔ ایک عمر رسیدہ شخص کسی کونے سے برآمد ہو کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے نیم شفاف سر پر سرمئی بالوں کی جھالر لٹک رہی تھی۔ ہونٹوں میں ایک سستے برانڈ کا سگار پائپ دبائے اپنی کہنہ سال آنکھیں اس کے چہرے پر جما کر وہ کہنے لگا۔ ''ان بوڑھی آنکھوں نے اپنے شباب میں عالمی حکمرانی کے مناظر دیکھے تھے مسٹر سیمی!! اقتدار کا وہ نشہ کسی قدیم ترین شراب سے بھی کہیں زیادہ نشیلا ہے۔ میری اور مجھ جیسے لاکھوں لوگوں کی یہ آرزو ایک بار پھر پوری کر دو۔ ہمیں کرکٹ کا عالمی حکمران بنا دو۔''

سیمی فرط جذبات سے گنگ تھا۔

''ہم سب کوشش کریں گے۔ خداوند یسوع مسیح ہمارا حامی و ناصر رہے۔'' وہ انہیں امید و آس کے جگنو تھما کر لوٹ آیا۔

دوست احباب، اہل خانہ اور دور و نزدیک کے سبھی رشتہ داروں نے ان سے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، اس کا بار اٹھانا سہل نہ تھا۔ عالمی کپ کے پہلے میچ میں آئرلینڈ کو شاندار شکست سے دو چار کرنے کے بعد ان کے حوصلے بلند تھے۔

آسٹریلیا کے خلاف کھیلا جانے والا میچ ''مر دیا مار دو'' جیسی صورت اختیار کر چکا تھا۔ سیمی کی آبائی سرزمین ''سینٹ لوشیا'' پر کھیلے جانے والے اس میچ میں ان کی خوب درگت بنی۔ مجموعی طور پر سیمی کے لیے یہ عالمی کپ ذاتی کارکردگی کے تناظر میں قدرے بہتر ہی رہا تھا۔ چار میچوں میں اکیاون رنز اور چھ وکٹیں ٹیم کی بہترین انفرادی کارکردگی میں سے ایک تھیں۔

لیکن اسے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ وہ اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکا تھا۔ لاکھوں دلوں کے ٹوٹنے کی صدائیں اس کی سماعت میں سسکیاں بھرتی تھیں۔ ایک بار پھر وہ قسمت کے ہاتھوں مغلوب ہو گیا تھا لیکن اپنی محنت اور زور بازو پر تیقن اس کے دل کو قوی کرنے لگا تھا۔ اپنی ذات سے کیے ایک خاموش عہد نے اس کی روح کو پُرسکون کر دیا۔

☆......☆

ڈیرن سیمی اپنی عمر کے 26 پڑاؤ عبور کر چکا تھا اور والدین، بہن بھائیوں کی جانب سے اس کی شادی کی خواہش کا اظہار زور پکڑ رہا تھا۔ وہ خود بھی اس مقدس بندھن میں بندھنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ پیشہ ورانہ زندگی کی کٹھنائیوں اور مصروف ترین معمولات میں اسے لامحالہ طور پر ایک ایسی شریک حیات کی ضرورت تھی جو اس کے وجود میں گڑے کانٹے اپنی پلکوں سے چننے کی اہل ہو، اس سے بے پناہ محبت کرے تو اس کے خاندان کو بھی اسی کی طرح اپنائیت دے۔

اپنے تمام تر تحفظات و خواہشات کا ایک ہی مجسم جواب اس کے ذہن میں آتا تھا، ڈینیل کیتھی۔

کیتھی بچپن ہی سے اس کی دوست تھی۔ دوستی کے اس سفر میں انہوں نے چاہت کی وادی میں کب قدم رکھے؟ اس حقیقت سے وہ خود بھی ناآشنا تھے اور اب عمر بھر کے ایک اٹوٹ، خوبصورت ترین رشتے میں بندھ کر آدم و حوا کے وجود کی کاملیت کا وقت آ گیا تھا۔ 5 ستمبر 2010 کے اس خوشگوار دن میں ڈیرن اور ڈینیل رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

زندگی میں ایک نیا حسن در آیا۔

شادی کے بعد نئی زندگی اور چاہت کے خمار میں سرشار وقت کی ڈور تیزی سے پھسلتی جا رہی تھی۔ ایک ماہ کا عرصہ تو گویا کسی خواب کی مانند ہی گزر گیا تھا اور ابھی اس کی زندگی میں ایک اور انقلاب نے دستک دی۔

17 اکتوبر 2010 کو اسے ویسٹ انڈیز کی قومی کرکٹ ٹیم کی قیادت سونپ دی گئی۔ اس خبر کے بعد خوشی

کے علاوہ فکر اور اضطراب کی ایک لہر نے اس کے وجود کو اپنے گھیر میں ڈھانپ لیا۔ کیتھی سے محبوب شوہر کی یہ حالت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ شہد آگہیں لہجے میں بولی۔ ''اس خوشی کے موقع پر اتنی بے چینی کیوں؟ مسرت و اضطراب کی یہ دھوپ چھاؤں جیسی کیفیت آپ پہ جچتی تو نہیں''

''یہ بے چینی مستقبل قریب کے ان حالات کی ہے جن کے خطرات مجھے للکارتے نظر آرہے ہیں فکر مند ہوں کہ انہیں شکست سے دوچار کر پاؤں گا کہ نہیں؟''

''کیا خوفزدہ ہیں آپ؟''

''نہیں!! خوفزدہ نہیں ہوں۔ لیکن ڈوبتے ہوئے سفینے کا ناخدا بنا دیا گیا ہوں، اور اسے بحفاظت ساحل تک پہنچانے کی بہترین حکمت عملی تلاشنے کی خواہش ہے بس۔''

''آپ کی یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ آپ کی محنت اور جدو جہد ایسا رنگ جمائے گی کہ ایک دنیا یاد رکھے گی۔'' وہ اس کے ہاتھ تھامے بولی۔

''عوام میں کرس گیل کی مقبولیت کا تناسب مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ مجھے بخوشی قبول نہیں کریں گے۔'' اس کے خدشات بھی بے جانہ تھے۔

''لیکن گیل کی کارکردگی بھی تو کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انفرادی کارکردگی وہ لاجواب سہی، بحیثیت قائد اسے خاطر خواہ کامیابیاں نہیں مل سکیں۔'' کیتھی نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔

''اور میری انفرادی کارکردگی پر بھی تو ہمیشہ ایک سوالیہ نشان رہتا ہے، تسلسل کی کمی کا شکار ہوں میں بھی۔''

''ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔ آپ کی محنت اس کمی کو ختم کردے گی۔''

نصف بہتر کے اس تیقن نے اسے ہلکا پھلکا کردیا۔

☆......☆

سیمی کو اکتوبر 2010 میں سے 2011 کے اختتام تک ٹیم کی قیادت سونپی گئی تھی۔ اس وقت سیمی نے صرف 8 ٹیسٹ اور 41 ایک روزہ بین الاقوامی میچوں میں ٹیم کی نمائندگی کی تھی۔ سابق کپتان 'کرس گیل' اور نائب کپتان 'ڈوائن براوو' نے سنٹرل کانٹریکٹ کی شرائط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور نتیجتاً کرکٹ بورڈ نے ان کے متبادل کھلاڑیوں کا انتخاب کرلیا۔

کرکٹ کے زوال کا یہ عالم ہو چکا تھا کہ

### آپ ہی کا ہے

ایک وضع دار بزرگ سے ان کے ایک ملاقاتی نے پوچھا ''یہ پیارا بچہ کس کا ہے؟''

وہ بڑے اخلاق سے بولے ''آپ ہی کا ہے جی!''
پاس ہی بچے کی ماں تھی، ملاقاتی نے پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا ''اور یہ کس کی بیگم ہیں؟''

یہاں ان وضع دار بزرگ کے اخلاق حسنہ کا کوٹا ختم ہو گیا۔ ہم نے بھی یہی پوچھا تھا کہ یہ شہر کس کا ہے جو اتنا گندہ رہتا ہے۔ بلدیہ والوں نے ترنت بورڈ لکھوا کے لگا دیا کہ ''آپ ہی کا ہے جی!'' ''اپنے'' شہر کو صاف رکھیے۔ ہم نے خوش ہو کر کہا کہ اچھا تو ہم پانی بھرنے سے چھوٹے یعنی ٹیکس وغیرہ سے چھٹی۔ جواب ملا ''ہشت!''

صاحبداں، خدارا منصفی کرو۔ وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا۔

اقتباس: باتیں انشاجی کی
مرسلہ: شاہدہ بتول، فیصل آباد

جنوری 2004 سے نومبر 2010 کے درمیانی عرصہ میں 62 ٹیسٹ میچز میں ویسٹ انڈیز محض 5 دفعہ کامیابی حاصل کر پایا تھا۔ سری لنکا اپنی سرزمین پر ہمیشہ ہی سے مخالفین کو کڑا مقابلہ دینے میں شہرت کی حامل ہے، اس سیریز میں بھی ان کی آسان فتوحات کی پیش گوئیاں کی جا رہی تھیں مگر خراب موسم کی وجہ سے سیریز کا مکمل انعقاد ممکن نہ ہو سکا، اور 0_0 کے مایوس کن نتیجہ سے بھی وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔

ایک روزہ سیریز میں ویسٹ انڈیز کو شکست ہوئی تھی۔ سیمی کی مجموعی کارکردگی اس بار خود اس کے لیے بھی لمحہ فکریہ تھی۔ بیٹنگ اور باؤلنگ میں ناکامی اس کی پریشانیوں میں اضافہ کر رہی تھیں۔

اپریل اور مئی 2011 میں جزائر غرب الہند میں پاکستان کی آمد ہوئی۔ دو ٹیسٹ میچز کی سیریز کے پہلے میچ میں میزبان ٹیم نے 17 ٹیسٹ مقابلوں میں شکست کے بعد فتح کا امرت چکھا۔ دوسرا میچ مہمان ٹیم نے اپنے نام کر لیا۔ سیمی نے دس وکٹیں اپنے نام کیں۔

اگلے ہی ماہ ڈیرن سیمی کو ''ویسٹ انڈیز پلیئرز ایسوسی ایشن'' کی جانب سے ''بہترین ٹی ٹوئنٹی کھلاڑی'' کے اعزاز سے نواز کر بالآخر اس کی لگن کو سند قبولیت عطا کر ہی دی گئی۔

اس اعزاز نے اس کے تن میں ایک نئی روح پھونک دی اور اس کا جذبہ مزید مہمیز ہو گیا۔

اسی سال بھارت کے دورہ ویسٹ انڈیز میں اس نے اپنے ذاتی کھیل کے لیے مکمل جان لڑا دی۔ ناقدین اور کرکٹ پنڈت اس کی قیادت پر بہت ناخوش تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ڈیرن سیمی کی ٹیم میں بحیثیت کھلاڑی ہی جگہ نہیں بنتی، کجا وہ قائد مقرر کر دیا گیا ہے۔

ناقدین کی اس ہرزہ سرائی کا جواب اس نے اپنی کارکردگی سے دیا۔ بھارت، بنگلہ دیش اور آسٹریلیا کے خلاف اس نے اپنے جنون کو گیند اور بلے کے قالب میں ڈھال کر مخالفین کی زبانوں پر قفل بندی کر دی۔

اکتوبر میں سنٹرل کانٹریکٹس کی تجدید تو کی گئی، سیمی کا نام 'گریڈ B' میں برقرار رکھا گیا۔ کانٹریکٹ کی اس صنف میں اس سمیت محض چار کھلاڑی شامل تھے۔ کرکٹ بورڈ کے سب سے بڑے کانٹریکٹ میں صرف ''شیو نارائن چندر پال'' کو نامزد کیا گیا تھا۔

اگلے برس گوروں کی سرزمین پر اس نے رنز کے انبار لگا کر اپنی پہلی ٹیسٹ سنچری داغی۔ اس لمحہ کے لیے 26 میچز اور چار سال تک انتظار کرنے والے سیمی کی خوشی اس وقت مزید دوبالا ہو گئی جب اس کے آئیڈیل کھلاڑی ''ویوین رچرڈز'' نے اسے کہا۔ ''تمہاری ذات میں یکدم عود آنے والے اس اعتماد کی نئی لہر نے تمہارا کھیل بہت شاندار بنا دیا ہے۔ ایک عظیم قائد وہی ہوتا ہے جو اپنی ٹیم کو مشکل وقت سے نکال کر اس کی درست سمت میں رہنمائی کرے۔ ایک بکھری ہوئی شکست خوردہ ٹیم کے لیے تمہاری کوششیں لاجواب ہیں۔ جیت کا ماحول پیدا کر کے تم نے بلاشبہ اپنا انتخاب بہترین ثابت کیا ہے۔ اس لیے اپنے مستقبل کے بارے میں خوفزدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اپنی انھی کاوشوں کو برقرار رکھو، ناقدین اپنی کوتاہ بینی پر خود شرمسار ہو جائیں گے۔''

ان الفاظ اور حوصلہ افزائی نے اس 'اصیل گھوڑے' کے سموں میں برق دوڑا دی۔ جون اور اگست 2012 کے مابین ہونے والی نیوزی لینڈ کے خلاف ہوم سیریز میں اس نے اپنی ٹیم کی کایا ہی پلٹ دی۔ دو ٹیسٹ، پانچ ایک روزہ اور دو ٹی ٹوئنٹی میچز کی اس سیریز میں سیمی کی ٹیم کو محض تیسرے ایک روزہ میچ میں شکست ہوئی۔ ایک طویل مدت کے بعد اس شاندار کامیابی نے اس کی اہلیت روز روشن کی طرح عیاں کر دی تھی۔ اب تک زمبابوے اور بنگلہ دیش جیسی چھوٹی ٹیموں کے خلاف فتح حاصل کرنے والی اس ٹیم کے لیے وہ وقت یادگار تھا اور رہا ڈیرن سیمی، اس کی نظریں اب ورلڈ ٹی ٹوئنٹی پر تھیں۔ ایک وعدہ تھا جو وفا کرنا تھا۔ ایک قرض تھا جو اسے ادا کرنا تھا۔

☆......☆

2012 میں ہونے والے مختصر ترین فارمیٹ کی میزبانی سری لنکا کے سپرد تھی۔ اس مرتبہ سیمی اپنی ٹیم کی کامیابی کے لیے بہت پُر اعتماد تھا۔ اس کا وجدان اسے 'منزل' کے حصول کی نوید دیتا تھا۔ وہ برملا اس ٹائٹل کی جیت کا اظہار کر چکا تھا۔ کرکٹ کے سنجیدہ حلقے اور پنڈت اسے ''دیوانے کی بڑ'' سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔

سیمی نے اپنے اس دیرینہ خواب کی تکمیل کے لیے اپنے ساتھیوں کی ذہن سازی پر محنت کا آغاز کر دیا۔ منزل کٹھن تھی رستہ دشوار تھا۔ ساتھی کھلاڑی اپنی بے قدری اور عوامی رائے کے دباؤ میں اکثر دباؤ کا شکار رہتے تھے۔ اکثر کھلاڑی اپنے اس جنونی قائد سے مایوسی کے عالم میں ایک ہی بات دہراتے۔ ''ہمارا وجود یہاں بے مول کر دیا گیا ہے، فتح کے مینار پر چڑھائی شاید ہمارے بس کا روگ ہی نہیں۔''

''کیوں نہیں ہے؟ ہم اس قوم کے سپوت ہیں جس نے کئی عشروں تک دنیائے کرکٹ پر تنہا حکمرانی کی ہے، ہم انھی بیجوں کے خمیر ہیں۔ اس لیے مایوسی اور شکست کے الفاظ اپنے ذہنوں سے مکمل طور پر کھرچ دو۔'' سیمی سنجیدگی سے کہتا۔

''ایشیائی وکٹیں ہمارا بہت بڑا امتحان ثابت ہوتی ہیں۔ یہاں کارکردگی بھی قابل ذکر رہی بھی تو نہیں۔'' ایک اور کونے سے مایوس صدا ابھرتی۔

''زندگی کی اس دوڑ میں ہر دن ایک نیا دن ہوتا ہے۔ جو گزر گیا وہ ماضی تھا، جو موجود ہے اس سے استفادہ تمہارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی حیات کی کتاب کے ہر صفحے پر ہم اپنی اہلیت کے مطابق نئی تحریر لکھنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ اس لیے مثبت سوچ سے نئی داستانیں رقم کرنا کوئی مشکل نہیں۔'' اس کے الفاظ ان سبھی پر سحر طاری کرنے لگتے۔ ''فلک کے ستارے بھی ہماری دسترس میں آسکتے ہیں، اگر ہم متحد ہو کر بھرپور حکمت عملی سے ان کے حصول کی

کوشش کریں۔ اتحاد جس قدر کم ہوگا، منزل تک پہنچنے کے امکانات اس سے کہیں زیادہ کم ہونے لگیں گے۔ ایک دوسرے کی صلاحیتوں پر اعتماد رکھو، اپنی ذات کی بجائے اپنی ٹیم اور ملک کے لیے کھیلنا شروع کرو۔ اپنی ذات اور کھیل سے اپنے ساتھیوں کو تقویت دو، کرشمے وقوع پذیر ہونے لگیں گے، فتح آسان سے آسان تر ہوتی چلی جائے گی۔ لوگوں کو کبھی اس بات کا موقع نہ دینا کہ وہ ہماری کمزوریوں سے ہمیں آگاہ کریں، انہیں اس بات سے آگاہی دو کہ جزائر غرب الہند کے سپوت کبھی بھی، کہیں بھی اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ میں اس دفعہ اپنے مداحوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ انہیں وہ خوشی دینا چاہتا ہوں جس کے لیے انہوں نے برسوں انتظار کیا ہے۔''

اس عالمی کپ کے دوران اس کی ذاتی کارکردگی بدستور تنقید کا نشانہ بنتی رہی۔ گروپ میچز سے سیمی فائنل کے درمیانی عرصہ میں اسے چار مرتبہ بیٹنگ کا موقع ملا لیکن وہ صرف 127 سکور ہی بنا پایا۔ باؤلنگ میں 125 رنز کے عوض دو شکار اس کے ہاتھ لگ سکے۔

تنقید کے کوڑے کھاتے اس قسمت گزیدہ کھلاڑی نے فائنل کے سست رن ریٹ میں 15 گیندوں کا سامنا کرتے ہوئے 26 ناقابل شکست رنز بنائے اور بعد میں نازک ترین مواقع پر دو اہم کھلاڑیوں کو آؤٹ کر کے سابقہ تمام حسابات چکتا کر دیے۔

اس عالمی کپ میں سیمی نے اپنے خلوص نیت اور محبت سے کرس گیل، مارلن سیموئلز اور براوو کے بورڈ سے نظریاتی اختلافات کا اثر ٹیم پر نہ ہونے دیا تھا۔ اس کی ساحرانہ قیادت ہی کا نتیجہ تھا کہ ٹیم خاک سے اٹھ کر، مخالفین کو روندتی ہوئی فائنل میں میزبان کو شکست سے دوچار کر کے دیوانوں کی طرح ''گینگنم رقص'' کرتی نظر آئی۔ اس رقص اور جذبے نے کروڑوں لوگوں کے دل ان سیاہ فاموں کی محبت سے لبریز کر دیے۔

سینٹ لوشیائی عوام سے دو برس قبل کیا گیا وعدہ ایفا ہوا۔ جزائر غرب الہند کے سر پر 33 سال بعد عالمی حکمرانی کا تاج سج گیا تھا۔

☆......☆

پیشہ ورانہ زندگی میں کامیابیوں کے ساتھ اس کی ذاتی زندگی میں بھی کئی ایک تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ڈینئل کیتھی نے جب اسے اولاد کی پیدائش کی نوید سنائی تو وہ خوشی سے بے حال ہو گیا تھا۔ بے تابی اور فرط محبت سے رقص کرتے ہوئے اس نے کیتھی کو بانہوں میں لے کر دیوانہ وار گھما دیا۔ ''اس بچے کو ہم وہ تمام آسائشیں دیں گے، جن کی میری زندگی میں کمی رہی ہے۔'' اس نے کیتھی سے کہا۔ ''میں اپنی اولاد کو انہی خطوط پر پروان چڑھانا چاہتا ہوں جو میرے والدین نے ہمارے لیے مقرر کیے تھے۔''

''میں اس امر میں آپ کی تائید کروں گی۔ اور اپنی اولاد کو یقینی طور پر آپ ہی کی طرح بہترین انسان بناؤں گی۔'' کیتھی نے بڑے جذبے اور محبت سے کہا۔

''بچے کی پیدائش تک اپنے سامنے دیوار پر ایک جملہ لکھ رکھو کیتھی!''

''کیا بھلا؟'' کیتھی نے متانت سے استفسار کیا۔

''بچے کی پرورش نہیں، تربیت کی جانی چاہیے۔ اسے ان اقدار سے مالا مال کیا جائے جو بڑھاپے تک اس کا ساتھ نبھاتی رہیں۔''

اپنے جذبات پر وہ کبھی بھی غالب نہ رہ پاتا تھا۔ خوشی، غمی، تفکرات اور سرشاری کی تمام تر کیفیات اس کے چہرے سے واضح منعکس ہوتی تھیں۔ اولاد کی نعمت ملنے کی خوشی بھی 2013 کے آئی پی ایل کے ایک میچ میں اس کے ہر عضو سے چھلک رہی تھی۔ بچوں کے زیر استعمال رہنے والی ''چوسنی'' گلے میں لٹکائے وہ کنگز الیون پنجاب کے خلاف کھیلنے کے لیے میدان میں اترا تو اپنی پروڈکٹ کا جشن وہی چوسنی منہ میں لیے خیالی بچے کو بانہوں میں جھلاتے اور رقص کی صورت میں مناتا رہا۔

ایک طرف جوش وخروش اور جشن کا یہ عالم تھا تو دوسری جانب اعلیٰ ظرفی کا دامن بھی کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا تھا۔

نومبر 2013 میں ممبئی کے وانکھنڈے اسٹیڈیم میں سچن ٹنڈولکر اپنا آخری میچ ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیل رہا تھا۔ بھارتی عوام اور میڈیا کو کامل یقین تھا کہ وہ اپنی آخری اننگز یادگار بناتے ہوئے 101 ویں سنچری ضرور بنائے گا۔ عوامی توقعات اور میڈیا کے دعوؤں کے جواب میں سیمی نے کہا۔ ''میں سچن ٹنڈولکر کو یہ سنچری بنانے نہیں دوں گا بلکہ لاکھوں لوگوں کو رلانے کا موجب بنوں گا۔''

اس کے یہ الفاظ سولہ نومبر کو مجسم ہو گئے۔ وانکھنڈے سچن کے خاندان، رشتہ داروں، سیاست دانوں لاکھوں لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ اس کے ہر سنگل رن پر بھی سب

تماشائی آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ 74 کے اسکور پر سمی نے اس کا کیچ لے لیا۔ اسٹیڈیم میں اسی پل موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ بھارت کی سو کروڑ عوام کے دل بہت بری طرح ٹوٹے تھے۔ لیکن ڈیرن سمی نے اپنے قول کی پابندی پر جشن منانے کی بجائے تعظیمی انداز میں اس عظیم بلے باز کو گراؤنڈ سے الوداع کیا۔

وہ یونہی ہر ایک کے دل میں گھر کر لیا کرتا تھا۔

☆.....☆

اس کی محنت اور قسمت کی ازلی کشمکش نے آئندہ سیریز میں بھی اس کا دامن نہ چھوڑا۔ نومبر 2013 میں بھارت کے خلاف سیریز کے دونوں ٹیسٹ میچ تین دن میں ہی ان کی شکست پر ختم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد نیوزی لینڈ کے خلاف ہونے والی سیریز کا نتیجہ بھی مختلف نہ تھا، دونوں ٹیسٹ میچز کا فیصلہ چار، چار دنوں میں ہی ہو گیا۔

25 ٹیسٹ میچوں میں ٹیم کی قیادت کے بعد اسے آٹھ مرتبہ فتح نصیب ہوئی تو آٹھ ہی میچز میں شکست کی کڑواہٹ نگلنی پڑی تھی۔

دسمبر 2013 میں آخری میچ کھیلنے کے بعد شکستگی کے عالم میں اس نے ٹیسٹ کرکٹ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ کرکٹ بورڈ نے قیادت کا تاج 2014 میں ''دینش رام دین'' کے سر پہ سجا دیا۔

ایک روزہ کرکٹ میں بھی شکست کا آسیب اس کا پیچھا لیے ہوئے تھا۔ عالمی کپ 2015 میں ٹیم کوارٹر فائنل میں نیوزی لینڈ ہی کے ہاتھوں اس ٹورنامنٹ سے باہر ہوئی اور یہی میچ ڈیرن سمی کی ایک روزہ کرکٹ کا بھی آخری پڑاؤ تھا۔

اس نے اب اپنی توجہ مختصر کرکٹ اور اپنے خاندان پر مبذول کر لی تھی۔ وہ خاندانی اقدار کی بے حد پاسداری کرتا تھا۔ والدین، بیوی اور اولاد کے لیے اس کی محبت کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اپنے احباب میں جہاں وہ والدین کی قربانیوں اور اعلیٰ تربیت کو خراج تحسین پیش کرتا، وہیں بیوی کی محبت اور فرض شناسی کو اپنی محبت سے نوازنے میں کبھی بخل نہیں کرتا تھا۔

''میری غیر موجودگی میں وہ میرے خاندان کی مربی ہوتی ہے۔ کسی چٹان کی مانند میرے اہلِ خانہ کی حفاظت کرتی ہے۔ ایسی اطاعت گزار، وفا شعار اور محبت سے لبریز شریکِ حیات ملنا میری خوش نصیبی ہی تو ہے۔''

فراغت کے لمحات میں اہلِ خانہ کے ساتھ سیر و تفریح اور گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنے میں اسے بہت فرحت ملتی۔ کیتھی کے ساتھ کھانے کے برتن دھونے میں بھی اسے ایک رومانیت محسوس ہوتی۔ معمولی چیزوں میں خوشی کے نئے پہلو تلاشنے کا فن بھی اس پر ختم ہے۔

ٹی ٹوئنٹی کرکٹ کے لیے بھرپور محنت اور تینوں بچوں کے ساتھ گزرتے وقت میں وہ اپنی ازلی کشمکش فراموش کر چکا تھا۔ زندگی میں در آنے والی ٹھہراؤ کی اس کیفیت کی اسے عادت ہونے لگی تھی اور تقدیر وہیں قریب ہی اس کی ان نادانیوں پر خندہ زن اپنے ترکش کے نئے تیر سنبھالے کھڑی تھی لیکن وہ بے خبر تھا۔

☆.....☆

2016 کے آغاز میں وہ پاکستان سپر لیگ میں مصروف تھا۔ غرب الہند کے کھلاڑیوں کی غیر ملکی کرکٹ لیگز میں شمولیت کوئی نئی یا انوکھی بات نہ تھی۔ اپنے معاشی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ان راہوں کی مسافت ان کے لیے کس قدر ضروری تھی، یہ سیر شکم اور متعصب سفید فام جانتے ہوئے بھی انجان بن کر انہیں اذیت دینے کا ایک گھناؤنا منصوبہ تیار کیے بیٹھے تھے۔

بھارت، انگلستان، آسٹریلیا اور بنگلہ دیش کی کرکٹ لیگز کے بعد پاکستان سپر لیگ میں بھی کئی ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کی کارکردگی لاجواب رہی تھی۔ سمی اس لیگ میں 'پشاور زلمی' کا حصہ تھا۔ 23 فروری کو ہونے والے فائنل کے بعد وہ سبھی بہت مطمئن و سرشار تھے۔ پاکستانی عوام کی جانب سے ملنے والی محبت اور پذیرائی ان کے لیے ایک یادگار تجربہ تھی۔ اب نظریں مارچ میں ہونے والے چھٹے عالمی کپ کی تیاری پر مرکوز تھیں، جب مارک نکولس کے ایک ذاتی بیان نے ان کے قلب اور روح پر نشتر زنی کر ڈالی۔

مارک نکولس ایک سابق انگلش کرکٹر اور کمنٹیٹر تھا جس نے ایک بین الاقوامی ویب سائٹ پر اپنے ایک کالم میں سیاہ فام کرکٹرز کی ہرزہ سرائی کرتے ہوئے لکھا۔ ''یوں تو ویسٹ انڈین کھلاڑی دماغ اور عقل سے کلی طور پر محروم ہیں، تاہم آئی۔ پی۔ ایل میں ملنے والا نفع ان کی صفیں درست کر دیتا ہے۔ یہ کرائے کے وہ سپاہی ہیں جو ذرا سی مالی منفعت کے لیے اپنا وجود پرائی آگ میں جھونک دیتے ہیں۔''

یہ الفاظ کسی نیزے کی انی کی مانند ان کے دلوں میں گڑ گئے تھے۔ ایک آتشیں لہر تھی جس نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ عالمی کپ کے لیے بھارت روانگی سے قبل

اپنے کھلاڑیوں کے ساتھ ایک میٹنگ میں ڈیرن کے جذبات بے قابو ہو رہے تھے۔ ''اس جیت کے لیے اپنے وجود کی قربانی بھی دینی پڑے تو سودا مہنگا نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو! ہمارے قومی وقار کی جس طرح دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔ صرف فتح ہی ہمارا وقار بحال کر سکتی ہے۔'' ایک ساتھی نے کہا۔

''حیوانات کو بھی قدرت نے دماغ ودیعت کیے ہیں، کیا ہمیں جانوروں سے بھی بدتر تسلیم کر لیا گیا ہے؟ انسانیت کے درجے سے ہمیں خارج کر دیا گیا ہے؟'' دوسرا ساتھی کہنے لگا۔

''یہ کھیل نہیں، اب بقا کی جنگ ہوگی۔ بھول جاؤ کہ ہمارے کرکٹ بورڈ سے کیا اختلافات ہیں۔ یہ بھی بھول جاؤ کہ ہمارے وسائل جمود کا شکار ہیں۔ صرف ایک بات یاد رکھو۔ جزائر غرب الہند کی عزت داؤ پر لگی ہے اگر شکست تسلیم کی تو ہماری قوم پر لگنے والی یہ تہمت امر ہو جائے گی۔'' ڈیرن نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

اور پھر اس کی وہ پندرہ رکنی ٹیم اپنے تمام تر گلے شکوے پس پشت ڈالے جنگجوؤں کی مانند فتح کے لیے مخالفین پر ٹوٹ پڑی۔ سیمی فائنل میں ٹورنامنٹ کے میزبان اور ٹائٹل کی سب سے بڑے دعویدار بھارت کو ناقابلِ یقین شکست سے دوچار کیا۔ اس کے بعد فائنل میں انگلستان سے یقینی فتح چھین کر انہوں نے عالمی حکمرانی کی وہ جنگ جیت کر اپنا قومی وقار بحال کر لیا تھا۔

سیمی اس لمحے کا شدت سے منتظر تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک کھولتا ہوا لاوا تھا جسے اپنے اخراج کی راہ درکار تھی۔ اس میچ کے بعد ہونے والی آفیشل گفتگو میں ساری دنیا نے ان پر بیتنے والی افتاد کا کرب اس کے الفاظ میں محسوس کیا تھا۔ اپنا قومی پرچم تن پہ لپیٹے وہ بلاتکان بولتا چلا جا رہا تھا:

''میں خداوند کا شکر گزار ہوں جس کی رحمت اور خصوصی کرم کے بنا کچھ بھی ممکن نہیں۔ ہماری ٹیم میں آندرے فلیچر کے روپ میں ایک پادری بھی موجود ہے، جو ہر وقت سب کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ میں اس فتح پر بہت مسرور ہوں، کیونکہ یہ وہ فتح ہے جس کا جشن ہم مدتوں تک منائیں گے۔

میرے پاس 15 بہترین ساتھی موجود تھے۔ ہر ایک دوسرے سے ممتاز اور منفرد۔ ہر ایک نے اپنی ذمہ داریوں کا بار اٹھایا۔ کارلوس بریتھ ویٹ نے اپنے پہلے عالمی کپ میں جو کارکردگی دکھائی ہے، ناقابل فراموش ہے۔ اس کی یہاں موجودگی ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے ملک میں ذہانت کی کوئی کمی نہیں۔ مجھے امید ہے کہ بہتر حکمت عملیوں اور بنیادی ڈھانچے میں تبدیلیوں سے ایک دن ہماری ٹیسٹ اور ایک روزہ کرکٹ بھی اپنا کھویا ہوا مقام ضرور حاصل کر لے گی۔

ہم نے جس طرح اپنے اس سفر کا آغاز کیا تھا، اس کے حقائق سے صرف ہم ہی واقف ہیں۔ کئی لوگوں کو اس امر پر بھی تحفظات تھے آیا کہ ہم یہ ٹورنامنٹ کھیلنے آ بھی پائیں گے یا نہیں؟ ہمیں بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔ ہمارے اپنے کرکٹ بورڈ نے ہماری تذلیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مارک نکولس نے ہمیں عقل و دماغ سے عاری مخلوق قرار دے دیا۔ اور یہی سب عوامل تھے جس نے ہمیں پھر سے متحد کر دیا۔ میں اپنے ان پندرہ ساتھیوں کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے بھی اختلافات ایک طرف دھر کر اپنے ملک اور شائقین کے لیے بہترین کرکٹ کھیلی۔

میں ذاتی طور پر اپنے کوچنگ اسٹاف کا بہت شکر گزار ہوں جنھوں نے ہمارے لیے بہت محنت کی۔ اس ٹورنامنٹ میں ہمارے نئے منیجر ''راول لیوکس'' کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ اس سے قبل اُس نے کبھی کوئی ٹورنامنٹ منظم نہیں کیا تھا۔ جب وہ ہمارے پاس پہلی دفعہ آیا تو ہم دبئی کے ایک کیمپ میں تھے۔ ہمارے پاس یونیفارم تھے نہ ہی دیگر سامان۔ وہ دبئی سے کولکتہ گیا اور ہمیں تمام لوازمات مہیا کیے۔ میں اپنی مکمل ٹیم کو خصوصی مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ فتح ہمارے آبائی علاقوں کے تمام شائقین کے لیے بہت اہم ہے۔

ہمارے وزیراعظم نے آج صبح ٹیم کے لیے ایک ای میل بھیجی جو بھی کھلاڑیوں کے لیے بہت حوصلہ افزا تھی۔ مجھے ذاتی طور پر کرکٹ بورڈ کے ردعمل کا بہت انتظار تھا۔ کسی نے بھی ہمیں اپنی نیک خواہشات کے لیے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ میری مایوسی اس وقت ناقابل بیان ہے۔

آج اس جیت کا جشن میں دل کھول کر اپنے ان پندرہ ساتھیوں اور کوچنگ اسٹاف کے ساتھ مناؤں گا۔ کون جانے ہم دوبارہ کب ساتھ کھیل پائیں گے؟ کیونکہ ہمیں ایک روزہ کرکٹ کے لیے منتخب ہی نہیں کیا جاتا۔ اس لیے اے میرے ساتھیو!! تم سبھی کا بہت شکریہ۔ اب ہر کوئی باعلم

ہے کہ جزائر غرب الہند فاتح ہے۔"

☆......☆

سیمی اپنی اس جذباتی تقریر کے بعد ذہنی طور پر بہت پُر سکون تھا۔ اپنی قوم کی ہزیمت اور ناقدری کا جواب بھی ناقدین کے لیے ایک بھرپور طمانچہ تھا۔ اس کا وجدان اسے کچھ ممکنہ خطرات سے بھی آگاہ کر رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ جو حقائق اس نے طشت از بام کیے تھے ان کی کڑواہٹ انا پرستوں اور فرعونیت کے زعم میں مبتلا عہدیداران کو بہت ایذا دے گی۔ اس بار مقابل بچپن کے ساتھی نہ تھے جو اس کی سچائی کو برداشت کیے اپنے دل صاف کر کے سب گلے شکوے مٹا کر بغلگیر ہو جاتے بلکہ مقابل اقتدار کے نشے میں چور تھے جنھیں ذاتی انا اور ضد ملکی وقار سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

اس کے بیچ کی گونج جلد ہی منظر عام پر آ گئی۔ اگست میں سیمی کو بورڈ کی طرف سے بمشکل آدھے منٹ کی ایک فون کال آئی۔ سلیکشن کمیٹی کے چیئرمین نے بدلحاظی اور تنفر سے اسے مخاطب ہو کر کہا۔ "بورڈ نے قیادت کے لیے اپنی پالیسیوں پر از سر نو غور کیا ہے جس کی رو سے تم کپتانی تو درکنار، ٹیم میں بھی رہنے کے اہل نہیں ہو۔ تمھاری کارکردگی ہمارے معیار پر پوری نہیں اترتی۔"

سیمی اس ذلت پر سناٹوں کی زد میں تھا۔ عالمی کپ کی فتح کے لیے فائنل میں اس کی کارکردگی معمولی ہی تھی۔ وہ صرف آٹھ رنز اور ایک وکٹ ہی حاصل کر پایا تھا۔ لیکن چھ سال پہلے اسے جس انتشار زدہ ٹیم کی قیادت سونپی گئی تھی اس کی تعمیر نو اس کے لیے ایک بہت بڑی للکار تھی۔ اس ملک اور ٹیم کے لیے اس نے بے حد و بے حساب کوششیں کیں۔ 5 سال میں دو بار اپنی ٹیم کو 'ورلڈ چیمپین' بنایا تھا اور جواب میں ملی اس رسوائی نے اس کی ساری جدوجہد پل بھر میں بے مول کر دی تھی۔ قسمت کا یہ آخری وار بھرپور تھا۔

☆......☆

تین ماہ گذر چکے تھے۔

سیمی کے اہلخانہ اور کیتھی نے اس کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ لیکن احساس توہین کے وہ زخم مندمل ہونے میں ہی نہ آ رہے تھے۔ اس نے بظاہر اپنی ذات کو دیگر معمولات میں مصروف کر لیا تھا لیکن دل کا ایک کونہ ابھی بھی اداس و خاموشی کے لبادے میں لپٹا رہتا تھا۔

پاکستان سپر لیگ کی جانب سے اسے کھلاڑیوں کی نیلامی کی تقریب میں مدعو کیا گیا۔ بحیثیت کھلاڑی اسے پشاور زلمی ہی میں برقرار رکھا گیا تھا۔

پاکستانی قوم کی جانب سے ملنے والی محبت اور پذیرائی کا وہ ہمیشہ ہی قائل رہا تھا۔ پشاور زلمی فرنچائز کے مالک جاوید آفریدی کے ساتھ اس نے بنیادی پشتو سیکھنے کے بعد اپنے ٹوئٹر اکاؤنٹ پر اس کا استعمال جاری رکھا ہوا تھا۔

جاوید نے حکومت پاکستان سے خصوصی التجا کر رکھی تھی کہ ڈیرن سیمی کو پاکستان کی اعزازی شہریت سے نواز کر "سیمی خان" کا مقام دیا جائے لیکن اس بار ایک اور خوشگوار حیرت اس کی منتظر تھی۔

"جاوید آفریدی" اور زلمی کپتان "شاہد آفریدی" اس کے ساتھ اسٹیج پر موجود تھے۔ شاہد آفریدی نے اسے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اس سال میری ٹیم پشاور زلمی کی قیادت آپ کریں!!! یہ اب آپ کی ٹیم ہے۔ مجھے علم ہے کہ بورڈ نے آپ کو اس عزت سے نہیں نوازا جو ایک چیمپین اور ایک فاتح کی شایان شان تھی۔ مجھے چیمپین کی بھرپور قدر ہے۔ میری ٹیم اب آپ کے سپرد ہے۔"

کرکٹ بورڈ کے اس فعل کے تذکرے پر سیمی کی آنکھوں اور چہرے پر پل بھر میں چھاتے والی اذیت بہت واضح تھی لیکن ان نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بہت وقار سے کہا۔ "ڈیرہ ڈیرہ مننہ لالہ!!"

یہ ٹیم آپ ہی کی رہے گی۔ اس عزت افزائی پر میں آپ دونوں حضرات کا بہت مشکور ہوں۔"

اس رات کیتھی کو فون پر اس سارے واقعہ کی خبر گوش گزاری تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "میں نہ کہتی تھی کہ آپ عزت و احترام کے حقدار ہیں۔ آپ کا خلوص ضرور معتبر ٹھہرے گا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو کیتھی!!! لیکن جب اپنے گھر میں ہی عزت چھین لی جائے، تو بیرونی دنیا سے ملنے والے احترام کے انبار بھی دل پہ لگے ان زخموں کی کسک مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتے۔"

"یہ تشنگی بھی جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ وہ وقت دور نہیں۔ ہمارے اپنوں کو بھی آپ کی قدر ضرور ہو گی ایک دن۔" کیتھی پر یقین تھی۔

"ہاں!! مجھے بھی اُمید ہے کہ میری جدوجہد رائیگاں نہیں جائے گی۔ اسے ضرور تسلیم کیا جائے گا۔" سیمی نے ایک عزم نو سے کہا۔

وقت کی بساط پر وہ ایک نئی جنگ کے لیے پھر سے تیار تھا۔

# فروری کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے پہلے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے

فروری آیا اور ساتھ اپنے جاڑا لایا۔

موسم خاصا بدل گیا ہے۔ کمبل اور لحاف نکل آئے، خشک میوہ جات مزہ دینے لگے۔ چائے اور کافی کا استعمال بڑھ گیا۔ اس بار سردی کیا آئی، مری سے استنبول تک کتنے ہی شہر برف سے ڈھک گئے۔ یورپ میں بھی ریکارڈ سردی پڑی۔

اس موسم سے رومان بھی جڑا ہے اور قدرت کا حسن بھی، لیکن اگر احتیاط نہ کی جائے تو نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ سردیوں سے لطف اندوز ہونے کا صحیح طریقہ یہی کہ صحت کا مکمل خیال رکھا جائے۔

قارئین، فروری گریگورین سال کا دوسرا مہینا ہے۔ شمالی نصف کرہ میں اس ماہ سردی کا موسم ہوتا ہے، جنوبی نصف کرہ میں گرمیوں کا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ فروری قدیم زمانے میں سال کا آخری مہینا ہوا کرتا تھا۔ اس میں سال کے باقی بچ جانے والے دن رکھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے اس میں دنوں کی تعداد نسبتاً کم، یعنی 28 ہوتی ہے۔ یعنی دیگر مہینوں سے کم۔ چار سال بعد لیپ ایئر آتا ہے۔

اس ماہ کا نام فروری کیسے پڑا؟ اس کے لیے ہمیں قدیم روم میں جھانکنا ہوگا۔ وہاں سال کے آخر میں ایک میلہ ہوتا تھا، جس میں شہری اپنی روحانی صفائی کے لیے مذہبی رسومات ادا کرتے۔ یہ عمل februm کہلاتا تھا۔ اسی نسبت سے یہ فروری ٹھہرا۔

آئیں، اب اس ماہ کی نامور شخصیات پر نظر ڈال لیں۔

## ☆ شفقت امانت علی

وہ باکمال گلوکار ہیں۔ سروں پر اُن کی گرفت حیران کن۔ آج کے دور میں ان جیسی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان کی جادوئی آواز نے کرن جوہر جیسے بڑے ہدایت کاروں کو گرویدہ بنالیا تھا۔ وہ ان کی سمت کھنچے چلے آئے۔ بالی ووڈ میں اُن کا پہلا ہی گیت چارٹ بسٹر ثابت ہوا۔ ہر کوئی اسے گنگناتا نظر آتا۔ بعد میں ہندوستانی فلموں کے لیے کئی یادگار گیت گائے۔ یعنی وہ وہاں کے ماحول سے خوب ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ شومئی قسمت، اُن کی زندگی کا سب سے بدترین واقعہ بھی ہندوستان ہی میں پیش آیا۔ اور وہ بھی ایسے موقع پر، جب کروڑوں لوگوں کی ان پر نظریں ٹکی تھیں۔

ٹی 20 ورلڈ کپ میں پاک بھارت میچ کی افتتاحی تقریب میں جب شفقت امانت علی کو قومی ترانہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا، تو یہ بڑی حد تک متوقع تھا۔ وہ ایک بین الاقوامی آرٹسٹ تھے۔ پاکستانیوں کے ساتھ ہندوستانی بھی ان

کے مداح تھے۔ پھر فن گائیکی پر انہیں خوب گرفت تھی، مگر وہ دن شفقت کے لیے اچھا نہیں تھا۔ ان کا فن تکنیکی معاملات میں الجھ گیا۔ کان میں نصب مائیک اور وہاں کے آرکسٹرا میں جب ہم آہنگی نہیں رہی، تو وہ بے چین ہوگئے۔ پہلے قومی ترانے کا ایک مصرعہ غلط پڑھ گئے۔ پھر ایسا بدبخت لمحہ بھی آیا، جب وہ قومی ترانہ ہی بھول گئے۔ اتنی بڑی تقریب میں ایسی غفلت کے نتائج تو سامنے آنے تھے، پھر پاکستان وہ میچ بھی ہار گیا۔ جب احتساب کا نعرہ لگا، تو شفقت کی بھی خوب درگت بنی۔ اور ایسا بے سبب نہیں تھا۔ پاکستان آرٹسٹ کہیں اور غلطی کرے، تو رعایت کی جاسکتی ہے مگر وہ ہندوستان میں چوک گیا۔ پھر غلطی بھی کیسی؟ اپنا قومی ترانہ ہی غلط پڑھ گیا۔ شفقت پر کڑی تنقید ہوئی۔ ہر ٹی وی چینل پر ان کا مذاق اڑایا گیا۔ وہ ولن بن گئے۔ گو بعد میں انھوں نے کچھ وضاحتیں دی۔ تکنیکی مسائل کی نشان دہی مگر بات نہیں بنی۔ یوں ایک شان دار گلوکار ایک قومی سطح کے معاملے میں الجھ کر اپنے شان دار کیریر پر داغ لگا بیٹھا۔

البتہ اگر ہم کچھ دیر کو اس واقعے کو بھول جائیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ایک شان دار فنکار ہیں جنہوں نے کلاسیکی اور جدید موسیقی کے امتزاج سے سامعین کے دل جیت لیے تھے اور بین الاقوامی سطح پر خود کو منوایا۔ جب جب مائیک پر آئے، علم موسیقی سے بھرپور انصاف کیا۔ اپنی اسی قابلیت کے وسیلے وہ فیوژن جیسے مشکل فن کو جس پر کلاسیکی فنکاروں کے شدید تحفظات رہے ہیں، ایمان داری سے نبھا سکے۔ ویسے ان کا یہ کارنامہ قطعی حیران کن نہیں۔ وہ برصغیر کے ممتاز کلاکار استاد امانت علی کے سپوت ہیں۔ پٹیالے گھرانے سے تعلق ہے۔ سمجھ لیجیے جیسا باپ تھا، ویسا ہی بیٹا ہے۔ (جنوری کے اوائل میں اسی گھرانے کے ایک اور شان دار فن کار استاد فتح علی خان ہم سے جدا ہوئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے)

شفقت کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈال لیتے ہیں۔ وہ 26 فروری 1965 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پٹیالہ گھرانے کی نویں پیڑی سے ان کا تعلق ہے۔ پہلے باپ کے زیر سایہ رہے۔ پھر دیگر بزرگوں سے تربیت حاصل کی۔ اس وقت بھی چلن تھا کہ بچہ تمام سُر بڑوں سے سیکھتا۔ ان ہی کے ساتھ محافل میں جانا شروع کیا۔ اٹھنے بیٹھنے کے آداب سیکھے۔ کلاسیکی کی بنیادی تربیت کے ساتھ جدید سازوں پر بھی یکساں توجہ دی۔ پڑھائی سے بھی غفلت نہیں برتی۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور سے انھوں نے گریجویشن کیا۔ وہاں کی میوزک سوسائٹی کا حصہ رہے۔ مختلف بینڈز سے وابستہ رہے مگر جب ہم خیال دوست ملے، تو "فیوژن" نامی بینڈ بنایا۔ اس کے پیچھے یہی خیال تھا کہ ایک طرف شفقت ہیں جو کلاسیکی گھرانے سے ہیں، دوسری طرف جدید ساز ہوں گے۔ خوب رنگ جمے گا۔

ان کی پہلی ویڈیو "آنکھوں کے ساگر" نے سب کو متوجہ کرلیا۔ ہر جگہ اس بینڈ کا چرچا ہونے لگا۔ اگلی میوزک ویڈیو "انکھیاں" کو بھی بہت مقبولیت ملی۔ البم مارکیٹ میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اسی عرصے میں "کھماج" کی ویڈیو منظر عام پر آئی۔ گانا تو پہلے ہی مقبول تھا مگر اس کی متاثر کن ویڈیو نے لوگوں کو گرویدہ بنالیا۔ یوں لگتا ہے کہ آپ ایک شان دار فلم دیکھ رہے ہیں۔ اس ویڈیو کے ڈائریکٹر ثاقب ملک کو بھی خوب سراہا گیا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اس بینڈ کا مستقبل روشن ہے مگر پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ بینڈ کا کوئی ایک شخص توجہ کا مرکز بن جاتا ہے، باقی پس پردہ چلے جاتے ہیں اور یہاں سے اختلافات شروع ہوتے ہیں۔

فیوژن اور ان کا ساتھ 2006 میں تمام ہوا۔ اب انھوں نے سولو کیریر شروع کیا۔ پہلے پہل خیال تھا کہ شاید وہ زیادہ کامیابی حاصل نہ کرسکیں کہ ان کا بیک گراؤنڈ کلاسیکی موسیقی کا تھا مگر شفقت نے اپنے مخالفین کو غلط ثابت کردیا۔ 2008 میں "تعبیر" کے نام سے آنے والے البم کو خاصا پسند کیا گیا، جس میں فوک اور صوفی رنگ شامل تھے۔

اب بات ہوجائے ہندوستانی فلم انڈسٹری سے وابستگی کی، جہاں شفقت نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ ہوا یوں کہ ایک بار ہندوستانی موسیقار شنکر نے کسی ریڈیو اسٹیشن پر فیوژن کا گیت "آنکھوں کے ساگر" سنا۔ انہیں شفقت کی آواز بہت بھائی۔ وہ سنگر کی تلاش میں نکل پڑے اور انہیں پاکر ہی دم لیا۔ جب انھوں نے کرن جوہر سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ بھی شفقت کی آواز سے بڑے متاثر ہوئے۔ انھوں نے فلم "کبھی الوداع نہ کہنا" کا ڈول ڈالا، تو اس کا سب سے پرسوز گیت "متوا" شفقت ہی کی آواز میں ریکارڈ کیا۔ کرن جوہر کا

یہ جوا کامیاب رہا۔ گانا راتوں رات ہٹ ہوگیا۔ شاہ رخ خان پر فلمائے جانے والے اس گیت نے شفقت کو ایک اسٹار بنا دیا۔ اب فلم ''ڈور'' میں ان کی آواز سنائی دی۔ مائی نیم از خان'' کے لیے ''تیرے نینا'' گایا، تب وہ اپنے فن کی بلندی پر دکھائی دیے۔ 2011 میں انھوں نے فلم ''را۔ون'' کا گیت ''دل دارہ'' گا کر خوب داد سمیٹی۔ سمجھ لیجیے کہ وہ بالی ووڈ کا حصہ بن گئے تھے۔ ان کے پاس کئی آفرز تھیں۔ انھیں لمبی ریس کا گھوڑا قرار دیا جارہا تھا، مگر پھر منظر میں نریندر مودی کی آمد ہوئی اور حالات بدلنے لگے۔ انتہاپسندی کو فروغ ملا، قوم پرستی کا پرچم لہرایا گیا۔ نفرت کا نزلہ پاکستانی فنکاروں پر گرا۔ فواد خان، ماہرہ خان، علی ظفر، شفقت امانت علی اور راحت فتح علی خان کے گرد گھیرا تنگ ہونے لگا۔ فلم سازوں کو انتہاپسند تنظیموں کی دھمکیاں ملنے لگیں۔ مجبوراً انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ بالی ووڈ سے پاکستانی فنکاروں کا رشتہ منقطع ہوگیا۔

موجودہ حالات میں اگر کہا جائے کہ شفقت مشکل دور سے گزر رہے ہیں، تو غلط نہیں ہوگا۔ کہاں وہ شاہ رخ کی آواز بن گئے تھے، عالمی شہرت ان کے حصے میں آئی اور کہاں اب وہ پاکستانی پاپ انڈسٹری تک محدود ہوگئے ہیں، شہرت دھیرے دھیرے دم توڑ رہی ہے۔ نہ تو البم ریلیز ہوتے ہیں، نہ ہی میوزک ویڈیوز بنائی جاتی ہیں۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ سیاہ، دبیز بادلوں کے پیچھے آج بھی سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ آج نہیں تو کل، شفقت بھرپور کم بیک کریں گے اور انڈسٹری پر چھا جائیں گے۔

## ☆ طاہر القادری

ایسا منظر بھلا کس نے دیکھا ہوگا کہ ایک مذہبی مبلغ کنٹینر میں سوار ہو کر انقلاب کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے ہزاروں پیروکاروں کے ساتھ ملک کے دارالحکومت پہنچے اور وہاں دھرنا دے کر بیٹھ جائے۔ یہ مطالبہ کردے کہ جب تک وزیراعظم استعفیٰ نہیں دیتا، وہ وہیں بیٹھے رہیں گے... کڑاکے کی سردی ہو، آسمان برسے، آندھی یا طوفان آئے مگر وہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ وہاں ڈٹے رہے۔ زور شور سے گھنٹوں پر محیط تقاریر کرے۔ ایسا خطاب کہ سامعین پر رقت طاری کردے۔ ملک بھر کا میڈیا اس تقریر کی لائیو کوریج کرے۔ تناؤ بڑھے۔ ملکی حالات بگڑ جائیں۔ نظام لپیٹے جانے کے اندیشے بڑھنے لگیں۔ سیاسی جماعتیں بھی اس سے آن ملیں۔ بالآخر معاملات ہاتھ سے نکل جائیں۔ اس کے حامی سرکاری ٹیلی وژن پر قبضہ کرلیں... ایک روز پارلیمنٹ پر چڑھائی کردی جائے... مگر وزیراعظم استعفیٰ نہ دے۔ کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ جمہوریت پر شب خون مارنے کا منصوبہ ناکام ہوجائے۔ بالآخر گرجتے برستے دعوے کرنے والا وہ شخص فلائیٹ پکڑ کر بیرونِ ملک چلا جائے۔

ڈاکٹر طاہر القادری نہ صرف پاکستان، بلکہ عالم اسلام کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ پاکستان کے ساتھ ہندوستان میں بھی ان کے لاکھوں مرید ہیں۔ ان کی تنظیم تحریک منہاج القرآن کا شمار ملک کی منظم ترین تنظیموں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بین المذاہب مکالمے کے لیے بڑے پیمانے پر علمی و تحقیقی کام کیا۔ اسی وجہ سے مغرب میں بھی شناخت حاصل ہوئی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مغرب کے لیے اسلام کا معتدل چہرہ ہیں۔ انھوں نے خودکش حملوں کے خلاف فتوے دیے۔ دہشت گردوں پر کڑی تنقید کی۔ گذشتہ کچھ برس سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔ ان کا پیغام عالمی حیثیت اختیار کر گیا تھا مگر 2014 میں جب وہ انقلاب کے نعرے کے ساتھ میدان میں داخل ہوئے، تو ان کی حیثیت متنازع ہوگئی۔ آج جب ان کا نام لیا جاتا ہے، تو ذہن میں ان کے وہ دعوے اور وعدے گھومنے لگتے ہیں، جو پورے نہیں ہوسکے۔ یوں لگتا ہے کہ آنے والے چند عشروں میں انھیں نواز حکومت کے خلاف دیے جانے والے دھرنے ہی کی وجہ سے یاد کیا جائے گا۔ سیاست... جو کبھی اُن کا ثانوی حوالہ تھا، اب پہلا حوالہ بن چکا ہے۔

کیوں ناں کچھ دیر ٹھہر کر ان کے حالات زندگی پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ پاکستان کے یہ معروف اسکالر 19 فروری 1951 کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈاکٹر فرید الدین قادری معروف عالم دین تھے۔ اجداد سیال تھے۔ اسکول اور مدرسے کی تعلیم ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ وہ انقلابی فکر کے حامل تھے۔ امام غزالی، شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی، مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر کا جم کر مطالعہ کیا۔ کارل مارکس، فریڈرک اینجلس، لینن، اور ماؤزے تنگ کے افکار نے بھی انھیں متاثر کیا۔ وہ

تحریک کی اہمیت کے قائل ہوگئے۔ جدوجہد کرنے کو تیار تھے۔ 1971 میں انہیں معروف مفکر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی صحبت ملی، جس نے ان کی دینی نقطۂ نگاہ سے ذہن سازی کی۔ روحانیت میں درک رکھتے تھے۔ شیخ سید طاہر علاؤالدین القادری الگیلانی کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔

جدوجہد کا آغاز 1976 میں جھنگ میں قائم ہونے والی تنظیم محاذ حریت سے کیا۔ تنظیم میں انہیں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ جلد انھوں نے اسے تحریک منہاج القرآن کا نام دے دیا گیا۔ اوائل میں وہ ہمیں مذہبی اور سماجی محاذ پر مصروف نظر آئے۔ یوں لگتا تھا کہ اس میدان وہ اپنی کل صلاحیتیں صرف کر دیں گے۔ ان کی کوششوں کے نتائج بھی سامنے آنے لگے۔ منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن کے تحت انھوں نے تعلیمی اور طبی میدان میں گراں قدر منصوبوں کا آغاز کیا۔ منہاج یونیورسٹی قائم کی۔ ان ہی خدمات کے پیش نظر انھیں 1994 میں چکوال کے معروف بزرگ سید رسول شاہ خاکی نے شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔ اس دوران تصنیف و تالیف اور درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈاکٹر طاہر القادری پنجاب یونیورسٹی لاہور میں لیکچر دیتے رہے۔ وہ فیڈرل منسٹری آف ایجوکیشن کے رکن رہے۔ پی ٹی وی کے پروگرام "فہم القرآن" نے بھی ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی خدمات بے پناہ ہیں۔ 1995 میں انھوں نے عوامی تعلیمی منصوبہ کی بنیاد رکھی، جسے کچھ حلقے غیر سرکاری سطح پر ایشیا کے چند بڑے تعلیمی منصوبہ میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے تحت پاکستان میں 572 ادارے قائم ہیں۔

دھیرے دھیرے انہیں احساس ہونے لگا کہ پاکستان میں دیرپا تبدیلی کے لیے فرد کا سیاست میں آنا ضروری ہے۔ تبدیلی لانے کے لیے اختیار و اقتدار لازمی ہے۔ سو انھوں نے پاکستان عوامی تحریک نامی تنظیم قائم کی اور سیاست میں قدم رکھ دیا۔ الیکشن لڑا، کامیابی بھی حاصل کی۔ مگر جلد اس سے اکتا گئے اور بیرون ملک چلے گئے۔

کسی زمانے میں وہ پنجاب کے ابھرتے ہوئے لیڈر میاں نواز شریف کے بے حد قریب آگئے تھے۔ نواز شریف کی اتفاق مسجد میں انہیں خطیب مقرر کیا گیا۔ میاں صاحب ان کے معتقد تھے۔ اس عقیدت کے قصے بعد میں طاہر القادری نے بیان بھی کیے۔ میاں صاحب کی جانب سے کبھی ان کی تردید نہیں کی گئی۔ حالات تیزی سے بدلے۔ جو سیاست داں ان کی مذہبی فکر سے متاثر تھا، جب وہ ملک کا طاقتور ترین آدمی بنا، تب تک طاہر القادری اور ان میں فاصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ اور جب 2014 میں وہ انقلاب کا نعرہ لیے میدان میں اترے، تب ان کا مقابلہ میاں صاحب ہی سے تھا۔ اُنھوں نے ماڈل ٹاؤن میں اپنے پیروکاروں کے قتل کا الزام بھی ن لیگ پر عاید کیا۔

اس وقت طاہر القادری بیرون ملک ہیں۔ وقفے وقفے سے ان کی جانب سے پاکستان آنے اور ایک اور تحریک چلانے کے بیانات آتے رہتے ہیں۔ گذشتہ دھرنے میں وہ عمران خان کے ساتھ تھے، مگر بعد میں ان میں فاصلے پیدا ہوگئے۔ عمران خان اُن کے منظر سے غائب ہونے کے بعد بھی دھرنے پر بیٹھے رہے۔ سانحۂ پشاور کے بعد انھوں نے دھرنا ختم کیا تھا۔ جب تحریک انصاف نے گذشتہ برس نومبر میں دھرنا پلس کا اعلان کیا اور حکومت کے خلاف ایک اور تحریک منظم ہونے لگی، تب تجزیہ کاروں کو توقع تھی کہ عمران اور طاہر القادری پھر ساتھ دکھائی دیں گے۔ اس ضمن میں شیخ رشید نے خاصی کوششیں کیں مگر یہ ہو نہیں سکا۔ دونوں قائدین میں فاصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ پھر حالات کچھ اس نوع کے ہوگئے کہ پاناما کیس عدالت میں چلا گیا اور عمران خان نے دھرنا منسوخ کر دیا۔ اس وقت قادری صاحب خاموش ہیں، مگر اس بات کا قوی امکان ہے کہ اگلا الیکشن قریب آتے ہی وہ پھر ایکشن میں نظر آئیں گے۔ ہمیں پھر انقلاب کا نعرہ سنائی دے گا۔ ممکن ہے، اس بار احتجاج کے بجائے وہ سیاست کے میدان میں زیادہ موثر کردار ادا کریں اور کسی حکومت مخالف اتحاد میں نظر آئیں۔

## ☆ شعیب ملک

پاکستانی کرکٹ کی تاریخ عجیب ہے۔ جو آج ہیرو ہے، وہ کل زیرو بن جاتا ہے۔ جسے آج سر پر بٹھایا جاتا ہے، کل اُسے اٹھا کر ٹیم سے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ چلیں، اگر کارکردگی کی بنیاد پر ایسا کیا جائے، پرفارمینس میں گراوٹ اس کی وجہ ٹھہرے، تو سمجھ میں آتا ہے، مگر یہاں معاملہ دیگر ہے، کارکردگی کے

بجائے پسند ناپسند کی بنیاد پر آپ کو ٹیم سے باہر کیا جاتا ہے۔ اور اگر آپ کے پاس تگڑی سفارش ہے، تو پرفارمینس کے بغیر ہی آپ واپس ٹیم کا حصہ بھی بن سکتے ہیں۔

شعیب ملک کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ جب وہ نئے نئے ٹیم میں وارد ہوئے تو ناقدین کو یقین تھا کہ یہ کھلاڑی لمبی ریس کا گھوڑا ہے۔ جلد اس کا شمار دنیا کے اہم آل راؤنڈرز میں ہوگا۔ ان کی پرفارمینس نے ناقدین کی رائے کو تقویت دی، مگر دنیا کے بہترین آل راؤنڈر بننے سے پہلے ہی وہ پاکستانی ٹیم کے کپتان بن گئے۔ بظاہر یہ ایک انوکھا فیصلہ تھا مگر پاکستانی کرکٹ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہاں کرکٹ بورڈ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ انوکھا کرنے میں جٹا رہتا تھا۔ جب بھی نیا کپتان بنایا جاتا ہے تو کوشش ہوتی ہے کہ ایسا کھلاڑی چنا جائے، جسے بورڈ بہ آسانی کنٹرول کر سکے۔ اسی وجہ سے شعیب کو کپتانی سونپی گئی۔ ایک ٹی وی انٹرویو میں وہ بھولپن میں یہ بھی کہہ گئے کہ فی الحال انہیں اپنے اختیارات کا بھی علم نہیں۔

بطور کپتان ان کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ انھوں نے تسلسل کے ساتھ کامیابیاں حاصل کیں۔ ذاتی ریکارڈ بھی بہتر کیا۔ خاصی اُمید بندھ گئی تھی مگر جوں ہی اُن کی کارکردگی میں گراوٹ آئی، بورڈ میں تبدیلیاں ہوئیں، مخالفین کو سازش کا موقع مل گیا۔ اور پھر وہی ہوا جو ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ باصلاحیت کھلاڑی ٹیم سے باہر ہو گیا۔ یوں ایک ایسا اسپورٹس مین جو جم کر پاکستان کی خدمت کر سکتا تھا، طویل عرصے تک کھیل سکتا تھا، ان آؤٹ ہونے کے بے انت سلسلے میں اُلجھ کر ضائع ہو گیا۔ ایک برطانوی کرکٹ ایکسپرٹ کے مطابق اتنے طویل عرصے پاکستان کی نمائندگی کرنے والے اور ہر طرز کی کرکٹ میں آزمائے جانے والے اس کھلاڑی کے بارے میں تاحال یہ تعین نہیں ہو سکا کہ اس کی بہترین صلاحیتیں کس شعبے میں.... سامنے آتی ہیں۔ اِسی سے ہم پاکستان کرکٹ بورڈ کی غفلتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سابق کپتان شعیب ملک یکم فروری 1982 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ہاں سیالکوٹ جو اپنی فٹ بالز کے لیے مشہور ہے۔ اوائل میں آف اسپنر تھے مگر بلے بازی کی صلاحیت بھی ان میں موجود تھی جسے انھوں نے جلد شناخت کر لیا۔ اس ضمن میں کوچز نے کلیدی کردار ادا کیا۔ انہیں ایک ایسے آل راؤنڈر کے طور پر شناخت کیا جانے لگا جو ون ڈے کرکٹ کے لیے آئیڈیل تھا۔ دفاع بھی مضبوط تھا اور تیز رفتار شاٹس کھیلنے کی بھی قابلیت تھی۔

فرسٹ کلاس کرکٹ میں اپنی متاثر کن کارکردگی کے ذریعے وہ سلیکٹرز کی نظروں میں آگئے۔ انھوں نے 1999 میں ویسٹ انڈیز کے خلاف اپنے ون ڈے کیریئر کا آغاز کیا۔ اس وقت ثقلین مشتاق جیسا ممتاز آف اسپنر ٹیم کا حصہ تھا، ارشد خان بھی اپنی جگہ کے لیے زور مار رہے تھے، ایسے میں شعیب ملک کے لیے حالات کٹھن تھے مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور دوسرا موقع حاصل کرنے کے لیے خوب محنت کی۔ جلد انہیں ٹیسٹ کرکٹ میں بھی آزمایا گیا۔ 2001 میں وہ بنگلہ دیش کے خلاف ایکشن میں نظر آئے۔ بڑے کھلاڑی ایک ایک کر کے ٹیم سے باہر جا رہے تھے۔ شعیب کے لیے جگہ نکل آئی۔ کچھ ہی برس بعد وہ ٹیم کا مستقل حصہ تھے۔ آف اسپن بولنگ اور سودمند بیٹنگ کے ساتھ ان کی فیلڈنگ بھی باکمال تھی۔ ہاں، ایک مرحلے پر ان کا ایکشن زیرِ عتاب آیا اور اسے غیر قانونی قرار دیا گیا مگر بعد میں بازو کی سرجری اور مشق سے انھوں نے اس مسئلے سے نجات حاصل کر لی۔

ان کا ریکارڈ قابلِ رشک ہے۔ وہ 232 ون ڈے مقابلوں میں میدان میں اترے۔ 34.43 کی اوسط سے چھ ہزار رنز داغے۔ 35 نصف سنچریوں کے ساتھ آٹھ بار سنچری کا ہندسہ عبور کیا۔ ذہن میں رکھیے کہ یہ ایک آل راؤنڈر کا بیٹنگ ریکارڈ ہے۔ پاکستان میں تو ایسے بلے بازوں نے بھی برسوں ٹیم کی نمائندگی کی، جن کی بیٹنگ اوسط شعیب ملک سے کم تھی۔ اب ان کی بولنگ پر نظر ڈالیے۔ انھوں نے 151 وکٹیں اپنے نام کیں۔ زیادہ وکٹیں کیریئر کے آغاز میں حاصل کیں۔ اپنی کپتانی کے دور میں بھی وہ فل فارم میں دکھائی دیے۔ مگر جب اختلافات نے انہیں ٹیم سے باہر کر دیا، گروہ بندی واضح ہو گئی، اس کے بعد انہیں ٹیم میں شامل کیا بھی گیا تو ان کی بولنگ پر زیادہ اعتبار نہیں کیا گیا۔ اس دور میں محمد حفیظ کو بطور آف اسپنر نمایاں ہونے کا موقع ملا۔

ٹیسٹ میں انہیں زیادہ مواقع نہیں ملے۔ 35 مقابلوں میں انھوں نے 1,898 رنز اسکور کیے اور 32 وکٹیں لیں۔ تین سنچریاں داغیں۔ اس میں انگلینڈ کے خلاف ان کی 245 رنز کی شاندار اننگز بھی شامل ہے۔ اوروں کے مانند وہ بھی خود کو ٹیسٹ کرکٹ کے لیے بہترین انتخاب نہیں سمجھتے تھے، سو انھوں نے اس فارمیٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔

آج وہ 34 برس کے ہیں۔ اس عمر میں کپتانی کے لیے بہترین انتخاب ہو سکتے تھے، اپنی ذمے داری زیادہ بہتر انداز

## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماےراحت |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

## ☆ایک ماہ دو شاعر

اردو کی جدید تاریخ کے دو عظیم شعرا کا تعلق اسی مہینے سے ہے۔ دونوں ہم عصر تھے اور دونوں نے نسلوں کو متاثر کیا۔
پہلا نام ہے جوش ملیح آبادی کا ہے جنہوں نے کہا تھا:

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں
مشورے دے کر ہٹ گئے احباب

ان کا شعری سفر کئی عشروں پر محیط ہے۔ انھوں نے شاعری میں نئے رجحانات متعارف کروائے۔ ان کے شعری مجموعے طلبا کے لیے نصاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نثر بھی کمال کی لکھتے تھے۔ ان کی خودنوشت ''یادوں کی برات'' کو اردو کی مقبول ترین کتاب تصور کیا جاتا ہے۔ پورے عہد کو اس کتاب نے گرویدہ بنالیا۔ انھوں نے گیت نگاری بھی کی۔ ان کے انتقال کو چار عشرے ہونے کو ہیں، لیکن یادوں کے نقش دھندلے نہیں پڑے۔ وقت کے ساتھ اُن کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ ان پر جامعات میں مقالے لکھے جارہے ہیں۔

ان کا پورا نام شبیر حسین خان تھا۔ تعلق آفریدی قبیلے سے تھا۔ اُنھوں نے 5 دسمبر 1898 کو اترپردیش کے علاقے ملیح آباد کے ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اس گھرانے میں کئی علمی ہستی گزری ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے سے حاصل کی۔ عربی اور فارسی پڑھی۔ سینٹ پیٹرز کالج، آگرہ میں زیرِتعلیم رہے۔ شانتی نکیتن کا بھی کچھ برس حصہ رہے۔ 1925 میں ریاست حیدرآباد کی عثمان یونیورسٹی کے دارالترجمہ سے منسلک ہوگئے۔ اب انھوں نے کلیم نامی پرچے کی بنیا رکھی۔ اس پلیٹ فورم سے آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ ان کا لکھا ہوا مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' نے انہیں شاعر انقلاب کا خطاب دلوایا۔ جلد ان کا نہرو سمیت ہندوستان کے نمایاں سیاست دانوں سے تعلق قائم ہوگیا۔ تقسیم کے بعد وہ ''آج کل'' کے ایڈیٹر ہوگئے۔ ہندوستان میں اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے کے باعث 1958 میں پاکستان چلے آئے۔ یہاں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوگئے۔ اردو لغت کی تیاری سمیت کئی اہم منصوبوں میں معاونت کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان آنے کے فیصلے سے خوش نہیں تھے۔ 22 فروری 1982 کو اسلام آباد میں وہ 83 برس کی عمر میں انتقال کرگئے۔

اُنھیں کتنے ہی اعزازات سے نوازا گیا۔ ہجرت سے قبل 1954 میں ہندوستانی حکومت نے اُنھیں پدم بھوشن پیش کیا۔ 2012 میں حکومت پاکستان نے اُن کے لیے ہلال پاکستان کا اعلان کیا۔ ان کی موت کے بعد یہ بحث چھڑ گئی کہ یہ صدی کس

میں نبھا سکتے تھے، مگر وہ اس جال میں نو برس قبل ہی الجھ گئے۔
یہ 2007 کا ذکر ہے۔ ورلڈ کپ میں شکست کے بعد ٹیم اور کرکٹ بورڈ بڑی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ انضمام الحق کی ریٹائرمنٹ کے بعد محمد یوسف، محمد یونس اور شعیب ملک کا نام اگلے کپتان کے طور پر لیا جانے لگا۔ زیادہ تر لوگ یونس کے حق میں تھے اور شاید وہی اس وقت بہتر انتخاب تھے۔ یونس نائب کپتان کی حیثیت سے عرصے سے سرگرم تھے، مگر صورت حال میں تبدیلی آئی اور کپتانی کا تاج شعیب کے سر رہا۔ جیسے کہ ہم نے ذکر کیا، اوائل میں ان کی کارکردگی بہت اچھی رہی۔ ان کی کپتانی میں ٹی 20 ٹیم نے ورلڈ کپ کے فائنل تک رسائی حاصل کی، جہاں مصباح کی ایک غلط شاٹ کے باعث پاکستان چیمپئن بنتے بنتے رہ گیا۔ مگر ون ڈے میں بڑی ٹیموں کے مدمقابل ان کی ٹیم کی خامیاں ظاہر ہوگئیں۔ جب شکستوں کا سلسلہ دراز ہوا تو ملبا ہمیشہ کی طرح کپتان پر ڈال دیا گیا۔ انتظامیہ کو شکوہ تھا کہ وہ کھلاڑیوں سے زیادہ گھلتے ملتے نہیں، ٹیم میٹنگز میں بھی خاموش رہتے ہیں، فیلڈ میں بھی زیادہ متحرک دکھائی نہیں دیتے۔ اب بورڈ کے بڑوں کو کون سمجھاتا کہ ہر کھلاڑی کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ شعیب مزاجاً ایسے ہی تھے۔ اسٹیو وا کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے جو کھلاڑی سے کم ہی گھلتے ملتے تھے۔ دُور دُور رہتے تھے، مگر وہ ایک عظیم

شاعر سے منسوب ہے۔ کچھ حلقے ان کا موازنہ اقبال سے کرتے، تو کچھ فیض سے۔
دلچسپ امر یہ ہے کہ اس تذکرہ میں دوسرا نام فیض احمد فیض ہی کا ہے۔ جن کی یاد جب دل میں آتی ہے، تو ویرانے میں جیسے بہار آجاتی ہے۔ صحرا میں بادِ نسیم چلنے لگتی ہے۔ ان کے اشعار سننے والے بیمار کو قرار آجاتا ہے۔ کیا باکمال شخص تھے، فسوں گر تھے۔ شخصیت بڑی حلیم تھی۔ بات کتنی ہی تلخ ہو، مسکرانے پر اکتفا کرتے۔ مشکلات کا حُسن کا مقابلہ کرتے۔ گو جوش کو صدی کا سب سے بڑا شاعر کہا جاتا ہے، مگر جو شہرت فیض صاحب کو نصیب ہوئی، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کہتے ہیں، ایک عہد غالب کا تھا، دوسرا اقبال کا اور تیسرا فیض کا۔ انھوں نے فقط اپنی نسل کو نہیں... آج کی نسل کو بھی متاثر کیا۔ اشعار گیتوں کی صورت ملک کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ مظلوم کی پکار ٹھہرے۔ فکری طور پر ترقی پسند تھے۔ یہ نظریات حکومت کے لیے ناپسندیدہ ٹھہرے۔ کئی بار پابند سلاسل رہے۔ راولپنڈی سازش کیس میں 9 مارچ 1951 کو گرفتار کیا گیا۔ چار برس جیل میں رہے۔ "زنداں نامہ" کی بیشتر نظمیں اُسی عرصہ میں لکھی گئیں۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان کے مجموعے نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہ سنگ، سر وادیِ سینا، شام شہر یاراں، مرے دل مرے مسافر کے زیرعنوان منظر عام پر آئے۔ ان کے کلیات "نسخہ ہائے وفا" کا شمار اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتب میں ہوتا ہے۔
فیض صاحب 13 فروری 1911 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے حاصل کی۔ اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں زیر تعلیم رہے۔ اسی زمانے میں فارسی اور عربی سیکھی۔ ایف اے مرے کالج سیالکوٹ سے کیا۔ انگریزی میں ماسٹرز گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ عربی میں بھی ایم اے کیا۔ پھر وہ ایم اے او کالج امرتسر میں لیکچرر ہوگئے۔ فوج میں کپتان بھی رہے۔ 1947 میں فوج سے مستعفی ہو کر لاہور آگئے۔ 1947 تا 1958 وہ مدیر ادب لطیف اور مدیر لوٹس رہے۔ 1959 میں پاکستان آرٹس کونسل میں سیکریٹری تعینات ہوئے، تین برس وہاں بیتے۔ 1964 میں عبداللہ ہارون کالج، کراچی میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1930 میں ایلس فیض سے شادی ہوئی۔ اُن کی بیگم بھی اہم سماجی شخصیت تھیں۔
انھیں بین الاقوامی شہرت ملی۔ لینن ایوارڈ سمیت کئی اہم اعزازات سے نوازے گئے۔ مغرب میں انھیں اردو شاعری کا نیرودا کہا جاتا ہے۔ ان کے استعارے، الفاظ اور تلازمے آج بھی زندہ ہیں۔ موضوعات تو شاید ہی کبھی پرانے ہوں۔ اقبال بانو اُن کا کلام گا کر امر ہوگئیں۔ "ہم دیکھیں گے" اور "دشت تنہائی میں" آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ فیض صاحب کا 20 نومبر 1984 کو لاہور میں انتقال ہوا۔

کپتان تھے۔
خیر، شعیب کو ہٹا دیا گیا۔ اب یونس کپتان بنے۔ کوچ اور بورڈ... دونوں ان کے خلاف ہوگئے۔ نیا کپتان چننے کا فیصلہ کیا گیا، اس بار قرعہ فال یونس خان کے نام نکلا۔ انہیں فارغ کرتے ہوئے کسی نے بطور کپتان ان کا ریکارڈ کھنگالنے کا نہیں سوچا۔ ان کی قیادت میں 36 میں سے 24 ون ڈے میچز میں پاکستان فاتح رہا تھا۔ جن 17 ٹی 20 میچز میں وہ کپتان رہے، ان میں سے 12 میں فتح ملی۔ یہ شان دار ریکارڈ ہے۔ قابل تعریف ہے، مگر انہیں ٹیم سے باہر کر دیا گیا۔ بعد میں جب وہ واپس آئے، تب بھی ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ نہیں کیا گیا۔ ان کے ایکشن پر بھی پابندی لگتی رہی۔ یوں لگتا تھا کہ ان کا کیریر ختم ہوگیا، مگر 2014 میں ان کی واپسی ہوئی، تو یکسر الگ روپ میں نظر آئے۔ کارکردگی میں واضح بہتری دیکھی گئی۔
شعیب ملک کی شہرت کا ایک سبب اور بھی ہے۔ اور وہ ہے ان کی شادی۔ پاکستان سے زیادہ وہ ہندوستان میں مقبول ہیں، کیونکہ ان کی بیگم ہندوستان سے تعلق رکھنے والی ممتاز ٹینس اسٹار ثانیہ مرزا ہیں۔ جب سے شادی ہوئی ہے، یہ جوڑا خبروں کی زینت بنا ہوا ہے۔ انہیں سیلیبریٹی کا درجہ حاصل ہے۔ شعیب اور ثانیہ پاک و ہند کے شوبز پروگرام اور اشتہارات

میں تواتر سے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی اسکرین پر موجودگی ریٹنگ کا باعث بنتی ہے۔ اس رشتے کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ روایات کے برعکس شادی کے بعد ثانیہ ہندوستان ہی میں رہیں اور اپنے ملک کی نمائندگی کرتی رہیں۔ اس شادی سے قبل شعیب ایک اسکینڈل میں بھی پھنس گئے تھے۔ اور اس کا تعلق بھی بھارت ہی سے تھا۔ دراصل ہندوستان سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی سے اُن کی انٹرنیٹ پر دوستی ہوئی تھی۔ بعد میں خبر آئی کہ دونوں کا نکاح ہوگیا ہے۔ جب شعیب اور ثانیہ کی شادی کا معاملہ اٹھا، تب وہ خاتون بھی منظر عام پر آگئیں، جو شعیب کی بیگم ہونے کی دعوے دار تھیں۔ شعیب کے خاندان کی جانب سے اس پر مبہم سا موقف اختیار کیا گیا۔ وہ تعلق تو تسلیم کرتے تھے مگر نکاح سے انکاری رہے۔ پاکستان کے دیگر کرکٹرز کی جانب سے دبی دبی زبان میں یہ کہا گیا کہ اس رشتے کے معاملے میں شعیب سے دھوکا ہوا تھا۔ انٹرنیٹ پر شعیب کی دوستی جس لڑکی سے تھی، وہ کوئی اور تھی اور نکاح کی دعوے دار خاتون کوئی اور ہیں۔ خیر، بہت شور مچا۔ آخر معاملات طے پا گئے۔ شعیب ملک کی جانب سے ان خاتون کو خاموشی سے طلاق دے دی گئی اور ثانیہ اور شعیب رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ بعد میں ثانیہ مرزا اکثر میچز میں شعیب ملک کی حوصلہ افزائی کرتی نظر آئیں۔ یہ جوڑی اب بھی بہت مقبول ہے۔ البتہ یہ طے ہے کہ شعیب کا کیریر دھیرے دھیرے اپنے اختتام کی سمت بڑھ رہا ہے۔ اگر وہ انگلا ورلڈکپ کھیل پائے، تو یہ ان کی بڑی کامیابی ہوگی۔

## ☆ فخر الدین جی ابراہیم

پاکستان کی عدلیہ کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، تو ہمیں دو انتہائیں دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ خامیاں ہیں تو روشن مثالیں بھی ہیں جنھوں نے اس ادارے کا وقار بڑھایا۔ البتہ ایسی مثال کم ہوں گی، جہاں ملکی تاریخ پر دیرپا اثرات مرتب کرنے والے شیڈز ایک ہی جج کے کیریر میں سمٹ آئیں۔ ایک مثال تو جناب افتخار چوہدری کی ہے۔ پہلے انھوں نے پی سی او کے تحت حلف لیا۔ مگر بعد میں جرأت اور انصاف کی علامت بنے، ایک عظیم تحریک چلائی۔ البتہ آخر میں اپنے بیٹے کے کیس کے باعث اُن کی باوقار شخصیت پر ایک داغ لگ گیا۔ کچھ یہی معاملہ عزت مآب فخر الدین جی ابراہیم کا بھی ہے۔ انھیں پاکستانی تاریخ کے کھرے اور مخلص ترین قانون دانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ضیاالحق کے دور میں پی سی او کے تحت حلف نہ لے کر انھوں نے ایک ایسی جرأت مندانہ مثال قائم کی، جو پورے پاکستان کے لیے قابل فخر تھی۔ سرکاری ملازمت چھوڑنے کے بعد بھی انھوں نے بطور ماہر قانون ہمیشہ حق اور سچ کا ساتھ دیا، مگر پھر اپنی عمر کے آخری حصے میں... جب وہ خاصے ضعیف ہوگئے تھے، انھوں نے ایک بھاری ذمے داری اٹھالی، جسے نبھانے میں ناکامی کے باعث وہ شدید تنقید کی زد میں آگئے۔ اور ان کے بے داغ دامن پر ایک دھبا پڑ گیا.. 2013 کے انتخابات کا دھبا۔

بہتر تو یہی ہوتا کہ فخرو بھائی کے نام سے معروف یہ قابلِ احترام اور ہر دل عزیز شخصیت پاکستان کے اہم ترین انتخابات کے لیے الیکشن کمشنر بننے سے انکار کردیتی۔ دراصل اس الیکشن میں ن لیگ اور تحریک انصاف میں کڑے مقابلے کی توقع تھی۔ حسبِ روایت کئی بے ضابطگیاں ہوئیں۔ عمران خان شکست تسلیم کرنے کے بجائے عوامی طاقت کے ہمراہ میدان میں کود پڑے۔

یوں انتخابات کی حیثیت متنازع ہوگئی۔ کسی نے فخرو بھائی پر بدعنوانی کا الزام عائد نہیں کیا۔ سب ان کی عزت کرتے ہیں، مگر ان کا ادارہ مطلوبہ کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرسکا۔ یوں جسے ایک جرأت مند منصف، ایک ذہین فطین قانون داں اور ایمان دار گورنر کے طور پر یاد کیا جاتا تھا، اسے بطور الیکشن کمشنر تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ اس صورتِ حال کے باعث فخرو بھائی کے خیر خواہوں کو شدید کرب سے گزرنا پڑا۔

اس تذکرہ کو چھوڑ کر کیوں ناں ان کی زندگی پر نظر ڈال لی جائے۔ فخر الدین جی ابراہیم 2 فروری 1928 کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق پڑھے لکھے متوسط گھرانے سے تھا۔ ذہین فطین اور تیز طرار طالب علم تھے۔ تعلیمی مدارج تیزی سے طے کیے۔ پھر بیرونِ ملک چلے گئے۔ 1952 میں انھوں نے انگلینڈ سے قانون کی ڈگری لی۔ وہاں سے لوٹ کر کراچی کو مسکن بنایا۔ پریکٹس شروع کردی۔ اس زمانے میں ترقی پسند نظریات زوروں پر تھے۔ حکومت کمیونسٹوں کے خلاف سرگرم تھی، مگر مارکسی نظریات کا اثر بڑھتا، پھیلتا چلا جارہا تھا۔ اُن

دنوں زیڈ اے سلہری سینٹرل جیل کراچی میں نظر بند تھے۔ ان کا جرم اخبار میں ایک کارٹون چھاپنا تھا، جس میں مشرقی پاکستان کو شعلوں میں گھرا دکھایا گیا تھا (یہ پیش گوئی کچھ برس بعد درست ثابت ہوئی) نوجوان فخر الدین جی ابراہیم زیڈ اے سلہری سے ملنے جیل جایا کرتے۔ وہیں مشہور ترقی پسند رہنما حسن ناصر بھی قید تھے۔ فخر الدین جی ابراہیم اور حسن ناصر کے درمیان دوستی ہوگئی۔ انھوں نے حسن ناصر کا مقدمہ لڑا۔ ان کی کوششیں لاحاصل رہیں۔ حسن ناصر کو تشدد کر کے قتل کر دیا گیا۔ تاریخ کا فیصلہ آج سب کے سامنے ہے۔ حسن ناصر زندہ ہے، اس کے قاتل بے نام ہوئے۔

فخر الدین جی ابراہیم نے ترقی کے مراحل تیزی سے طے کیے۔ کامیابیاں ان کے قدم چومتی گئیں۔ سندھ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بننا ان کا بڑا کارنامہ تھا۔ اس وقت وہ خاصے کم عمر تھے۔ ماہرین کا خیال تھا کہ ایک دن وہ پاکستان کے چیف جسٹس بنیں گے۔ یہ اندازہ غلط بھی نہیں تھا۔ جلد وہ سپریم کورٹ کے جج ہوگئے۔ وہ اٹارنی جنرل بھی رہے۔ اپنے کیریر میں کبھی اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا۔ 1981 میں جب وہ سپریم کورٹ کے جج تھے، جنرل ضیا الحق نے ججز کو پی سی او کے تحت حلف اٹھانے کا حکم دیا۔ فخر الدین جی ابراہیم سپریم کورٹ کے ججز میں جونیئر ترین تھے، مگر ان کے حوصلے کا قد سب سے بلند تھا۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا اور ملازمت چھوڑ دی۔ اس فیصلے نے انھیں حق گوئی اور دلیری کا استعارہ بنا دیا۔ وہ کراچی لوٹ آئے اور پریکٹس کرنے لگے۔ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں انھوں نے گورنر سندھ کا عہدہ سنبھالا۔ یہ عہدہ دراصل انھیں نشان سپاس پیش کرنے کی ایک حقیر کوشش تھی۔ اپریل 1989 میں وہ گورنر ہوئے۔ کراچی میں Citizen Police Liaison Committee (CPLC) کے قیام میں ان کا کردار کلیدی رہا۔ وہ فقط ایک برس گورنر کے عہدے پر رہ سکے۔ اصولوں پر سمجھوتا انھیں گوارا نہیں تھا۔ جب راہ میں رکاوٹ کھڑی کی گئی، انھوں نے اپنی راہ جدا کرلی۔

کرکٹ سے بھی ان کا عجیب تعلق رہا۔ 1995 میں آسٹریلوی کھلاڑیوں نے جب پاکستانی کپتان سلیم ملک پر الزامات لگائے، تو ان کی انکوائری فخرو بھائی ہی نے کی۔ اس کیس کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔ 2006 میں پاکستان کرکٹ بورڈ نے اینٹی ڈوپنگ کمیٹی بنایا تو وہ اس کے چیئرمین تھے۔ 14 جولائی 2012 کو انھیں الیکشن کمیشن پاکستان کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ بس یہیں سے کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ آیا۔ 2013 کے عام انتخابات میں اُن کی مخلصانہ کوششوں کو بدعنوانی اور نظام کی خستہ حالی نے نگل لیا۔ وہ شدید تنقید کی زد میں آگئے۔ صدارتی انتخابات کے فوری بعد 31 جولائی 2013 کو انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

## ☆ عطاء الحق قاسمی

ان کے قلم میں مزاح کی سیاہی ہے مگر اس مزاح کی کاٹ بہت گہری ہے۔ اور یہی کاٹ ان کی انفرادیت ہے۔ ایک سمت ان کی تحریریں شگفتگی سے لبریز ہیں، دوسری طرف ان میں غور وفکر کا سامان ہے۔ سفر پر نکلے تو اس کی روداد اتنی خوبصورتی اور مہارت سے قلم بند کی کہ پڑھنے والے عش عش کر اٹھے۔ کتاب "شوق آوارگی" کو جدید اردو کے بہترین سفرناموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ سفرنامہ کتابی صورت میں آنے سے قبل "فنون" میں قسط وار چھپتا رہا۔ ان کے دیگر سفرنامے "گوروں کے دیس میں"، "دنیا خوب صورت ہے" اور "دلی دور است" بھی پسند کیے گئے۔ البتہ ایک "غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ" کی بات ہی نرالی تھی۔ پڑھنے والا ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجائے۔ خاکے لکھے، تو کتاب کو "مزید گنجے فرشتے" کا نام دیا۔ اس میں بھی طنز و مزاح کے عروج پر نظر آئے... اگر آپ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کا تعارف مکمل ہوا، تو یہ آپ کی بھول ہے۔ ڈراما نویسی کا ذکر تو رہ ہی گیا۔ پی ٹی وی کے لیے تحریر کردہ ان کے ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ "خواجہ اینڈ سن" تو آج بھی لوگوں کے ذہن میں تازہ ہے۔ کچھ یہی معاملہ "شب دیگ" کا بھی تھا، جسے بہترین ڈراما سیریل کا گریجویٹ ایوارڈ ملا۔ علی بابا چالیس چور، آپ کا خادم (شیدا ٹلی)، اپنے پرائے، حویلی، ایکشن ایکشن اور ہرفن مولا بھی بہت پسند کیے گئے۔ شہرت کا ایک سبب اور سن لیجیے۔ عطا الحق قاسمی دراصل استاد ہیں۔ یکم فروری 1943 کو پیدا ہونے والے ان صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے

## سیلولر فون
## (Celluler phone)

سیلولر فون دراصل کسی شہر کو ایک خیالی سدد نما علاقہ (Imaginary Hexegonal Areas) میں تقسیم کرتا ہے۔ جسے سیل کہتے ہیں۔ یہی ایک سیل اس کی بنیادی اکائی (Basic Unit) ہوتی ہے۔ سیلولر ٹیلی فون سسٹم مندرجہ ذیل تین اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ بی ٹی ایس، بی ایس سی اور ایم ایس سی پر ایک سیل کے پاس ایک بیس ٹرانس ریسیور ہوتا ہے، جو اور ایک بیس اسٹیشن کنٹرولر (BCS) سے بذریعہ کیبل ایک مخصوص خرد رولہر سے منسلک رہتا ہے۔ تمام بیس اسٹیشن کنٹرولر سے ایک سنٹر کنٹرول سے جڑے رہتے ہیں۔ جسے موبائل سوئچنگ سنٹر کہتے ہیں۔ یہی موبائل سوئچنگ سنٹر پورے سیلولر ٹیلی فون سسٹم کا مرکزی حصہ ہے، جو کہ پبلک سوئچ ٹیلی فون نیٹ ورک اور آئی ایس ڈی این کے ذریعے اس پورے سسٹم کو باہر کی دنیا سے جوڑتا ہے۔

مرسلہ: ناظم حسین، کوٹ سپران

اردو کیا اور گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور سے بطور مدرس وابستہ ہوگئے۔ 2000 میں ایف سی کالج سے ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے طلبا ملک بھر میں پھیلے ہیں۔

اب توجہ اس سبب پر مرکوز کرتے ہیں جس نے عطاالحق کو اپنے عہد کا بااثر ترین ادیب بنا ڈالا۔ یوں تو انھوں نے جو لکھا، ہاتھوں ہاتھ لیا گیا مگر یہ ان کے کالم تھے جنھوں نے انھیں ملک گیر شہرت بخشی۔ آغاز ''نوائے وقت'' میں چھپنے والے کالموں سے ہوا۔ 32 برس تک اس اخبار سے وابستگی رہی۔ نوائے وقت کے بہت سے کالم قارئین کو آج بھی یاد۔ ادھر ادبی صفحے کے نگراں بھی رہے۔ 1979 میں انھوں نے ''معاصر'' کے نام سے ادبی جریدہ نکالا جو بہت مقبول ہوا۔ 2001 میں روزنامہ جنگ سے وابستہ ہوگئے۔ ادھر ''روزن دیوار سے'' کے عنوان سے کالم لکھنے لگے۔ اے پی این ایس کی طرف سے بہترین کالم نویس کا ایوارڈ اپنے نام کیا۔ کالموں کے مجموعے ''روزن دیوار'' پر آدم جی ادبی ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ بعد میں کالموں کے کئی مجموعے آئے جو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ ان کے صاحب زادے یاسر پیرزادہ نے بھی اس شعبے میں نام کمایا۔

کالم نگاری نے انھیں سسٹم کو قریب سے دیکھنے، اسے سمجھنے اور پرکھنے کا موقع دیا۔ اقتدار کے ایوانوں تک رسائی ہوگئی۔ وہاں ہونے والی سرگرمیوں کے تجزیے نے ان کی اہمیت دوچند کردی۔ ن لیگ کے وہ نزدیک آتے گئے۔ میاں صاحب کے ابتدائی ادوار میں انھوں نے ناروے اور تھائی لینڈ میں پاکستانی سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ موجودہ دور حکومت میں انھیں الحمرا کا سربراہ مقرر کیا گیا، پھر پی ٹی وی کی ذمے داری بھی انھیں سونپ دی گئی۔ سمجھ لیجیے، وہ حکومت کے لیے ثقافتی و ادبی محاذ سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کا کہا حرف آخر ہے۔

شہرت اچھے اور برے دونوں طرح کے اثرات مرتب کرتی ہے۔ جہاں دوست ملتے ہیں، وہاں دشمنوں کی تعداد بھی بڑھ جاتی ہے۔ بہت سے تعریف کرتے ہیں، بہت سے تنقید۔ اب جو شہرت عطاالحق قاسمی کے حصے میں آئی، جس قسم کے اعلیٰ سرکاری عہدے انھیں ملے، اس پر ناقدین کا اعتراض حیران کن نہیں۔ الحمرا اور پی ٹی وی، دونوں کی ذمے داری انھیں سونپنے پر بھی خاصی لے دے ہوئی۔ ماضی میں بھی جب سفیر بنے تھے، تب بھی تنقید کی زد میں رہے۔ البتہ انھوں نے ترقی کی سمت اپنا سفر جاری رکھا۔

### ☆ اسفندریار ولی

سیاست اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ایک ایسے باپ کے بیٹے تھے، جس نے نظریات کے لیے طویل ترین جدوجہد کی، عشروں تک قید میں رہا، ان کے دادا کو سرحد کا گاندھی کہا جاتا تھا۔ انھوں نے خدائی خدمات گار جیسی تحریک شروع کی۔ عدم تشدد کا پرچار کیا اور باچا خان کا خطاب حاصل کیا۔ لوگ آج بھی انھیں یاد کرتے ہیں۔ پھر جس پارٹی کی انھیں قیادت ملی، کسی زمانے میں وہ ملک بھر میں روشن خیال اور محنت کش طبقے کی نمائندہ جماعت تھی۔ بدقسمتی سے اُن کے دور تک آتے آتے اُس کے کس بل نکل چکے تھے۔ ان کے فیصلے اور پالیسیاں بھی اس کی راہ درست نہیں کرسکیں۔ یوں ہم نے ایک شان دار میراث کو دھیرے دھیرے بکھرتے دیکھا۔

اسفندیار ولی اپنے وقت کے ممتاز سیاست داں ولی خان کے بیٹے ہیں۔ ان کے دادا خان عبدالغفار خان نے

خیبر پختون خوا کی نسلوں پر اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ باپ دادا کو غیر ملکی ایجنٹ ٹھہرایا گیا۔ ان پر غداری کے الزامات لگے، بھارتی پشت پناہی کا بہتان لگایا گیا، اس کے باوجود آج انہیں محبت اور احترام سے یاد کیا جاتا ہے، تو اس کا سبب ان کی بے لوث جدوجہد تھی۔ کیا اسفند یار ولی کو بھی مستقبل میں اسی طرح عزت اور محبت ملے گی، اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔

آج کی عوامی نیشنل پارٹی دراصل نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) سے نکلی ہے، جو اپنے ترقی پسند افکار، مخلص کارکن اور منظم جدوجہد کے لیے معروف تھی۔ اپنے وقت کی کئی جید شخصیات اُس سے منسلک رہیں۔ اس جماعت نے بلوچستان میں حکومت بھی قائم کر لی تھی، جسے بھٹو صاحب نے ختم کر دیا۔ بلوچستان کے دانشور طبقات آج بھی نیپ کی حکومت کو بلوچستان کی اکلوتی نمائندہ حکومت ٹھہراتے ہیں۔ البتہ عوامی نیشنل پارٹی اسفند یار ولی کی قیادت میں اس قسم کا تاثر قائم نہیں کر سکی۔ گو 2008 کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انھوں نے خیبر پختون خوا میں حکومت بنائی (سرحد کو خیبر پختون خوا کا نام بھی ان ہی کی حکومت نے دیا) سندھ میں وہ پی پی کے اتحادی تھے مگر دونوں ہی جگہ یہ روشن خیال، منظم جماعت اپنا حقیقی کردار ادا نہیں کر سکی۔ ایک طرف انہیں بدعنوانی اور دہشت گردی کا سامنا رہا تو دوسری طرف لسانی تقسیم کا، جس نے کراچی کا حسن گہنا دیا۔

اسفند یار ولی 19 فروری 1949 کو چارسدہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے وقت ولی خان جیل میں تھے۔ ان کی والدہ زچگی کے دوران انتقال کر گئیں۔ ایک سیاسی گھرانے میں پلنے والے نوجوان کے مانند انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں سیاست میں قدم رکھ دیا تھا۔ ایوب خان کے خلاف شروع ہونے والی طلبا تحریک میں وہ آگے آگے رہے۔ باپ دادا کے مانند ان پر بھی کئی الزامات لگے۔ کہا جاتا تھا کہ انہیں افغانستان کے کمیونسٹوں کی معاونت حاصل ہے۔ عسکری پسندی کو فروغ دینے کا ذمے دار بھی مخالفین انہیں ہی ٹھہراتے ہیں۔

الزامات کے اس سلسلے نے 1975 میں سنگین شکل اختیار کر لی۔ انہیں حیات شیر پاؤ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ کہتے ہیں، دوران حراست ان پر بدترین تشدد کیا گیا۔ ولی خان بھی گرفتار ہوئے۔ حیدر آباد ٹریبونل نے اسفند یار کو قصور وار ٹھہرایا۔ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد 1978 میں وہ رہا ہوئے۔ اگلے چند برس انتخابی سیاست سے دور

رہے۔ جب واپسی ہوئی تو گرج چمک تو برقرار تھی مگر طریقہ کار کچھ بدل گیا تھا۔ 1990 میں صوبائی اسمبلی کے رکن بنے۔ 1993 میں نیشنل اسمبلی تک پہنچے۔ 1997 میں پھر منتخب ہو کر نیشنل اسمبلی کا حصہ بنے۔ 1999 میں وہ اے این پی کے صدر بنے۔ لگتا تھا کہ وہ انتخابی سیاست کے گر سیکھ گئے ہیں اور خیبر پختونخوا میں جلد حکومت بنائیں گے، مگر 2002 کے انتخابات میں امریکا مخالف نعرے نے مذہبی جماعتوں کے اتحاد "متحدہ مجلس عمل" کو ایک بھرپور قوت بنا دیا۔ اسفند یار کی پارٹی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ وہ سیٹ بچانے میں کامیاب رہے۔ 2008 کے انتخابات عوامی نیشنل پارٹی کی قسمت چمکی اور وہ اقتدار میں آ گئے۔ البتہ آنے والے برس کچھ اچھے نہیں تھے۔ ایک تو بدعنوانی کے الزامات، پھر پی پی کو درپیش مشکلات۔ انھوں نے ہر محاذ پر پی پی کو سپورٹ کیا، جس سے ان کا اپنا امیج بھی متاثر ہوا اور بہت سے پرانے ساتھی ناراض ہو گئے۔ بیگم نسیم ولی بھی اُن پر کڑی تنقید کرتی نظر آئیں اور آخر انھوں نے اسفند یار ولی سے اپنے راستے جدا کرنے کا اعلان کر دیا۔

دہشت گردی اُن کی پارٹی کو درپیش سب سے سنگین مسئلہ تھا۔ سوات سمیت بہت سے علاقے ہاتھ سے نکل گئے۔ انہیں مجبوراً عسکریت پسندوں سے معاہدے کرنے پڑے۔ اُن کے کارکنوں کو بڑے پیمانے پر قتل کیا گیا۔ رہنماؤں پر حملے ہوئے۔ بشیر بلور اور میاں افتخار کے بیٹے کو شہید کیا گیا۔ خود اسفند یار ولی پر خودکش حملہ ہوا، جس میں بال بال بچے۔ حملے کے بعد وہ کچھ روز بیرون ملک رہے۔ ادھر کراچی میں لسانی فسادات کے الزامات کا سایہ ان کی پارٹی پر پڑا۔ ناقص کارکردگی کا اثر 2013 میں نظر آیا، جہاں ان کی پارٹی کو بدترین شکست ہوئی۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس وقت یہ پارٹی مشکل دور سے گزر رہی ہے۔ اس کے مضبوط اپوزیشن کا کردار ادا کرنا بھی مشکل ہے۔ اگلے انتخابات میں کامیابی کے لیے اسے منظم منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔

# ہر فن مولا

انور فرہاد

**اس نے پاکستانی فلمی دنیا میں ایک خاص مقام بنا رکھا تھا۔ فلم کے ہر شعبہ پر اس کی پکڑ مضبوط تھی۔ اس نے فلمی دنیا میں لگاتار تجربے کیے اور اپنا مقام بنایا۔ پاکستان کی پہلی آرٹ فلم میں مرکزی کردار ادا کیا لیکن اب وہ پاکستانی نہیں ہے۔**

**[illegible] سے کچھ خاص**

"یار! میں تم سے بہت ناراض ہوں۔"

"اللہ خیر کرے۔ میں نے ایسا کیا کر دیا کہ تم جیسا دوست ناراض ہو گیا؟"

"تم اتنے لوگوں پر لکھتے ہو مگر آج تک میرے استاد، میرے گرو دیو پر کچھ نہیں لکھا۔"

"تمہارا مطلب ہے، خان عطاء الرحمٰن پر نہیں لکھا؟"

"ہاں ... ان سے کتنے جونیئر پر لکھا۔ خان صاحب کو تم نے اس قابل نہیں سمجھا کہ ان پر لکھو۔ کیا یہ میری ناراضگی کا سبب نہیں ہو سکتا؟"

یہ ٹیلی فونک گفتگو گزشتہ دنوں نقی مصطفیٰ سے ہوئی تھی۔ وہی نقی مصطفیٰ جنہوں نے خان عطاالرحمٰن کی تاریخی فلم "نواب سراج الدولہ" کے مکالمے لکھ کر بہترین مکالمہ نگار کا نگار ایوارڈ حاصل کیا تھا۔

"تمہاری ناراضگی درست ہے مگر بات دراصل یہ ہے یار کہ......"

"تمہارے پاس ان کے بارے میں مواد نہیں ہے۔ تم یہی کہو گے ناں؟"

"ہاں......یہی بات ہے۔"

"تم نے تو انہیں بہت دنوں تک بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی فلموں کی شوٹنگز دیکھی ہیں۔ انہیں کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کی فلمیں دیکھی ہیں اداکار کی حیثیت سے بھی، گلوکار اور موسیقار کی حیثیت سے بھی اور فلمساز و ہدایت کار کی حیثیت سے بھی ان کی کارکردگی سے بخوبی واقف ہو۔"

"ہاں......مگر......"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ ان کے بارے میں جو باتیں تمہیں معلوم ہیں۔ ان کی بنیاد پر لکھنا شروع کرو۔ انشاء اللہ بھرپور مضمون تیار ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کروں گا۔" کہہ کر اس سے جان چھڑائی مگر ایسا کر کے میں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے کوئی کالم تو لکھنا نہیں ہوتا کہ اپنی یادداشت سے چند باتیں لکھ کر خانہ پری کر دوں۔ مجھے تو پوری زندگی کا احاطہ کرنا پڑتا ہے۔ سارے فیکٹ اینڈ فیگر پیش کرنا پڑتے ہیں۔

بہرحال اب تو خان صاحب پر لکھنا تھا۔ اپنے یار سے وعدہ کر لیا تھا اس لیے فیکٹ اور فیگر کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔

خان عطاالرحمٰن جیسے فنکار بہت کم ہوتے ہیں۔ فن کے کسی ایک شعبے ہی میں بہت سے فنکار زندگی بھر کمال حاصل نہیں کر سکتے مگر رب العزت نے خان عطاالرحمٰن پر اپنی عطا اور بخشش کے گھنگھور بادل برسا دیے تھے۔ انہوں نے جس شعبے میں قسمت آزمائی، اس میں خدائے بخشندہ نے انہیں بھرپور کامیابی سے نوازا۔ ان کے اندر فن اور آرٹ کا سمندر تھا۔ جس شعبے میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے [illegible] لیتے۔ اداکاری ہو، گلوکاری ہو، نغمہ

نگاری ہو، موسیقاری ہو، کہانی نویسی ہو، مکالمہ نگاری ہو، منظر نامہ نویسی ہو، ہدایت کاری ہو یا فلم سازی، کبھی خان صاحب نے اپنی کارکردگی سے مایوس نہیں کیا۔ ہر رنگ میں اپنی کامیابی کا پھریرا لہرایا۔ ناقدین، مبصرین اور ناظرین نے ان کے کام کو پسند کیا، ان کی تعریف کی۔ ان کی بھرپور پذیرائی کی۔

خان عطاء الرحمٰن کو اللہ نے جو خوبی اور صلاحیت دی تھی، اس کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے انہوں نے انتھک محنت کی۔ اپنے ہر کام کو انتہائی ذمہ داری سے کیا۔ اپنے کام کو عبادت سمجھ کر کیا۔ اس لیے انہیں ہر محاذ پر کامیابی حاصل ہوئی۔ رب ذوالجلال اس کی مدد کرتا ہے جو خود جدوجہد کرتے ہیں، اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ خان صاحب نے اس فارمولے پر زندگی بھر عمل کیا، وہ اپنے جونیئرز کو بھی کہتے تھے۔ ''تمہاری ترقی اور کامیابی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم جتنی دیانتداری سے جتنی محنت کرو گے اتنی ہی کامیابی اور کامرانی تمہارے حصے میں آئے گی۔''

خان عطاء الرحمٰن کی پہلی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' تھی جس میں انہوں نے اداکار کی حیثیت سے فلم کا مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں انہوں نے خان عطاء الرحمٰن کے نام سے نہیں بلکہ انیس کے فلمی نام سے کام کیا تھا۔

''جاگو ہوا سویرا'' کی بھی اپنی ایک کہانی ہے۔ ترقی پسندوں نے جہاں انڈیا میں اپنی تحریک کی ترویج کے لیے فلمیں بنائیں وہاں پاکستان میں بھی اس مقصد کے لیے فلمیں بنائی گئیں جن میں ''جاگو ہوا سویرا'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے پروڈیوسر نعمان تاثیر تھے۔ ڈائریکٹر اختر جنگ کاردار تھے جو اے جے کاردار کے نام سے مشہور ہیں جب کہ اس کے اسکرپٹ رائٹر اور نغمہ نگار فیض احمد فیض تھے۔

اس فلم کی کہانی ایک بنگالی ناول سے لی گئی تھی جس میں ماہی گیروں پر استحصال کرنے والوں کو دکھایا گیا تھا۔ فیض صاحب بنگلہ زبان سے واقف نہیں تھے اس لیے ناول کو انگریزی زبان میں منتقل کروایا۔ اس کام کے لیے انہوں نے ظہیر ریحان کا انتخاب کیا جو ان دنوں ڈھاکا یونیورسٹی کے ایک طالب علم تھے مگر ترقی پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔ فیض صاحب بنگالی زبان کے ترقی پسند ادیبوں شاعروں سے بخوبی واقف تھے۔ اس

لیے متذکرہ ناول کو انگریزی میں منتقل کرنے کی ذمہ داری نوجوان افسانہ نگار ظہیر ریحان کو سونپی۔ اسی طرح فیض صاحب نے ناول کی کہانی کو فلم کے اسکرپٹ کے روپ میں ڈھالا اور اسے نیچرل لوکیشن پر عکس بند کرنے کے لیے مشرقی پاکستان میں جاکر اس کی شوٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب شوٹنگ کا مرحلہ آیا تو فیض صاحب نے ظہیر ریحان سے کہا۔ ''تم اے جے کاردار کے اسسٹنٹ کے طور پر بھی کام کرو گے۔''

ظہیر ریحان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ''مگر سر! مجھے تو فلمسازی کی کوئی سدھ بدھ نہیں۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ اے جے کاردار تمہیں بتا دیں گے سکھا دیں گے۔''

ظہیر ریحان فیض صاحب کی بات کیسے ٹال سکتے تھے۔ ظہیر ریحان کو فیض صاحب نے اپنی یونٹ میں اس لیے شامل کیا تھا کہ وہ بنگالی ہونے کے ناطے نہ صرف لوکیشن پر موجود بنگالی مچھیروں سے ہدایت کار کے موڈ مزاج کے مطابق کام لے سکیں بلکہ بنگالی ناول کے تاثر کو بھی برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہو۔

اے جے کاردار اور فیض صاحب نے جس محبت سے ظہیر ریحان سے کام لیا اس سے اس جواں سال افسانہ نگار کو فلمسازی سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس نے ان دونوں شخصیات سے بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا جو بعد میں انہیں ایک کامیاب ہدایت کار بنانے میں کام آیا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے صفِ اول کے ہدایت کار کی حیثیت سے اپنی شناخت کروائی۔ بنگالی اور اردو زبانوں میں یادگار فلمیں بنائیں۔ پاکستان کی پہلی فل لینتھ رنگین فلم ''سنگم'' بنانے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

''جاگو ہوا سویرا'' میں خان عطاء الرحمٰن نے مرکزی کردار ادا کیا تھا جب کہ ان کے ہمراہ کام کرنے والے آرٹسٹ ترپتی، مترا، زدرین، مینا لطیف اور قاضی خلیق تھے جنہوں نے نمایاں کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کے دیگر تمام آرٹسٹوں کا انتخاب مشرقی پاکستان سے کیا گیا تھا۔ بس ایک زدرین لاہوری آرٹسٹ تھے۔ اے جے کاردار اور فیض صاحب نے اصل ناول کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے فلم مکمل کرلی۔ فیض احمد فیض اس فلم کے اسکرپٹ رائٹر کے علاوہ نغمہ نگار بھی تھے۔ جن کے بول تھے۔

☆ جاگو ہوا سویرا، جاگو ہوا سویرا (آواز: راحت، نیلوفر یاسمین، الطاف محمود)۔

☆ بھور ہوئی بھور، گھر آجاؤ ماجھی۔ بھور ہوئی بھور (راحت غزنوی)

☆ ڈوب گیا دن شام ڈھلی۔ شام ڈھلی ڈوب گیا دن (آواز: الطاف محمود)

☆ اب دیکھیں کیا راہ تمہاری۔ بیت چلی رات (آواز: راحت غزنوی)

☆ موتی ہو کہ شیشہ ہو۔ جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا (آواز: محبوب حسنات)

''جاگو ہوا سویرا'' 25 اپریل 1959ء کو نمائش پذیر ہوئی مگر باکس آفس پر کامیابی حاصل نہ کر سکی کیونکہ یہ مکمل طور پر ایک آرٹ فلم تھی اور ایسی فلمیں عام تماشائی پسند نہیں کرتے۔ خان عطاء الرحمٰن اپنی پہلی فلم کا یہ حشر دیکھ کر قدرے مایوس ہو گئے تھے مگر اس کے تخلیق کاروں کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں پڑی تھی۔ وہ جانتے تھے ایسی فلموں کی قدر و قیمت کہاں ہوتی ہے اور کون لوگ ان کے جوہر شناس ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے پوری فلم کو انگریزی زبان میں ڈب کیا اور اسے ''Day Shall Down'' کا نام دیا اور ماسکو کے فلمی میلے میں اسے پیش کیا جہاں اسے بے حد سراہا گیا اور اسے گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔ اس کے بعد جہاں بھی عالمی فلمی میلہ ہوتا وہاں ''Day Shall Down'' اعزاز و اکرام کی مستحق قرار دی جاتی۔ جب اس فلم کو بین الاقوامی شہرت ملی تو خان عطاء الرحمٰن کی مایوسی ختم ہوئی اور انہیں اس بات پر فخر محسوس ہوا کہ بطور اداکار ان کی پہلی فلم نے عالمی شہرت حاصل کی یعنی انہیں ایک عالم نے دیکھا اور ان کے کام کو پسند کیا۔

اس کے بعد خان عطاء الرحمٰن کی فلمی مصروفیات میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ خان صاحب کی پہلی فلم میں کام کرنے سے پہلے انہوں نے کیا کچھ کیا۔ کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کیا کھویا، کیا پایا۔

ان کے والد زیارت حسین اور والدہ زہرہ خاتون انہیں ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ وہ ابھی بہت چھوٹے تھے۔ جب ہی سے وہ پیار سے کہتے تھے۔ ''ہمارا بیٹا بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا۔ لوگوں کو دکھ بیماری سے نجات دلائے گا۔''

دونوں میاں بیوی یہ حسین خواب دیکھتے تھے کہ جب ان کا جگر گوشہ ڈاکٹر بن جائے گا تو ان کے دن پھر جائیں

گے۔ ان کے گھر میں خوش حالی اور فارغ البالی ہوگی۔

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ننھے عطاء الرحمٰن کی طبیعت کسی اور طرف مائل تھی۔ جب وہ تیسری جماعت کے طالب علم تھے تو انہوں نے اپنے ضلع میں منعقد ہونے والے مقابلے میں گیت سنا کر پہلا انعام حاصل کیا۔ ماں باپ کو بیٹے کی اس کامیابی پر خوشی نہیں ہوئی وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔

''ارے بھئی! تمہارا بیٹا تو پڑھنے لکھنے سے زیادہ دلچسپی گانے بجانے میں لے رہا ہے۔''

''وقتی بات ہے۔'' زہرہ خاتون بولیں۔ ''ہر بچہ کتابوں کا کیڑا نہیں ہوتا۔ اس کی کچھ دلچسپی بھی ہوتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' زیارت حسین نے کہا۔ ''تم اس پر کڑی نگاہ رکھو۔ کتابوں سے اس کی دلچسپی بڑھاؤ۔ آخر اسے ڈاکٹر بننا ہے اگر ابھی سے زیادہ محنت نہیں کرے گا تو......''

''آپ فکرمند نہ ہوں۔ وہ ڈاکٹر ہی بنے گا۔ میرا بیٹا بہت ذہین ہے۔ اسے ڈاکٹری کا امتحان پاس کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔''

ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1946ء میں عطاء الرحمٰن کے والدین نے انہیں ڈھاکا میڈیکل کالج میں داخلہ دلوا دیا مگر فنون لطیفہ سے ان کی دلچسپی نے انہیں میڈیکل کی تعلیم جاری رکھنے نہ دی۔ ان کا دل وہاں کی پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ وہ بڑی بے دلی کے ساتھ میڈیکل کالج جاتے تھے۔

ایک دن زہرہ بیگم نے دیکھا۔ دن خاصا چڑھ گیا ہے۔ عطاء الرحمٰن ابھی تک سو کر نہیں اٹھا۔ وہ اس کے کمرے میں گئیں اور اسے آواز دی۔ ''کیا بات ہے بیٹے! تم ابھی تک اٹھے نہیں۔ میڈیکل کالج نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں۔''

''کیا چھٹی ہے؟''

''نہیں۔''

ماں کا ماتھا ٹھنکا۔ ''جب چھٹی نہیں ہے تو پھر کیوں نہیں جاؤ گے؟''

''بس...... میرا جی نہیں چاہتا۔''

''یہ کیا بات ہوئی جی نہیں چاہتا۔ جی نہیں چاہے گا تو تم ڈاکٹر کیسے بنو گے؟''

''میں ڈاکٹر بننا نہیں چاہتا۔''

''کیا......؟''

ماں کا موڈ مزاج ایک دم بدل گیا۔ نرم لہجے کی بجائے کرخت لہجے میں بولیں۔ ''ڈاکٹر نہیں بنے گا تو کیا گانے بجانے والا بنے گا؟''

''ہاں...... جو میرا دل چاہے گا۔ بنوں گا۔'' بیٹے کا موڈ بھی خراب ہو گیا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے لگا۔

''عطاء الرحمٰن! ہم تو چاہتے ہیں تیرا مستقبل شاندار ہو اور تو چاہتا ہے بے کار کام۔ میں اپنی زندگی برباد کر کے......''

''میں اپنی زندگی کو جس طرح چاہوں گا بناؤں گا یا بگاڑوں گا۔''

''نہیں بیٹا! تیری زندگی تیرے لیے ہی نہیں، ہمارے لیے بھی بڑی قیمتی ہے۔'' ماں پھر ماں تھی۔ ایک دم شعلے سے شبنم بن گئی۔ بے حد پیار سے بولی۔ ''کوئی ماں باپ نہیں چاہتے کہ اس کے بچے کا مستقبل تباہ ہو۔ کل اگر تو ڈاکٹر بن کر ہماری خواہش کی تکمیل کرے گا تو خود بھی عیش و آرام کی زندگی بسر کرے گا اور تیری بیوی اور بچے بھی خوشگوار زندگی بسر کریں گے۔''

ماں کی باتوں کا کوئی جواب دینے کی بجائے وہ گھر سے باہر چلا گیا۔

''ارے...... ارے ناشتا تو کر کے جا......'' ماں نے ہانک لگائی مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ماں کا دل مسوس کر رہ گیا۔

شام کو زیارت حسین گھر آئے تو بیوی کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر بولے۔ ''کیا بات ہے تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟''

زہرہ خاتون جواب تک اپنے آپ کو سنبھالے ہوئی تھیں، ایک دم رو پڑیں۔ زیارت حسین مزید پریشان ہو گئے۔ ان کے پاس جا کر انہیں سنبھالتے ہوئے بولے۔ ''کہیں سے کوئی بری خبر تو نہیں آئی؟''

زہرہ خاتون نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

''پھر کیا بات ہے؟''

اب انہوں نے ساڑی کے آنچل سے اپنے آنسو خشک کیے اور بیٹے کے باغیانہ خیالات کے بارے میں وہ ساری باتیں بتا دیں جو اس نے کہی تھیں۔ زیارت حسین اداس ہو گئے۔

رتن کمار ہماری فلمی تاریخ کا گم گشتہ ستارہ ہے۔ مگر میں اس مفروضے کو تسلیم نہیں کرتا۔ رتن کمار کو میری نسل کبھی بھلا نہیں سکتی۔ گو وہ قدرے کم مقبول اداکار رہے مگر ان کی فنکارانہ بولی اور اداکاری بھلائی نہیں جا سکتی۔ وہ بطور فنکار طفل (چائلڈ آرٹسٹ) کے زیادہ مقبول ہوئے۔ بے بی ناز اور تبسم کے ساتھ ان کی اداکاری یادگار ہے۔ مگر وہ بحیثیت ہیرو اتنے کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ مقبول اور اچھا چائلڈ آرٹسٹ آگے چل کر بہت کم ہی کامیاب اداکار بنتا ہے۔

رتن کمار کا اصل نام نذیر رضوی ہے۔ ان کی پیدائش 19 مارچ 1941 کو اجمیر شریف، راجستھان میں ہوئی۔ رتن کمار جتنے بڑے اداکار ہیں اتنے اچھے انسان بھی ہیں۔ وہ ایک ایسے فنکار ہیں جو فلم اور اداکاری کی جزیات کو ہنر مندی کے ساتھ سمجھتے بھی ہیں۔ ان کے سے میری یادیں فلم ''بیداری، ناگن، اور داستان کے حوالے سے جڑی ہوئی ہیں اور آج بھی میرے ذہن و دماغ میں رچی بسی ہیں۔

وہ نو سال کی عمر میں اپنے خاندان کے ساتھ اجمیر شریف سے بمبئی آ گئے تھے۔ ان کے والد صاحب کرکٹر تھے۔ وہ 1932 کی ہندوستانی کرکٹ ٹیم کا حصہ بھی رہے۔ ان کے بڑے بھائی وزیر علی بھی کرکٹر تھے۔ رتن کمار بھی اچھے کرکٹر تھے۔ ان کی دوستیاں فلمی لوگوں سے کم اور کرکٹ کے کھلاڑیوں سے زیادہ رہیں۔

ماضی کے پاکستانی کرکٹرز حسیب احسن، نسیم الغنی اور مشتاق محمد ان کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔

رتن کمار نے مجھے بتایا کہ افسانہ نگار کرشن چندر ان کے والد سلطان عباس صاحب کے قریبی دوست تھے۔ وہ ان دنوں فلم ''راکھ'' بنا رہے تھے۔ کرشن چندر نے اس فلم میں بچے کے ایک کردار کے لیے رتن کمار کو منتخب کر لیا۔ یہ ان کی پہلی فلم تھی۔

''وہ ہے کہاں؟''

''صبح کا گیا، ابھی تک نہیں آیا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد جب وہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو گئے تو بیوی نے ان کے سامنے کھانا لا کر رکھا۔ دال بھات اور مچھلی کا سالن۔

''تم نہیں کھاؤ گی؟''

''تم کھا لو۔ میرا جی نہیں چاہتا۔ پتا نہیں اس نے کچھ کھایا پیا ہے یا......''

زیارت حسین نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور کھانا شروع کر دیا۔ کھاتے کھاتے بولے۔ ''اب وہ بچہ نہیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ہر ماں باپ کی طرح ہم جو کچھ اس کے بہتر مستقبل کے لیے کر سکتے تھے کیا۔''

''وہ نادان ہے۔ ناسمجھ ہے۔ اسے سمجھاؤ۔''

''ہم اسے زور زبردستی ڈاکٹر نہیں بنا سکتے۔ وہ خود جو بننا چاہتا ہے اسے بننے دو۔''

''مگر......اس طرح تو اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ لوگ ہمیں اس کا ذمہ دار قرار نہیں دیں گے کہ کیسے ماں باپ تھے، بیٹے کو تباہی کے غار میں گرنے سے نہیں بچایا؟''

زیارت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کھانا کھا کر اخبار پڑھنے بیٹھ گئے۔ زہرہ برتن سمیٹ کر رسوئی گھر چلی گئیں۔

دن بھر کی محنت مشقت کی وجہ سے زیارت حسین تھکے ہوئے تھے۔ اخبار کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد بستر پر جا کر دراز ہو گئے۔ زہرہ رسوئی سے جھوٹے برتن دھو کر باہر آئیں تو دیکھا عطا کے بابا بستر پر خراٹے لے رہے ہیں۔ ان کا دل بھی چاہا کہ لیٹ کر دن بھر کی تھکن دور کریں مگر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔ بیٹھ کر بیٹے کا انتظار کرنے لگیں۔ جانے کتنی دیر بعد انہیں اس کا اندازہ نہیں ہوا۔ عطا کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ ممتا کی ماری ماں اٹھی۔ رسوئی گھر گئی۔ ذرا دیر بعد واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں بیٹے کے لیے کھانا تھا۔ عطاء اپنے بستر پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

''چل اٹھ۔ کھانا کھا لے۔''

''تم کیا سمجھتی ہو ماں۔ کیا میں اپنا پیٹ خود نہیں بھر سکتا؟''

''مگر میں تو تیرے انتظار میں بھوکی پیاسی بیٹھی ہوں کہ تو کھالے گا تو میں بھی کھا لوں گی۔''

''تم کھا لو ماں، میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کروٹ بدل کر ماں کی طرف پیٹھ کر لی۔

تھوڑی دیر بعد زہرہ کھانا لے کر رسوئی گھر میں داخل ہوئی۔ کھانا سمیت برتن رکھ کر واپس آ گئی اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے ان کی آنکھ دیر سے کھلی۔ ہڑبڑا کر اٹھیں۔ زیارت حسین کے کمرے میں

انہوں نے راج کپور، مدھو بالا، کامنی کوشل، ثریا جی، رکیش مکرجی، کاردار اور محبوب خان کے ساتھ کام کیا۔ انہوں نے راج کپور (جن کو وہ 'راج بھیا' کہتے تھے) کے متعلق بتایا کہ وہ سخت محنتی، صاف گو، رحم دل، سادہ دل اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ بقول رتن کمار "میں نے آج تک راج بھیا سے بڑا "شومین" نہیں دیکھا۔ انہیں ہندی اردو بہت اچھی آتی تھی مگر وہ اردو کو فوقیت دیتے تھے اور اردو میں اسکرپٹ لکھواتے تھے۔" رتن کمار نے بھی اپنی ہر فلم میں اردو اسکرپٹ کا ہی انتخاب کیا۔ مدھو بالا کے متعلق بتایا کہ وہ طبیعت میں بہت سادہ اور مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتی تھیں، خوب صورت اداکارہ تھیں اور ڈوب کر اداکاری کرتی تھیں۔ رتن کمار نے وادیا صاحب کی فلم "بالم" میں واسطی اور ثریا کے ساتھ کام کیا۔

ممبئی میں ان کا قیام باندرہ / پالی ہل میں رہا۔ رتن کمار کے والد پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان اور سیاست دان عبد الحفیظ کاردار کے کہنے پر لاہور چلے گئے کیونکہ کاردار نے ان کے بھائی وزیر علی کو پاکستان کی کرکٹ ٹیم میں شمولیت کا یقین دلوایا تھا۔ مگر وزیر علی پاکستان کی کرکٹ میں شامل نہ ہو سکے۔ رتن کمار نے 15 سال کی عمر میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ 1956 میں پاکستان نقل مکانی کی۔ پاکستان آ کر فلم "بیداری" میں ناقابل فراموش اداکاری کی۔ یہ فلم 6 دسمبر 1957 میں ریلیز ہوئی۔ اصل میں یہ بھارتی فلم "جاگرتی" کا چربہ تھی۔ "بیداری" حب الوطنی پر مبنی ایک خوبصورت اور ولولہ انگیز فلم تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تھی تو حکومت پاکستان نے اس فلم پر ٹیکس معاف کر دیا تھا اور کراچی کے اسکولز کے بچے گروپ کی صورت میں یہ فلم دیکھنے جاتے تھے۔ راقم الحرف نے یہ فلم کراچی میں مشن روڈ پر 'قسمت' سینما میں دیکھی تھی۔ اس فلم میں رتن کمار کا ہیر اسٹائل بہت مقبول ہوا اور ہر بچہ اور نوجوان اپنے بالوں کو اسی طرز پر سنوارتا تھا۔ "بیداری" کی موسیقی فتح علی خان نے دی تھی۔ منور

گئیں۔ وہ بستر پر نہیں تھے۔ "اوہ! وہ بغیر کچھ کھائے پیئے دھندے پر چلے گئے۔" ذرا دیر بعد وہ بیٹے کے کمرے میں گئیں کہ اس کو ناشتا کرنے پر رضا مند کر لوں۔ وہ بھی اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ واپس لوٹ رہی تھیں کہ بستر پر میڈیکل کی ایک موٹی کتاب سے دبا ہوا ایک کاغذ نظر آیا۔ جھپٹ کر اسے اٹھایا۔ اس پر لکھا تھا۔

ماں!

میں جا رہا ہوں تم لوگوں کے گھر سے۔ اب اس وقت لوٹوں گا جب کچھ بن جاؤں گا، تم لوگوں کے حسین خوابوں کے مطابق شاندار زندگی گزارنے کے قابل بن جاؤں گا۔

عطاء الرحمٰن

ماں کلیجہ تھام کر بیٹھ گئی۔ وہ چیخ کر چلا کر رونا چاہتی تھی مگر اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ انہیں پورا کمرا چکر کھاتا ہوا محسوس ہوا اور پھر ہر طرف تاریکی چھا گئی۔

پڑوس کے گھر سے ایک لڑکی آئی تھی۔ "خالہ! ذرا اپنی بیٹھی تو دو ماں مچھلی بنا لے گی تو واپس لے آؤں گی۔"

مگر خالہ کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تو "اوہو...... کہاں ہو خالہ؟" کہتی ہوئی وہ انہیں ڈھونڈنے لگی۔ پھر اس کی نظر ایک کمرے میں گئی جہاں خالہ فرش پر لمبی لیٹی ہوئی نظر آئیں۔ "ارے خالہ نیچے زمین پہ کیوں سو رہی ہو؟"

مگر خالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بے حس و حرکت ہی رہی تو لڑکی ڈر کر بھاگی اور ماں کو جا کر بتایا۔ "خالہ تو شاید مر گئی ہے۔"

"کیا بک رہی ہے جمیلہ۔"

"وہ ایک کمرے میں زمین پر پڑی ہے۔ میری آواز پر بھی نہیں اٹھی۔ شاید مر گئی ہے۔"

پڑوسن بیٹی کے ساتھ بھاگتی ہوئی زہرہ کے پاس پہنچی۔ دیکھا تو وہ واقعی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ غور سے دیکھا تو سانس چل رہی تھی۔

"ارے، یہ تو بے ہوش ہیں۔ جمیلہ! بھاگ کر تھوڑا پانی تو لا۔"

جمیلہ نے پانی لانے میں دیر نہیں لگائی۔ پڑوسن نے زہرہ خاتون کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور انہیں آوازیں دیں۔ ذرا دیر بعد ان کی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے پڑوسن اور ان کی بیٹی کو اپنے قریب دیکھا تو کراہتی ہوئی اٹھ بیٹھیں۔

"کیا ہوا تھا تمہیں؟"

"شاید سر چکرایا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا کچھ پتا نہیں۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ......"

"یہ جمیلہ آپ کی بیٹھی لینے آئی تھی کہ آپ کو فرش پر پڑا دیکھا۔"

"شکریہ! آپ نہ آتیں تو جانے کب تک بے ہوش

سلطانہ، سلیم رضا نے گلوکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ فیاض ہاشمی نے اس کے گانے لکھے تھے جو بہت مقبول ہوئے۔ چند گانوں کے بول ملاحظہ کریں۔

☆ اے قائداعظم تیرا احسان ہے تیرا احسان

☆ ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے

☆ آؤ بچوں سیر کرائیں تم کو پاکستان کی

اس کے بعد رتن کمار نے سترہ (17) فلموں میں کام کیا۔ ان کی پسندیدہ فلموں میں، چھوٹی امی، بوٹ پالش اور داستان شامل ہیں۔ ''بوٹ پالش'' میں ان پر فلمایا ہوا گانا'' ننھے منے بچے تیری مٹھی میں کیا ہے'' اپنے زمانے کا سب سے مقبول گانا تھا۔ 'بوٹ پالش' میں راج کپور نے مرکزی کردار ادا کیا تھا اور اس کے ہدایت کار پرکاش اروڑا تھے۔ فلم میں رتن کمار نے 'بھولا' اور بے بی ناز نے بیلو کا کردار ادا کیا تھا۔

رتن کمار کی فلموں کی فہرست یوں بنتی ہے۔

1951 کیا افسانہ، بزدل...... 1952، بیجو باورہ، موتی محل...... 1953، درد دل، دو بیگھے زمین، لیلی مجنوں، نیا گھر، دیوانہ...... 1954، جاگروتی، بہت دن ہوئے، راوھا کشن، بھاگیوان، انگارے، بوٹ پالش...... 1955، ایک کاوش...... یہاں سے رتن کمار کی پاکستانی فلموں کا دور شروع ہوتا ہے...... 1957، بیداری، معصوم...... 1958، واہ رے زمانے...... 1959، ناگن...... 1960، الہ دین کا بیٹا، دو استاد، کلرک، نیلوفر...... 1961، تاج اور تلوار، غازی ابن عباس...... 1962،

پڑی رہتی۔''

ماں بیٹی بیٹھی رہ کر چلی گئیں تو وہ بیٹے کے بستر پر ڈھیر ہوگئیں۔

زیارت حسین بیوی کے بارے میں بہت فکر مند تھے۔ بیٹے کے سلوک سے ماں کو جو صدمہ ہوسکتا تھا، اس سے وہ واقف تھے، اس لیے ان کا دل کام میں نہیں لگا اور وہ ظہر کی نماز پڑھ کر گھر واپس آگئے۔ گھر آکر بیوی کو تلاش کیا تو وہ بیٹے کے کمرے میں بے ہوشی کی حالت میں ملیں۔ ان کی مٹھی میں کوئی چیز نظر آئی۔ مٹھی کھول کر دیکھا تو کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ ماں کے نام بیٹے کا دوسطری خط تھا۔

ان کے منہ پر انہوں نے پانی کے چھینٹے مارے تو انہیں ہوش آگیا۔ آنکھیں کھولیں تو میاں کو اپنے اوپر جھکا دیکھا۔ ''وہ میرا سر چکرایا تھا اور......''

''کھاؤ کی پیو گی نہیں تو چکر تو آئے گا۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ''وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔''

''اچھا ہوا چلا گیا۔ نہیں جاتا تو میں اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔''

زہرہ خاتون نے چونک کر میاں کو دیکھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''وہی جو مجھے کہنا چاہیے۔ اس کی قسمت میں ہی اگر ٹھوکر لکھی ہے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ اس کے لیے اگر آنسو بہاؤ گی تو میں بھی گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

زہرہ نے گھور کر شوہر کو دیکھا۔ اس لہجے میں کبھی انہوں نے بات نہیں کی تھی۔

''جو بھی دال بھات کل کا بچا ہوا ہے لے کر آؤ۔ مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔'' وہ صبح جاتے وقت رات کے بچے ہوئے بھات کی پتیلی میں پانی ڈال گئے تھے کہ چاول خراب نہ ہو۔ بنگالی رات کے بچے ایسے چاول کو پانتا بھات کہتے ہیں جو نمک اور بھنے ہوئے سرخ مرچوں کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔

زہرہ خاتون یہ سوچ کر اٹھیں کہ رات کا بھات تو خراب ہوگیا ہوگا۔ کچھ نیا ہی پکانا پڑے گا مگر چاول کی پتیلی کھولی تو پانی میں ڈوبے چاول کو دیکھ کر سمجھ گئیں کہ پانی ان ہی نے ڈالا ہوگا وہ جلدی سے مرچیں جلا کر پانتا بھات لے کر آئیں تو زیارت حسین بولے۔

''میں اکیلے نہیں کھاؤں گا۔ میرے ساتھ تمہیں بھی کھانا پڑے گا۔ ورنہ......''

☆......☆

ڈھاکا میڈیکل کالج کا طالب علم عطاء الرحمن میڈیکل کالج کی تعلیم سے فرار اختیار کر کے گھر سے نکلا تو سیدھے بمبئی پہنچ گیا۔ ڈھاکے میں اس کے گانے بجانے کے سنگی ساتھی اس سے کہتے تھے۔ ''اگر تو اپنے شوق کی تکمیل کرنا چاہتا ہے، گا بجا کر کچھ بننا چاہتا ہے تو بمبئی چلا جا۔ وہاں بہت بڑی فلم انڈسٹری ہے۔ وہاں کلاکاروں کو آگے

حسن و عشق...... 1963، بارات، سمیرا، شیر اسلام...... 1964، چھوٹی امی...... 1965، گوپال کرشنا......
1966، امر پالی...... 1966، اسرا، داستان۔
رتن کمار نے فلم "داستان" بنائی۔ اور ہدایت کاری کے فرائض بھی خود ہی سر انجام دیے۔ اس فلم میں فیاض ہاشمی کا لکھا ہوا گانا جس کی موسیقی خلیل احمد نے ترتیب دی تھی بہت مقبول ہوا۔ گانے کے بول تھے۔ قصہ غم میں تیرا نام نہ آنے دیں گے، ہم تیرے پیار پہ الزام نہ آنے دیں گے۔
جس زمانے میں حسن طارق اور ان کی بیوی رانی کے درمیان سنگین نوعیت کے ازدواجی زندگی کے جھگڑے جاری تھے۔ وہ اس دوران اپنی فلم "بیگم جان" بنا رہے تھے گھریلو پریشانیوں کے سبب حسن طارق فلم کو وقت نہ دے پا رہے تھے تو رتن کمار نے اس فلم کو مکمل کرنے میں حسن طارق کی بھرپور مدد کی۔ "بیگم جان" کی کہانی پاکستان میں پٹھان عورتوں کے گھر گھر جا کر اسمگل شدہ کپڑے بیچنے والی عورتوں کی کہانی پر محیط تھی۔ اس فلم میں رانی نے بیگم جان کا کردار ادا کیا تھا۔ اس زمانے میں شاعر احمد فراز پاکستان سنسر بورڈ کے کرتا دھرتا تھے۔ انھوں نے اس فلم کو دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کیا اور اس پر کئی اعتراضات کرتے ہوئے فلم کو ریلیز کی اجازت نہیں دی۔ مگر فیض احمد فیض کے سمجھانے بجھانے پر احمد فراز "بیگم جان" کو ریلیز کرنے پر آمادہ ہو گئے۔
1977 میں رتن کمار کی ساڑھے چار سالہ بچی سڑک کے حادثے میں اللہ کو پیاری ہو گئی (اللہ پاک مغفرت فرمائے) جس نے انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور وہ فلمی دنیا سے دل برداشتہ ہو کر جرمنی چلے گئے۔ 16-12-12 کو کیلی فورنیا امریکا میں انتقال کر گئے۔

بڑھنے، کچھ کرنے کا موقع ملتا ہے۔"
یہ 1949ء کا سال تھا۔ جب نوجوان عطاء الرحمٰن بمبئی پہنچا تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد جیوتی اسٹوڈیو میں کیمرا مین جلال ایرانی کی زیر نگرانی اسے کام کرنے کا موقع ملا۔ جلال ایرانی نے اسے اپنا شاگرد بنا لیا اور فوٹو گرافی کے اسرار و رموز سکھانے لگا مگر اس کام میں اس کا جی نہیں لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ "میں کس مقصد کے لیے بمبئی آیا تھا اور یہاں آ کر کس گورکھ دھندے میں پھنس گیا؟"
اور پھر اگلے سال یعنی 1950 میں ایک دن وہ چپکے سے بمبئی کو خیر باد کہہ کر کراچی آ گیا۔ کراچی آ کر اس نے ریڈیو پاکستان کراچی میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ یہاں اس کی ملاقات فتح لوہانی سے ہوئی۔ وہ بھی ایک بنگالی تھے اور ریڈیو پاکستان کے صداکاری کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ بنگالی بابو کی تھوڑی سی سفارش کے بعد عطاء الرحمٰن کا آڈیشن ہوا جس میں وہ کامیاب ہوا اور اسے بنگالی خبریں پڑھنے کے لیے بطور براڈ کاسٹر منتخب کر لیا گیا۔ یہ اس کی پہلی ملازمت تھی جو اس کے لیے ایک سہارا ثابت ہوئی۔ بمبئی میں جلال ایرانی اسے کوئی تنخواہ نہیں دیتے تھے۔ بس اس کے کھانے پینے اور سر چھپانے کا بندوبست اپنی نگرانی میں کر دیا تھا۔
ریڈیو پاکستان کراچی میں بنگالی بابو فتح لوہانی نے اس کی بڑی مدد کی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ نوجوان گاتا بھی ہے تو اسے گانے کے پروگرام بھی دلوانے لگے۔
جب ڈھاکے میں فلمیں بننے لگیں تو فتح لوہانی نے بطور اداکار اور ہدایت کار بہت سی فلموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا مگر یہ بہت بعد کی بات ہے۔
عطاء الرحمٰن نے جب ریڈیو سے گلوکاری شروع کی تو سارنگی نواز استاد جواہری خان نے اس نوجوان سے کہا۔ "گانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ سر سنگیت کے اسرار و رموز سے آگاہ ہو۔"
"مجھے تو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ مجھے گانے کا شوق تھا۔ میں خود ہی گانے لگا۔"
"اگر اچھا گلوکار بننا چاہتے ہو تو کسی استاد سے گانے کی تربیت حاصل کرو۔"
"یہاں تو میں کسی استاد کو نہیں جانتا۔ آپ کو بھی تو لوگ استاد جواہری خان کہتے ہیں۔ آپ ہی مجھے کچھ بتائیں کچھ سکھائیں۔"
وہ اچھا دور تھا۔ اچھے لوگ تھے۔ اس سیدھے سادے اور بھولے بھالے بنگالی نوجوان کو استاد جواہری خان نے مایوس نہیں کیا اور اپنی شاگردی میں لے کر اسے سر سنگیت کے بارے میں بتانے اور سکھانے لگے۔
بعد میں یہ جو عطاء الرحمٰن کے نام کے آگے "خان" کا اضافہ ہے شاید یہ جواہر خان ہی کے حوالے سے ہے ورنہ ان کے آباؤ اجداد میں تو کوئی بھی خان نہیں تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں عطاء الرحمٰن نے گانے بجانے کی معقول تربیت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ ریڈیو کے براڈ کاسٹر کے علاوہ گلوکار کی حیثیت سے بھی پروگراموں میں شرکت کرنے لگا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ بنگالی بابو فتح لوہانی کراچی سے لندن چلے گئے۔ وہاں انہیں بی بی سی میں بطور صداکار بہتر چانس ملا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے عطاء الرحمٰن کو بھی لندن بلا لیا۔ وہ بھی بی بی سی کے پروگراموں میں حصہ لینے لگا۔ اس نے وہاں بنگالی زبان میں گلوکاری اور صداکاری کر کے خاصی عزت اور شہرت حاصل کی۔

لندن میں کئی مشہور تھیٹر کمپنیاں ہیں جو سال بھر تک ڈرامے اسٹیج کرتی ہیں۔ خان عطاء کو بھی تھیٹر میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوا اور ایک تھیٹر کمپنی میں بطور اداکار بھی کام کرنے لگا۔ یہ 1959ء کی بات ہے اداکاری کے استادوں کا کہنا ہے کہ جو اسٹیج پر اداکار کی حیثیت سے کامیاب ہو گیا اس کے لیے کسی بھی دوسرے فارمیٹ میں پرفارمنگ آسان ہو جاتی ہے۔ لندن کے اسٹیج ڈراموں میں کام کر کے اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کو جلا حاصل کرنے کا خوب موقع ملا۔ بی بی سی اور لندن کے اسٹیج سے اسے گلوکاری، صداکاری اور اداکاری کی زیادہ سے زیادہ تربیت حاصل کرنے کا بہترین موقع ملا۔ اس کا بنیادی شوق گلوکاری تھا مگر جب اسے صداکاری اور اداکاری سیکھنے کا موقع ملا تو اس نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ اس کی تربیت حاصل کی۔ یہ سوچ کر کہ گلوکاری تو پرفارمنگ کا ایک شعبہ ہے اگر صداکاری اور اداکاری کے ذریعے بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملے گا تو مجھے زیادہ فائدہ ہوگا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ”وقت کرتا ہے پرورش برسوں حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔“

قدرت کو شاید اس جواں سال کلاکار سے بہت کام لینا تھا۔ اسے آنے والے دنوں میں ایک مہان فنکار بنانا تھا، اس لیے اس کے لیے نت نئے دروازے کھلتے گئے۔ وہ ناپختہ اور ناتجربہ کار نوجوان تجربوں اور آزمائشوں کی آنچ میں پک کر کندن بنتا رہا۔

☆......☆

1956ء کی بات ہے۔ ڈھاکے میں بھی کچھ لوگوں کو فلمسازی کا خیال آیا۔ جن میں ایک صاحب خان عبدالجبار خان بھی تھے۔ یہ صاحب دراصل فلموں کے ایک تقسیم کار تھے۔ جو کلکتے کی بنگالی فلمیں اور لاہور اور کراچی کی اردو فلموں کے حقوق حاصل کر کے تقسیم کاری کا کاروبار کرتے تھے۔ عبدالجبار خان نے اپنے اس خیال کا اظہار اپنے کچھ دوستوں سے کیا۔

”خیال تو اچھا ہے۔“ ان کے دوستوں نے کہا۔ ”مگر فلم بناؤ گے کیسے؟“

”جیسے سب بناتے ہیں۔“

”ارے یار! سب تو تب بناتے ہیں جب انہیں فلم بنانے کے ساز و سامان میسر ہوتے ہیں اور یہ ساز و سامان انہیں فلم اسٹوڈیو سے ملتا ہے۔ یہاں نہ کوئی اسٹوڈیو ہے نہ فلم بنانے کی بنیادی چیزیں۔“

”بنیادی چیزوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”جبار میاں! بنیادی چیزوں سے مراد کیمرا، ساؤنڈ مشین وغیرہ ہے۔“

دوستوں نے خان عبدالجبار خان کو جن باتوں کی نشاندہی کرائی تھی وہ واقعی قابلِ غور تھی۔ اس وقت ڈھاکے یا مشرقی پاکستان کے کسی اور شہر میں نہ کوئی نگار خانہ تھا نہ فلمسازی کے ساز و سامان تھے۔ اس کے باوجود خان صاحب کے سر میں فلم بنانے کا جو بھوت سوار ہو گیا تھا اس نے انہیں نچلا بیٹھنے نہیں دیا۔

انہوں نے سب سے پہلے اپنی فلم کی ایک کہانی خود ہی لکھی کہ کہانی تیار ہوگی تو فلم سازی کے ساز و سامان ملتے ہی شوٹنگ شروع کر دیں گے۔ انہوں نے جرمنی کے دو سر پھرے نوجوانوں کا قصہ سن رکھا تھا کہ انہوں نے بھی بے سر و سامانی کے باوجود ایک فلم ”بائیسائیکل تھیف“ بنائی تھی جس نے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی تھی۔

دھن کے پکے خان عبدالجبار خان نے بھی ایک کیمرا اور ساؤنڈ مشین کے حصول کے لیے جانے کیا کیا کچھ نہیں کیا۔ کسی نہ کسی طرح جب وہ شوٹنگ کے قابل ہوئے تو انہوں نے بدقت تمام ایک فلم بنا لی۔ یہ ان کی بنگالی فلم ”مکھ و موکوش“ (چہرہ اور نقاب) تھی۔ یہ ڈاکوؤں کی کہانی تھی۔ جو مکمل طور پر آؤٹ ڈور لوکیشن میں عکس بندی کی گئی تھی مگر نہ عکاسی صحیح طور پر ہوئی تھی نہ صدابندی۔ عکاسی دھندلی اور صدابندی کا یہ معیار کہ اداکاروں کی آواز سے زیادہ چیل کوؤں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ناقص اور ناکارہ کیمرا اور ساؤنڈ مشین وغیرہ سے جو کچھ ہو سکتا تھا ہوا۔ تمام تر نقائص سے بھرپور ہونے کے باوجود سنیما گھر میں اس کی نمائش ہوئی

تو مشرقی پاکستان کی پہلی بنگالی فلم ہونے کے ناطے اس کی پذیرائی ہوئی اور خان عبدالجبار خان کو اس فلم کا فلمساز و ہدایت کار ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

''مکھ وموکوش'' کی تکمیل کے بعد ڈھاکے کے فلم ٹریڈ سے متعلق لوگوں نے اجتماعی طور پر اس بات کی کوشش شروع کردی کہ یہاں باضابطہ فلمیں بننی چاہیے اور اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کی حکومت کو بھرپور تعاون کرنا چاہیے۔

حکومت نے اس سلسلے میں فلم ڈیویلپ کارپوریشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اس کے تحت ایک جدید اسٹوڈیو بنایا جو ایف ڈی سی اسٹوڈیو کے نام سے مشہور ہوا اور وہاں باضابطہ فلم سازی شروع ہوئی اور ڈھاکے کو پاکستان کا تیسرا فلمی مرکز قرار دیا گیا۔

خان عبدالجبار خان کے علاوہ دیگر فلم تقسیم کاروں نے بھی فلم سازی شروع کردی جیسے کیپٹن احتشام اور ان کے بھائی مستفیض نے۔ ان کا تقسیم کار ادارہ لیو فلمز فلم سازی کے میدان میں کودا۔ اسی طرح اسٹار سینما والوں نے بھی فلم سازی میں سرمایہ کاری شروع کردی۔ ابتداء میں ساری فلمیں بنگالی زبان میں بنائی گئیں اور پڑھے لکھے اور باشعور لوگ اس کام میں حصہ لینے لگے۔

بی بی سی کے ذریعے ڈھاکے میں نیا فلمی مرکز قائم ہونے اور باضابطہ فلمیں بننے کی خبریں نشر ہونا شروع ہوئیں تو لندن میں مقیم خان عطاء الرحمٰن کو اپنے جنم بھومی کا خیال آیا۔

''اب تو میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ اپنے دیس میں کچھ کرسکوں۔'' خان عطاء الرحمٰن نے سوچا اور پھر اپنے محسن بنگالی بابو فتح لوہانی سے مشورہ کیا۔

''ہاں، جاؤ۔ ابھی وہاں تمہارے جیسے تجربہ کار فنکاروں کی ضرورت ہے۔''

اس موقع پر انہیں اپنے والدین کی بھی یاد آئی۔ ''ہاں اب میں کسی قابل بن گیا ہوں کہ یہ ثابت کرسکوں کہ دیکھو میں نے اپنی پسند سے جو راستہ اختیار کیا اس میں بھی کامیاب زندگی بسر کرسکتا ہوں۔''

اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہے کہ عطاء نے بمبئی پہنچ کر وہاں سے خط بھیجا تھا کہ میں بمبئی میں ہوں۔ پھر جب کراچی آیا تو کراچی سے خط لکھا کہ میں ان دنوں کراچی میں ہوں پھر جب لندن چلا گیا تو وہاں سے بھی اطلاع بھجوائی کہ میں لندن میں مقیم ہوں مگر کسی بھی خط میں اپنا پتا نہیں لکھا

## خان عطا کی جیون کہانی ایک نظر میں

نام: عطاء الرحمٰن

ولادت: 11 دسمبر 1928ء

والد: زیارت حسین

والدہ: زہرہ خاتون

تعلیم: میڈیکل کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔

سفر: بمبئی، کراچی اور پھر لندن میں تھوڑے عرصے قیام کیا۔

پہلی فلم: جاگو ہوا سویرا، بطور ہیرو۔

شادی: تین شادیاں کیں۔ پہلی لندن میں ایک انگریز لڑکی شرلی سے۔ طلاق ہوگئی۔ دوسری گلوکارہ محبوبہ حسنات سے۔ تیسری نیلوفر یاسمین سے۔

اولاد: پہلی بیوی سے ایک بچہ۔ دوسری سے ایک بیٹی پیدا ہوئی، رومانہ اسلام۔ تیسری سے ایک بیٹا آگون پیدا ہوا۔ جو اداکار اور گلوکار بنا۔

فنی کیریئر: اداکار، گلوکار، نغمہ نگار، موسیقار، مصنف، فلمساز، ہدایت کار اور تقسیم کار کے طور پر فنی سفر جاری رکھا۔

سیاسی سرگرمیاں: بنگلہ دیش پارلیمنٹ کے دو بار ممبر منتخب ہوئے۔ ایک بار 1973ء میں، دوسری بار 1979ء میں۔ 1984ء میں صدر ارشاد حسین کی حکومت میں بھی شامل رہے۔

آخری فلم: ذاتی فلم ''ایکھونو انیک راست'' 1988ء میں ریلیز ہوئی۔

وفات: یکم دسمبر 1997ء بمقام ڈھاکا۔

### ذاتی فلمیں

بنگالی زبان کی: (1) اونیک دنیر چینا (2) جانا جانی (3) سات بھائی چمپا (4) جوار بھاٹا (5) ارن بورن کرن مالا (6) جھٹر پنچھی (7) ایکھونو انیک رات۔

### اردو فلمیں

(1) نواب سراج الدولہ (2) سوئے ندیا جاگے پانی

گلوکارہ شہناز بیگم اور گلوکارہ شبینہ یاسمین کو بطور پلے بیک سنگر اپنی فلموں کے ذریعے متعارف کرایا جو آج ٹاپ گلوکارہ کی حیثیت سے بنگلہ دیش کی فلموں کے لیے اپنی خدمات پیش کررہی ہیں۔

تھا۔
جن دنوں خان عطا ڈھاکے واپس آیا ہے انہی دنوں ''جاگو ہوا سویرا'' کے لیے مقامی آرٹسٹوں کا انتخاب ہو رہا تھا۔ خان عطاء الرحمٰن بھی پہنچ گیا۔
انٹرویو میں اس سے پوچھا گیا۔ ''تم بنگالی ہو؟''
''جی ہاں۔''
''مگر یہ فلم اردو زبان میں بنائی جا رہی ہے۔ تم اردو مکالمے بول سکو گے؟''
''جی ہاں۔ بہت اچھی طرح۔'' اس نے اردو میں جواب دیا۔
''ارے واہ! تم تو بہت اچھی اردو بول لیتے ہو۔ کہاں سیکھی؟''
''کچھ بمبئی میں، کچھ کراچی میں اور کچھ لندن میں۔''
''ماشاء اللہ تم تو......''
''جی ہاں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہوں۔'' اس نے فیض صاحب کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔
پھر جب اس سے بمبئی کراچی اور لندن کے بارے میں تفصیل معلوم کی گئی تو فیض صاحب اور اے جے کاردار بہت متاثر ہوئے۔ ''تم نے بی بی سی کے علاوہ لندن کے تھیٹر میں بھی کام کیا؟''
''جی ہاں۔''
انہوں نے لندن کے تھیٹروں کے بارے میں جو سوالات کیے خان عطا نے تسلی بخش جواب دیئے۔ اس سے بنگالی، اردو اور انگریزی کے مکالمے بلوائے گئے۔ اس نے اپنی صداکاری کا بہترین مظاہرہ کیا۔ اداکاری کے لیے جتنے بھی لوگ انٹرویو میں شریک ہوئے۔ ان میں عطاء الرحمٰن اوّل نمبر پر آیا اور اسے اس فلم کے مرکزی کردار کے لیے چن لیا گیا۔
فیض صاحب اور اے جے کاردار نے اپنی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' میں اسے انیس کے نام سے متعارف کرایا مگر اس فلم کے بعد اس نے انیس کی بجائے اپنے اصل نام خان عطاء الرحمٰن ہی کو شوبز کی دنیا میں اپنایا اور اسی نام سے آخری دم تک اپنی شناخت برقرار رکھی۔
ڈھاکا کے معروف تقسیم کار کیپٹن احتشام نے جب اپنی پہلی فلم ''اے دیش تمار آمار'' (یہ وطن تمہارا ہمارا) شروع کی تو اس کے لیے بھی خان عطاء الرحمٰن کا بطور ہیرو انتخاب کیا۔ اس کے مقابل سمیتا دیوی ہیروئن اور اداکار رحمٰن ولن کی حیثیت سے کاسٹ کیے گئے۔ مصباح الدین، سبھاش دتہ، مادھوری چٹرجی، شاہ جہاں، سلطانہ محی الدین، امیر علی حیدر، پینا اور طارق چوہدری دیگر کرداروں کے لیے منتخب کیے گئے جب کہ ایک ملی نغمہ کے کورس میں اداکارہ شبنم بھی جو اس وقت جھرنا کے نام سے مشہور تھیں بطور ایکسٹرا شریک ہوئی تھیں۔
اس فلم کی موسیقی بھی خان عطا نے کمپوز کی تھی، اس کے گیت بھی لکھے تھے اور دیگر سنگرز کے ساتھ خود بھی گائے تھے۔ دوسرے گانے والوں میں عبدالعلیم، فریدہ یاسمین، روشن آراء، فردوسی بیگم، محبوبہ رحمان، عبداللطیف، سہراب حسین، ریتا گھوش (روبن گھوش کی بہن) اور روبن گھوش شامل تھے۔ اس فلم کی عکاسی اے کیو زمان نے کی۔ کوریو گرافر جی ایم منان اور تدوین کار بشیر یسین اور مستفیض تھے۔ کہانی اور منظرنامہ فلم کے ہدایت کار نے خود لکھے تھے۔ مکالمے احتشام اور خان عطاء الرحمٰن نے مل کر لکھے تھے۔
خان عطاء الرحمٰن اپنی پہلی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' میں صرف اداکاری کے شعبے میں جلوہ گر ہوئے تھے مگر اپنی پہلی بنگلہ فلم ''اے دیش تمار آمار'' میں موسیقار، گیت نگار، مکالمہ نویس اور وطن پرست نوجوان کے روپ میں ہیرو کے طور پر اپنی فنی کارکردگی کا بہترین مظاہرہ کیا۔
''اے دیش تمار آمار'' 23 دسمبر 1958ء میں ریلیز ہوئی اور باکس آفس پر بہترین بزنس کیا۔
اپنی زبان کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے بنگالی اردو اور ہندی فلمیں دیکھنے پر مجبور تھے مگر جب انہیں اپنی مادری زبان میں فلم دیکھنے کو ملی تو اس کی دل کھول کر پذیرائی کی۔ اس فلم کی خاطر خواہ کامیابی کے بعد دوسرے فلم میکرز بھی میدانِ فلم سازی میں اترے۔
ظہیر ریحان جنہوں نے خان عطا کے ساتھ ہی ''جاگو ہوا سویرا'' سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ بھی فلم میکنگ کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ ان کی پہلی فلم بطور مصنف اور ہدایت کار کو کھوتو آشی نی (کبھی نہیں آؤں گا) تھی۔ انہوں نے بھی اس فلم کے مرکزی کردار کے لیے خان عطا کا انتخاب کیا دیگر آرٹسٹوں میں سمیتا دیوی، جھرنا، شاہ زیب، یوسف، انعام احمد، نارائن چکرورتی اور یوسف بشیر شامل تھے۔ اس فلم کی تدوین کاری لاہور کے نامور تدوین کار علی نے کی تھی۔ اسکرپٹ ظہیر ریحان نے خود لکھا تھا۔ خان عطاء الرحمٰن نے

اس فلم میں بھی گیت اور سنگیت کے شعبے سنبھالنے کے ساتھ ساتھ گلوکاری بھی کی تھی۔
اس فلم میں خان عطا کا گایا ہوا ایک گانا ”کوتو دور“ کلیم اشرفی نے بڑے چاؤ سے گایا تھا۔ اس فلم کا ایک اور گیت جسے خود خان عطا نے گایا تھا اور خود ان پر ہی فلمایا گیا تھا۔ خان عطاء الرحمٰن کی آواز میں ایک اور گانا ”دنیا بوڑوا پلومیلو“ بھی زبان زد عام ہوا تھا۔
اس فلم میں خان عطا اور سمیتا کی جوڑی کو بہت پسند کیا گیا تھا جب کہ جھرنا نے بھی چھوٹی بہن کے روپ میں ناظرین کی توجہ حاصل کی تھی۔ 1961ء میں یہ فلم نمائش پذیر ہوئی اور اس نے خاطر خواہ بزنس کر کے ظہیر ریحان کی ساکھ کو استحکام عطا کیا۔
بنگالی عام طور پر پڑھے لکھے اور باشعور ہوتے تھے۔ فلم سازی کو اپنانے والوں میں بھی بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ایسے ہی لوگوں میں فلم ساز و ہدایت کار صلاح الدین بھی تھے جو پیشے سے پروفیسر تھے اور کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کی پہلی فلم شور جواشان (سن باتھ یا غسل آفتابی) تھی جو اپنی کہانی، ہدایت کاری، اسکرپٹ اور منظر نامے کے لحاظ سے ایک مضبوط اور مربوط فلم ثابت ہوئی۔ اداکاری، گلوکاری میں بھی اس نے جس معیار کا ثبوت دیا، اب تک کی دیگر بنگالی فلمیں بہت کم تر نظر آئیں۔ پڑھے لکھے اور باشعور لوگوں نے اسے بنگالی زبان کی ایک بڑی اور بلند معیار کی فلم قرار دیا۔ اسے 1961ء کی بہترین بنگالی فلم کا نگار ایوارڈ ہی نہیں ملا بلکہ 1965ء میں منعقد ہونے والی فلمی میلے میں جوڈھاکے میں سرکاری طور پر انعقاد پذیر ہوا تھا۔ اس میں بھی اسے کئی ایوارڈز سے نوازا گیا تھا جن میں بہترین اسکرین پلے، بہترین گیت اور بہترین فلم کے اعزازات شامل تھے۔ اس فلم کی کاسٹ میں نسیمہ خان، انور حسین، نینا، سبھاش دتہ اور روشن آراء نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ انور حسین کی اداکاری عروج پر تھی۔ خان عطاء الرحمٰن نے ”شور جواشان“ میں بطور موسیقار اور گیت نگار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ بہترین گیت لکھنے پر انہیں بہترین گیت نگار تسلیم کرتے ہوئے سرکاری ایوارڈ سے نوازا گیا۔
اس فلم کے ہدایت کار صلاح الدین نے ایک نیا تجربہ بھی کیا، جو یہ تھا کہ اس بنگالی فلم میں ایک اردو گیت بھی شامل کیا۔ اس کی کمپوزیشن بھی خان عطا نے کی اور فردوس بیگم کی آواز میں اسے صدا بند کیا۔ گیت کے بول تھے۔

## بطور اداکار جن فلموں میں کام کیا

(1) جاگو ہوا سویرا (بطور ہیرو) (2) اے دیش تمار آمار (بطور ہیرو) (3) کوکھونو آشی نی (بطور ہیرو) (4) جے ندی ہورے پو تھے (بطور ہیرو) (5) سات بھائی چمپا (6) نواب سراج الدولہ (7) کانچیر دیال (بطور ہیرو) (8) چھوٹو ٹیر گھنٹا

## بطور موسیقار جن فلموں کی موسیقی ترتیب دی

اردو فلمیں: سنگم، بہانہ، مالا، ساگر، آخری اسٹیشن، نواب سراج الدولہ، سوئے ندیا جاگے پانی، قسم اس وقت کی۔
بنگالی فلمیں: اے دیش تمار آمار، کوکھونو آشی نی، سورجو اشان، سونار کاجل، کانچیر دیال، دوئی دیگانتو، اونیک دنیر چینا، جانا جانی، راجا سنیاسی، سات بھائی چمپا، شیش پریختو، جی یون تھیکے نیا، جوار بھاٹا، ارن بورن کرن مالا، جھٹر پر پکھی، پاروش پاتھور، ابر تو را مانوش ہو، سوجون سکھی، مونیر موتن بو، اکھونو انیک راست۔

## بطور نغمہ نگار

اے دیش تمار آمار، کوکھونو آشی نی، شور جواشان، قسم اس وقت کی (بنگالی گیت)، جھٹر پر پکھی۔

## بطور گلوکار

اے دیش تمار آمار، کوکھونو آشی نی، کانچیر دیال، جی یون تھیکے نیا، جھٹر پر پکھی۔

## بطور رائٹر

اے دیش تمار آمار (اس کے مکالمے لکھے)، انیک دنیر چینا (کہانی، مکالمے اسکرین پلے لکھے)، جانا جانی (کہانی، مکالمے اسکرین پلے لکھے)، سات بھائی چمپا (لوک گیت کو فلم کے پیرائے میں ڈھالا)، نواب سراج الدولہ (کہانی، اسکرپٹ اور اسکرین پلے لکھے)، سوئے ندیا جاگے پانی (کہانی، اسکرین پلے تحریر کیے)، جوار بھاٹا (کہانی، اسکرپٹ، مکالمے اور اسکرین پلے لکھے)، ارن بورن کرن مالا (کہانی، مکالمے، اسکرین پلے تحریر کیے)۔

## بطور موسیقار

خان عطا نے لاہور اور کراچی کے جن گلوکاروں اور گلوکاراؤں کو اپنی فلموں میں گانے کا موقع دیا ان میں احمد رشدی، نجمہ نیازی، ناہید نیازی، آئرن پروین اور سلیم شہزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ تجربہ کامیاب رہا۔ فلم دیکھنے والوں نے اسے پسند کیا۔ بعد میں یہ تجربہ مزید فلموں میں بھی دہرایا گیا۔

اسی سال اسی ادارہ کی ایک اور فلم ''سجے ندی بارو پوتھے'' (میرے راستے پر بہتی ندی) میں خان عطاء الرحمٰن نے نسیم خان اور سندیپ کے ساتھ کلیدی کردار ادا کیا اور اپنی کردار نگاری سے عوامی پذیرائی حاصل کی۔

1962ء میں ہدایت کار ظہیر ریحان نے ''سونار کاجل'' کے نام سے جو فلم بنائی اس کے بھی موسیقار خان عطا تھے۔ اس فلم میں اداکار خلیل کو متعارف کرایا گیا تھا جس نے بطور ہیرو بہت اچھی اداکاری کر کے اپنی ساکھ بنالی تھی۔ اس فلم میں منجھی ہوئی اداکارہ سمیتا دیوی نے خلیل کی ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ سمیتا دیوی نے بھی اس نئے اداکار کی تعریف کی تھی اور کہا تھا اس لڑکے نے جس اعتماد کے ساتھ اداکاری کی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ آنے والے دنوں میں وہ ایک کامیاب اداکار ثابت ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔

اگلے سال 1963ء میں ظہیر ریحان کی ایک چونکا دینے والی فلم ''کانچیر دیال'' (شیشے کی دیوار) منظر عام پر آئی جس کی کہانی، ہدایت کاری اور بہترین پیش کش نے تہلکہ مچادیا۔ یہ دو بھائیوں اور ان کی فیملی کی کہانی پر بنائی گئی تھی۔ دونوں بھائی ایک ہی گھر میں رہتے تھے مگر ایک بار دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا اور انہوں نے مکان کو دو حصے میں تقسیم کر دیا۔ گھر کے اندر ایک دیوار کھڑی کر دی گئی جس کے ایک طرف ایک بھائی کی فیملی اور دوسری طرف دوسرے بھائی کی فیملی۔ اس تقسیم سے جہاں بڑوں کی انا کو تسکین پہنچی۔ وہاں چھوٹوں کے لیے ایک عذاب نازل ہو گیا۔ ایک بھائی کا بیٹا اور ایک بھائی کی بیٹی ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے ان کے درمیان سماج کی یہ دیوار کھڑی ہو گئی تو دو پیار کرنے والوں کے دلوں پر جو بیتی وہی اس فلم کی کہانی میں پیش کیا گیا ہے۔ خان عطا اور سمیتا دیوی کی جلن، تڑپ اور بے چینی اور بے قراری کو جس پیرائے میں ظہیر ریحان نے لکھا اور اسے جس خوب صورتی سے فلم کے روپ میں پیش کیا۔ اس نے اس فلم کو ایک یادگار، ایک انمول فلم بنا دیا۔ بظاہر ایک چھوٹی سی کہانی پر بنائی گئی فلم ہے مگر اس نے جو تاثر قائم کیا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کی انہی خوبیوں کے پیش نظر سال کی بہترین فلم، بہترین ڈائریکٹر بہترین مکالمہ نگار، بہترین تدوین کار، بہترین صدا کار اور بہترین اداکارہ (سمیتا دیوی) کو ایوارڈز ملے۔

اس شاہکار فلم میں انور حسین، سمیتا دیوی، خان عطاء الرحمٰن، رانی سرکار، آسیہ اور انعام احمد نے اپنی خوب صورت اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ خان عطاء الرحمٰن نے اس فلم میں اداکاری کرنے کے علاوہ اس کی موسیقی بھی ترتیب دی اور اس کے لیے گلوکاری بھی کی۔ اس فلم میں خان عطاء کا گایا ہوا ایک نغمہ امر سنگیت کا حصہ بن گیا۔ اس فلم میں انہوں نے بیک وقت اداکار، گلوکار، موسیقار اور نغمہ نگار کے طور پر اپنی خداداد فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور ہر روپ اور ہر رنگ میں کامیاب رہے۔

خان عطاء الرحمٰن چومکھی لڑنے والے سپاہی کی طرح فلم کے متعدد شعبوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ 1964ء میں فلمساز و ہدایت کار عبدالحق نے ''دوئی دگانتو'' بنائی تو اس فلم کے لیے بھی خان عطا کو بطور موسیقار منتخب کیا۔

اسی سال خان عطا کو خیال آیا کہ خود اپنی فلم بھی پروڈیوز اور ڈائریکٹ کرنی چاہیے۔ لہٰذا انہوں نے ''انیک دنیر چینا'' (بہت دنوں کی پہچان) کے نام سے فلم شروع کی۔ اگلے سال 1965ء میں انہوں نے اپنی دوسری فلم ''جانا جانی'' (جان پہچان) بنائی۔ اپنی ان دونوں فلموں میں انہوں نے اداکار حسن امام کو ہیرو لیا۔ ہیروئن سلطانہ زمان تھیں۔ ''جانا جانی'' کو 1965ء میں بہترین بنگلہ فلم کا ایوارڈ بھی ملا۔

اسی سال خان عطاء الرحمٰن نے فلم تقسیم کاری کا کام بھی شروع کر دیا۔ آدمی بہت حساس تھے۔ فلمساز بنے تو انہیں معلوم ہوا کہ ڈسٹری بیوٹرز کس کس طرح فلم بنانے والوں کا استحصال کرتے ہیں لہٰذا انہوں نے سوچا کیوں نہ خود تقسیم کاری کا کام بھی کیا جائے اور اپنی فلم خود نمائش کے لیے پیش کی جائے۔ واضح رہے کہ خان عطا کے نقش قدم پر چلنے والے رنگیلا نے بھی اپنی فلموں کی خود تقسیم کاری کے لیے اپنا تقسیم کاری ادارہ قائم کیا تھا۔

ڈھاکا میں بنگالی فلمیں بن رہی تھیں اور ٹھیک ٹھاک انداز میں بزنس بھی کر رہی تھیں مگر ان کا کاروباری حلقہ صرف مشرقی پاکستان تک محدود تھا۔ احتشام اور مستفیض نے جب اردو فلم ''چندا'' اور ''تلاش'' بنائیں تو ان فلموں نے پورے پاکستان میں کامیابی حاصل کر کے فلم سازوں کی آنکھیں کھول دیں اور پھر اردو فلموں کا سلسلہ چل نکلا۔ ''پریت نہ جانے ریت'' (جس کی تکمیل کے دوران رحمٰن کی

ٹانگ کا حادثہ ہوا) آخری اسٹیشن، وطن، چکوری وغیرہ کی بلاک بسٹر کامیابی کو دیکھ کر بنگالی فلم میکرز کے رجحان میں انقلابی تبدیلی آگئی اور انہوں نے اردو فلمیں بنانا شروع کر دیں۔

ظہیر ریحان بھی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے بنگالی فلم کی بجائے اردو فلم بنانے کا فیصلہ کیا وہ چونکہ بہت ذہین اور دور تک دیکھنے والے فنکار تھے۔ لہٰذا انہوں نے سوچا ان کی اردو فلم میں کوئی خاص بات ہونی چاہیے تاکہ اس کی کامیابی یقینی ہو۔ وہ بنگالی زبان کے ادیب، شاعر اور فلم میکر تھے۔ اردو زبان اور اردو فلموں کے شائقین کے بارے میں انہیں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ لہٰذا انہوں نے سوچا اگر میں اپنی پہلی اردو فلم کو بلیک اینڈ وائٹ کی بجائے رنگین بناؤں تو اگر فلم میں کوئی خرابی یا خامی ہو گی وہ بھی پاکستان کی پہلی رنگین فلم ہونے کی وجہ سے معاف کر دی جائے گی۔ لہٰذا انہوں نے ''سنگم'' بنا کر پاکستان کی فلمی تاریخ میں پاکستان کی پہلی رنگین فلم کے فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے اپنا نام درج کروا لیا۔ ''سنگم'' اپریل 1964ء میں نمائش پذیر ہوئی اور اس نے ظہیر ریحان کی توقعات کے مطابق خاطر خواہ کامیاب ہو کر انہیں بھی اردو فلم بنانے والوں کی صف میں شامل کر دیا۔ ایف ڈی سی کی انتظامیہ نے رنگین فلم بنانے کے سلسلے میں ان کی ہر ممکن مدد کی۔

کہانی کے لحاظ سے ''سنگم'' ان کی بنگالی فلموں کے معیار سے کمتر فلم تھی مگر پہلی مکمل رنگین فلم ہونے کی وجہ سے اس نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں بہت کامیاب بزنس کیا۔ فلم کا بزنس فلم بنانے والوں کے لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ظہیر ریحان خود بھی اپنی اس فلم کو قابل ذکر اور اپنے معیار کی نہیں سمجھتے تھے مگر اب مجبور ہو گئے تھے کہ آئندہ بھی وہ اردو فلمیں ہی بنائیں گے۔

''سنگم'' کی کاسٹ میں ہارون، روزی، سمیتا دیوی، خلیل، بدرالدین، مایا ہزاریکا اور سہیل انور شامل تھے۔

خان عطاء الرحمٰن کی بھی یہ پہلی اردو فلم تھی جس کی موسیقی انہوں نے ترتیب دی تھی اور کئی اچھے گیت کمپوز اور ریکارڈ کیے تھے جن میں ایک کورس گیت ''ہزار سال کا جو بڈھا مر گیا۔ دھوم دھام سے اسے دفن کرو'' کافی مقبول ہوا۔ اس گانے میں بشیر احمد کے ساتھ محبوبہ رحمٰن اور ساتھیوں کی آوازیں شامل تھیں۔

اس فلم کی کہانی کا تھیم جدید اور قدیم دور کی کشمکش تھا۔ پرانے سماجی اقدار کو ہزار سال کا بڈھا بنا کر پیش کیا گیا تھا

خان عطاء الرحمٰن نے بھی زندگی بھی بھرپور طور پر گزاری۔ تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی لندن کے دوران قیام ایک انگریز لڑکی Shirley سے کی جس سے ان کا ایک بچہ بھی ہوا جب خان عطا ڈھاکے واپس آنے لگے تو وہ ان کے ساتھ آنے پر رضامند نہ ہوئی اور طلاق لے کر لندن ہی میں بچے کے ساتھ رہ گئی۔ ڈھاکے میں اپنی پہلی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' کی دو گلوکاراؤں محبوبہ حسنات اور نیلوفر یاسمین سے یکے بعد دیگرے شادیاں کیں۔ محبوبہ حسنات جب محبوبہ رحمٰن بنیں تو خان عطا کی ایک صاحبزادی رومانہ نے جنم لیا۔ محبوبہ رحمٰن ماشاء اللہ اب تک بقید حیات ہیں جب کہ ان کی بیٹی بنگلہ دیش میں ٹیلی ویژن اور تقریبات کی ممتاز گلوکارہ اور اداکارہ ہے۔ 1968ء میں خان عطاء الرحمٰن نے گلوکارہ نیلوفر یاسمین سے ازدواجی رشتہ قائم کیا۔ جوڑھا کا کی نامور گلوکارہ سبینہ یاسمین کی بڑی بہن تھیں۔ 2003ء میں نیلوفر یاسمین کا انتقال ہو گیا۔ ان سے خان عطاء کا ایک بیٹا آگون کے نام سے ہے جو گلوکار اور اداکار ہے۔ خان عطاء الرحمٰن نے اپنے اس بیٹے کا ابتدائی نام انیس الرحمٰن رکھا تھا۔ چونکہ ان کی پہلی فلم ''جاگو ہوا سویرا'' میں انہیں انیس کے نام سے پیش کیا گیا تھا اسی حوالے سے انہوں نے بیٹے کا نام انیس الرحمٰن رکھا تھا کیونکہ اس فلم کے بعد انہوں نے اپنے اصل نام سے اپنا فنی سفر جاری رکھا۔

اگر یہ فلم مکمل طور پر رنگین نہ ہوتی تو اسے یہ کامیابی اور پذیرائی نصیب نہیں ہوتی۔

کالج کے لڑکے لڑکیاں ایک بڑی کشتی پر اپنے استادوں کی معیت میں پکنک پر جاتے ہیں۔ پرانے خیالات کے استاد جہاں لڑکوں کو لڑکیوں سے الگ رکھنے کی کوشش میں ہر وقت سرگرداں رہتے تھے وہاں لڑکے لڑکیاں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آپس میں میل ملاپ میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔

اس فلم کے دیگر گانوں میں جن کی موسیقی خان عطا نے ترتیب دی تھی یہ تھے

☆ تیری میٹھی میٹھی باتوں میں۔ میرا دل کھو گیا، پیار ہو گیا

☆ نیلا گگن ہے تیرا میرا ملن ہے۔ چاہت کی روشنی

ہے
''سنگم'' کی تقریباً ساری ہی عکس بندی آؤٹ ڈور ہوئی تھی۔ طلباء نے پکنک منانے کے لیے کئی دن کا پروگرام بنایا تھا۔ جو کشتی کے سفر اور دریاؤں اور پہاڑی علاقوں میں گھوم پھر کر اور موج مستی کر کے اختتام پذیر ہوا۔

ظہیر ریحان سے میری بڑی اچھی دوستی تھی۔ اس لیے وہ اکثر اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ دیتے تھے۔ ایک دن ''سنگم'' کی نمائش کے بعد میں نے ان سے کہا۔ ''آپ نے ''سنگم'' میں محض شور شرابہ اور ہلا گلا پیش کیا۔ اپنی فلم سازی کا اصل روپ اس فلم میں پیش نہیں کیا، ایسا کیوں کیا؟''

''اس لیے انور فرہاد کہ میرا اصل روپ کمرشل فلموں کا نہیں۔ اگر میں ''کانچیر دیال'' جیسے سبجیکٹ پر کوئی اردو فلم بناتا تو تم ہی بتاؤ کیا اسے ملک گیر طور پر باکس آفس پر کامیابی حاصل ہوتی؟''

''نہیں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''ایسی کسی فلم کو ملک گیر طور پر روکھی سوکھی پذیرائی تو حاصل ہوتی، بزنس نہیں کرتی، سنگم کی طرح کما کر نہیں دیتی۔''

''یار! جو فلم میکر فلم بنانے سے پہلے پلاننگ نہیں کرتے کہ انہیں کیسی فلم بنانی چاہیے، وہ بہت کم کامیاب ہوتے ہیں جن لوگوں کی وجہ سے فلم باکس آفس پر کامیاب ہوتی ہے جو لوگ بار بار ایک فلم کو دیکھتے ہیں ان کی پسند کے مطابق فلم بنتی ہے تو وہ اسے بار بار دیکھتے ہیں ہم اگر اپنی پسند کے مطابق فلم بنائیں گے تو اسے عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہوگی۔ میری بنگالی فلم ''کانچیر دیال'' جتنی اعلیٰ معیار کی تھی، اس کے برعکس کا معیار اتنا ہی کمتر تھا۔ ''سنگم'' میرے خیال میں میری ایک کمتر معیار کی فلم ہے مگر کاروباری لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ثابت ہوئی۔''

احتشام نے سنگم کی کامیابی کو دیکھ کر رنگین فلم ''ساگر'' بنائی مگر اس میں شاید اس کی کامیابی کے لیے کامیاب پلاننگ نہیں کی گئی تھی، اس لیے رنگین ہونے کے باوجود وہ باکس آفس پر کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ یعنی ظہیر ریحان نے جو کہا تھا غلط نہیں کہا تھا۔

ظہیر ریحان نے اپنی اگلی اردو فلم ''بہانہ'' بنائی۔ جو بلیک اینڈ وائٹ فلم تھی مگر پاکستان کی پہلی سینما اسکوپ فلم تھی اور اس کی تقریباً ساری شوٹنگ کراچی میں کی گئی تھی۔ اس فلم میں کراچی کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا گیا تھا۔ ظہیر

ریحان نے اس فلم کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی اس میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ جب کہ مستفیض نے بغیر پلاننگ کے محض ''بہانہ'' کی کامیابی کو پیش نظر رکھ کر رنگین اور سینما اسکوپ فلم ''مالا'' بنائی پھر بھی اسے کامیاب نہ کرا سکے۔ ڈھاکے میں ان کا مین سینما گھر ''گلستان'' ان کا اپنا تھا۔ میرا مطلب ہے ان کے پارٹنر اور انویسٹر دوسانی صاحب کا تھا، اس کے باوجود ''مالا'' کی کامیابی مشکل ہوگئی۔ زبردستی اس کی سلور جوبلی کروائی۔

''ساگر'' اور ''مالا'' کی سپر ناکامی کے بعد ان کے انویسٹر ایف ایم دوسانی نے ان دونوں بھائیوں کے لیے سرمایہ کاری روک دی اور کہا۔ ''جب تک تم لوگ میرے نقصان کا ازالہ نہیں کرو گے، تمہاری کسی فلم کے لیے سرمایہ کاری نہیں کروں گا۔''

اس کے بعد احتشام کی بہت ہی لو بجٹ کی بلیک اینڈ وائٹ فلم ''چکوری'' نے بلاک بسٹر کامیابی حاصل کی تو دونوں بھائیوں کی ساکھ برقرار ہوئی۔ چکوری کے لیے انہوں نے بس اتنی منصوبہ بندی کی تھی کہ وحید مراد کی فلم ''ارمان'' کی کمٹری تو زبزنس کو دیکھ کر انہوں نے یہ پلاننگ کی کہ اگر ڈیپ رومانس کی کوئی فلم بنائی جائے جس کے گانے اور جس کا میوزک اچھا ہو تو فلم کامیاب ہو سکتی ہے۔ اتفاق سے ندیم کے تڑکے نے اس فلم کی کامیابی میں سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

خان عطاء الرحمٰن نے ''سنگم'' سے بطور موسیقار اردو فلموں کا جو سفر شروع کیا تھا اس کا سلسلہ بڑی کامیابی سے جاری و ساری رہا۔ 1965ء میں ان کی موسیقی سے آراستہ چار اردو فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ یہ ظہیر ریحان کی ''بہانہ'' احتشام کی ''ساگر'' مستفیض کی ''مالا'' اور سرور بارہ بنکوی کی ''آخری اسٹیشن'' تھیں۔ گویا 1965ء بطور موسیقار خان عطاء الرحمٰن کا معروف ترین سال تھا۔

''بہانہ'' کی تیاری کے دوران میں نے ظہیر ریحان سے کہا۔ ''یار! تم سرور بارہ بنکوی سے گانے کیوں نہیں لکھواتے؟ کیا اس لیے کہ وہ احتشام اور مستفیض کے گروپ کے شاعر ہیں؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''وہ جینوئن شاعر ہیں۔ ان کی ادبی حیثیت ہے۔ پھر وہ تمہارے ترقی پسند تحریک کے شاعر ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم کہتے ہو تو ''بہانہ'' کے لیے ان ہی

سے گیت لکھواتے ہیں۔"

خان عطا سے ظہیر ریحان نے سرور صاحب کے بارے میں کہا تو اس نے جواب دیا۔ "میں خود تم سے کہنا چاہتا تھا کہ سرور سے بھی گیت لکھواؤ۔ بہت اچھا پوئٹ ہے۔"

"تمہاری تو شاید اس سے دوستی بھی ہے؟"

"ہاں! وہ اچھا شاعر ہی نہیں، اچھا دوست اور اچھا انسان بھی ہے۔"

"بہانہ" کے مرکزی کردار رحمٰن اور کابوری تھے۔ خان عطا نے اس فلم کے لیے احمد رشدی، منیر حسین اور آئرن پروین کا انتخاب مغربی پاکستان سے کیا۔ چند گانے ڈھاکا کے گلوکاروں سے بھی گوائے۔ اس فلم کا ایک مزاحیہ کورس گیت جو متذکرہ تینوں گانے والوں کی آواز میں تھا۔ پسند کیا گیا۔ جس کے بول تھے۔ "کہو یہ کون ہے کراچی؟ ارے شہر کا نام ہے کراچی" آئرن پروین کی آواز میں یہ سولو نغمے بھی پسند کیے گئے۔

☆ دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

☆ میرے افسانے میں رنگ آ ہی گیا

☆ اب شمع بجھا دو۔ اب کون آئے گا یہاں

اس پہلی سینما اسکوپ فلم کے عکاس افضل چوہدری تھے۔

احتشام کی فلم "ساگر" کے لیے بھی خان عطا نے خوب صورت موسیقی ترتیب دی تھی۔ ان کی کمپوز کی ہوئی دھن میں بشیر احمد کی آواز میں اس فلم کا ایک گیت

☆ جا دیکھا پیار تیرا، جا دیکھا پیار تیرا۔ خوشیوں کے گیت چھینے، لوٹا قرار میرا۔

یہ پُرسوز نغمہ مقبول بھی ہوا۔

"ساگر" کے دیگر گانے یہ ہیں۔

☆ کوئی تن من میں مرلی بجانے لگا۔ میرے انگنا کوئی آنے جانے لگا (آواز: فردوسی بیگم)

☆ تاروں کی چھیاں چھیاں۔ من لہرایوں سیاں۔ تم نے یہ کیا کیا (آواز: آئرن پروین، مسعود رانا)

☆ توڑ کے آشا جیون کی ملنے سے مجبور کیا (آواز: فریدہ یاسمین)

☆ جیسے دلہن ہونت نویلی۔ ایسے آئی رت رنگیلی (آواز: آئرن پروین)

"ساگر" کی کاسٹ میں شبنم، عظیم، شبانہ، شوکت

خان عطاء الرحمٰن اپنی ہمہ جہت خوبیوں کی وجہ سے فلمی دنیا میں ہرفن مولا کے طور پر جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ اپنے معاشرتی تعلقات کی بنا پر بھی ہردلعزیز فنکار تھے۔ پڑھے لکھے اور دنیا دیکھے ہوئے تھے۔ وسیع مطالعے اور مشاہدے کے مالک تھے۔ مختلف موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کرنا ان کی شخصیت کا نمایاں حصہ تھا۔

1973ء میں وہ بنگلہ دیش پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔ 1979ء میں دوبارہ پارلیمنٹ کے ممبر بنے۔ 1984ء میں صدر ارشاد حسین کی گورنمنٹ میں بھی شامل ہوئے۔

1998ء میں ان کی آخری فلم "ایکھونو انیک راست" نمائش پذیر ہوئی۔ جب کہ سال بھر پہلے یکم دسمبر 1997ء کو 69 سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے، (آمین)۔

اکبر، سبھاش دت، جلیل افغانی شامل تھے۔ عکاسی کے فرائض کیو ایم زمان نے ادا کیے تھے۔

رنگین اور سینما اسکوپ فلم "مالا" کی عکاسی بھی کیو ایم زمان نے کی تھی۔ جب کہ ان کی بیگم سلطانہ زمان نے اس فلم میں عظیم کے مقابل ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ خان عطاء الرحمٰن جو سرسنگیت کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے، اچھی آوازوں کے بھی پرستار تھے۔ انہوں نے "مالا" کے لیے گولڈن وائس (سنہری آواز) احمد رشدی کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ احمد رشدی کی آواز میں یہ المیہ گیت

☆ جھوٹی ہے یہ ساری نگری جھوٹا ہے سنسار۔ جو تھا من کا میت اسی نے لوٹ لیا میرا پیار

نے موسیقی کے شائقین کی توجہ حاصل کی جب کہ احمد رشدی اور آئرن پروین سے خان عطا نے جو گیت گوائے اس کی موسیقی بھی انہوں نے بہت دلکش کمپوز کی تھی۔

☆ او بانکی چھوری، بانکی چھوری۔ میرے دل کے پار گئی تیری نیناں کٹار

"مالا" کے لیے نجم نیازی کا یہ نغمہ بھی پسند کیا گیا۔

☆ اتنا بھی موہے نہ ترساؤ سیاں

خان عطا بنگالی تھے۔ ڈھاکا ان کی جنم بھومی تھا۔ یہاں کی بنگالی فلموں میں انہوں نے اداکاری بھی کی، گلوکاری بھی اور فلموں کے لیے موسیقی بھی ترتیب دی مگر جب اردو فلموں کے لیے میوزک کی کمپوزیشن شروع کی تو

لاہور اور کراچی کی اردو فلموں کے لیے جو گانے والے اور گانے والیاں مقبول اور مشہور تھے ان کی صلاحیتوں سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا جس کے نتیجے میں ڈھاکے کی اردو فلموں کی موسیقی کا معیار بہتر ہوا۔ کئی فلمیں ناکام ہوئیں مگر ان کے گیت مقبول ہوئے۔ یہ خان عطا کی وسعت نظری تھی کہ انہوں نے جہاں سے بھی اور جو بھی انہیں فلم کے مفاد کے لیے سود مند نظر آیا اس کا انتخاب کیا۔

سرور بارہ بنکوی کی پہلی فلم ''آخری اسٹیشن'' کے لیے بھی خان عطا نے موسیقی ترتیب دی اور اس کے گیتوں کی مناسبت سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے گانے والوں کا انتخاب کیا۔ فلم کی فضا اور ماحول کو بھی اچھے موسیقار اہمیت دیتے ہیں اور اس کی مناسبت سے گانوں کی دھنیں اور گانے والوں کو منتخب کرتے ہیں۔ آخری اسٹیشن کے نغمے جن کے شاعر خود سرور صاحب تھے۔ خان عطا نے ان کی پیش کش میں بھی اپنے حسن انتخاب کا ثبوت دیا۔

☆ اے میرے انوکھے ہمراہی کچھ ایسی ادا کا نام بھی ہے (فردوسی بیگم اور محمد حفیظ کی آوازوں میں الگ الگ)

☆ آیا کوئی آنکھوں میں لیے افسانے پیار کے (آوازیں: فردوسی بیگم، محمد حفیظ)

☆ ہائے اللہ مشکل میں ہے میری جان (آواز: نجمہ نیازی)

☆ کون ہے میرا کون ہے میرا۔ ٹوٹا اک تارا چھکا اندھیرا (آواز: آئرن پروین)

ان کے علاوہ ایک مزاحیہ کورس گیت جو فلم میں مختلف فنکاروں پر پکچرائز کیا گیا۔

☆ چائے گرم چائے گرم
سگریٹ بیڑی پان لے لو (آوازیں: احمد رشدی۔ بشیر احمد، عبدالجبار، اختر عباس)

ان گیتوں میں استعمال کی جانے والی آوازوں میں فردوس بیگم، بشیر احمد، محمد حفیظ، عبدالجبار اور اختر عباس مقامی گانے والے تھے۔ اس کے باوجود خان عطا نے انہیں فلم کی کہانی کی مناسبت سے گانے کا موقع دیا جب کہ احمد رشدی، نجمہ نیازی اور آئرن پروین سے انہوں نے وہی گانے گوائے جہاں ان کی ضرورت تھی۔

ظہیر ریحان کی سینما اسکوپ فلم ''بہانہ'' کے بارے میں یہ بات بتانا بھول گیا تھا کہ اس فلم میں سرور بارہ بنکوی کے علاوہ بشیر احمد نے بھی دو گیت تحریر کیے تھے۔ بشیر احمد گلوکاری کے ساتھ ساتھ نغمہ نگاری بھی بی اے دیپ کے نام سے کرتے تھے۔

''آخری اسٹیشن'' سرور صاحب کی پہلی ایسی فلم تھی جس کی ہدایت کاری بھی انہوں نے کی تھی۔ یہ فلم ساگوریکا فلمز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کی کہانی مشہور افسانہ نگار ہاجرہ مسرور نے تحریر کی تھی، جسے سرور صاحب نے اسکرپٹ کی شکل دی تھی۔ اس فلم کی ساری آؤٹ ڈور شوٹنگ دوہزاری میں ہوئی تھی۔ دوہزاری چاٹگام سے تھوڑے فاصلے پر تھی جہاں ایسٹرن ریلوے کی حد جاکر ختم ہو جاتی تھی۔ بہ الفاظ دیگر یہ آخری ریلوے اسٹیشن تھا۔ فلم کی کہانی یہیں شروع ہو کر یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ ایک شہری بابو بھی یہاں آیا تھا۔ یہاں کی ایک گوری سے دل لگایا تھا۔ جب اس سے دل بھر گیا تو اسے چھوڑ کر واپس شہر چلا گیا۔ پیار کی ماری اس بستی کی ناری شہری بابو کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی۔ ہر ٹرین کے آنے کے وقت وہ ریلوے اسٹیشن آجاتی کہ اس کا شہری بابو تو نہیں آیا اس گاڑی سے۔ بابو کو واپس نہ آنا تھا، نہ آیا اس کے انتظار میں گاؤں کی گوری ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ اس حالت میں بھی وہ ہر ٹرین کی آمد کے وقت ریلوے اسٹیشن پر آجاتی اور اپنی متلاشی نگاہوں سے آنے والے مسافروں میں شہری بابو کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔ وہ پہلے بھی کسی سے کچھ کہتی سنتی نہیں تھی۔ پاگل پن کی حالت میں بھی اگر کچھ بولتی تھی تو کسی کو روک کر کہتی ''تمہارے پاس ایک بیڑی ہوگی؟''

لوگ اس کے حال پر ترس کھا کر اسے بیڑی دے دیتے تھے۔ اس کے کش لگاتے ہوئے وہ کچھ دیر تک اسٹیشن میں رہتی پھر واپس چلی جاتی تھی۔

یہ کردار اداکارہ شبنم نے ادا کیا تھا اور اس خوب صورتی سے ادا کیا تھا کہ یہ اس کے اداکارانہ کیریئر کا یادگار کردار بن گیا۔ یہ فلم کا ایک ضروری کردار تھا۔ ننگے پیر، ننگے سر۔ تن پر ایک پھٹی پرانی ساڑی۔ مٹی دھول میں اٹی۔ تباہی و بربادی اور حسرت و یاس کی ایک تصویر۔ مگر ہزاری ریلوے اسٹیشن کا ایک اہم کردار۔

اس فلم کی ہیروئن اداکارہ رانی اور ہیرو ہارون تھے۔ دیگر کاسٹ میں شوکت اکبر، رزاق، ریشماں، سبھاش دت، مرزا شاہی، محفوظ اور جلیل افغانی شامل تھے۔ فلم کی انڈور شوٹنگ حبیب انصاری صاحب کی کوٹھی میں ہوئی تھی جو انہوں نے ڈھاکے کے علاقے گلشن میں لکھنؤ کے نوابوں جیسی حویلی

کے طرز پر بنائی تھی۔ حبیب انصاری صاحب جوٹ کے کاروبار سے وابستہ تھے۔ انجمن ترقی اردو ڈھاکا کے آنریری سیکریٹری تھے اور سرور صاحب کے چاہنے والوں میں تھے۔ انہوں نے ان کی کوٹھی میں شوٹنگ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو حبیب انصاری انکار نہ کر سکے۔ اس فلم کے پروڈیوسر محمود الحسن تھے جو چاٹگام کے ممتاز تاجر تھے یہ بھی سرور بارہ بنکوی کے بے حد چاہنے والے دوستوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

''آخری اسٹیشن'' 1965ء میں اس وقت ریلیز ہوئی جب اس کے ساتھ ہی لاہور کی فلم ''نائلہ'' نمائش پذیر ہوئی تھی جس میں سنتوش اور درپن کے ساتھ شمیم آراء نے یادگار اداکاری کی تھی۔ یہ لاہور کی مکمل رنگین فلم تھی اور اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے تماشائیوں کی پسند کا مرکز بنی رہی جب کہ ''آخری اسٹیشن'' بلیک اینڈ وائٹ ہونے کے ساتھ ساتھ تکنیکی طور پر کمزور فلم تھی۔ کہانی کے تھیم اور شبنم کی مشکل ترین کردار نگاری کی وجہ سے ناقدین اور مبصرین نے اس فلم کی بڑی تعریف وتوصیف کی مگر باکس آفس پر اسے پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

ظہیر ریحان نے کامیابی کے لیے جو کامیاب منصوبہ بندی کی بات کی تھی، اس میں بڑا وزن تھا۔ وہ بہت درست تھی۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب ڈھاکا فلم انڈسٹری میں اردو فلمیں بنانے کا رجحان بہت بڑھ گیا تھا۔ یہاں فلم میکرز کی اکثریت بنگالیوں کی تھی جو اردو فلموں سے انصاف نہیں کر سکتے تھے جس کے نتیجے میں بہت سی فلمیں مکمل ہی نہیں ہو پاتیں۔ مکمل ہونے والی فلمیں بھی زیادہ تر بڑے فلم سازوں کی ہوتی تھیں۔ ان میں بھی چند کامیاب ہوتی تھیں۔ ایسے حالات میں جہاں ناتجربہ کاروں کے ہاتھوں سرمائے کا زیاں ہو رہا تھا وہاں بنگالی فلموں کی فلم سازی کو بھی بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ اردو فلموں کے مقابلے میں بنگالی فلموں کو چھوٹے چھوٹے شہروں اور گاؤں دیہات کے لوگوں کا جو سپورٹ ملا تھا۔ اس سے بنگالی فلم سازی پنپ رہی تھی۔ پھل پھول رہی تھی۔ جب سارے بنگالی اردو فلمیں بنانے لگے تو بنگالی فلموں کی ترقی کا پہیا جام ہو گیا۔ دوسری طرف مقامی طور پر بنی اردو فلمیں بھی اندرون ملک وہ کامیابی حاصل نہ کر سکیں جو بنگالی فلموں نے حاصل کی تھی۔

اس صورت حال کا جب کچھ فلم والوں کو اندازہ ہوا تو انہوں نے اس کے تدارک کے لیے یہ منصوبہ بندی کی کہ گاؤں دیہات اور کونے کھدرے میں بسنے والے بنگالیوں کے لیے خصوصی طور پر فلمیں بنائی جائیں۔ کچھ بدھی مان فلم میکرز نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کو وہی کچھ دیکھنے کو دیا جائے جن سے وہ واقف ہیں اور ان کی واقفیت لوک گیتوں سے تھی۔ بنگالی زبان میں کئی مشہور لوک گیت تھے جو ایک طویل عرصے سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے تھے۔ کچھ فقیر انہیں گا کر بھیک مانگتے تھے۔ تو نٹنکیوں میں انہیں اسٹیج پر گا بجا کر پیش کیا جاتا تھا۔ گاؤں دیہات کی ثقافت میں کئی پشتوں سے یہ لوک گیت جو عام طور پر تمثیلی ہوتے تھے۔ جن میں کسی محبت کا تذکرہ ہوتا تھا یا کسی دلچسپ واقعہ کی ترجمانی ہوتی تھی۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی تھی۔

ایسی ہی ایک مشہور کہانی پر بنی لوک گیت ''روپ بان'' کے نام سے دیہاتوں اور بنگال کے نواحی علاقوں میں بہت پاپولر تھا۔ ابن میزان نے جو ڈھاکے کے بی کیٹگری کے فلم میکر تھے۔ انہوں نے کامیاب منصوبہ بندی کے ساتھ روپ بان کو فلم کے روپ میں پیش کر دیا۔ کہانی کے کرداروں سے جو مکالمے بلوائے گئے تھے وہ سارے کے سارے منظوم تھے، بالکل اسی طرح جس طرح لوک گیت میں تھے۔ ڈھاکے کے سینما گھروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں کے سینماؤں میں جب ''روپ بان'' فلم کی صورت میں پیش کی گئی تو گاؤں دیہات کے بنگالی سینما گھروں پر ٹوٹ پڑے۔ لوک گیتوں کے رسیا، فلم کے روپ میں اپنے پسندیدہ لوک گیت کو دیکھنے کے لیے جوق درجوق سینما گھروں کی رونق میں اضافہ کرنے لگے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فلم کو فلم کی تمام تکنیکی ضرورت کے تحت نہیں بنائی گئی۔ کیمرا ایک جگہ رکھ کر سارا منظر عکس بند کر لیا گیا تھا اور جواز یہ پیش کیا گیا کہ دیہاتی لوگ فلم کی تکنیک کیا جانیں۔ انہیں تو بس وہ سب کچھ متحرک صورت میں دیکھنے کو مل رہا ہے جو اب تک وہ سنتے آرہے تھے۔ ان کی دلچسپی کے لیے یہی کافی ہے۔

''روپ بان'' کی تہلکہ خیز کامیابی نے فلم انڈسٹری میں تہلکہ مچا دیا۔ پھر وہی ہوا جو ایسے حالات میں عام طور پر فلم والے کرتے ہیں۔ ''روپ بان'' کی تمثیلی کہانی کو مختلف انداز میں توڑ مروڑ کر کئی فلمیں بنائی گئیں اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی کوشش کی گئی۔

لوٹ سیل کی سی اس کیفیت کو دیکھ کر کچھ بڑے اور

مستند فلم میکرز کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ ان میں خان عطاء الرحمٰن جیسے ہرفن مولا بھی موجود تھے مگر دوسروں کے مقابلے میں سیانے اور اچھی سوجھ بوجھ کے مالک تھے اس لیے موجودہ روش سے ذرا ہٹ کر اپنی چال چلی۔ ''روپ بان'' کو نئے سرے سے بنانے کی بجائے ایک دوسرے مقبول فوک گیت ''سات بھائی چمپا'' کو فلم کے روپ میں پیش کر دیا۔ انہوں نے بھی تکنیکی اور فنی خوبیوں کو بالائے طاق رکھ کر کم سے کم خرچ پر فلم بنائی۔ اس فلم نے بھی بلاک بسٹرڈ کامیابی حاصل کی اور ان کے بینک بیلنس میں زبردست اضافہ کیا۔ یہ فلم 1967ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب خان عطا کی شہرت بام عروج پر تھی۔ بنگالی فلموں کے بعد اردو فلموں میں بھی وہ ہر محاذ پر میدان مار رہے تھے۔ کامیابی کے جھنڈے لہرا رہے تھے مگر اس حال میں بھی وہ بنگالی فلموں کی آفر کو ٹھکراتے نہیں تھے۔ ''سات بھائی چمپا'' بنانے سے پہلے یعنی 1966ء میں بنگلہ زبان کی فلم ''راجا سنیاسی'' میں موسیقی ترتیب دینے کو کہا گیا تو انہوں نے انکار نہیں کیا اگرچہ یہ فلم کمزور تھی اور اس نے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کی۔

اپنے اسی عروج کے دور میں خان عطاء الرحمٰن نے اردو زبان میں ایک تاریخی فلم ''نواب سراج الدولہ'' بنائی۔ ایک تو تاریخی فلم ہی بڑی چیلنجنگ ہوتی ہے۔ تاریخی حالات و واقعات کو فلم کے روپ میں ایسے دلچسپ انداز میں پیش کرنا کہ اسے دیکھنے والے دلچسپی کے ساتھ دیکھیں۔ فلم میں جب تک فلم کے لوازمات موجود نہیں ہوتے تماشائیوں کی دلچسپی برقرار نہیں رہتی۔ خان عطاء الرحمٰن کو اپنی صلاحیتوں پر بھروسا تھا کہ وہ ایسی ساری فنی نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے اپنی اس تاریخی فلم کو قابل دید بنائیں گے۔ اس کی کہانی انہوں نے خود لکھی تھی۔ اسکرین پلے بھی ان کا اپنا تھا جب کہ اس کے پرشکوہ مکالمے نوجوان رائٹر اور ان کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نقی مصطفیٰ نے لکھے تھے۔

''نواب سراج الدولہ'' کی ملک گیر کامیابی میں جہاں خان عطاء الرحمٰن کی زبردست ڈائریکشن اور انور حسین کی ٹائٹل رول کی بھرپور اداکاری کا کردار ہے وہاں نقی مصطفیٰ کے پرشکوہ اور شاندار مکالمے بھی اس فلم کی کامیابی کی ایک وجہ ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اس فلم میں اسے سال کے بہترین مکالمے نگار کا نگار ایوارڈ ملا۔ جب کہ اس کے مدمقابل ریاض شاہد اور علی سفیان آفاقی بھی تھے مگر کامیابی ''نواب سراج الدولہ'' کے مکالمہ نگار کو حاصل ہوئی۔ مغربی پاکستان کے فلم بینوں کی اکثریت نے بھی نقی مصطفیٰ کے مکالموں کی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ جب کہ فلمی ناقدین اور مبصرین نے بھی اس فلم کے مکالموں کو اپنی پسندیدگی کی سند عطا کی تھی۔ نقی مصطفیٰ کے مکالموں نے مغربی پاکستان کے بعض لوگوں کے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ مشرقی پاکستان میں اچھے مکالمہ نگاروں کا فقدان ہے۔

تاریخی فلم ہونے کے باوجود ''نواب سراج الدولہ'' کو مشرقی اور مغربی سرکٹوں میں عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ''نواب سراج الدولہ'' کا ٹائٹل رول اداکار انور حسین نے کمال مہارت سے ادا کیا جب کہ خان عطا نے ڈائریکٹر کے طور پر فلم کے ہر فریم میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ بطور موسیقار بھی ان کی کارکردگی شاندار رہی۔ اس فلم کی ایک غزل جس کے شاعر سرور بارہ بنکوی تھے اور آواز فردوسی بیگم کی تھی آج بھی مقبول ہے جو یہ تھی۔ ''ہے یہ عالم تجھے بھلانے میں۔ اشک آتے ہیں مسکرانے میں''

اس فلم میں بنگلہ زبان کے لوک فنکار عبدالعلیم نے یہ گیت بھی بہت خوب گایا تھا۔ ''دو کنارے اس ندیا کے کتنے ہیں بے میل۔ اسے ڈبوئے اسے ابھارے ندیا کا یہ کھیل۔''

''تم ہی سے دعا میری کملی والے کہ تم ہو حبیب خدا۔''

شہناز بیگم کو خان عطا نے پہلی بار اپنی اس فلم کے ذریعے فلمی گلوکارہ کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا اور اس سے یہ نغمات صدابند کروائے تھے۔

☆ بیدردی دل میں تیرے پیار نہیں (آواز: شہناز بیگم)

☆ ساقیا ساقیا جام دے۔ کچھ نگاہوں سے بھی کام لے (آواز: شہناز بیگم، ناہید نیازی)

شہناز بیگم اس سے پہلے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے گاتی تھیں۔

''سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد'' گا کر انہوں نے شہرت حاصل کی تھی۔ جب کہ ملی نغمہ ''جیوے جیوے پاکستان'' سے بھی وہ جانی پہچانی جاتی تھیں۔ اس سے پہلے شاعر صدیقی کے گیت پرائیویٹ طور پر گا کر انہوں نے عوامی توجہ حاصل کی تھی۔

''کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے'' یہ گیت

انہوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسٹیج پر گا کر اپنی سنہری آواز کو عوام تک پہنچایا تھا۔ خان عطا جو سچے فنکار تھے اور ابھرتے ہوئے آرٹسٹوں اور گلوکاروں کو نکھارنے اور سنوارنے میں جہاں تک ممکن ہوتا کوشش کرتے تھے۔ یہ انہی کی سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ شہناز بیگم نے بعد میں ڈھاکے کے فلموں کی نامور پلے بیک سنگر کے طور پر عزت شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔

''نواب سراج الدولہ'' میں اس کے ہیرو انور حسین کو اس کی بہترین اداکاری پر اسپیشل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس فلم کے دیگر آرٹسٹوں میں علیہ چوہدری، انورہ جمال، سجاتا، تندرا، زرینہ، ایم خالق، صمد، قلب عالم اور خان عطا بھی شامل تھے۔ اس کی عکاسی کے فرائض بے بی اسلام نے کی جس کا معیار بہت اچھا تھا۔

ان کی لوک کہانی پر مبنی بنگالی فلم ''ساٹ بھائی چمپا'' جو کاروباری طور پر سوپر ڈوپر ہٹ ہوئی تھی اس کی کاسٹ میں عظیم کابوری، علیہ چوہدری، راج اور خان عطا شامل تھے۔

1968ء میں خان عطاء الرحمٰن نے ایک اور اردو فلم ''سوئے ندیا جاگے پانی'' بنائی۔ اس کی کہانی غالباً کسی چینی کہانی سے ماخوذ تھی اور عام ڈگر سے ہٹی ہوئی تھی۔ اس میں جس کردار کے گرد کہانی کی اساس تھی وہ ایک حیوان نما انسان تھا۔ اس کے بدن پر بڑے بڑے بال تھے۔ وہ عظیم الجثہ انسان تھا اور اپنی ہیئت کی وجہ سے انسان سے زیادہ حیوان نظر آتا تھا۔

یہ فلم مکمل ہو کر جب سنسر بورڈ میں پیش کی گئی تو بورڈ کا ایک ممبر جو اپنے ساتھ اپنی ایک بچی کو بھی لایا تھا اس بچی کی نظر جیسے ہی اس کردار پر پڑی خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس بات پر سنسر بورڈ کو اس کردار پر اعتراض کرنا پڑا۔

''اس کردار کی وجہ سے تماشائیوں کے دل و دماغ پر منفی اثرات پڑیں گے۔ اس لیے یا تو اس کردار کو فلم سے نکال دیجیے یا اس کی یہ ہیئت بدل دیجیے۔''

سنسر بورڈ کے اس اعتراض کے بعد خان عطا نے کہا۔ ''پھر تو فلم بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ کہانی کا دارومدار تو اسی غیر معمولی انسان پر ہے۔'' اسے نکال دینے سے یا اس کی ڈراؤنی ہیئت تبدیل کر دینے سے کہانی کا مطلب ہی فوت ہو جائے گا۔ بے مقصد کہانی ہو جائے گی۔''

سنسر حکام نے خان عطا کی کوئی بات نہیں سنی، کوئی استدلال تسلیم نہیں کیا۔ فلم بن گئی تھی، اسے ڈبے میں بند کر کے رکھنا نہیں تھا لہٰذا ''قہر درویش بر جان درویش'' خان عطا کو اس کردار کی ہیئت تبدیل کرنی پڑی۔ اور انجام وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ ایک بہت ہی خوب صورت اور عام ڈگر سے ہٹی ہوئی فلم بے مقصد ہو کر رہ گئی۔ دیکھنے والوں کے سر سے گزر گئی۔

''فلم تو بہت اچھی ہے مگر اس میں ہے کیا؟''

''خان عطاء الرحمٰن نے آخر اس فلم میں کیا پیش کیا ہے؟ کیا دکھایا ہے؟''

''نواب سراج الدولہ'' جیسی فلم بنانے والا اگر ایسی بے سر پیر کی فلم بنائے گا تو.....''

عام تماشائیوں کے اس قسم کے ریمارکس کا مطلب یہ تھا کہ فلم کی کامیابی کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔

خان عطاء الرحمٰن ''سوئے ندیا جاگے پانی'' کے فلم ساز ہدایت کار مصنف اور موسیقار تھے۔ انہوں نے جس جذبے سے ایک اچھوتی اور چونکا دینے والی فلم بنائی تھی اور سوچا تھا یہ فلم بھی ان کو شہرت اور مقبولیت کی نئی منزلوں تک پہنچائے گی مگر صد حیف کہ ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ان کی ساری محنت سنسر بورڈ کی ضد نے برباد کر دی۔ ایک عمدہ اور اعلیٰ تخلیق کا ستیاناس کر دیا۔ یہ غیر معمولی کردار جس پر اعتراض کیا گیا جلیل افغانی نے بڑی عمدگی سے ادا کیا تھا۔ ان کی ہیئت میں تبدیلی کے بعد ان کا کردار بے جان ہو کر رہ گیا۔

اس فلم کے دیگر کردار حسن امام، کابوری، روزی اور رشیدہ حق نے کیے تھے۔

نقی مصطفیٰ اس فلم کے بھی مکالمہ نگار تھے مگر اس فلم میں انہوں نے ''نواب سراج الدولہ'' کے انداز کے پرشکوہ مکالمے نہیں لکھے تھے کیونکہ اس فلم میں ایسے ڈائیلاگس کی ضرورت نہیں تھی۔ نقی نے اس فلم میں بھی خان عطا کو اسسٹ کیا تھا۔

''سوئے ندیا جاگے پانی'' میں خان عطا نے کراچی کے پلے بیک سنگر سلیم شہزاد کو نجمہ نیازی اور آئرن پروین کے ہمراہ یہ گیت گوایا تھا۔ ''زندگی کے ہزاروں رنگ ہیں۔ کہیں ہنستے ہو ہم کہیں روتے ہیں ہم''

یہ سلیم شہزاد وہی تھے جو وحید مراد کی فلم ''ہیرا اور پتھر'' میں ''مجھے ایک لڑکی سے پیار ہو گیا'' گا کر شہرت حاصل کی تھی۔ اس فلم میں خان عطا نے بطور گلوکار شبینہ یاسمین کو

متعارف کرایا اور اس سے یہ گیت ریکارڈ کروایا۔ ''رات آئی اور آنسو آ گئے۔ ہر خوشی پر غم کے بادل چھا گئے''۔

واضح رہے کہ شبینہ یاسمین، خان عطاء الرحمٰن کی دوسری بیوی گلوکارہ نیلوفر یاسمین کی چھوٹی بہن ہے۔ نیلوفر یاسمین سے خان عطا نے 1968ء میں شادی کی تھی۔ اس فلم کے بعد شبینہ یاسمین نے بہت سی اردو فلموں کے لیے گیت گائے۔ جب کہ آج کل وہ بنگلہ دیش کی ٹاپ گلوکارہ ہے۔

''سوئے ندیا جاگے پانی'' کا تھیم سانگ۔ ''سوئے ندیا جاگے پانی، کیسی ہے یہ کہانی۔ لہر کو لہر پکارے لیکن لہر بنی انجانی'' کو شائقین فلم نے بہت پسند کیا تھا۔ جسے خان عطاء الرحمٰن نے بشیر احمد اور شہناز بیگم کی آوازوں میں الگ الگ ریکارڈ کیا تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں خان عطا ذاتی پروڈکشن کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی فلموں کے لیے بھی کام کرتے رہتے تھے۔ ان کے ہمعصر اور دوست ظہیر ریحان نے جب 1969ء میں دو بنگلہ زبان کی فلمیں ''شیش پر جنتو'' اور ''جیبون تھیکے نیا'' (زندگی سے حاصل کیا) بنائی تو دونوں فلموں کے لیے خان عطاء الرحمٰن کو موسیقار منتخب کیا۔

دوسری فلم ''جیبون تھیکے نیا'' میں خان عطا نے اپنی آواز میں یہ گیت بھی گایا تھا۔ ''اے کھانچا بھانگبو ای کے مون کورے'' ان دونوں فلموں میں رزاق نے ہیرو کا رول کیا تھا جب کہ سچیتا اور سچندا بالترتیب ہیروئن تھیں۔

اسی سال خان عطاء الرحمٰن نے بطور فلم ساز و ہدایت کار دو فلمیں ''جوار بھاٹا'' اور ''اُرون بورن کرن مالا'' پروڈیوس کیں۔ ''جوار بھاٹا'' نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ اس میں شبنم اور رحمان نے مرکزی کرداروں میں بڑی خوب صورت اداکاری کی تھی جب کہ خان عطا کی ڈائریکشن کا معیار بھی بہت بلند تھا۔

دوسری فلم ''اُرون بورن کرن مالا'' تین بہن بھائیوں کے ناموں پر مبنی فلم تھی۔ یہ جہیز کے موضوع پر ایک اثر انگیز فلم تھی۔ اس معاشرتی فلم میں نامور گلوکار احمد رشدی نے بلا معاوضہ اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اس کی کاسٹ میں کابوری، عظیم، خان عطا اور عطیہ چوہدری شامل تھے۔ اس فلم نے بھی اپنے موضوع اور معیار کی وجہ سے عوامی پذیرائی حاصل کی تھی۔

1969ء میں خان عطاء الرحمٰن نے اپنے پہلے فلمی ہدایت کار اے جے کاردار کی دوسری فلم ''قسم اس وقت کی'' میں بحیثیت موسیقار اور گلوکار شرکت کی۔ اپنی آواز میں صرف ایک گیت گایا جب کہ بطور موسیقار اردو اور بنگالی مکچر ڈوئیٹ رونا لیلیٰ اور بشیر احمد کی آوازوں میں ریکارڈ کیا۔

''اس جھکے ہوئے گلشن میں یہ پھول پر پھول کی خوشبو۔ اک تم ہو اک میں ہوں اک تم ہو اک میں ہوں'' اس نغمے کے بنگالی حصے کے شاعر خود خان تھا اور اردو بولوں کے شاعر فیاض ہاشمی تھے۔

اس فلم میں شبنم، طارق عزیز نے مرکزی کردار کیے تھے۔ یہی بطور موسیقار خان عطاء الرحمٰن کی آخری اردو فلم تھی۔

خان عطاء الرحمٰن کا کمپوز کردہ سدا بہار گیت جسے بشیر احمد نے بنگالی فلم ''اپون پور (اپنا پرایا)'' کے لیے گایا اسے امر سنگیت کا درجہ حاصل ہوا اس کی پکچرائزیشن ظفر اقبال پر ہوئی تھی۔ اس کے بول تھے ''جارے جائی جودی جا، بنجور کھلے دیا سی''۔

سقوط ڈھاکا کے بعد بنگلہ دیش میں جہاں اردو بولنے والوں کا قتل عام ہوا وہاں اردو فلموں کا بھی قصہ تمام ہوا۔ جب آہستہ آہستہ وہاں کے حالات نارمل ہوئے تو بنگالی فلم میکرز نے فلم سازی کا کام دوبارہ شروع کیا۔ خان عطاء الرحمٰن نے بھی نئے سرے سے اپنا سفر شروع کیا۔ اس دوران وہاں آرٹ فلم کی نوعیت کی ایک فلم ''چھوٹیر گھنٹا'' (چھٹی کی گھنٹی) بنائی گئی۔ جس میں چائلڈ اسٹار کے ساتھ خان عطا نے پرفارم کیا۔ یہ فلم اپنے اچھوتے موضوع کی وجہ سے بے حد پسند کی گئی۔ اس فلم میں شبانہ اور رزاق کی جوڑی کو بہت پسند کیا گیا۔

اس نئی جوڑی کی عوامی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے خان عطاء الرحمٰن نے بھی اپنی ایک فلم میں اسے پیش کیا۔ یہ فلم تھی ''جھنر پکھی'' (بارش سے بھیگا پرندہ)۔ خان عطا اس فلم کے ہدایت کار کے ساتھ ساتھ اس کے موسیقار اور نغمہ نگار بھی تھے۔ یہ فلم بھی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔

بطور موسیقار ان کی اس دور کی دیگر فلموں میں پاروش پاتھور (پارس پتھر) ابار تورا مانوش (پھر تم انسان ہو) سوجون سکھی (پیاری سہیلی) موتیر موتو بو (من پسند بیوی) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

# ایک صدی کا قصہ

قاسم رضا

اس بات سے ہر شخص آگاہ ہے کہ تقسیم کے بعد پاکستان کی فلمی دنیا لاہور میں قائم ہوئی کیونکہ انگریزوں کے دور میں بھی لاہور میں فلمی صنعت وجود تھی لیکن ایسے بہت سے لوگ ہوں گے کہ جنہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ پاکستان میں فلمی صنعت کو مضبوط کرنے میں ملتان کا بھی ہاتھ ہے۔

تحقیق کے دریچے سے ایک لاجواب تحریر

برصغیر کی فلمی تاریخ میں 7 جولائی 1896ء کا دن اس لحاظ سے بھی تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ اس دن دو سائنسدانوں لومیئر برادرز جن کا تعلق فرانس سے تھا، نے بمبئی کے ''واٹسن تھیٹر'' میں پہلی بار چند فلموں کی نمائش کی پھر ایک ہفتے بعد یعنی 18 جولائی 1896ء سے ناولٹی تھیٹر میں عوام کے لیے باقاعدہ شو منعقد کیے جانے لگے۔ ٹرین کی آمد اور سانپ، ڈانسر، لندن گرل جیسی 24 مختصر مختصر فلمیں دکھائی جاتیں جس کا دورانیہ چند منٹ کا ہوتا۔ 1900ء میں برصغیر کے لوگ بھی اس

صنعت میں آگئے اور خورشید جی پاٹلی والا ناولٹی تھیٹر میں ولایت سے درآمد شدہ فلمیں دکھانے کا اہتمام کیا 1904 میں مانک ڈی سٹھیانی نے life of chrest کی نمائش کی۔ حضرت عیسیٰ کی زندگی پر مبنی اس فلم سے متاثر ہوئے۔ دادا صاحب پھالکے نے بھی فلم سازی کی ابتدا کردی۔

اس وقت سینما لوگوں کے لیے بالکل ایک عجوبہ اور نئی تفریح تھی۔ تھیٹر، نوٹنکی اور سوانگ جو صدیوں سے اپنی دلچسپی کے سبب لوگوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے ان کا زور ٹوٹنے لگا۔ تھیٹر کا پردہ آہستہ آہستہ گرنے لگا اور سینما کا پردہ اٹھنے لگا۔ بمبئی، کلکتہ، لاہور، مدراس اور میسور جو کبھی تھیٹر ڈراموں کے گڑھ ہوا کرتے تھے وہاں خاموش یعنی گونگی فلمیں بننا شروع ہوئیں۔ لومیئر برادرز تو چند مختصر فلموں کی نمائش کے بعد واپس چلے گئے لیکن برصغیر میں سینما کی روایت ڈال گئے۔ برصغیر میں فلم سازی کی ابتدا بابائے ہندی سینما دادا صاحب پھالکے نے کی۔ ''راجا ہریش چندر'' ان کی پہلی فلم تھی جو انہوں نے 13 مئی 1913ء کو بمبئی کے ''کارونیشن تھیٹر'' میں نمائش کے لیے پیش کی۔ اس طرح برصغیر میں خاموش فلمیں بننے کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہوا جنہیں نمائش کے لیے بڑے شہروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے شہروں میں بھی بھیجا جانے لگا۔ تھیٹر، منڈوے سینما گھروں میں تبدیل ہونے لگے لیکن سینما کے ساتھ ساتھ لوک تھیٹر اور ڈرامے کی روایت بھی جاری رہی۔ جہاں تک سرائیکی خطے کا تعلق ہے تو اس خطے کے چھوٹے بڑے شہروں میں بھی سینما گھر بننے لگے۔ ملتان، بہاول پور، رحیم یار خان، ڈیرہ غازی خان، لیہ، بھکر، میانوالی، راجن پور، کہروڑ پکا اور جھنگ جیسے شہروں میں سینما گھر بننے لگے۔ ملتان جو سرائیکی خطے کا دل کہلاتا ہے اس میں تقریباً 22 سینما گھر بنے جہاں پہلے خاموش فلموں اور بعد میں بولتی فلموں کی نمائش شروع ہوئی۔ ملتان کے اندرون شہر میں بہت سے قدیم تھیٹر اور منڈوے تھے جو بعد میں سینما گھروں میں تبدیل ہوئے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سینما کے ارتقاء میں ہندوؤں کا مرکزی کردار ہے۔ ملتان کے ابتدائی سینما گھر بنانے والے بھی ہندو سیٹھ تھے جو پہلے تھیٹر اور منڈوے تھے اور بعد میں انہیں گرا کر سینما گھروں میں تبدیل کیا گیا۔ سیٹھ درباری لعل، لالہ حکومت رائے، سیٹھ رادھورام، سیٹھ بدھورام، وشن نارائن، لالہ نند لعل اور ان جیسی اور بھی کئی شخصیات نے سینما گھروں کی تعمیر میں اپنی خدمات پیش کیں۔ حشمت محل سینما، کرن سینما، کراؤن سینما، راڈھو سینما، محفل سینما، امپریل سینما یہ پہلے دراصل تھیٹر منڈوے تھے جہاں مقامی اور باہر سے آنے والی تھیٹریکل کمپنیاں ڈرامے کھیلا کرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد جب ہندو ملتان سے رخصت ہوئے تو یہ سینما گھر مسلمان مالکان کو الاٹ ہوئے۔ بوہڑ گیٹ میں واقع تاج محل سینما واحد سینما ہے جو مسلمانوں نے بنایا۔ جن کے مالکان پیشے کے اعتبار سے مستری (ترکھان) تھے۔ جیسے جیسے خاموش فلموں کی نمائش نے زور پکڑا تو تھیٹر، نوٹنکی اور سوانگ کا زور ٹوٹنے لگا۔ تھیٹر اور ریڈیو کے بعد فلم یعنی سینما لوگوں کی تفریح کا بڑا ذریعہ بن گیا۔ دور دراز علاقوں سے لوگ شہروں میں ''سینما کا تماشا'' دیکھنے آتے۔ اس وقت زیادہ تر خاموش فلمیں انگریزی ناموں سے ریلیز ہوا کرتی تھیں لیکن سادہ لوح دیہاتی لوگ چاہے زبان نہ سمجھ بھی آتی پھر بھی دلچسپی سے فلمیں دیکھنے آتے۔ اس وقت فلمیں طویل دورانیے کی ہوا کرتی تھیں ایک فلم کئی کئی راتیں چلتی پھر کہیں جا کر اس کا اختتام ہوتا۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے بعد سرائیکی خطے کے مختلف شہروں میں فلموں کی نمائش ہونے لگی پھر ایسا ہوا کہ ایک پارسی فلم ساز اردشیر ایرانی نے 14 مارچ 1931ء کو پہلی متکلم یعنی بولتی فلم ''عالم آراء'' ریلیز کر کے گونگی فلموں کو زبان دی۔ ریکارڈنگ اور ساؤنڈ سسٹم نے ترقی کی اور فلم میں موسیقی بھی شامل ہوگئی۔ اداکار مکالمے بولنے لگے اور سینما روز بروز ترقی کی منازل طے کرتا گیا۔ فلم ایک ایسا میڈیا ہے جس میں فنون لطیفہ کے تقریباً تمام فنون مرکب شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ کہانی نویسی، مکالمہ نویسی، شاعری، موسیقی، گلوکاری، اداکاری، ہدایت کاری اور اسی طرح ایڈیٹنگ لیبارٹری پراسیسنگ کے دیگر شعبے اور سینما پینٹنگ جیسے اہم شعبے سینما سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 42 شعبہ جات فلم سے متعلق ہوتے ہیں جن کے لیے ان شعبوں کے ماہر افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے پہل جب سینما شروع ہوا تو غیر ملکی اداکار اور ٹیکنیشن فلم سے وابستہ تھے لیکن بعد میں جب دادا صاحب پھالکے نے ''راجا ہریش چندر'' بنائی تو اس فلم میں مقامی کاسٹ شامل کی۔ پھالکے صاحب جب فلم بناتے تھے تو انہیں کاسٹ کے لیے خواتین آرٹسٹوں کی ضرورت پڑی تو اس وقت کوئی بھی Female آرٹسٹ فلم میں کام کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ انہوں نے بازار حسن کا رخ کیا لیکن وہاں بھی

خواتین نے کھڑکیاں دروازے بند کر لیے یعنی اس وقت فلم میں کام کرنا ان کے دھندے سے بھی برا فعل تصور کیا جاتا تھا مجبوراً فلم میں Female کریکٹر بھی Male آرٹسٹوں نے کیے۔ یہ وہ ابتدائی مشکلات تھیں جن کا سامنا اس وقت کے فلم سازوں نے کیا۔ پھر وقت بدلا اور فلم کے ہر شعبے میں لوگ دھڑا دھڑ آنے لگے۔ بمبئی، کلکتہ، لاہور، مدراس اور ان جیسے بڑے شہروں میں خاموش فلمیں بنائی جانے لگیں۔ ملتان اور سرائیکی وسیب کے دوسرے بڑے شہروں میں بھی فلموں کی نمائش ہونے لگی۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں سینما گھر بنے اور دور دراز دیہاتوں میں ''ٹورنگ ٹاکیز'' جنہیں عرف عام میں ''کچی ٹاکی'' کہتے تھے فلموں کی نمائش ہونے لگی۔ کچی اینٹوں کی دیوار پر گارے سے پلستر کر دیا جاتا اور جب دیوار خشک ہوتی تو چونے کی سفیدی کر کے اس دیوار کے بالکل سامنے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی کوٹھی بنائی جاتی جس کے اندر فلم کا پروجیکٹر ہوتا تھا۔ ایک مربع فٹ کا دیوار میں سوراخ کر کے فلیش چونے والی دیوار پر ڈالا جاتا اور سینما اپنا کام شروع کر دیتا۔ نہ کوئی فرنیچر اور نہ کوئی آسائش سہولت میسر ہوتی۔ لوگ لکڑی کے پھٹوں، بینچوں، دریوں اور چٹائیوں پر بیٹھ کر ''سینما کا تماشا'' دیکھتے۔ پہلے پہلے بڑی فلموں کے ٹکڑے دکھائے جانے لگے اور بعد میں مکمل فلمیں دکھانے کا رواج پڑا۔

تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ برصغیر میں جیسے ہی سینما داخل ہوا اور فلمیں بننا شروع ہوئیں اس وقت سے ہی سرائیکی وسیب کے آرٹسٹوں نے دنیا کے اس مقبول ترین میڈیا سے ناطہ جوڑا جو کہ ابھی تک نہیں ٹوٹا۔ سرائیکی وسیب سے تعلق رکھنے والے بے شمار آرٹسٹ فلم کی رنگین دنیا میں گئے اور فلمی دنیا کی کہی اور ان کہی داستانوں کا حصہ بن گئے۔ بہت سے فلمی آرٹسٹ معروف فلمی شخصیات بنے، بہت سے ناکام ہوئے اور وقت کی گرد نے ان کے نام اور کام کو ہمیشہ کے لیے دھندلا دیا اور وہ قصہ پارینہ بن گئے۔ یہ ایک طویل کہانی ہے جس کو یہاں مختصراً بیان کیا جائے گا۔ سلور اسکرین سے سرائیکی وسیب کی جڑت خاموش فلموں کے دور سے ہی چلی آرہی ہے۔ وہ گمنام آرٹسٹ جنہوں نے خاموش فلموں میں کام کیا اور ان کا تعلق سرائیکی خطے سے تھا ان کا آج تک کھوج اس لیے نہیں لگایا جاسکا کہ اس موضوع پر سنجیدگی سے کام ہی نہیں ہوا۔ پاکستانی فلمی صنعت کے تقریباً ساٹھ فیصد آرٹسٹوں کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے سرائیکی خطے سے رہا ہے۔

موسیقی، اداکاری، ہدایت کاری، گلوکاری، مکالمہ نویسی اور رقص جیسے اہم ترین شعبے میں فلمی آرٹسٹوں کی خدمات ہیں۔ سرائیکی خطے کے آرٹسٹوں کا سینما سے تعلق پاکستانی، بنگلہ دیشی اور ہندی سینما سے ہوتا ہوا ہالی ووڈ تک بکھرا ہوا ہے۔

بہت سے گمنام فلمی آرٹسٹ ایسے ہیں جن کے نام تک کا لوگوں کو علم نہیں اس مضمون میں ایسے گمنام فلمی آرٹسٹوں کے چاند چہروں سے وقت کی گرد ہٹائی جائے گی اور ان کے کام کو ریکارڈ پر لایا جائے گا تاکہ دیگر مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ سلور اسکرین کے لیے بھی اس خطے کی خدمات Record پر آسکیں۔ ملتان میں ڈرامے کی روایت صدیوں سے جاری ہے۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس جیسے بڑے بڑے شہروں سے بھی تھیٹریکل کمپنیاں ملتان میں پڑاؤ ڈالتیں اور ان کا ڈراما کئی کئی ماہ کھیلا جاتا۔ آغا حشر کاشمیری جیسے عظیم ڈراما نگار ڈراما کھیلنے اپنی تھیٹریکل کمپنی کو ملتان لے کر آتے۔ ''پرتھوی راج'' جو خاموش فلموں کے آرٹسٹ تھے اور برصغیر کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' میں کام کرنے کا بھی اعزاز پایا، ان کا بچپن پاک گیٹ ملتان میں گزرا۔ ان کی بھی تھیٹر کمپنی تھی۔ پرتھوی راج نے بچپن میں پاک گیٹ پر شربت بھی بیچا۔ ان کے والد پشاور پولیس میں ملازم تھے جو ملازمت کے سلسلے میں تقریباً سات سال ملتان میں بھی تعینات رہے۔ پرتھوی راج کو باڈی بلڈنگ کا بھی شوق تھا۔ وہ پنجاب کے پہلے فلمی ہیرو ماسٹر غلام قادر کے شاگرد تھے جو فلموں میں ''اسسٹنٹ مین'' بھی تھے۔ ماسٹر غلام قادر ولی محمد قلندر (علامہ عتیق فکری کے والد) کے بہت ہی قریبی دوست تھے۔ پرتھوی راج کی تھیٹریکل کمپنی پورے برصغیر میں گھوما کرتی تھی۔ فراغت کے دنوں میں پرتھوی راج نے حسین آگاہی مسجد پھول ہٹ کے ساتھ چائے کا ایک کھوکھا بھی بنایا ہوا تھا جہاں ان کا چچازاد بھائی بیٹھا کرتا تھا۔ پرتھوی راج قلعہ کہنہ قاسم جو اس وقت سنسان اجاڑ تھا وہاں روزانہ ورزش کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس کھوکھے پر اس وقت کے معروف تھیٹر آرٹسٹوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ جن میں مقامی اور باہر سے آئے ہوئے تھیٹر آرٹسٹ ہوتے تھے۔ پرتھوی راج خود بھی خاموش فلموں میں کام کرتے تھے اور ملتان سے بھی خاموش فلموں کے لیے آرٹسٹ لے جاتے تھے۔ عطا محمد، خان قمر، حاجی شاہ، کیشو لعل جو کہ لالہ نند لعل کے قریبی عزیز تھے، محمد بخش سوداگر، اسھا رام جو کہ رادھو رام کے چھوٹے بھائی تھے اور ان جیسے بہت سے آرٹسٹ خاموش فلموں میں اداکاری کرتے رہے ہیں اور یہ سب کے

سب ملتان اور اس کے مضافاتی علاقوں کے رہائشی تھے۔ خلیل خان، عبدالرحمن کابلی بھی کافی عرصہ ملتان میں رہے۔ سردار علی درزی اور ولی محمد قلندر جو کہ علامہ عتیق فکری کے والد محترم تھے انہوں نے بھی خاموش فلموں میں اداکاری کی۔ ولی محمد قلندر تھیٹر کے معروف آرٹسٹ تھے۔ آغا حشر کاشمیری حسین آگاہی میں موجود سیٹھ درباری لعل کے منڈوے پر زیادہ تر ڈرامے اسٹیج کیا کرتے تھے۔ ولی محمد قلندر آغا صاحب کے تھیٹر آرٹسٹوں کے لباس تیار کرتے۔ اسٹیج کی تزئین و آرائش کرتے۔ ان کے پردے سیتے اور ساتھ ساتھ آغا کے ڈراموں میں کام بھی کیا کرتے تھے۔ پہلی بولتی فلم عالم آرا کی ریلیز تک جتنی بھی خاموش فلمیں بنیں ان میں سرائیکی خطے کے کچھ آرٹسٹوں نے بھی کام کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس دور کی چند بولتی فلموں کے کورس گانوں میں بھی ملتان کے آرٹسٹوں کی آوازیں شامل رہی ہیں۔ ملتان کے گمنام فلمی اداکاروں میں ایک نام ''شیخ افتخار رسول'' کا بھی ہے۔ فلمی دنیا کا یہ وہ نامور ستارہ ہے جس نے ہالی ووڈ اور برطانوی سینما کی فلموں میں کام کیا۔ برصغیر کی عظیم اور تاریخ ساز ادبی شخصیت قرۃ العین حیدر نے اپنے تاریخی ناول ''گردش رنگ چمن'' میں اس Legendry شخصیت کا ذکر کیا ہے جسے اس وقت مشرق کا ''روڈلف ویلنٹینو'' کہا جاتا تھا۔ گردش رنگ چمن میں وہ اقتباس پیش خدمت ہے جس میں شیخ افتخار رسول کا ذکر موجود ہے۔

''Rudolph Valentino کا دور تھا ایک ہینڈسم پنجابی نوجوان ولایتی فلموں میں کام کر کے ''مشرق کا روڈلف ویلنٹینو'' کہلانے لگا تھا۔ شیخ افتخار رسول...... حضرت قانون پڑھنے ملتان سے لندن گئے۔ بیرسٹر بننے کے بعد فلموں میں کام کرنے لگے۔ گارڈن آف اللہ، شیڈو آف دی حرم، شہزادہ، سرپینٹ آف دی نائیل ان کی معروف فلمیں ہیں۔ وہ رقاص بھی تھے۔ اودے شنکر سے برسوں پہلے انہوں نے بوڈاپیسٹ اور وی آنا میں ہندوستانی کلاسیکل رقص پیش کیے لیکن شوبز کی شہرت چند روزہ ہوتی ہے یہ 1929ء کی بات ہے اب کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔

شیخ افتخار رسول محلہ قاضیاں پاک گیٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ ریاست بہاول پور کے حکمران خاندان سے ان کے خاندان کے قدیم خاندانی تعلقات تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی شیخ عزیز رسول نواب آف بہاول پور کے خاندانی وکیل تھے۔ وہ ملتان کینٹ میں موجود ''بہاول پور ہاؤس'' کے انتظامی انچارج بھی تھے۔ نواب آف بہاول پور نے انہیں اپنے ہی خرچ پر قانون کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا تھا۔ بیرسٹری کی تعلیم کے ساتھ ساتھ شیخ افتخار رسول کو فنون لطیفہ یعنی کلاسیکل رقص، مصوری اور فلم میں دلچسپی تھی۔ بہت سی فلموں میں کام کیا۔ ہالی ووڈ، برطانیہ اور بہت سے ملکوں کے فلمی ایکٹروں اور ایکٹریسوں سے دوستی تھی۔ جرمن اداکارہ مارلین ڈیٹرچ سے رومانس ہوا۔ امریکا کا نامور کالا گلوکار پال رابنسن شیخ صاحب کا بہت اچھا دوست تھا۔ ان کے ساتھ اکثر خط کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ شیخ افتخار رسول کو شرقی اور مغربی موسیقی پر عبور حاصل تھا۔ کلاسیکل ہندوستانی رقص کے ماہر تھے جسے (Costume) کہا جاتا ہے۔ رقص کی یہ صنف خاصی مشکل ہے۔ اشاریت اور علامت اس کے خاص عناصر ہیں۔ وہ بہت اچھے لکھاری بھی تھے۔ الیسٹریٹڈ ویکلی (illustrated weekly) میں باقاعدہ مضامین لکھتے تھے۔ خاموش فلموں کے معروف مزاحیہ اداکار سر چارلی چپلن ان کا رفیق کار اور روم میٹ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چارلی چپلن کی ابتدائی فلموں کے اسکرپٹ فائنل کرنے میں شیخ افتخار رسول کا بھی حصہ شامل رہا ہے۔ زندگی کے آخری دن ملتان میں گمنامی میں گزارے۔ فلمی دنیا کی اس عظیم شخصیت کا 9 دسمبر 1971ء کی ایک سرد ڈھلتی شام کو انتقال ہوا۔ ''شیخ اقبال'' بھی دہلی گیٹ کے ایک گمنام آرٹسٹ تھے جنہوں نے تقسیم ہند سے پہلے ''کملی'' نامی فلم میں کام کیا۔ اس فلم کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ کے ایم ملتانی سورج میانی سے تعلق رکھنے والے ایک اور گمنام شخصیت ہیں جنہوں نے تقسیم ہند سے پہلے اور بعد میں چند فلموں میں اداکاری کی اور پھر ہدایت کاری کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔ اندرون ملتان کے قدیم ترین محلے ''ہنوں کے چھجے'' سے تعلق رکھنے والی کچھ شخصیات کا تعلق فلمی دنیا سے رہا ہے ان میں ایک نام رفیق انصاری کا ہے جس نے چالیس کی دہائی میں جادوئی بندھن، عرب کا ستارہ، دنیا تمہاری ہے جیسی فلموں میں کام کیا۔ رفیق انصاری کے چھوٹے بھائی صادق انصاری بھی فلمی دنیا سے وابستہ رہے چند فلموں میں کام کیا لیکن اپنے بڑے بھائی کی طرح ناموری نہ ملی۔ ہندی سینما کا بڑا نام ''اوم پرکاش'' کا بچپن بھی اس محلے میں گزرا۔ ہندوستان کے معروف کہانی کار اور فلم ساز راج گروور کا خاندان بھی صدیوں

ملتان میں آباد رہا۔ ان کے والد کا نام ماسٹر دینا ناتھ تھا۔ جنہیں محبت سے ”لالہ جی“ کہا جاتا تھا۔ انہوں نے ڈی اے وی (موجودہ مسلم ہائی اسکول) میں ایک طویل عرصے تک تعلیمی خدمات انجام دیں پھر ریٹائرمنٹ کے بعد حسین آگاہی کے علاقے کراؤن سینما کے بالمقابل واقع رہائشی مکانوں کے عقب میں ”لالہ دینا ناتھ اسکول“ قائم کیا جو کہ قیام پاکستان تک موجود رہا۔ راج گرود ور نے فنی زندگی کا آغاز آل انڈیا ریڈیو میں بچوں کے پروگرام سے کیا۔ راج کے چچا دیوان شرر معروف فلمی رائٹر اور ایکٹر تھے۔ انہوں نے پروڈیوسر شانتا رام کے لیے دو فلمیں دو آنکھیں بارہ ہاتھ اور جھنک جھنک پائل باجے لکھیں۔ ان میں راج نے بطور ایکٹر کام کیا۔ عظیم فلمی شخصیت بھیشم ساہنی کے بھائی بلراج ساہنی کو اسسٹ کیا۔ سنیل دت کی ”اجنتا آرٹس“ میں تیس سال تک کام کیا۔ فلم من کا میت، ریشماں اور شیرا (امیتابھ بچن کی پہلی فلم) نہلے پہ دہلا اور یادیں ایسی فلموں میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کام کیا۔ بطور پروڈیوسر راج کی پہلی فلم طاقت تھی جسے راجندر سنگھ بیدی نے لکھا تھا۔ موسیقی لکشمی کانت پیارے لعل نے دی تھی۔ ”پتی“ نامی فلم بنائی ایک اور فلم ”ٹھکانہ“ پروڈیوس کی۔ اس کے ڈائریکٹر مہیش بھٹ اور کاسٹ میں انیل کپور اور سمیتا پاٹیل تھے۔ موسیقی کلیان جی آنند جی نے دی تھی۔ راج گرود ور کا آبائی گھر جہاں ان کے بچپن کے بارہ سال گزرے آج بھی اندرون بوہڑ گیٹ نوگزی قبر کے ساتھ موجود ہے۔

ہندی سینما کے نامور ہیرو راجیش کھنہ کا تعلق بورے والا سے تھا۔ اسی طرح انڈین موسیقار انو ملک کے بھی آباؤ اجداد ملتان کینٹ کے رہائشی تھے۔ ”شام سندر“ ”محمد پور گھوٹا کے رہنے والے تھے۔ انڈین موسیقار خیام کے بچپن کے ابتدائی دن بھی ملتان کے قدیم نواحی علاقے قاسم بیلہ میں گزرے۔ موسیقار خیام کے دو بھائی اور بھی تھے جن میں ایک عبدالشکور بیدل ہیں جو ریڈیو میں ملازم تھے۔ شوقیہ گاتے بھی تھے ان کا مشہور فلمی گیت فلم ”گڈا گڈی“ کا ”چن نال پیار کرن دلیے، ایہو نتیجہ ہوندا اے“ ہے۔ دوسرے بھائی کا نام مشتاق ہاشمی ہے جنہوں نے کچھ عرصہ پرویز مہدی کے ساتھ دوگانے بھی گائے۔ ”نی سیے بے خبرے تیرا لٹیا شہر بھنبھور“ ان کا مشہور آئٹم ہے بعد میں یہ جوڑی ٹوٹ گئی۔ شعبہ اداکاری میں بہت سے نام ایسے ہیں کہ آج کی نئی نسل ان کے ناموں سے واقف ہی

گزشتہ ایک صدی میں جو سائنسی ایجادیں منظر عام پر آئیں ان میں سینما کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اگرچہ آج ہمارے لیے سینما عجوبہ نہیں رہا ہے لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جب اس کی ایجاد ہوئی تھی تو دنیا کے لیے یہ معجزے سے کم نہ تھا۔ فوٹو گرافی کی ایجاد سے عکس کو دیر پا بنا دیا گیا تھا لیکن اس کو متحرک بنانے میں کئی برس تک کئی سائنسداں سرگرداں رہے۔ متحرک فلموں کی کہانی اس لحاظ سے ایک بہت ہی دلچسپ داستان ہے۔

سینما کا پہلا مرحلہ تھا کنیما ٹو گراف جو 19 ویں صدی کے آخر میں ایجاد کیا گیا۔ کنیما (Kinema) دراصل یونانی لفظ ہے جس کے معنی حرکت کرتی ہوئی تصویریں ہیں۔ بہت عرصے تک یورپ میں کنیما ٹو گراف لفظ رائج رہا لیکن بعد میں فرانسیسی لفظ ''سینما ٹو گراف'' چل پڑا۔

بعض محققین سینما کی ایجاد کے ابتدائی سلسلے کو سیام، چین، جاپان اور ہندوستان میں دکھائے جانے والے چھایا ناٹکوں سے وابستہ کرتے ہیں لیکن انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ ہاں مشہور جرمن ریاضی داں اتھانا میں کرچر نے روم میں اپنی میجک لینٹرن (Magic Lantern) کے ذریعے ہاتھ سے بنائی کچھ تصاویر پردے پر دکھائی تھیں جنہیں سینما کی ایجاد کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جاسکتا ہے لیکن اس کے بعد لگ بھگ دو سو برس تک اس طرح کی کوشش یا تجربے کے آثار نہیں ملتے۔ جس سے یہ کہا جاسکے کہ سینما کی ایجاد کے سلسلے میں مسلسل کوشش جاری رہی۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ سینما کی ایجاد کی کوششوں کا حقیقی سلسلہ انیسویں صدی کے ابتدائی دور سے شروع ہوتا ہے اس سلسلے میں 24 دسمبر 1824ء کو شہرہ آفاق تصنیف (Thesaurus) کے مصنف پیٹر مارک روجٹ متحرک تصاویر سے متعلق لندن کی رائل سوسائٹی میں پڑھا گیا مقالہ (The Perststance of vision with regard to Moving object) بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک سائنسداں جان ہرشل نے لکڑی کا ایک چھوٹا کھلونا بنایا جسے متحرک تصویروں کی ایجاد کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جاسکتا ہے۔ ہرشل نے موٹے کاغذ کے ایک گول ٹکڑے پر ایک طرف ایک پرندے اور دوسری طرف ایک پنجرے کی تصویر بنائی تھی اور دونوں سروں پر ایک دھاگا باندھ دیا تھا جب اس گول ٹکڑے کو تیزی سے گھمایا جاتا تھا تو دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ پرندہ پنجرے میں قید ہے حالانکہ ایسا محسوس ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تیزی سے گھومنے کی وجہ سے پرندے پر نظر ٹکنے سے پیشتر ہی آنکھوں کے سامنے پنجرہ آجاتا تھا۔ ہرشل کے علاوہ ہنری فٹن اور ڈاکٹر مائیکل فیریڈے نے بھی متحرک تصاویر سے متعلق تحقیق میں نمایاں حصہ لیا۔

1832ء میں ڈاکٹر جوزف انٹونی فرڈیننڈ پلیٹو نے بیلجیم میں اور ڈاکٹر سائمن رٹر فان سٹیمپفر نے آسٹریا میں بیک وقت تصویروں کو متحرک بنانے کا ایک آلہ تیار کیا جسے سینما کی ایجاد کی جانب ایک اہم قدم قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں ایک چرخی پر بہت سی تصاویر چسپاں کردی جاتی تھیں اور جب اس چرخی کو گھمایا جاتا تھا تو تصویریں حرکت

نہیں ہے۔ ان گمنام ناموں میں سے ایک فلمی نام ''استاد صادق علی بیلی'' کا ہے۔ آپ یکم مارچ 1922ء کو انڈیا کے شہر شاہ کوٹ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ آٹو انجینئر اور ڈرائیور رہے۔ فیروز پور چھاؤنی میں آرمی میں ملازم ہوئے وہاں فوجیوں کو ڈرائیوری سکھاتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد خاندان ہجرت کرکے کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان میں رہائش پذیر ہوا۔ وہاں کی تھیٹریکل کمپنی کے سرگرم آرٹسٹ تھے۔ بہت سے یادگار ڈرامے کیے۔ سحر ہونے تک، ٹرک تاڑی وجدی اے، بدرو بینک

ور بندوق ان کے یادگار ڈرامے ہیں۔ بحیثیت فلمی اداکار ان کی پہلی فلم ''آبرو'' تھی جس میں فلمسٹار بہار بیگم کے مقابل کام کیا۔ منور ظریف کی پہلی فلم ''ڈنڈیاں'' میں بھی کریکٹر رول کیا۔ اسی طرح کچھ اور فلمیں بھی صادق علی بیلی کے کریڈٹ پر ہیں۔ فلمی دنیا سے اکتائے تو ملتان لوٹ آئے اور پھر ساری زندگی ملتان کے تھیٹر اور ریڈیو پاکستان ملتان کے ڈراموں کے لیے وقف کردی۔ آپ کا شمار ملتان کے تھیٹر کے سینئر ترین اداکاروں میں ہوتا تھا۔ 17 جولائی 1981ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور

کرتی محسوس ہوتی تھیں۔

اس کے بعد 1853ء میں آسٹریا کے بیرن فرینز فان اچٹس نے سیربین اور چرخی کو ملا کر ایک آلہ تیار کیا۔ اچٹس کے علاوہ لندن کے جارج ہارنر نے بھی اس سلسلے میں اہم کام انجام دیا۔ پلیٹو اور سٹیمپفر کے مشاہدات و تجربات سے فائدہ اٹھا کر زیٹروپ (Zoetrope) نامی آلہ منظر عام پر آیا۔ زیٹروپ میں ایک چرخی پر بہت سی تصاویر چسپاں کر دی جاتی تھیں اور اس کے آگے ایک اور چرخی ہوتی تھی جب اس چرخی کو گھمایا جاتا تھا تو تصویر میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی لیکن اس آلے میں ایک نقص تھا کہ تصویریں کیمرے کے بجائے ہاتھ سے بنی ہونے کی وجہ سے یکساں نہیں بنتی تھیں جس سے حرکت میں تسلسل نہیں رہتا تھا اور رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ اس آلے کے ذریعے جانوروں، مداریوں اور مسخروں وغیرہ کی تصویریں چلتی پھرتی صورت میں دکھائی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں ایملے رینالڈ کی Praxinoscope کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس میں اور پہلے کے بنائے گئے آلوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا صرف اس میں دیکھنے والے سوراخوں کی جگہ شیشے لگا دیئے گئے تھے۔ رینالڈ 1892ء تک اس میں مسلسل اضافہ و اصلاح کرتے رہے اور آخر انہوں نے پیرس میں ایک تھیٹر کھول لیا جہاں وہ 1900ء تک ان چلتی پھرتی تصویروں کی نمائش کرتے رہے حتیٰ کہ فرانس میں فلموں کی باقاعدہ نمائش شروع ہوگئی اور انہیں اپنے اس کھیل کو مجبوراً بند کرنا پڑا۔

1860ء میں ایک امریکن باشندے ہنری کول مین نے زیٹروپ کے تصویروں میں پیدا ہونے والی رکاوٹ کو دور کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن اس نے اپنے بچے کو ایک بکس میں کیل ٹھوکتے ہوئے دیکھا اور اس نے دوسرے شیشے کا استعمال کر کے اس کے کئی پوز کھینچ لیے اور انہیں اسٹریواسکوپ کے شیشے کے پیچھے گھومنے والے ایک پیڈل ویل پر چپکا دیا جس سے حرکت میں پیدا ہونے والی رکاوٹ دور ہوگئی اس سے تقریباً دس برس بعد فلاڈلفیا میں ہنری رینو ہیلن نامی فوٹو گرافر نے پہلی بار کئی پوز کی تصاویر کو ایک طشتری پر چسپاں کر کے متحرک تصاویر کی صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا اس کے بعد 1877ء میں کیلی فورنیا کے گورنر کی فرمائش پر ایڈورڈ مائی برج نامی فوٹو گرافر نے دوڑتے گھوڑے کی مسلسل 25 تصویریں کھینچ کر متحرک تصاویر کی ترقی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا چونکہ ان دنوں آٹو میٹک کیمرے نہیں تھے لہٰذا مائی برج نے 25 کیمروں کو ایک قطار میں لگا کر ان سب کے شٹر دھاگے سے اس طرح باندھے کہ جب دوڑتا ہوا گھوڑا کیمرے کے سامنے سے گزرتا تھا تو یکے بعد دیگرے دھاگے ٹوٹتے جاتے اور شٹر کھل کر بند ہوتا جاتا تھا ان تصاویر کو ایک ساتھ دیکھنے سے گھوڑا دوڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ 1880ء میں سان فرانسسکو میں ان تصاویر کو ایک شیشے کی طشتری کے ذریعے متحرک حالت میں دکھایا گیا۔

اقتباس: فلم ڈائریکٹری، از: یاسین گوریجہ

مرسلہ: ارباز خان۔ پشاور

خوبصورت شخصیت کے مالک معروف اداکار حبیب محلہ قاضیاں اندرون پاک گیٹ کے رہائشی تھے۔ یہیں سے وہ فلمی دنیا کی روشنیوں میں گئے۔ ہدایتکار لقمان کی فلم ''آدمی'' سے شہرت ملی۔ حبیب کی شادی ملتان میں ایک خاتون سے ہوئی پھر جب فلمی دنیا میں گئے تو اداکارہ نغمہ سے شادی کی، پہلی بیوی کو طلاق دے دی اور ملتان کو چھوڑ دیا۔ حبیب نے سینکڑوں فلموں میں کام کیا۔ چند فلمیں پروڈیوس بھی کیں۔ معروف فلمی اداکار اور کریکٹر اداکار افضال نے بھی اپنی زندگی کے کئی ابتدائی سال صابن والی گلی اندرون حرم گیٹ میں گزارے۔ یہ افضال کی گمنامی کا دور تھا۔ یہاں سے پھر وہ ساہیوال چلے گئے۔ لیجنڈ اداکار محمد علی، خالد سلیم بٹ، سلیم ناصر، اداکار اقبال حسن جیسے نامور آرٹسٹ ملتان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جمال حسین راجپوت ملتان اندرون بوہڑ گیٹ کے گمنام فلمی اداکار تھے۔ خوبرو اور فنی صلاحیتوں سے مالا مال اس ایکٹر نے 1944ء کو آنکھ کھولی۔ شروع سے ہی شوبز سے لگاؤ تھا۔ تاج محل سینما کے مالکان سے ان کی رشتہ داری تھی۔ نامور فلمی گائیک و شہنشاہ غزل مہدی حسن ان کے بڑے بھائی میاں ممتاز حسین راجپوت کے گہرے دوست

تھے۔ مہدی حسن کی وجہ سے 1967ء کو فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ مسٹر اللہ دتہ، انقلاب، حیدر علی، حاتو جٹ سمیت کم وبیش 15 فلموں میں اداکاری کی۔ 1972ء میں فلمی دنیا سے دلبرداشتہ ہوکر ملتان واپس آگئے۔ میاں جمال حسین راجپوت کا 10 اکتوبر 2005ء کو انتقال ہوا۔ چوک شہیداں کی ایک اور گمنام فلمی شخصیت نیر سلطان ہیں جنہوں نے ''برسات'' اور ''رواج'' نامی فلمیں بنائیں۔ فلم پروڈیوسر اجمل قریشی اور اکمل قریشی ایڈووکیٹ بھی کافی عرصہ فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ دلجیت مرزا کا نام بھی فلمی صنعت میں بطور اداکار، فلمساز خاصا معروف ہے۔ جو ملتان کینٹ کے رہائشی تھے۔ ابتداء میں ملتان تھیٹر کے معروف آرٹسٹ رہے۔ ''نانی ٹھگی'' کے کریکٹر سے انہیں خاصی شہرت ملی۔ دلجیت مرزا نے شباب کیرانوی کی فلم ''جلن'' سے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا۔ بہت سی فلموں میں اداکاری کی، بطور مزاحیہ اداکار بھی اپنی پہچان بنائی۔ ''ڈی ایم فلمز'' کے نام سے فلمی ادارہ بنایا اور کافی فلمیں بنائیں۔ ان کے بیٹے بھی فلم سازی سے منسلک رہے ہیں جو فلم ''رقعہ'' میں بطور ہیرو کام کر چکے ہیں۔ راج ملتانی کا تعلق ملتان کے مضافاتی شہر جہانیاں سے تھا۔ فلم ''یار مستانے'' میں بطور ہیرو آئے۔ خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ سرائیکی فلم ''رمضانا'' کا ٹائٹل رول بھی راج ملتانی نے کیا۔ سرائیکی فلم ''دھیاں نمانیاں'' میں بھی اداکاری کی۔ بطور فائٹر کریکٹر ایکٹر 400 سے زائد فلموں میں کام کیا۔ راج ملتانی کی زندگی کے آخری دن انتہائی کسمپرسی کی حالت میں گزرے۔ ملتان اور اس کے مضافاتی علاقوں سے تعلق رکھنے والے دیگر فلمی اداکاروں میں فلمساز واداکار خالد محمود خان، عامر بھٹی، انور جٹ، سعید گجر، شوکت زاہدی، سلیم بھٹی، قاسم گیلانی، بہادر گیلانی، محسن گیلانی، ماسٹر فقیر حسین امرتسری، قادر نواز خان، شیخ چلی، آغا حسین، زاہد سلیم، فدا ملک، حق نواز قمر، قسور حیدری (باباشیراں والا)، شمشیر حیدر ہاشمی، سلیم رضا، احمد فراز، خادم ملتانی، راشد ملتانی، ملک رانجھو، مجید عباس، اسلم ترنگی، عزیز کالرو، تسیم بھٹہ اور ان جیسے بہت سے غیر معروف آرٹسٹ ہیں جو فلم نگر گئے لیکن فلم کے بڑے اداکار نہ بن سکے۔ بات کامیابی یا ناکامی کی نہیں کوئی بھی آرٹسٹ چاہے ایک سین میں آیا ہو، فلم کامیاب ہوئی ہے یا فلاپ، فلم کا ہر آرٹسٹ سینما کی تاریخ کا حصہ ہے۔

سرائیکی خطے کے دوسرے شہروں سے بھی بہت سے آرٹسٹ فلم سے وابستہ رہے ہیں۔ ٹی وی اداکار توقیر ناصر جن کا تعلق مظفر گڑھ سے ہے انہوں نے بھی کچھ فلموں میں کام کیا لیکن بطور ہیرو جگہ نہ بنا سکے صرف ٹی وی ڈراموں تک محدود رہے۔ فلمی اداکار فیروز کا تعلق لیہ سے ہے۔ فلم فائٹرز میرن لودھی اور محمد حسین لودھی کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے ہے۔ اداکار جمال جنہوں نے جذبات 69ء، راجا جانی 70' ور ہستی 70' آنسو بہائے پتھروں نے 71ء، شاہ 72ء، رنگیلا عاشق 73ء کی فلموں میں کام کیا، ڈیرہ غازی خان سے تعلق رکھتے ہیں۔ احسان قادر چانی نے جن فلموں میں کام کیا ان میں ساڈا لہو، گنگا سنگھ، زندگی، دنیا پاگل خانہ، بدلہ شامل ہیں۔ ہدایت کاری ان کا پسندیدہ شعبہ ہے۔ جام پور سے تعلق رکھنے والے نامور فلمی ایکٹر شیر علی ہیں۔ انہوں نے پنجابی، سرائیکی، اردو اور پشتو فلموں میں بیک وقت کام کیا ہے۔ ان کی معروف فلموں میں رنگیلا عاشق، قتل کے بعد، کھلی کچہری، حاتو جٹ (سرائیکی)، پانی، شیر دل، ماجھو، ولیا، دل کسی کا دوست نہیں اور ان جیسی پچاسوں فلمیں شامل ہیں۔ مشہور ٹی وی سیریل ''دشت'' میں بھی کام کر چکے ہیں۔ اداکار فیض ملتانی 12 اپریل 1938ء کو محلہ غریب آباد ملتان میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے تھا۔ فلم ساز ہدایتکار ملک تسیم بھٹہ کے قریبی دوست تھے۔ فیض ملتانی نے بہت سی فلموں میں کریکٹر رول کیے جن میں اردو، پنجابی اور سرائیکی فلمیں شامل ہیں۔ فلم عادل، ندیا کے پار، اکھڑ، موت کھیڈ جواناں دی، حاتو جٹ اور خان بلوچ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح ڈیرہ غازی خان کی ایک اور مشہور شخصیت نصر اللہ قریشی شامل ہیں۔ یہ فلم ساز اداکار ماشاء اللہ قریشی کے صاحبزادے ہیں۔ فلم دھڑکن اور جان جان پاکستان میں کام کر چکے ہیں۔ پاکستانی فلمی تاریخ میں مزاحیہ اداکاری کے حوالے سے محمد رفیع خاور ننھا کا نام لیجنڈ اداکاروں میں ہوتا ہے۔ اداکار ننھا کا تعلق کہروڑ پکا سے تھا۔ 1929ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک اسی شہر سے کیا اور بینک میں ملازم ہوگئے۔ کچھ عرصہ کہروڑ پکا میں گزارا اور وہیں تھیٹر کے ابتدائی ڈرامے کیے پھر ساہیوال چلے گئے اور وہاں سے بینک کی ملازمت چھوڑ کر فلمی دنیا کی چکاچوند روشنیوں میں گم ہوگئے۔ اداکار ننھا کی پہلی فلم (وطن کا سپاہی) تھی۔ اندازاً تین سو پچاس فلموں میں کام کیا۔ علی اعجاز اور ننھا کی مزاحیہ جوڑی

نے فلمی صنعت کو بہت سی یادگار فلمیں دیں۔ بطور فلم ساز بھی کچھ فلمیں بنائیں۔ معروف ٹی وی مزاحیہ ڈراما "الف نون" ان کے فنی کیریئر کا یادگار ڈراما ہے۔ فلمی اداکارہ نازلی کے عشق میں ناکامی ہوئی اور اپنے ہی ہاتھوں سر میں گولی مار کر زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ پہلی ریلیز سرائیکی فلم "دھیاں نمانیاں" اور "رب دا روپ" میں ان کے برجستہ مزاحیہ جملے کون بھول سکتا ہے؟

ملتان کی مٹی میں آرٹ گوندھا ہوا ہے۔ بہت سی ادبی اور ثقافتی شخصیات جن کے دم سے ملتان کی ادبی اور ثقافتی فضا میں ایک عرصے تک رنگینی رہی آج ان کے نام پر گمنامی کی چادر پڑی ہوئی ہے۔ کنور مجید خان ایسی ہی ہشت پہلو شخصیت ہیں۔ تھیٹر، فلم، صحافت اور ان جیسے بہت سے حوالے اس شخصیت کا تعارف ہیں۔ کنور مجید خان شجاع آباد سے ملتان ایسے وارد ہوا جیسے رات کی بساط پر ستارہ نمودار ہوتا ہے۔ اس ستارے نے محنت کے پسینے اور ادبی کاوشوں کی چمک سے ملتان کی راتوں کو سہانا پن عطا کیا۔ کنور مجید خان، کالونی ٹیکسٹائل ملز کی تھیٹریکل اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکزی کردار شمار ہوتے تھے۔ کالونی تھیٹر کی تمام سرگرمیوں کے تمام انتظامی امور اس شخص نے انتہائی ایمانداری سے انجام دیئے۔ بہت سے آرٹسٹوں کو دور دراز دیہاتوں اور شہروں سے کالونی ملز کے اسٹیج تک لے آئے۔ تھیٹر، ڈراموں، موسیقی کی محافل اور مشاعروں کا تسلسل اسی شخصیت کی وجہ سے ممکن ہوا۔ کنور مجید نے ایک میگزین "ماہنامہ پاک کھلاڑی" شروع کیا۔ اس میگزین کے دفتر میں ہر وقت ادبی اور ثقافتی شخصیات کا ہجوم رہتا تھا جن میں جی ایم رفعت (اسکالر) شاہد ربانی (انجینئر اور اداکار) سلیم ناصر (ٹی وی و فلم اداکار) پرواز جالندھری، اطہر سلیم مسعودی، تاثیر نقوی، گلزار تبسم (شعراء) تصدق علی جانی، ریڈیو پاکستان کی معروف شخصیت اور استاد نزاکت علی خان سلامت علی خان کے چھوٹے بھائی کے علاوہ کئی اور زندہ دل ادیب شامل تھے۔ کنور مجید ملتان سے لاہور گئے وہاں انہوں نے "فلم ڈائجسٹ" شروع کیا جس کی وجہ سے فلمی شخصیات سے رابطے بڑھے۔ 1966ء میں کنور مجید نے مغربی اور مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے بڑے فلمی اداکاروں، ماہرین فلمی صنعت اور جنگی ماہرین کے تعاون سے قومی امنگوں کے عین مطابق ایک فلم 6 ستمبر بنانے کا اعلان کیا۔ فلم کے ہدایتکار کنور مجید خود تھے۔ کہانی و مکالمہ نویس قیصر ملک تھے۔ جنگ ستمبر 1965ء اور لاہور کے دفاع

آتش فارسی زبان کا لفظ ہے جس کو عربی میں نار، ترکی میں ادت، سنسکرت میں اگنی، ہندی اور اردو میں آگ کہتے ہیں۔ سائنس کے طالب علم جانتے ہیں کہ لفظ "آگ" عام طور پر چیزوں کے احتراق (Combustion) یا جلنے کے نظر آنے والے اثرات کو ظاہر کرتا ہے (آگ کا لفظ وسیع معنوں میں کسی بھی دہکتی ہوئی تپش کے مظاہرے کا احاطہ کرتا ہے) احتراق یا جلنے کے عمل میں جلنے والی چیز کے ایک یا ایک سے زائد جزو کے آکسیجن کے ساتھ کیمیائی ملاپ کے نتیجے میں یہ اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ عام فہم زبان میں جب ہوا کی آکسیجن (O2) کسی کاربنی میٹریل سے کیمیائی ملاپ کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں حرارت، شعلہ اور روشنی پیدا ہوتی ہے چنانچہ اسی شعلے کو آتش یا آگ کہتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم کے مضامین سے اقتباس

تلاش: خالد مغل، خانیوال

پاکستانی کرکٹ ٹیم کے سابق فاسٹ بالر سرفراز نواز کیم دسمبر 1948ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر سے انہوں نے اپنے کرکٹ کیریئر کا آغاز کیا۔ پاکستان کی جانب سے 55 ٹیسٹ میچوں میں انہوں نے 177 وکٹیں حاصل کیں، جبکہ 45 ون ڈے میچوں میں وہ 45 کھلاڑیوں کو اپنا شکار بنانے میں کامیاب رہے۔ ان کے والد مرحوم محمد نواز لاہور کے معروف کنسٹرکٹر تھے۔ تعمیراتی کام کے حوالے سے انہیں بہت زیادہ شہرت حاصل تھی۔ ان کی والدہ حسن آرا بیگم گھریلو خاتون تھیں۔ سرفراز نواز کے دو بھائی ہیں۔ جاوید نواز، جو کہ ان سے بڑے ہیں اور شاہد نواز ان سے چھوٹے ہیں۔ بڑے بھائی لاہور میں اور شاہد انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ چھوٹے بھائی نے انگلینڈ میں پروفیشنل لیگ کرکٹ کھیلی جبکہ پاکستان کے قومی سطح کے مقابلوں میں بھی حصہ لیا، تین بہنیں عظمت، فضیلت غفور اور عائشہ شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے گھروں میں خوش گوار زندگی بسر کررہی ہیں۔

مرسلہ: فرزانہ روحی، لاہور

کے ہیرو جنرل سرفراز خان نے فلم کے افتتاحی کلمات اور کلیپ دے کر افتتاح کی رسم ادا کی۔ یہ فلم مکمل ہوئی لیکن جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کی بھینٹ چڑھ گئی جو کہ ابھی تک ڈبوں میں بند پڑی ہے۔

ہدایتکاری اور فلم سازی کے شعبے میں ایک اور بڑا نام جمشید نقوی کا بھی ہے جنہوں نے خریدار، پیاری، نشانی، آئی لو یو، ہوا کا جھونکا، شیر باز خان جیسی فلمیں بنائی ہیں۔ جمشید نقوی کا بچپن اندرون بوہڑ گیٹ میں گزرا۔ یہاں غربت اور جدو جہد کی زندگی گزاری، یہیں تعلیم مکمل کی۔ جمشید نقوی جب فلمی دنیا میں گئے تو وہاں خوب محنت کی۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کیا اور اپنے نام کا سکہ جمایا۔ اسی طرح تھیٹر کی دنیا کا ایک اور معروف نام ایس قمر زیدی کا بھی ہے۔ ملتان میں تھیٹر کی روایت کو بام عروج تک پہنچانے میں اس شخصیت کی خدمات نصف صدی سے بھی زائد عرصے پر محیط ہیں۔ قمر زیدی نے مشرقی پاکستان میں اپنے کیریئر کا آغاز فلم سے کیا تھا۔ اس وقت کے معروف فلمی ہدایتکار چوہدری سلطان کو کئی فلموں میں اسسٹ کیا جن میں ”سیلاب“ قابل ذکر فلم ہے۔ پاکستانی فلمی دنیا کی معروف ہیروئن شبنم جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے اپنے کیریئر کا آغاز تھیٹر ڈراموں سے کیا تھا۔ اس وقت شبنم کا نام ”جھرنا“ تھا۔ شبنم نے ایس قمر زیدی کی ڈائریکشن میں کئی ڈراموں میں کام کیا۔ اسی طرح آج کل کے نوجوان ہدایتکار شہزاد حیدر جن کا تعلق ملتان کے نواحی قصبے قادر پوراں سے ہے راقم کے کلاس فیلو بھی تھے۔ شہزاد حیدر بہت سی پنجابی فلموں کی ڈائریکشن بھی دے چکے ہیں اور کامیابی کے لیے جدو جہد کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

جہاں تک فلمی اداکاراؤں کا تعلق ہے تو پاکستان کی بیشتر معروف ہیروئنوں کا تعلق سرائیکی خطے اور خصوصاً ملتان سے رہا ہے۔ تقسیم سے پہلے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کرنے والی برصغیر کی نامور فلمی ہیروئن اداکارہ ”مینا شوری“ جنہیں فلمی دنیا میں ”لارا لپا گرل“ کے نام سے شہرت ملی ریلوے کالونی ملتان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد چادروں کی رنگائی کا کام کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ انصار کالونی میں بھی چادروں کی رنگائی کا کام کرتے رہے۔ ان کا نام میاں برکت علی تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے سہراب مودی کی فلم ”سکندر اعظم“ سے مینا شوری نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ ان کی یادگار فلموں میں پتھروں کے سوداگر، رت رنگیلی، آرسی، انمول، رتن، کالے بادل، دکھیاری اور قیام پاکستان کے بعد کی چند کامیاب فلموں میں مس 56، سرفروش، گل فروش، بچہ جمورا، بہروپیا، آخری نشان، گلشن، موسیقار، خاموش رہو، جمالو اور مہمان شامل ہیں۔ مینا شوری نے اپنے وقت کے تقریباً ہر ہیرو کے ساتھ رومانس کیا۔ پانچ شادیاں کیں۔ یہاں تک کہ ایک شادی کے لیے مذہب بھی تبدیل کر لیا۔ اتنی شادیوں کے باوجود بھی انہیں سکھ نہ ملا اور نہ ہی اولاد ملی۔ زندگی کے آخری دن غربت اور گمنامی میں گزارے یہاں تک کہ بھیک تک مانگی۔ معروف لوک فنکارہ نذیراں بہاولپورن کی بیٹیاں انجمن اور گوری پاکستانی فلمی صنعت کی صف اول کی فلمی ہیروئنیں بنیں۔ اس گھرانے کا ابتدائی وقت بھی ملتان میں گزرا۔ اداکارہ انجمن اور گوری نے اردو فلموں سے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا لیکن اپنے بے پناہ حسن اور ہوشربا رقص کی وجہ سے پنجابی فلموں کی صف اول کی ہیروئنیں بنیں اور ایک طویل عرصہ تک ان دونوں بہنوں کا راج فلمی دنیا پر رہا۔ انجمن کی پہلی فلم ”وعدے کی زنجیر“ اور گوری کی ”ذرا سی بات تھی“۔ سرائیکی خطے کے اہم ترین شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھنے والی خوبرو ہیروئن مسرت شاہین نے ایک طویل عرصہ پنجابی، اردو اور خاص طور پر پشتو فلموں میں اداکاری کی۔ قیصر ملک کی سرائیکی فلم ”حیدر و لیر“ کی ہیروئن بھی مسرت شاہین ہی تھیں۔ دلہن ایک رات کی ان کی یادگار فلم تھی۔ کچھ عرصہ پہلے انہوں نے اداکاری کو خیر باد کہنے کے بعد اپنی ایک سیاسی پارٹی ”تحریک مساوات“ بنائی۔ قومی اسمبلی کے الیکشن بھی لڑے اور آج کل شوبز سے کنارہ کشی اختیار کی ہوئی ہے اور سیاست میں متحرک ہیں۔ اسی طرح نامور گلوکار سیان کی بیٹی ریما نے فلم ”بلندی“ سے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا۔ اداکارہ اتنی اچھی ثابت نہیں ہوئیں جتنی اچھی ڈانسر تھیں۔ آج کل فلم ڈائریکشن اور ماڈلنگ سے وابستہ ہیں اور ریما سے ریما خان بن گئی ہیں۔

ولایت آباد ملتان کی رہائشی ریڈیو آرٹسٹ نسیم بھٹی جو بعد میں فلمسٹار بازغہ کے نام سے معروف ہوئی نے چند فلموں میں کام کیا اور پھر سرائیکی خطے کے نامور لوک فنکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی سے شادی کر لی اور فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ اسی طرح آج کل کی معروف فلمی ہیروئنیں اداکارہ ثناء اور سائرہ خان کا تعلق بھی ممتاز آباد ملتان سے ہے۔ شکیلہ قریشی اور اس کی بہن نسرین قریشی نے بھی ٹی وی ڈراموں میں کام کیا۔ شکیلہ قریشی نے عمر شریف سے شادی کی اور اس دوران مسٹر چارلی و دیگر فلموں میں کام کیا۔ عمر شریف سے علیحدگی کے بعد فلمی دنیا

سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

اداکارہ صائمہ جو آج سلور اسکرین کی صف اوّل کی اداکارہ ہیں ملتان سے تعلق رکھتی ہیں۔صائمہ نے "خطرناک" سے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔سلطان راہی کے ساتھ بحیثیت ہیروئن بہت سی فلموں میں کام کیا۔سلطان راہی کے اچانک قتل کے بعد پنجابی فلموں پر بحران آیا لیکن صائمہ کی فلم "چوڑیاں" نے پھر عروج بخشا۔سید نور سے شادی کی، کچھ عرصہ اسے خفیہ رکھا گیا اور بعد میں باضابطہ اعلان ہوا۔آج صائمہ فلمی دنیا کی معروف ومصروف ترین اداکارہ شمار ہوتی ہیں۔رخسانہ ملتانی بھی ماضی کی ایک خوبرو اداکارہ تھیں فلم "دھیاں نمانیاں" سے فلمی سفر کا آغاز کیا۔انتہائی باصلاحیت اداکارہ تھیں۔چیلنج، الٹی میٹم، ہسدے آ ہسدے جاؤ، جان کی بازی اور باری سٹوڈیوز کی بہت سی فلموں میں کام کیا۔ملتان کے معروف علاقے "ڈی مراثیاں" سے تعلق رکھنے والی اس اداکارہ کو علاقہ غیر میں انتہائی بے دردی سے قتل کردیا گیا۔اس کا قتل آج تک معما ہے۔اسی طرح ملتان کی کچھ اور اداکاراؤں نے فلموں میں کیریکٹر رول کیے۔تمیرا لودھی نے فلم بہرام ڈاکو، چن وریام، شمیم اختر عرف نمی نے اوکھیاں راہواں، اداکارہ وگلوکارہ شمشاد بانو نے فلم وچھوڑا بھجاں وا اور پروفیسر میں سپورٹنگ رول کیے۔شبانہ بھٹی نے فلم لائے دی جان، شباب، جی دار، مکھن خان اور چند پشتو فلموں میں کام کیا۔زبیدہ یاسمین نے فلم من کی آس اور تھیٹر کی معروف اداکارہ پروین انور نے فلم رب دا روپ میں کام کیا۔اداکارہ صاعقہ کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے تھا بہت سی فلموں میں اداکاری کی۔پہلی دو سرائیکی فلموں دھیاں نمانیاں اور سانجھ ساڈے پیار دی کی ہیروئن بھی اداکارہ صاعقہ ہی تھیں۔اسی طرح سرائیکی خطے سے بے شمار لڑکیاں ہیروئن بننے کے خواب لیے فلم انڈسٹری میں گئیں لیکن ایکسٹرا سے زیادہ کام نہ مل سکا اور وہ فلمی نگار خانوں کی گمنام کہانیاں بن گئیں۔

ملتان تھیٹر کی چند بے باک اداکارائیں صرف فلمسٹار بننے کے لالچ میں لاہور کی فحش اور سی کلاس فلموں میں اداکاری کرکے سستی شہرت حاصل کرچکی ہیں لیکن عریانیت کو کبھی بھی آرٹ کا نام نہیں دیا جاسکتا۔اتنی عریانیت دکھانے کے باوجود بھی سینما زوال کا شکار ہے۔

فلمی ہدایتکاری کے شعبے میں شوکت ہاشمی کی بہت زیادہ خدمات ہیں۔شوکت ہاشمی قیام پاکستان سے پہلے صحافت کے شعبے سے وابستہ تھے پھر فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔فلم "دربار" میں نامور ہدایتکار ریاض احمد کو اسسٹ کیا۔بحیثیت ہدایتکار ان کی پہلی ذاتی فلم "ہمسفر" تھی۔اس فلم کی شوٹنگ مشرقی پاکستان میں ہوئی تھی۔شوکت ہاشمی کے کریڈٹ پر بے شمار فلمیں ہیں۔فلم دروازہ، ڈاکٹر، جلنے نہ کیوں پروانہ، بندھن ان کی خاص فلمیں ہیں۔وہ نامور اداکارہ "بیگم پروین" کے بھائی تھے جنہوں نے بہت سی فلموں میں کام کیا۔نامور انڈین ہیرو عمران ہاشمی شوکت ہاشمی کے پوتے ہیں۔فلمی دنیا کی ایک اور معروف اور لیجنڈ شخصیت قیصر ملک کا تعلق بھی سرزمین ملتان سے ہے۔ملتان میں جدید تھیٹر کی بانی شخصیت شمار ہوتے ہیں۔بے شمار ڈرامے لکھے، نئے آرٹسٹوں کو متعارف کرایا۔ریلیز ہونے والی پہلی سرائیکی فلم "دھیاں نمانیاں" کے رائٹر تھے۔عنایت حسین بھٹی کو سرائیکی فلموں میں کامیابی اسی شخصیت نے دلائی۔اس متحرک شخصیت نے کل 32 فلمیں لکھیں جن میں دھیاں نمانیاں، رب دا روپ، حیدر دلیر (سرائیکی)، صدقے تیری موت توں، روٹی، کپڑا اور مکان، ارادہ، مقابلہ، الٹی میٹم، زندہ باد، توڑ دیو زنجیراں، ٹارگٹ، زلف تے زنجیر، آخری دشمن، انتقام کے شعلے، زندگی یا موت، کال گرل، پیشہ ور بدمعاش، خون دی ہولی قاتل، ذکر ہیں۔روٹی، کپڑا اور مکان موضوع کے اعتبار سے انقلابی فلم تھی جس کے ڈائیلاگ آج بھی لوگوں کو ازبر ہیں۔قیصر ملک نے مکالمہ نویسی، گیت نگاری، ہدایت کاری، فلم سازی غرض فلم کے تقریباً ہر شعبے میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ہمارے سرائیکی خطے خصوصاً ملتان میں فلم کے حوالے سے جو لیجنڈ شخصیت موجود ہیں وہ اس وقت قیصر ملک ہیں۔آج جبکہ سینما زوال کا شکار ہے تو قیصر ملک جیسی فلم کی نمائندہ شخصیت کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ازحد ضروری ہے۔عنایت حسین بھٹی کی زندگی کا بیشتر حصہ سرائیکی خطے میں گزرا۔تھیٹر کے حوالے سے ان کی اپنی شناخت تھی۔محرم الحرام میں مجلسیں پڑھتے۔اعلیٰ پائے کے ذاکر بھی تھے۔سرائیکی فلم سازی کا آغاز بھی اس لیجنڈ نے کیا۔کہتے ہیں لوہاری گیٹ جہاں اس وقت لنڈے والے بیٹھے ہیں وہاں بھٹی نے اپنی گمنامی کے دنوں میں کوئلہ بھی بیچا۔دولت، شہرت اور عزت کی دیوی عنایت حسین بھٹی پر پوری طرح مہربان تھی۔فلم سازی، گلوکاری، اداکاری، مجلسیں پڑھنا غرض ہر شعبے میں عنایت حسین بھٹی نے خوب پیسا کمایا۔بقول نور جہاں عنایت حسین بھٹی سرائیکی خطے کے "دلیپ کمار" تھے۔اسی

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

طرح ملک نسیم بھٹہ کی بھی فلمی دنیا میں بہت سی خدمات ہیں۔انور کمال پاشا کے شاگرد تھے۔ملتان فلم اسکوائر اور الحیات پاپولر پکچرز کے نام سے فلم ساز ادارے بنائے۔وہ ان اداروں کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ڈسٹری بیوٹر تھے۔سرائیکی فلم بنانا ان کا خواب تھا۔فلم ''جاتو جٹ'' بنائی بدقسمتی سے یہ فلم ریلیز نہ ہوسکی۔اس فلم کے موسیقار گلزار مختار تھے یہ فلم اپنی لازوال موسیقی کی وجہ سے آج بھی فلمی شائقین کو یاد ہے۔اس فلم کی ریلیز کے بعد ملک نسیم بھٹہ دو اور سرائیکی فلمیں ''میڈا سائیں'' اور ''رانجھن یار'' بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اس کے علاوہ دو اردو فلمیں ''مدھ بھرے نین'' اور ''داغ تمنا'' کا اسکرپٹ مکمل کرچکے تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور یہ سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔اسی طرح پروفیسر عامر فہیم بھی نابغہ روزگار شخصیت ہیں۔سرائیکی فلم سازی میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔''تھیوا'' فلم ریلیز کی۔عامر فہیم نے بہت سے آرٹسٹوں کو متعارف کرایا بقول ان کے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو بھی انہوں نے متعارف کرایا۔خالد محمود خان جو کہ ''سانجھ ساڈے پیار دی'' کے ہیرو اور فلم ساز تھے ان کا شمار ملتان کے ابتدائی تھیٹر آرٹسٹوں میں ہوتا ہے۔سرائیکی فلم سازی کے لیے ان کی بے شمار خدمات ہیں۔فلم ''سانجھ ساڈے پیار دی'' کے سیکنڈ ہیرو، فلم ساز و سینئر تھیٹر آرٹسٹ عامر بھٹی بھی فلم سازی کے حوالے سے منفرد پہچان رکھتے ہیں۔منور شہزاد نے بھی فلم کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں۔فلم ''سانجھ ساڈے پیار دی'' کے رائٹر وہی تھے۔اس کے علاوہ فلم ''آئی لو یو'' اور دیگر کچھ اور فلموں کی کہانیاں ان کے کریڈٹ پر ہیں۔بنیادی طور پر وہ ریڈیو پاکستان ملتان کے اسکرپٹ رائٹر تھے۔ملتان میں تھیٹرز کے لیے بھی بہت سے ڈرامے لکھے۔

موسیقی فلم انڈسٹری کا اہم ترین شعبہ ہے۔سرائیکی وسیب کے سب سے اہم اور بڑے موسیقار، پاکستان فلم انڈسٹری کے اعظم خواجہ خورشید انور کا تعلق سرائیکی خطے کے اہم شہر میانوالی سے تھا۔خواجہ خورشید انور برصغیر کے یہاں کلاسیکل گائیک اور نائیک استاد توکل حسین خان کے شاگرد تھے۔جن کی زندگی کا طویل عرصہ ملتان، ڈیرہ غازی خان اور سرائیکی خطے کے مختلف علاقوں میں گزرا۔استاد توکل حسین خان نے فلم انڈسٹری کو خواجہ خورشید انور جیسا لیجنڈ موسیقار دیا۔جن کی فلمی دھنیں آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہیں۔خواجہ خورشید انور 21 مارچ 1912ء کو میانوالی میں پیدا ہوئے۔گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے فلسفہ کا امتحان پاس کیا۔موسیقی میں خان توکل حسین خان کی شاگردی اختیار کی۔کلاسیکل موسیقی کی باقاعدہ تربیت حاصل کی اور آل انڈیا ریڈیو سے کلاسیکی موسیقی کے پروگراموں میں بحیثیت گلوکار گاتے رہے۔1936ء میں انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا لیکن ملازمت نہ کی۔1939ء میں آل انڈیا ریڈیو میں موسیقی کے پروڈیوسر منتخب ہوئے لیکن طبعاً آزاد منش ہونے کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی۔پہلی فلم ''کڑمائی'' کی موسیقی ترتیب دی۔1940ء سے 1982ء تک خواجہ صاحب نے کل 28 فلموں کی موسیقی دی۔اشارہ، پروانہ، سنگھار، انتظار، کوئل، گھونگھٹ، چنگاری، جھومر، زہر عشق، ہمراز اور ہیر رانجھا شامل ہیں۔موسیقی کے علاوہ خواجہ صاحب نے بحیثیت فلم ساز اور کہانی نویس چھ فلمیں بنائیں۔تین فلموں گھونگھٹ، چنگاری، ہمراز کی ہدایات بھی دیں۔1976ء میں خواجہ صاحب نے کلاسیکی موسیقی محفوظ کرنے کے لیے اپنی زندگی کا سب سے بڑا پروجیکٹ ''آہنگ خسروی'' شروع کیا جو دو سال کی شب و روز محنت کے بعد 1978ء کو مکمل ہوا۔90 راگوں کو دس کیسٹوں پر محفوظ کیا۔آہنگ خسروی کا دوسرا حصہ 20 کیسٹوں پر مشتمل کلاسیکی گھرانوں کی گائیکی ہے۔1980ء کو حکومت پاکستان نے ستارہ امتیاز سے نوازا۔30 اکتوبر 1984ء کو سرائیکی خطے کے اس عظیم موسیقار کا انتقال ہوا۔فلمی موسیقی، گلوکاری اور اداکاری کے حوالے سے ایک معروف نام استاد فدا حسین جالندھری کا بھی ہے جو کہ دہلی گیٹ ملتان کے رہائشی تھے۔1923ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔والد کا نام استاد بھیک خان تھا۔آل انڈیا ریڈیو سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا۔ان کا گھرانہ کلاسیکی موسیقی اور قوالی کے حوالے سے مشہور تھا۔استاد فدا حسین نے فلم میں خاندانی ورثے کو فروغ دیا۔فلم میں قوالی گانے کی روایت ڈالی۔قیام پاکستان سے پہلے فلم ''سوہنی کمہارن'' کے لیے قوالی گائی اور کچھ فلموں کی موسیقی بھی دی جن میں من تھن، بمبئی والا، سہانا گیت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔پرتھوی راج کپور جن کا شمار ہندی سینما کے لیجنڈ اداکاروں میں ہوتا ہے اور ان کے چھوٹے بھائی ترلوک پور جو کافی عرصہ ملتان میں رہائش پذیر رہے، استاد فدا حسین کے قریبی دوست تھے۔کچھ فلموں میں اکٹھے اداکاری بھی کی۔جواہر لعل نہرو استاد فدا حسین کو اپنی تقریبات اور محافل میں بلوایا کرتے تھے۔جواہر لعل نہرو نے استاد فدا حسین کو گولڈ میڈل بھی دیا۔اسی طرح پری چہرہ نسیم جن کا شمار اس

وقت برصغیر کی بڑی اداکاراؤں میں ہوتا تھا استاد فدا حسین جالندھری کی باقاعدہ شاگرد رہیں اور خان صاحب سے موسیقی سیکھتی رہیں۔استاد فدا حسین کا خاندان قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہوگیا۔یہاں بھی ریڈیو کراچی کے لیے بحیثیت میوزک ڈائریکٹر کام کیا پھر 50ء کی دہائی کے آخر میں ملتان کے دہلی گیٹ میں رہائش اختیار کی۔سابق صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان جب شکار کے لیے جاتے تو اپنے ساتھ زاہدہ پروین اور استاد فدا حسین کو بھی لے جاتے تھے۔جنرل ایوب خان، استاد فدا حسین جالندھری سے "کیا حال سناواں دل دا کوئی محرم راز نہ ملدا" (کافی) اکثر سنا کرتے تھے۔ملتان میں فن قوالی کے ارتقاء میں استاد فدا حسین کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔کلاسیکی گائیکی کے ساتھ ساتھ قوالی اور کافی میں مہارت، راگوں کی جانکاری، فلموں میں اداکاری، گلوکاری اور سازوں کی ایجاد کے بارے میں معلومات ان کی فنی عظمت کی گواہی ہے۔استاد فدا حسین نے "بولتا سنگیت" کے نام سے 650 راگ، راگنیوں کی اپنی آواز میں تفصیل سے ریکارڈ کیا۔آپ کا کلاسیکل موسیقی پر یہ کام بہت بڑا ہے۔استاد فدا حسین 4 جولائی 1992ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔گلزار مختار موسیقار بھائیوں کی اس جوڑی نے بھی فلمی موسیقی میں نام کمایا۔ان کی مشہور زمانہ فلم "جاتو جٹ" ہے۔اس فلم کے گیت شائقین آج بھی نہیں بھولے ہیں۔

بہت سی فلمیں ایسی ہوتی ہیں جن کا میوزک اس فلم کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھتا ہے چاہے فلم باکس آفس پر کامیاب ہو یا نہ ہو۔"جاتو جٹ" ایک ایسی فلم ہے جو فلم کے پارٹنرز کے جھگڑے کی وجہ سے ریلیز ہی نہ ہوسکی لیکن اس فلم کی موسیقی آج بھی لوگوں کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔موسیقار گلزار تو آج اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کے بھائی موسیقار مختار ریڈیو پاکستان ملتان میں بحیثیت کمپوزر آج بھی وابستہ ہیں۔مختار نے چند سال پہلے پروفیسر عامر فہیم کی فلم "تھیبا" کا بھی میوزک دیا لیکن ملتان میں اس موسیقار کو ضائع کیا جارہا ہے۔مختار اگر لاہور میں ہوتے تو بحیثیت فلمی موسیقار زیادہ ترقی کرتے۔موسیقار منظور شاہی نے بھی فلم کے لیے میوزک دیا۔فلمی دنیا کے معروف موسیقار ماسٹر عبداللہ اور ماسٹر عنایت حسین، استاد عبدالباری کے بہت ہی قریبی دوست تھے۔استاد عبدالباری نے استاد شرف الدین شرف (سارنگی نواز) کی گھنٹا گھر والی اکیڈمی کو پھر سے آباد کیا۔ماسٹر عبداللہ اور ماسٹر عنایت حسین اکثر اس بیٹھک پر آتے اور فلمی کمپوزیشن پر ڈسکس ہوتی۔"کوئی لکھ کرے انکار دیا پیسے دی" مہدی حسن اور "جان من اتنا بتادو محبت ہے کیا" رونا لیلیٰ جیسے لافانی گیتوں کی طرزیں استاد عبدالباری خان کی اس اکیڈمی میں رکھے گئے ہارمونیم پر ہی فائنل ہوئیں۔

پاکستان کی لوک موسیقی میں استاد طفیل نیازی (مرحوم) کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔موسیقی کی اس عہد ساز شخصیت کا تعلق بھی ملتان سے رہا ہے ان کا تعلق برصغیر کے معروف اور قدیم پکھاوجی گھرانے سے تھا۔قیام پاکستان کے بعد استاد طفیل نیازی کا گھرانہ ملتان شفٹ ہوگیا اور صرافہ بازار ملتان کے ساتھ "گلی بگائیاں" میں رہائش رکھ لی۔طفیل نیازی کے قریبی عزیز رشتے دار بھی موسیقی کے لوگ تھے اور قوالی کیا کرتے تھے۔طفیل نیازی خود بھی قوالی کرتے رہے۔کلاسیکی موسیقی کے ماہر تھے اور فوک بہت گایا۔اسی گھرانے کا ایک قدیم آرٹسٹ "عظیم" تھا جو گلوکار نور جہاں کو کاپی کیا کرتا تھا۔کہا جاتا ہے کہ نور جہاں کے گیت اتنی مہارت سے گاتا تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ کیسٹ چل رہی ہے۔استاد طفیل نیازی نے ملتان کے جن گلوکاروں کو متعارف کرایا ان میں ناہید اختر اور ان کی بہن حمیدہ اختر کا بھی نام ہے۔انہیں طفیل نیازی نے ٹی وی کے پروگرام لوک تماشا میں متعارف کرایا۔ناہید اختر بعد میں فلمی سنگر بنیں۔استاد طفیل نیازی نے بذات خود فلموں میں گایا بھی اور موسیقی بھی دی۔ دھوپ اور سائے، چھوٹے لعل، منہ زور، مٹی دا باوا جیسی فلمیں ان کے کریڈٹ پر ہیں۔ان کا مشہور گیت "آ سن پاس کوئی گاؤں نہ دیا اور بدریا چھائی ہے" کس کو یاد نہیں؟ تصدق علی جانی کا تعلق شام چوراسی گھرانے سے ہے نے بھی فلم کے لیے میوزک دیا ہے۔جہاں تک فلمی شاعری کی بات ہے تو حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں کو فلم "وسیاں نمانیاں" سانجھ سانجھے پیار دی میں بھی شامل کیا گیا۔خواجہ صاحب کے کلام کی "تضمین" کی گئی۔حضرت سلطان باہوؒ کے کلام کو "مولا جٹ" میں غلام علی نے گایا۔جہاں ضرورت پڑی سرائیکی وسیب کے صوفی شعراء کے کلام سے استفادہ کیا گیا۔فلمی شاعری کے حوالے سے ملتان کے غزل گو شاعر حزیں صدیقی کا ایک بہت بڑا نام ہے۔فلمی دنیا سے ان کی وابستگی 30 سالوں پر محیط ہے۔حزیں صدیقی نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے اردو اور ہریانوی ڈراموں سے فنی سفر کا آغاز کیا۔تقسیم کے بعد ان کا خاندان ملتان آکر آباد ہوا۔حزیں صدیقی معروف فلم ساز شباب کیرانوی کے فلمی

اوارے ”شباب پروڈکشن“ میں طویل عرصہ فلمی کہانیوں کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ بہت سے فلمی گیت اور مکالمے لکھے۔ شباب کیرانوی خود بھی لکھتے تھے لیکن ان کی بیشتر تخلیقات حزیں صدیقی کے زورِ قلم کا نتیجہ تھیں۔ چند ایک فلمی گیتوں میں حزیں صدیقی کا نام آیا لیکن زیادہ تر شباب کیرانوی کا نام چھپتا رہا۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ کسی تخلیق کا کریڈٹ دوسرے شخص کو جائے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ایسی ہی پیشہ وارانہ بددیانتیوں سے لاہور کی کئی فلمی شخصیات نے سرائیکی خطے کے تخلیق کاروں کی تخلیقات کا کریڈٹ اپنے نام کروا کر اپنے قد کو اونچا کیا۔ فلم ”دل اک آئینہ“ کا مشہور گیت ”کسی نے اک نظر میں دل چرالیا ابھی ابھی“ اور نور جہاں کا فلم ”انسان اور آدمی“ کا گیت ”تو جہاں کہیں بھی جائے میرا پیار یاد رکھنا“ حزیں صدیقی کا ہی لکھا ہوا ہے۔ حزیں صدیقی نے کچھ فلموں میں اداکاری بھی کی۔ فلم ”درد“ میں دیبا کے والد کا کردار ان کا یادگار رول ہے۔ حزیں صدیقی کچھ فلمی رسائل اور اخبارات کے ایڈیٹر بھی رہے جن میں لاہور ٹائمز، نیا پیام اور شباب کیرانوی کا فلمی پرچہ ”پکچر“ بھی شامل ہے۔ سرور جالندھری فلمی شاعری کرتے تھے۔ دہلی گیٹ ملتان کے رہائشی تھے۔ ریڈیو کے لیے بھی گیت لکھے۔ فلم ”محلے دار“ سرور جالندھری کی یادگار فلم ہے جس میں انہوں نے گیت لکھے۔ سرور جالندھری برصغیر کے نامور انقلابی شاعر حبیب جالب کے قریبی رشتہ دار تھے۔ حبیب جالب کچھ عرصہ ملتان میں بھی رہے۔ حبیب جالب کا قیام سرور جالندھری کے ہاں ہی ہوتا تھا۔ معروف فلمی شاعر خواجہ پرویز بھی کالونی ملز میں کئی سال ملازم رہے۔ طارق جامی کا نام فلمی شاعری میں اس لیے ہمیشہ زندہ رہے گا کہ انہوں نے مشہورِ زمانہ گیت لکھا۔ ”نیناں دے بوہے بند نہ کر، محبوب مٹھا من ٹھار سجن، ساکوں جیندے جی نہ مار سجن“ یہ گیت غلام علی نے فلم ”سانجھ ساڈے پیار دی“ کے لیے گایا تھا۔ ملتان کے ادبی حلقوں میں طارق جامی کی کافی شہرت تھی۔ ساحر بخاری نے فلم ”سانجھ ساڈے پیار دی“ کے گیت لکھے۔ ریڈیو، ٹیلی وژن کے لیے بھی کافی گیت تخلیق کیے۔ ممتاز اطہر نے بھی چند فلمی گیت لکھے ہیں بقول ان کے فلم ”امبر“ کا گیت جسے اے نیئر نے گایا ہے ”ملے دو ساتھی کھلیں دو کلیاں“ انہی کی تخلیق ہے۔ فلمی دنیا میں یہ رواج عام ہے کہ تخلیق کسی کی ہوتی ہے اور ریکارڈ پر نام کسی اور کا ہوتا ہے۔ ممتاز اطہر کے ساتھ بھی وہی ہوا جو حزیں صدیقی کے ساتھ ہوتا رہا۔ ان کی تخلیق کا کریڈٹ بھی کوئی اور شاعر لے اڑا۔ قیصر ملک کی ویسے تو شہرت بطور فلمی کہانی، مکالمہ نویس کے ہے لیکن انہوں نے بہت سے فلمی گیت بھی لکھے۔ دھیاں نمانیاں، رب دا روپ، فلم میں خواجہ فرید کے کلام کی تضمین بھی انہوں نے کی۔ اس کے علاوہ اور بھی کافی فلموں میں قیصر ملک نے گیت نگاری کی۔ سرائیکی وسیب کے معروف شاعر محسن نقوی جو ہدایتکار جمشید نقوی کے قریبی دوست تھے ان کے کہنے پر ایک دو فلموں کے لیے گیت لکھے۔ اسی طرح عامر فہیم، منظور سیال، تسیم ملک بھٹہ، افضل عاجز فلمی گیت نگاری کرتے رہے۔

جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے تو بہت سی فلمی آوازیں ایسی ہیں جن کا تعلق سرائیکی خطے سے رہا ہے۔ استاد بڑے غلام علی خان جنہوں نے مغل اعظم جیسی فلم کے لیے کلاسیکل آئٹم ریکارڈ کرائے ہمیشہ ہی پیچھے آتے رہے۔ ملکہ ترنم نور جہاں اور ان کی بڑی بہنیں گلزار اور حیدر باندی 1930ء کی دہائی میں جس تھیٹریکل کمپنی کے لیے گاتی تھیں ملتان کے نقارچی خاندان کے خلیفہ رحیم بخش نقارچی بھی اسی کمپنی کے لیے کام کرتے تھے اسی کمپنی سے ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر شادی خان، ماسٹر چنی خان اور استاد گامے خان (میڈم کے استاد) جیسے اساتذہ موسیقی سے وابستہ تھے۔ نور جہاں ان دنوں باقاعدگی سے محرم الحرام کے دنوں میں اپنی تھیٹر پارٹی کے ساتھ نوحہ خوانی کے لیے آیا کرتی تھیں۔ حیدر باندی جن کا ایک طویل عرصہ سرائیکی خطے میں گزرا، نے فلم کے لیے بھی گایا اور فلم میں بحیثیت اداکارہ کام بھی کیا۔ عنایت بائی ڈھیرو والی نے بھی تقسیم سے پہلے دو تین فلموں میں گیت ریکارڈ کرائے۔ عنایت بائی کی زندگی کے آخری 12 سال ملتان میں گمنامی میں گزرے۔ بدرو ملتانی کو بے شمار مرتبہ فلم میں گانے کی پیشکش ہوئی لیکن بدرو ملتانی نے فلم کے لیے نہیں گایا۔ کہتے ہیں کہ بدرو ملتانی نے کسی فلم کے لیے دو آئٹم ریکارڈ کرائے تھے لیکن اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا بدرو ملتانی نے فلمی آئٹم گائے تھے یا نہیں؟ تقسیم سے پہلے دو بہنیں جنہوں نے تھیٹر اور فلم میں اداکاری بھی کی تھی ایک کا نام اللہ وسائی اور دوسری بہن کا نام اللہ بندی تھا۔ ان بہنوں نے فلمی دنیا میں ریکارڈ ہونے والی خواتین کی پہلی قوالی ”آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے“ فلم (زینت) کے کورس میں گایا تھا۔ تقسیم سے پہلے ریلیز ہونے والی چند فلموں کے کورس گانوں میں ان کی آوازیں موجود ہیں۔ کلاسیکی موسیقی کے

حوالے سے معروف شام چوراسی گھرانہ جو تقسیم کے بعد ملتان منتقل ہو گیا تھا اس گھرانے کی ایک گائیک جوڑی استاد نزاکت علی خان، سلامت علی خان نے بھی فلم میں کچھ کلاسیکل آئٹم گائے۔ استاد ذاکر علی خان نے بھی فلم کے لیے گایا۔ کافی گائیکی کی ملکہ زاہدہ پروین جس کا نام سرائیکی خطے میں لیجنڈ تسلیم کیا جاتا ہے کافی گائیکی سے پہلے بطور فلمی گلوکارہ چند فلموں میں گیت گا چکی تھیں۔ زاہدہ پروین نے 1946ء سے 1961ء تک فلموں میں گلوکاری کی۔ زاہدہ پروین کا انتقال 7 مئی 1975ء کو ہوا۔ اقبال بانو کا نام کلاسیکل موسیقی اور غزل گائیکی کا معتبر نام ہے۔ اقبال بانو نے اپنی زندگی کا کافی حصہ ملتان میں گزارا۔ اقبال بانو نے فلم کے لیے کافی آئٹم گائے۔ ''الفت کی نئی منزل کو چلا'' ''پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے'' ''دشت تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہے'' ''رگوں میں زہر کے نشتر اتر گئے چپ چاپ (غزل)'' ان کے کیریئر کے یادگار آئٹم ہیں۔ ثریا ملتانیکر جن کا نام پورے برصغیر میں کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے معروف ہے۔ استاد غلام نبی خان (سارنگی نواز) دہلی والے سے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ ثریا ملتانیکر نے بھی فلم کے لیے گایا۔ ان کا مشہور زمانہ فلمی گیت ''بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے'' جو انہوں نے فلم ''بدنام'' کے لیے گایا ان کی ملکی اور بین الاقوامی شہرت کا باعث بنا۔ ثریا ملتانیکر نے چند اور بھی فلمی گیت گائے لیکن ان کی شہرت اسی فلمی گیت کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ پاکستانی فلمی صنعت کی گولڈن وائس مجیب عالم کا تعلق بھکر سے تھا۔ ان کا خاندان کافی عرصہ شجاع آباد میں رہائش پذیر رہا۔ کیپٹن احتشام کی فلم ''چکوری'' جو کہ لیجنڈ ایکٹر ندیم کی بھی پہلی فلم تھی بحیثیت گلوکار مجیب عالم کی پہلی فلم تھی۔ ''وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں'' اس گیت نے مجیب عالم کو صف اوّل کے گلوکاروں میں شامل کر دیا۔ مجیب عالم نے سندھی، پنجابی، اردو فلموں کے لیے گیت گائے۔ ان کی چند یادگار فلموں میں چکوری، گھر پیارا گھر، لوری، شمع اور پروانہ، میں کہاں منزل کہاں، میں زندہ جلوہ ہوں، آوارہ، افسانہ، سوغات، قلی، قسم اس وقت کی شامل ہیں۔ مجیب عالم نے تقریباً 120 فلموں میں گلوکاری کی۔ ان کے کریڈٹ پر بے شمار فلمی گیت ہیں جو آج بھی مقبول ہیں۔ تاج ملتانی بھی ملتان کے ایک سینئر فلمی سنگر ہیں۔ تاج ملتانی ملتان کے ایک قصبے احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ تاج ملتانی نے موسیقی کی باقاعدہ تربیت ملتان میں استاد سلامت علی خان، استاد نزاکت علی

## ستم ظریفی

☆میاں بیوی ہوٹل میں گئے تو ایک عجیب لڑکی نے آدمی کو ''ہیلو'' کہا۔

بیوی نے غصے سے پوچھا۔ ''کون تھی یہ؟'' شوہر نے برہم ہو کر کہا۔ ''پلیز میرا دماغ مت خراب کرو، ابھی اس کو بتانا ہے کہ تم کون ہو؟''

☆شوہر ٹی وی کے سامنے بیٹھا رو رہا تھا۔ بیوی نے پوچھا۔ ''تم کون سا سیریل دیکھ رہے تھے جو رو رہے ہو؟''

''یہ سیریل نہیں، ہماری شادی کی مووی ہے۔'' شوہر نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

فاریہ احمد..... کینیڈا

## میری ادا

بہت مشہور ہوتا جا رہا ہوں
میں خود سے دور ہوتا جا رہا ہوں
یقیناً اب کوئی ٹھوکر لگے گی
بہت مغرور ہوتا جا رہا ہوں

رفیق احمد..... گجرات

خان سے حاصل کی۔ ریڈیو ملتان اور ریڈیو کراچی پر غزل، گیت، ٹھمری، دادرا اور کافی کے ساتھ کلاسیکی موسیقی کے پروگرام بھی پیش کیے۔ 1965ء کی جنگ میں ملی گیتوں کی وجہ سے بہت شہرت ملی۔ فلمی گیت گائے ان کی بیوی نگہت سیما جو استاد طفیل نیازی کی شاگردہ تھیں نے فلمی گلوکاری میں نام پیدا کیا۔ نگہت سیما نے جن فلموں میں گلوکاری کی ان میں بندگی، افشاں، رشتہ ہے پیار کا، استادوں کا استاد، جلنے نہ کیوں پروانہ، محل، شامل ہیں۔ فلمی دنیا کی معروف آواز ناہید اختر کا تعلق بھی ملتان سے ہے۔ ماضی کی ملتان کی نامور مغنیہ مسرت گنگی ان کی پھوپی تھیں۔ ناہید اختر اور اس کی بہن حمیدہ اختر نے سب سے پہلے ٹیلی وژن پروگرام لوک ورثہ میں شرکت کی۔ ناہید اختر کو بھی استاد طفیل نیازی نے متعارف کرایا۔ ٹیلی وژن کے بعد فلمی دنیا میں قدم رکھا اور فلم ''ننھا فرشتہ'' سے فلمی گائیکی کا آغاز کیا۔ رونا لیلیٰ کے بنگلہ دیش شفٹ ہونے کی وجہ سے Female سنگر کا جو خلا بن گیا تھا وہ ناہید اختر نے پورا کیا۔ ناہید اختر نے بے شمار فلموں میں گلوکاری کی۔ اپنے ابتدائی دنوں میں ریڈیو ملتان سے سرائیکی گیت اور کافیاں بھی گائیں۔ کافی عرصے سے شوبز سے کنارہ کشی اختیار

کی ہوئی ہے۔

نامور لوک فنکارہ ریشماں جن کی گمنامی کا عرصہ ملتان میں گزرا۔ کوثر ملک سے بھی گلوکاری سیکھتی رہیں۔ ریشماں نے پاکستانی فلم ''وڈیرہ'' اور انڈین فلموں ''ہچ ہچی اور طوائف'' اور ''چمن پردیسی'' کے لیے گلوکاری کی۔ نامور گلوکارہ گل بہار بانو نے فلم ''چوروں کا بادشاہ'' اور ''چوروں کی بارات'' میں فلمی گیت گائے۔ ثریا خانم نے فلم ''قلی'' میں گیت گائے۔ اس فلم میں ناہید اختر کے ساتھ گائی ہوئی قوالی بہت مقبول ہوئی۔ سرائیکی خطے کے ایک اور نامور گلوکار غلام عباس نے بھی فلم کے لیے بے شمار گیت گائے۔ غلام عباس 1955ء میں جھنگ مگھیانہ میں پیدا ہوئے۔ پھر ان کا خاندان ملتان آگیا۔ غلام عباس نے تعلیم ملتان میں مکمل کی۔ موسیقی کی تربیت مہدی حسن کے چچا استاد اسماعیل خان سے حاصل کی اور بعد میں مہدی حسن کے بھی باقاعدہ شاگرد بنے۔ فنی زندگی کا آغاز لاہور سے کیا۔ پاکستان کے تقریباً ہر ریڈیو اسٹیشن پر غلام عباس کے گائے آئٹم موجود ہیں۔ ریڈیو ملتان نے مقامی شعراء اور خواجہ غلام فرید کی کافیاں ان کی آواز میں ریکارڈ کی ہوئی ہیں۔ سرائیکی خطے کے اور بھی کافی گلوکاروں نے فلم کے لیے گایا۔ ملک کے نامور فنکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے فلم میں اداکاری اور گلوکاری کی۔ ان کے بہت سے معروف گیتوں جن میں ''قمیص تیڈی کالی'' اور ''اے تھیوا مندری دا تھیوا'' جیسے معروف گیتوں کو فلم میں شامل کیا گیا۔ گلوکار شبیر ملک (فلم سانجھ ساڈے پیار دی) ارشاد علی منصور ملنگی بھی فلم میں گلوکاری کر چکے ہیں۔ اسی طرح سرائیکی خطے کے بہت سے ساز کار بھی فلم میوزک کا حصہ رہے ہیں۔ بقول استاد شریف خان سارنگی نواز کے، انہوں نے پہلی سندھی فلم ''عمر ماروی'' کے گیتوں کی کمپوزیشن میں سارنگی بجائی اور موسیقار فیروز نظامی نے انہیں نور جہاں کے مشہور فلمی گیت ''چن دیے آ ٹوٹے آ دلاں دے آکھوٹے آ'' میں سارنگی بجانے کا موقع دیا۔ اسی طرح نامور سارنگی نواز استاد ظہور خان نے بھی کچھ فلمی گیتوں میں سارنگی بجائی۔ استاد شریف خان (شہنائی نواز) کو موسیقار رحمٰن ورما نے فلم ''ایک تھی ماں'' کے گیتوں میں بطور سازندہ موقع دیا۔ اس فلم کے بیک گراؤنڈ میوزک میں بھی شہنائی بجائی گئی تھی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے سرائیکی خطے خصوصاً ملتان میں بہت سے ساز کار ایسے تھے جو کسی بھی طرح لاہور کے فلمی سازندوں سے مہارت میں کم نہ تھے۔ وسائل اور مواقع کی کمی کی وجہ سے انہیں کام نہ ملا ورنہ طافو جیسے فلمی موسیقار بمعہ ڈی پوترہ کے عظیم سپوت بابا معشوق خان (طبلہ نواز) کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے تھے۔ فلم ''کرتار سنگھ'' کے مشہور گیت ''دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا، ویرا گھوڑی چڑھیا'' کے اس گیت میں جس بینڈ ماسٹر نے بینڈ بجایا تھا وہ اس وقت ملتان کے نواحی گاؤں ٹاٹے پور کا رہائشی ہے۔ بہت سی فلموں کے میوزک میں بطور ساز کار شامل رہا ہے۔ آج اس ''رحمت'' نامی شخص کی عمر 88 سال ہے اور گمنامی کی زندگی گزار رہا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے سی ڈی فلموں کی پروڈکشن کا ٹرینڈ شروع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں سرائیکی زبان میں بھی چند فلموں کی پروڈکشن ہوئی ہے۔ جن کا ذکر سرائیکی فلم سازی کے مضمون میں تفصیل سے موجود ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ دنیا میں آج بھی ابلاغ کا سب سے بڑا میڈیا سینما ہی تصور کیا جاتا ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں اس کی مقبولیت روز اوّل کی طرح قائم ہے۔ پاکستانی سینما کے زوال کی وجوہات سب جانتے ہیں کہ کیا ہیں؟ اس زوال میں سی ڈی فلمیں اور اس کی پروڈکشن سینما کے دائرے کو محدود کرتی ہے۔ Record پر وہی فلم آئے گی جو سینما گھروں پر ریلیز ہوگی اور بڑی اسکرین پر چلے گی۔ سی ڈی پر چاہے کتنی ہی فلمیں بنائی جائیں وہ ٹیلی فلمیں ہیں سینما اسکوپ فلمیں نہیں جو قومی Record میں آئیں۔ ان فلموں کے اداکار، گلوکار، پروڈیوسر، ڈائریکٹر، شاعر سب محدود شہرت پاتے ہیں۔ نئی فلموں کی تخلیق میں اتنا معیار ضرور ہونا چاہیے کہ انہیں سینما گھروں میں ریلیز کیا جاسکے تاکہ سینما گھروں کے اندر کی تاریکی اور ویرانی ختم ہو۔ فلم بین پھر سے سینما گھروں میں فلم دیکھنے آئیں۔ ایک صدی سے زائد عرصے سے جاری سینما کی روایت مضبوط ہو۔ سینما بینی بھی ثقافت کا حصہ ہے۔ سینما گھروں میں تھیٹر ڈرامے ہوسکتے ہیں۔ فلمیں کیوں نہیں چل سکتیں۔ سوال فلموں کے معیار کا ہے۔ معیار بہتر ہوگا تو فلمیں ضرور باکس آفس پر کامیاب ہوں گی۔ ہمارے سرائیکی خطے کے فلمساز سینما کے لیے فلمیں پروڈیوس کریں تاکہ فلم سے وابستہ نیا ٹیلنٹ اس قومی میڈیا پر متعارف ہو جو ہمارے سرائیکی خطے کے آرٹسٹوں کی سینما سے جڑت کی روایت کو جاری رکھنے میں شب و روز مصروف ہے۔ ہمارا سرائیکی خطہ جہاں دوسرے بے شمار ثقافتی حوالوں سے اپنی الگ پہچان رکھتا ہے وہاں سینما کے ارتقاء میں بھی سرائیکی خطے کے آرٹسٹوں کی خدمات کلیدی حیثیت رکھتی ہیں جو اس خطے کی فنی عظمت کی گواہ ہیں۔

# مہم جو

طارق عزیز خان

مہم جوئی ایک پُرخطر شوق ہے۔ ایسے شوق کے حامل افراد کو بادشاہانِ وقت خاص اہمیت دیتے تاکہ پُرامن طریقہ اپناتے ہوئے چھوٹے ممالک کو اپنی سلطنت میں شام کرسکیں۔ وہ بھی اسی شوق کا حامل تھا۔ اس نے سمندر کے راستے تلاش کیے تاکہ نئے ممالک دریافت ہوسکیں۔

## ایک معروف جہاز راں کا احوال



مہم جوئی کی تاریخ میں امریکا اور کولمبس کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ امریکا کی تاریخ کی بات کریں اور کولمبس کو فراموش کردیں۔ اطالوی نژاد ہسپانوی مہم جو کرسٹوفر کولمبس نے مغرب کی طرف سے ایشیا تک رسائی کی مہم کے دوران بحراوقیانوس پار کرکے 12 اکتوبر 1492ء کے دن امریکا کو دریافت کیا۔ اس نے اپنے دریافت کردہ علاقے کو ''نئی دنیا'' کا نام دیا۔ وہ مرتے دم تک اسی خیال پر قائم رہا کہ اس نے کوئی نیا براعظم نہیں بلکہ ایشیائی جزائر کو

دریافت کیا تھا۔ کولمبس کی مشہور زمانہ مہم کے بعد ایک اطالوی مہم جو، امریگو ویس پوچی نے 1501ء سے 1502ء کے دوران جنوبی امریکا کے مشرقی ساحلوں کی چھان بین کی اور برازیل کی موجودہ بندرگاہ ریوڈی جنیرو کو دریافت کیا۔ اس کی مہم کے نتیجے میں جنوبی امریکا کے بارے میں اہم جغرافیائی انکشافات منظر عام پر آئے۔ یہاں تک کہ شمالی اور جنوبی امریکا کو دو الگ الگ براعظم تسلیم کرلیا گیا۔ جرمن جغرافیہ داں اور نقشہ نویس مارٹن والڈسی مولر (Martin Waldseemuller) نے امریگو ویس پوچی کی معلومات کی روشنی میں 25 اپریل 1507ء میں دنیا کا ایک نقشہ تیار کیا۔ مولر نے امریگو کی خدمات کے اعتراف میں اپنے اس نقشے پر پہلی مرتبہ بحراوقیانوس کے مغرب میں دریافت شدہ نئی سرزمین کو "امریکا" کے نام سے ظاہر کیا۔

امریکا کی دریافت کے بعد استعماریت اور سیاحت کے جس دور کا آغاز ہوا وہ تاریخ کا اہم موڑ تھا۔ یورپین کی دو نئے براعظموں تک رسائی ہوجانے کے بعد یورپ کی بڑھتی ہوئی آبادی کو امریکا میں سمانے کے ساتھ ساتھ امریکا سے حاصل ہونے والی معدنی دولت اور خام مال کے خزانے ہاتھ لگنے سے اسپین اور مجموعی طور پر یورپ کی معیشت بدل گئی۔

سچ یہ ہے کہ امریکا کی دریافت نے تاریخ عالم پر اس قدر بھرپور اثرات مرتب کیے کہ خود کولمبس کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ بظاہر کولمبس کی مشہور زمانہ مہم نے اس کے ہم عصر یورپی جہازرانوں کی بحراوقیانوس میں مہمات کو گہنا کر رکھ دیا ہے۔ تاہم ایک تاریخی سچائی یہ ہے کہ کولمبس کی پیدائش سے قریب پانچ سو سال پہلے سے ہی یورپین ملاحوں کی طرف سے بحراوقیانوس کو پار کرنے کی کوششیں شروع ہوچکی تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک اوّلین مہم اسکنڈے نیویا سے تعلق رکھنے والے ایک باپ بیٹے نے سرانجام دی۔ تاریخ میں انھیں ایرک دی ریڈ اور لیف ایرکسن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان باپ بیٹوں نے دسویں صدی عیسوی کے آخر میں بحراوقیانوس کو مغرب کی طرف سے پار کرکے گرین لینڈ اور شمالی امریکا کا براعظم دریافت کیا اور وہاں پہلی یورپین کالونیوں کی بنیاد رکھی۔

گو کہ ان کی دریافتوں کا احوال بھی عام نہیں ہوسکا، تاہم بیشتر تاریخی شواہد اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بحراوقیانوس کو مغرب کی طرف سے پار کرنے کا کارنامہ سب سے پہلے ایرک دی ریڈ اور اس کے بیٹے لیف ایرکسن ہی نے سرانجام دیا تھا۔

ایرک دی ریڈ 950ء میں جنوبی ناروے میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے سرخ بالوں کی وجہ سے ایرک دی ریڈ کہلاتا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد ماہر شکاری اور ماہی گیر ہونے کے ساتھ ساتھ بحری قزاقی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ایرک دی ریڈ کا بچپن اپنے باپ اور خاندان کے دیگر مردوں کے ساتھ خشکی اور سمندر چھانتے ہوئے گزرا۔ یہ لوگ ناروے سمیت اسکنڈے نیویا میں ملنے والی بہترین اور مضبوط لکڑی سے اپنے بحری جہاز تیار کرتے جو وائی کنگ کہلاتے تھے۔ ایک اوسط درجے کے وائی کنگ جہاز کی لمبائی 80 فٹ چوڑائی 25 فٹ تک ہوتی تھی۔ چپوؤں اور بادبانوں کے سہارے چلنے والے ان بحری جہازوں کو رواں دواں رکھنے کے لیے کم از کم 30 ملاحوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ آج ناروے کے دارالحکومت اوسلو کے وائی کنگ میوزیم میں پرانے وائی کنگ بحری جہازوں کے ڈھانچوں کا قریب سے مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

970ء کی دہائی میں ایرک کا باپ قتل کے الزام کی وجہ سے جلاوطن ہونے پر مجبور ہوا۔ وہ اپنے خاندان، دوستوں اور چند دیگر لوگوں کے ساتھ کشتیوں پر سوار ہوکر ناروے سے ایک ہزار کلومیٹر مغرب میں واقع آئس لینڈ پہنچا اور جزیرے کے مغربی حصے میں بس گیا۔ 981ء میں ایرک کے ہاتھوں ایک مقامی کے قتل کے بعد اسے اور اس کے دو دوستوں کن جورن اور الف سون کو آئس لینڈ سے فرار ہونا پڑا۔ ایرک اور اس کے دوست رات کے اندھیرے میں ایک کشتی میں سوار ہوکر آبنائے ڈنمارک کے ٹھنڈے پانیوں میں داخل ہوئے۔ ان لوگوں نے اگلے دس دن کے مسلسل سفر کے دوران 550 کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ یہاں تک کہ انھیں اپنے سامنے دھند اور کہرے میں لپٹا برف سے ڈھکا ایک بہت بڑا جزیرہ دکھائی دے گیا۔ ایرک نے سرسبز زمین کی تلاش میں جزیرے کے ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

اس نے اگلے ایک ہفتے کے دوران جزیرے کے جنوب میں واقع راس فیرویل کے گرد چکر لگایا اور جزیرے کے جنوب مغربی ساحل پر واقع ایک سرسبز ساحل کے قریب پہنچ گیا۔ ایرک دی ریڈ نے خشکی پر قدم رکھا اور اس نئے خطہ زمین کو گرین لینڈ کا نام دیا۔ جزیرے پر قیام کے دوران اس کا وہاں رہنے والے اسکیمو قبائل سے واسطہ پڑا۔ ایرک نے پایا کہ یہ لوگ برف کی سلوں سے اپنے گول گھر تیار کرتے جنھیں وہ مقامی زبان میں اگلو (Igloo) کہتے تھے۔ ان کی گزر بسر ماہی گیری اور سیلز کے شکار پر منحصر تھی۔

وہ برفانی ریچھ اور سیلز کی کھال سے بنے لباس پہنتے۔ سیلز کا گوشت کھاتے اور اس کی چربی کو بطور ایندھن استعمال کرتے۔ اسکیمو صلح جو قبائل تھے۔ وہ بہت جلد اجنبیوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ ان کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں ایرک کو گرین لینڈ کی وسعت کا اندازہ ہوا۔

بحر اوقیانوس کے شمال میں واقع گرین لینڈ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ جزیرے کی شمالاً جنوباً لمبائی 2700 کلومیٹر ہے جبکہ درمیان سے چوڑائی 1300 کلومیٹر ہے۔ گرین لینڈ کا کل زمینی رقبہ 21 لاکھ 75 ہزار 6 سو مربع کلومیٹر ساحلوں کی لمبائی 44 ہزار کلومیٹر اور موجودہ (2011) آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔ گرین لینڈ کے شمال میں بحر منجمد شمالی، جنوب میں شمالی بحر اوقیانوس، مشرق میں بحیرہ گرین لینڈ اور آبنائے ڈنمارک، مغرب میں خلیج بیفن اور آبنائے ڈیوس اور جنوب مغرب میں بحیرہ لیبریڈر واقع ہیں۔ گرین لینڈ کے طول وعرض کو برف کی ایک عظیم چادر نے گھیر رکھا ہے۔ اوسطاً 500 فٹ موٹی برف کی اس تہہ کی جزیرے کے وسط میں موٹائی کا اندازہ 11 ہزار فٹ ہے۔ گرین لینڈ کی مشرقی، مغربی اور جنوبی ساحلی پٹی اونچے نیچے سرسبز ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ سفید برف کے مقابلے میں یہ سرسبز علاقہ جزیرے کا صرف 10 فیصد ہے۔

ایرک دی ریڈ کے ہاتھوں دریافت کے بعد اگلی پانچ صدیوں تک یہ جزیرہ دنیا کی نظروں سے اوجھل رہا۔ 1492ء میں کرسٹوفر کولمبس کی جانب سے امریکا کی باقاعدہ دریافت کے بعد 1585ء میں برطانوی مہم جو جون ڈیوس نے گرین لینڈ کو مہذب دنیا کے لیے باقاعدہ دریافت کیا۔ 1721ء میں ڈنمارک نے جزیرے کو اپنی نوآبادی بنانے کا اعلان کیا۔ جس کے بعد سے اب تک گرین لینڈ کی حیثیت ڈنمارک کے زیر انتظام علاقے کی ہے۔ گرین لینڈ کی مغربی ساحلی پٹی پر واقع اس کا انتظامی دارالحکومت "نک" ہے جس کا پرانا نام گوڈ تھاب تھا۔ نک شہر کی موجودہ آبادی بیس ہزار کے قریب ہے۔ گرین لینڈ کی سرزمین معدنیات خاص کر سیسہ، زنک اور قدرتی گیس کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہاں پائی جانے والی جنگلی حیات میں بارہ سنگھے، ریچھ، بھیڑیے، ساحلی پرندے اور سیلز نمایاں ہیں۔

ایرک دی ریڈ نے گرین لینڈ میں چار سالہ قیام کے دوران یہ اندازہ لگالیا کہ اس کے خاندان کے لیے یہ آئس لینڈ سے کہیں بہتر مقام تھا۔ 985ء میں ایرک اپنے دوستوں کے ساتھ واپس آئس لینڈ آیا، جہاں اس نے اپنے رشتہ داروں کو گرین لینڈ ہجرت پر آمادہ کرلیا۔ اندازہ ہے کہ ایرک دی ریڈ کی قیادت میں چھ وائی کنگ بحری جہازوں پر سوار 100 سے زیادہ افراد نے گرین لینڈ کا سفر اختیار کیا۔ یہ لوگ جزیرے کے جنوب مغربی ساحل کے قریب ٹھیک اس مقام پر پہنچے جہاں آج نک شہر واقع ہے۔ ایرک کے لوگوں کو یہ جگہ راس آگئی اور انھوں نے یہاں پہلی یورپین کالونی کی بنیاد رکھی۔ 1000ء میں ایرک دی ریڈ کے انتقال کے بعد اس کے تین بیٹوں لیف ایرکسن، تھاروولڈ اور تھارسٹین نے مہم جوئی میں بہت نام کمایا۔ مانا جاتا ہے کہ ایرک دی ریڈ کا دوسرا بیٹا لیف ایرکسن وہ پہلا یورپین تھا جس نے گرین لینڈ کے جنوب مغرب میں واقع شمالی امریکا کا براعظم دریافت کیا۔

لیف ایرکسن 970ء میں آئس لینڈ میں پیدا ہوا۔ اپنے خاندان کی گرین لینڈ ہجرت کے وقت وہ ان کے ساتھ تھا۔ گرین لینڈ میں قیام کے دوران لیف ایرکسن نے اپنی ایک کزن تھورگونا سے شادی کی جس کے نتیجے میں اس کا ایک بیٹا تھارکل لیف سن پیدا ہوا۔ لیف ایرکسن کو اپنی نوجوانی کے زمانے میں مقامی اسکیمو قبائل سے سمندر پار مغرب میں واقع نئی سرزمین کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ بعض تجربہ کار بوڑھے ماہی گیروں نے انکشاف کیا کہ وہ اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں اس خطہ زمین کا نظارہ کرچکے تھے۔ لیف ایرکسن کے چند رشتہ داروں نے مغربی سمندر کو پار کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ ایرک دی ریڈ کی وفات کے سال لیف ایرکسن اور اس کے چند ساتھیوں نے اپنے آبائی وطن ناروے کا سفر اختیار کیا۔ اس زمانے میں ناروے پر بادشاہ اولاف اول کی حکومت قائم تھی۔ لیف ایرکسن نے بادشاہ تک رسائی حاصل کی اور اسے گرین لینڈ کے بارے میں بتایا۔ اولاف اول کے دربار میں موجود عیسائی پادریوں نے اسے عیسائی بننے پر آمادہ کرلیا۔ انھوں نے لیف سے کہا کہ وہ گرین لینڈ واپس جاکر اپنے خاندان اور مقامی قبائل کو عیسائیت کی طرف مائل کرے۔ ناروے میں چند ہفتے کے قیام کے بعد لیف ایرکسن واپس گرین لینڈ پہنچا تو وہاں اسے ایک بار پھر مغرب میں واقع سرزمین کی کہانیاں سننے کو ملیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس خطہ زمین کو دریافت کرے گا۔

یہ 1002ء کی گرمیوں کا آغاز تھا جب لیف ایرکسن اور اس کے 35 ساتھیوں نے چپوؤں اور ایک بڑے بادبان کے سہارے چلنے والی دو، وائی کنگ کشتیوں میں آبنائے ڈیوس سے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ انھوں نے اگلے دس سے پندرہ دن تک

مسلسل مغرب کی طرف سفر کے بعد خشک پتھریلی سیاہ چٹانوں سے ڈھکے ایک جزیرے کا نظارہ کیا۔ ممکنہ طور پر یہ کینیڈا کے مشرق میں واقع بیفن کا جزیرہ تھا۔ لیف ایرکسن نے اس ویران اور بنجر جزیرے کو Land of the Flat Stones کا نام دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مہم جاری رکھے گا اور جنوب مغرب کی طرف بڑھتا ہوا نئے جزائر تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیف ایرکسن کا قافلہ جزیرہ بیفن کے جنوب میں واقع بحیرہ لیبریڈر میں داخل ہوا۔ وہ اگلے ایک ہفتے تک مسلسل آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ انھیں کٹے پھٹے سفید ریتیلے ساحلوں اور گھنے درختوں سے اٹی سرزمین دکھائی دی۔ یہ خط استواء سے 60 ڈگری شمال اور 64 ڈگری مغرب پر واقع کینیڈا کے مشرقی صوبے نیوفاؤنڈلینڈ اور کیوبک کا شمالی علاقہ تھا۔ لیف ایرکسن نے یہاں چند دن کا قیام کیا اور اس علاقے کو Wood Land کا نام دیا۔ اسے یہ اندازہ قائم کرتے دیر نہیں لگی کہ یہ گرین لینڈ کے مقابلے میں ایک بہت بڑا خطہ زمین تھا۔

تاہم اسے اس نئے علاقے میں کوئی خاص کشش محسوس نہ ہوئی۔ اس نے اپنی مہم کے تیسرے مرحلے کا آغاز کیا۔ اس کی کشتیاں بحیرہ لیبریڈر میں نیوفاؤنڈلینڈ کے مشرقی ساحلوں کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھنے لگیں۔ اندازہ ہے کہ اگلے دو ہفتے کے دوران انھوں نے لگ بھگ 1200 کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے پہلے سے کہیں زیادہ سبز زمین کا نظارہ کیا۔ بیشتر تاریخی ذرائع کا ماننا ہے کہ لیف ایرکسن کو دکھائی دینے والا علاقہ خط استواء سے 51 ڈگری شمال اور 56 ڈگری مشرق میں واقع کینیڈا کا جزیرہ نیوفاؤنڈلینڈ تھا۔ لیف ایرکسن نے بطور پہلے یورپین کے نیوفاؤنڈلینڈ کے شمالی جزیرہ نما حصے میں قدم رکھا۔ اس نے اس علاقے میں پیدا ہونے والے انگوروں کی کثرت کی وجہ سے اس سرزمین کو "وائن لینڈ" کا نام دیا۔

ایرکسن نے جزیرے پر اپنا ایک عارضی کیمپ قائم کیا جسے اس نے Leifsbudir کا نام دیا۔ اس نے جزیرے کی سیر کے دوران محسوس کیا کہ یہ ایک وسیع براعظم سے منسلک تھا۔ یہاں کی جھیلوں اور دریاؤں میں سالمن مچھلی کی فراوانی تھی تو گھنے جنگلوں میں بھی شکار کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جزیرے پر ہر طرف بچھی سبزے کی چادر، گھنے درختوں، میٹھے پانی کی جھیلوں، قدرتی آبشاروں اور سہانے موسم نے لیف ایرکسن اور اس کے ساتھیوں کا دل موہ لیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ گرین لینڈ واپس جاکر اپنے لوگوں کو یہاں آباد ہونے کی ترغیب دیں گے۔

لیف ایرکسن نے گرین لینڈ لے جانے کے لیے جزیرے سے قیمتی لکڑی کے کچھ نمونے، پرندوں کے پر اور جانوروں کی کھالیں جمع کیں۔ اندازہ ہے کہ وہ نیوفاؤنڈلینڈ میں قریب دو ماہ کے قیام کے بعد گرین لینڈ واپس پہنچا۔ اس نے اپنے خاندان والوں اور قریبی دوستوں کو نئی سرزمین کے بارے میں بتایا۔ اندازہ ہے کہ ایرکسن کے اکسانے پر نہ صرف اس کے قریبی لوگ بلکہ چند مقامی اسکیمو بھی بحیرہ لیبریڈر کو پار کرکے کینیڈا میں آباد ہوگئے۔

1020ء میں لیف ایرکسن کا انتقال ہوا تو اس کی دریافت کردہ سرزمین کی کہانیاں آئس لینڈ کے لوگوں تک پہنچ چکی تھیں۔ آنے والے سالوں میں ایرکسن کی دریافتوں کا احوال سکنڈے نیویا تک بھی پہنچا تاہم اکثریت نے بحراوقیانوس کے مغرب میں واقع سرزمین کی دریافت کو افواہوں سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ تاریخی اعتبار سے لیف ایرکسن کی دریافتوں کا احوال عام نہیں ہوسکا اور نہ ہی اس کے کارنامے کی وجہ سے یورپ اور امریکا میں کسی نوع کی کوئی بڑی تبدیلی رونما ہوسکی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا کی باقاعدہ دریافت کا سہرا کرسٹوفر کولمبس کے سر باندھا جاتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق لیف ایرکسن نے گرین لینڈ سے امریکا کی تلاش میں شروع کی گئی اپنی مہم کے دوران شمالی بحراوقیانوس میں تقریباً 5 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اس سفر میں آبنائے ڈیوس میں 700 کلومیٹر اور بحیرہ لیبریڈر میں 4300 کلومیٹر کا سفر شامل ہے۔ لیف ایرکسن نے اپنی اس مہم کے دوران مشرقی کینیڈا کے جزیرہ بیفن اور نیوفاؤنڈلینڈ پر مشتمل 10 لاکھ مربع کلومیٹر علاقے کو دریافت کیا۔ دنیا لیف ایرکسن کی مہمات کو کس قدر اہمیت دیتی ہے اس بات کا اندازہ ہر سال 9 اکتوبر کو بیشتر امریکی ریاستوں میں منائے جانے والے "لیف ایرکسن ڈے" سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس تاریخ کو منتخب کرنے کی وجہ 9 اکتوبر 1825ء کے دن ناروے سے امریکی سرزمین کی طرف ہونے والی پہلی باقاعدہ ہجرت ہے۔ 1930ء میں امریکا کی طرف سے آئس لینڈ کی حکومت کو لیف ایرکسن کا ایک شاندار مجسمہ بطور تحفہ دیا گیا۔ آئس لینڈ کے دارالحکومت ریکجاوک کے ایک پارک میں نصب یہ مجسمہ ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا کہ امریکا کی دریافت میں لیف ایرکسن کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

# بندہ بیراگی

ایاز راہی

اس شخصیت کا ذکر جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے مسلمانوں کا خون بہانے کی عادت سی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے لیے وہ عذاب بن گیا تھا۔ پورے پنجاب میں وہ دہشت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔



سکھوں میں مقدس مانے جانے والے شخص کا قصہ

آج سے تقریباً چھ صدی پہلے سکھ مذہب کی بنیاد پڑی۔ یہ پہلے مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر (فروری 1483ء تا 26 دسمبر 1530 عیسوی) کا ابتدائی دور حکومت تھا۔ سکھ مت کے بانی بابا گرو نانک دیو (15 اپریل 1469 تا 22 ستمبر 1539 عیسوی) ہیں جو ضلع شیخوپورہ (پنجاب) کے نواحی گاؤں تلونڈی (تل ونڈی) میں پیدا ہوئے جو آج کل ننکانہ صاحب کہلاتا ہے۔ گرو نانک فطرتاً ایک الگ سوچ لے کر آئے تھے جو بنیادی طور پر خیر کی علامت تھی۔ لڑکپن میں ایک

روز والد نے انہیں کچھ رقم دے کر بازار بھیجا کہ جاؤ ذرا سودا سلف خرید لاؤ۔ گرو نانک بازار پہنچے تو ساری رقم گداگروں اور محتاجوں میں بانٹ دی اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔ باپ نے استفسار کیا تو کہنے لگے کہ "میں سچا سودا کر آیا ہوں۔" اس پر باپ حیرت سے دیکھتا رہ گیا کہ چہ خوب؟ سکھ مت دراصل ہندو سناتن دھرم (مورتی پوجا۔ بت پرستی) کے خلاف ردِّعمل تھا۔ اس سے صدیوں پہلے سوھارت مہاتما گوتم بدھ (480 ق م تا 400) قبل از مسیح کی بدھ مت بھی بت پرستی کے خلاف عملی رویہ تھا۔ مت، ہندی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ عقل۔ سمجھ۔ سوجھ بوجھ۔ سو۔ یہ تینوں مت (ہندومت۔ بدھ مت۔ سکھ مت) کسی بھی وحی سے محروم محض عقل و فکر کا ہی گورکھ دھندا ہیں۔ یہی حال پارسی مذہب اور دیگر مذاہب کا بھی ہے۔ صرف یہودیت، عیسائیت اور دین اسلام ہی آسمانی ادیان ہیں جن کے پیغمبروں پہ مسلسل وحی نازل ہوتی رہی۔ کامل عقل سلیم وہی ہے جو وحی الٰہی کے تابع ہو اور اسی کی پیروی کرے۔ گرو نانک کے ساتھ ایک مسلمان، مردان علی عرف مردانہ عمر بھر رہا۔ گرو نانک اپنے اشلوک۔ اشعار اور دوہے نظمیں ترنم میں لوگوں کو سناتے تو مردان علی عرف مردانہ ڈھولک بجا کر سنگت دیتا تھا، یہ تبلیغی گیت سنگیت عام آدمی کے دل پہ اثر کرتے۔ سکھوں کی دھرم پوتھی (مذہبی کتاب) گرنتھ صاحب میں مسلمان صوفی شاعر بابا فرید شکر گنج۔ پاک پتن۔ سابقہ اجودھن۔) پنجاب (4 اپریل 1179 تا 17 اکتوبر 1265 عیسوی) کے پنجابی سرائیکی اشعار بھی شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہارمونیم اک سکھ ہی کی ایجاد ہے۔ سکھ عبادت میں ہارمونیم اور ڈھولک شامل ہوتے ہیں۔ گرمکھی (گورو کے مکھ منہ کی) زبان سکھوں کی دھرم بھاشا (مذہبی زبان) ہے جیسے مسلمانوں کے ہاں عربی زبان۔ گرمکھی رسم الخط دیوناگری (سنسکرت) رسم الخط سے ملتا جلتا ہے۔ سکھ عبادت گاہ گردوارہ (گورو کی چوکھٹ۔ آستانہ) کہلاتی ہے۔ لفظ سکھ بھی ہندی پنجابی کا اکھر (لفظ) ہے جس کے معنی ہیں۔ شاگرد۔ چیلا۔ سیکھنے والا۔ سکھ۔ نانک پنتھی بھی کہلاتے ہیں۔ مذہبی نعرہ عموماً:

ست سری اکال
جو بولے سو نہال

ہوتا ہے۔ سکھوں کے پانچ ککّے لازم اور مشہور ہیں جن کے نام حرف ک سے شروع ہوتے، لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ 1۔ کیس (سر کے بال)۔ 2۔ کنگھا (شانہ۔ جس سے بال سنوارتے ہیں) 3۔ کڑہ (سونا۔ چاندی۔ لوہا۔ پیتل۔ کانچ وغیرہ کا بنا گول چوڑا حلقہ (جو بازو کلائی یا ٹخنوں میں پہنا جاتا ہے) 4۔ کرپان (تلوار۔ تیغ۔ شمشیر) 5۔ کچھا (لنگوٹ۔ جانگھیا۔) سکھ مت میں جسم کے بال کاٹنا۔ کسی بھی قسم کا نشہ اور مورتی پوجا (بت پرستی) پاپ (گناہ) ہے۔ سکھ اپنے آپ کو سنگھ (شیر) اور سردار کہلواتے ہیں۔ سر کے بڑھتے ہوئے بالوں کو مخصوص رنگ ڈھنگ کی پگڑی میں باندھ کے قابو میں رکھتے ہیں۔ بھارتی پنجاب دریائے بیاس اور دریائے ستلج کے درمیان دوآبہ (اضلاع کپور تھلہ۔ جالندھر۔ ہوشیار پور وغیرہ) کے لوگوں نے سکھ مت کو بڑی تیزی سے اپنایا۔ یہ بہادر، نڈر اور دلیر لوگ ہیں مگر بہادری کی خو کم فہمی اور نا سمجھی کی بنا پر ہے۔ خوشی کے موقع پر ڈھول کے ساتھ بھنگڑا ناچ اور بیلیاں (کھلے ہونٹوں پہ ہاتھ یا منکا رکھ کر نعرے، چیخ و پکار) لگانا کرنا ان لوگوں کی ریت ہے۔ لاش کو نذرِ آتش کیا جاتا ہے۔ لڑائی جھگڑا اور قتل و غارت گری ان کا شیوہ ہے۔ ہندومت کی تمام تر زہر افشانیوں کے باوجود سکھ خود کو ہندوؤں کے قریب سمجھنے اور رکھنے پہ مجبور ہیں یعنی رہا بھی نہ جائے سہا بھی نہ جائے۔ یہ سکھ دانشوروں کی غلط کاریوں اور کم فہمی کا ہی مآل ہے۔ گرو نانک کی سیدھی سادی عقلی تعلیم سموچا ہندو سناتن دھرم (مورتی پوجا) کے خلاف اک عملی جدوجہد اور کاوش تھی۔ آریاؤں نے برصغیر میں آکر دراوڑی تہذیب و تمدن کو ہندو مت میں ضم کر کے ختم کر دیا اور دراوڑ قوم کو شودر بنا کر انسان ماننے سے ہی انکار کر دیا جب کہ دراوڑی تہذیب موہن جودڑو (سندھ) اور ہڑپہ (ساہیوال) جیسی عالی شان تمدن کی حامل تہذیب تھی مگر خانہ بدوش آریاؤں کی بھینٹ چڑھ گئی اور اپنا وجود کھو بیٹھی۔ آریاؤں نے ذات پات (برہمن۔ کھشتری۔ ویش۔ شودر) اور بت پرستی (ان گنت دیوی دیوتا) پر اپنی تہذیب کی عمارت کھڑی کی لیکن مہاتما بدھ اور گرو نانک کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ دونوں کے عقلی مذاہب خدا کے تصور سے خالی یا مسخ و مبہم ہیں مگر انسان دوستی دونوں ہی پرچارکوں (مبلغین) کا مسلک اور اساسی دستور تھا۔ یہ الگ بات کہ بعد میں دونوں کے پیروکار بھٹک گئے اور اپنی من مانی کا شکار ہو کے رہ گئے۔ حتیٰ کہ دین اسلام کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا کہ انسانی من مانیوں کا دروازہ کھل گیا اور دین کی خاطر جان و مال قربان کرنے کی بجائے دین کو اپنی مرضی کے تابع کیا جانے لگا۔ بقول حکیم الامت علامہ اقبال۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

آج دینِ اسلام بھی صرف عبادات کا مجموعہ اک مذہب ہی بن کے رہ گیا ہے۔ سکھوں کی جہالت مشہور بلکہ ضرب المثل ہے اس قوم کو جب جب بھی موقع ملا اس نے بغاوت وسرکشی اختیار کی اور بے گناہ لوگوں خصوصاً مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا حتیٰ کہ جانوروں تک کو اپنے بے جا مظالم کا نشانہ بنایا۔ گوکہ ان کا دائرۂ اختیار پنجاب تک ہی محدود رہا مگر اپنے اقتدار میں یہ ہمیشہ کھل کھیلے۔ سکھ راہ نماؤں نے اکثر ماجھے (دوآبے) کے سکھوں کو اکسا بھڑکا کے اپنے گرد اکٹھا کیا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا کیوں کہ اس مذہب کا کوئی آفاقی قاعدہ قانون تھا ہی نہیں۔ وحی سے محروم بابا گرو نانک کی ذاتی عقل صرف مورتی پوجا اور ذات پات کے خلاف ہی رہی کوئی مستقل نظام یا دستور نہ دے پائی انجام یہ کہ سکھ صرف مورتی پوجا سے ہی آزاد ہو سکے اور رسم و رواج، رہن سہن، طور طریقے سبھی کچھ ہندوآنہ ہی رہا۔ موضوع کو آگے بڑھاتے ایک سکھ سرکش راہ نما بندہ بے راگی (27 اکتوبر 1670 تا 09 جون 1716 عیسوی) کا مختصر حال قلم بند کرنا مقصود ہے جس نے پنجاب میں بہت اودھم مچائے رکھا اور مسلمانوں پہ ظلم کے پہاڑ توڑتے کے بعد بالآخر مسلمانوں کے ہی ہاتھوں انجام تک پہنچا۔ بندہ بیراگی کا اصل نام لچھمن دیو تھا۔ ایک راج پوت گھرانے میں جنم لیا اور پھر راجوری میں ایک ہندو بیراگی جانکی داس کا چیلا بنا۔ ہندو گرو جانکی داس نے بندہ بیراگی کو مادھو داس کا نام دیا۔ بندہ بیراگی 6 عیسوی کو بیساکھی کے میلے میں قصور (پنجاب) آیا تو وہ رام داس بیراگی کا بھی چیلا بن گیا۔ لفظ براگ ہندی زبان کا مذکر لفظ ہے جس کے معنی ہیں خواہشوں کا ترک کر دینا۔ دنیا چھوڑ دینا۔ بیراگ سے ہی بیراگی یعنی خوشی اور غم سے بے پرواہ۔ بیراگی کی مونث بیراگن ہے۔ آگے چل کر مادھو داس (بندہ بیراگی) نے دکن (بھارت) کا رخ کیا تو اسے ناندیر (دکن۔ بھارت) میں سکھوں کے دسویں گرو گورو گوبند (22 دسمبر 1666 تا 07 اکتوبر 1708 عیسوی) نے بہت متاثر کیا اور وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ گورو گوبند نے بندہ بیراگی کو۔ پوہل (دھرم آشیرواد) دی اور نام بدل کر مادھو داس کی بجائے بندہ سنگھ بہادر رکھ دیا۔ گورو گوبند نے بندہ بیراگی کو مسلمانوں کے ظلم کی داستان اتنے دکھ بھرے انداز سے سنائی کہ بندہ بیراگی جوش کھا گیا جب گورو گوبند نے محسوس کیا کہ جادو چل چکا ہے تو اس نے بندہ بیراگی کو حکم دیا کہ وہ سکھوں کو منظم کرے۔ مغلوں، ترکوں اور افغانوں کو قتل کرنا، لوٹنا، کھسوٹنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کا خاتمہ کر کے خالصہ راج کی بنیاد رکھے۔ گورو گوبند نے پانچ پیاروں (تجربہ کار۔ چالاک) کے ساتھ بندہ بے راگی کو پنجاب کی طرف روانہ کر دیا۔ گورو گوبند کی وفات کے بعد بندہ بیراگی سکھوں کا راہ نما بن کے ابھرا اور اس نے مشہور کر دیا کہ گورو گوبند سنگھ دوبارہ بندہ بیراگی کے روپ میں نمودار ہو گئے ہیں۔ بندہ

## انعکاسِ روشنی

کسی سطح سے منعکس ہونے والی روشنی کی مقدار کا انحصار اس سطح کی نوعیت پر ہوتا ہے جس قدر کوئی چیز زیادہ چمک دار اور ہموار ہوگی اس پر سے روشنی کا انعکاس اسی قدر زیادہ ہوگا۔ ایسی سطحوں (مثلاً آئینہ) کا انعکاس انگیز یا عاکسی سطحیں (Reflecting Surfaces) کہا جاتا ہے۔ سطح زیادہ ناہموار ہو تو روشنی کا انعکاس مختلف سمتوں میں ہونے لگتا ہے اور یہ بے قاعدہ انعکاس کہلاتا ہے۔ آئینہ یا کسی بھی عاکس سطح پر عکس اس کے اتنا ہی پیچھے کی طرف بھی بنتا ہے جتنی کہ وہ چیز آئینے کے آگے کی طرف ہوتی ہے۔ انعکاس روشنی کا عمل بعض اصولوں کے تحت عمل میں آتا ہے۔ انہیں قوانین انعکاس کہا جاتا ہے۔ وہ شعاع جو کسی آئینے (یا کسی بھی عاکس سطح) پر آ کر گرتی ہے۔ اسے شعاع واقع کہا جاتا ہے۔ جب وہ ٹکرا کر لوٹتی ہے تو لوٹنے والی یہ شعاع، شعاع منعکس کہلاتی ہے۔ جس نقطے پر شعاع واقع آئینہ سے ٹکراتی ہے اسے نقطہ وقوع کہا جاتا ہے۔ نقطہ وقوع پر 90 درجے کا زاویہ بناتا ہوا خط کھینچا جاتا ہے تو وہ نقطہ وقوع کا عمود (Normal at the point of incidence) کہلاتا ہے۔ اس عمود اور شعاع واقع کا درمیانی زاویہ، زاویہ وقوع اور اس عمود اور شعاع منعکس کے درمیان کا زاویہ، زاویہ انعکاس کہلاتا ہے۔

مرسلہ: تہذیب سلطان۔ مانچسٹر یوکے

بیراگی نے سکھوں کو منظم کر کے کیتھل اور سامانہ (بھارت) کے شہروں سے قتل عام اور لوٹ مار کا آغاز کیا اور کم وبیش پندرہ بیس ہزار مسلمان مردوں۔" خواتین اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گھروں اور مساجد کو مسمار کر دیا، املاک لوٹ لی گئیں۔ سامانہ کی تباہی کے بعد بندہ بیراگی نے کہرام، شسکہ، کنج پورہ، شاد آباد، مصطفیٰ آباد، کپوری، انبالہ، چھت اور بنور میں قیامت ڈھائی۔ نہ صرف قتل عام کیا بلکہ مسلم مزاروں۔ گھروں، مساجد اور مقابر تک کو شہید کیا۔ مئی 1710 عیسوی کو بندہ بیراگی سرہند پر حملہ آور ہوا۔ سرہند پہ قابض ہو کے بندہ بیراگی نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی یوں سرہند سے جمنا تک کا سارا علاقہ اس کے قبضہ میں آ گیا۔ اپنے ایک ساتھی اور مصاحب باج سنگھ کو حاکم مقرر کر کے چھتیس لاکھ سالانہ مالیہ وصول کرنے لگا جس سے اس کی فوجی قوت میں خاصا اضافہ ہوا۔ بندہ بیراگی نے اپنے لیے، بندہ بادشاہ، کا لقب اختیار کیا۔ بابا گرونانک اور گورد گوبند کے نام کے سکے جاری کیے نیز نیا سن (تقویم۔ جنتری) بھی ایجاد کیا جس کا آغاز فتح سرہند سے ہوتا ہے۔ بندہ بیراگی کی خون آشامیوں پہ مولانا مناظر احسن گیلانی (پیدائش۔ ستمبر 1892 عیسوی) لکھتے ہیں کہ بندہ بیراگی مسلمانوں کو زندہ مکان میں بند کر کے آگ لگا دیتا۔ اس ظالمانہ عمل کو سکھ اپنی زبان میں "ہولے" کہتے۔ اسی طرح یہ وحشی لوگ زندہ جانوروں کو پنجروں میں بند کر کے آگ لگا دیتے۔ وہ تڑپ تڑپ کے جان دیتے تو یہ لوگ خوش ہوتے۔ جب جانور کٹے "ہولے" ہو جاتے تو چلے بھنے جانور کو خوب مزے لے لے کر کھاتے۔ سکھ ہندوؤں کی طرح جانور کا جھٹکا (گردن مارنا۔ جان نکالنا) کرتے ہیں۔ یہاں سے بندہ بیراگی نے ستر اسی ہزار سکھ فوج کے ساتھ دریائے ستلج عبور کیا اور دوبارہ مشرقی پنجاب پہ ٹوٹ پڑا۔ بے تحاشا لوٹ مار اور دہشت گردی کی۔ بٹالہ (بھارت) میں ایک عظیم کتب خانے کو برباد کیا اور تمام کتابیں جلا کے راکھ کر دیں۔ کئی جگہ مغلوں کو شکست سے دوچار کیا۔ محاصرے میں آیا لیکن بچ نکلنے اور فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ آخر مغل بادشاہ فرخ سیر (20 اگست 1685 تا 19 اپریل 1719 عیسوی) کے عہد میں گورداس پور (بھارت) کے مقام پر مغلوں کے گھیرے میں آ گیا۔ محاصرے سے تنگ آ کر ایک روز اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہونے لگا تو زندہ گرفتار ہوا۔ تین چار ہزار سکھ مارے گئے۔ بندہ بیراگی اور اس کے باقی ساتھیوں کو گرفتار کر کے لاہور لایا گیا۔ گلیوں اور بازاروں میں تشہیر کی گئی۔

ہزاروں لوگ جمع ہو گئے۔ سرہند کے صوبے دار وزیر خان شہید کی والدہ اپنے مکان کی چھت پر سے یہ منظر دیکھ رہی تھی جب بندہ بیراگی اور اس کے ساتھی پابہ جولاں مکان کے قریب سے گزرے تو اس خاتون نے اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لیے ایک وزنی پتھر باج سنگھ کے سر پہ دے مارا جس کی ضرب سے باج سنگھ "آہے گرو۔ واہے گرو" کہتا پکارتا واصل جہنم ہوا۔ باج سنگھ بندہ بیراگی کا خاص مصاحب اور سرہند کا صوبے دار تھا جس کے ہاتھوں صوبے دار وزیر خان شہید ہوا تھا۔ سکھ مصیبت اور موت میں گورو جی کو ہی پکارتے، فریاد کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ قسم بھی گورو جی کی ہی کھاتے، اٹھاتے ہیں۔ "واہ گورو دی سوں" سوگند لاہور سے بندہ بیراگی کو لوہے کے پنجرے میں بند کر کے دہلی روانہ کر دیا گیا۔ بادشاہ فرخ سیر کے حکم پر بندہ بیراگی کا منہ کالا کر کے دہلی میں پھرایا گیا۔ بندہ بیراگی کے کچھ ساتھیوں کو ہر روز توالی کے سامنے ایک چبوترے پہ لا کے قتل کر دیا جاتا۔ تمام سکھ ساتھی قتل ہو چکے تو آخر میں بندہ بیراگی کی باری آئی۔ ایک مغل سردار محمد امین خان نے بندہ بیراگی سے اس کے مظالم کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے کہا کہ "جب کسی قوم کے گناہ بڑھ جاتے ہیں تو خدا مجھ جیسے ظالم کو انہیں سبق سکھانے۔ ٹھکانے لگانے کے لیے پیدا کرتا ہے پھر مجھ جیسے لوگوں کے اعمال کی تلافی کے لیے تم جیسے لوگوں کو پیدا کر دیتا ہے۔" یوں بندہ بیراگی اپنے کیے کی سزا پا کے ذلت اور رسوائی کے ساتھ کیفر کردار کو پہنچا۔ بیراگی (خواہشوں سے بے پرواہ) بندہ سنگھ کلی طور پر ہوس و لالچ کا پتلا نکلا۔ عارضی قوت و اقتدار نے اسے خوں خوار بھیڑیا بنائے رکھا۔ بندہ بیراگی کے قتل کے بعد رد عمل کے طور پر پنجاب میں سکھ مطعون و مردود ٹھہرے۔ انہیں ملک دشمن اور باغی قرار دیا گیا۔ سو جو سکھ پکڑا جاتا قتل کر دیا جاتا۔ اس خوف کے مارے نہ صرف سکھوں نے اپنی وضع قطع بدل دی بلکہ بہت سے سکھوں نے ہندومت قبول کر کے جان بچائی۔ جب کہ بندہ بیراگی کی تباہ کاریوں سے پنجاب اور دوآبہ کے مسلمان معاشی تنگ دستی میں مبتلا ہو گئے۔ بڑے بڑے علمی اور روحانی مراکز نیست و نابود ہو کر رہ گئے۔ سکھوں کو عروج مہاراجا رنجیت سنگھ (13 نومبر 1780 تا 27 جون 1839 عیسوی) کے دور میں ملا مگر یہ لوگ اپنی فطری جہالت اور ظلم وجور کی خو اپنائے رہے چناں چہ رنجیت سنگھ کے عہد خانہ خراب میں ہی۔ "سکھا شاہی" زباں زد عام ہوئی۔

# شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔



ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ [illegible]

ہوا یہ تھا کہ میں ڈیوٹی پر پہنچا ہی تھا۔ سر سے کیپ اتار کر انگلیوں سے بال درست کر ہی رہا تھا کہ کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی۔ ہولڈنگ سینٹر جیل جیسا نہ ہوتے ہوئے بھی جیل ہے جہاں امیگریشن والوں کے پکڑے ہوئے قیدی رکھے جاتے ہیں۔ یہاں جیل جیسی سختی نہ ہوتے ہوئے بھی قیدی بھڑک اٹھتے ہیں کیونکہ تمام سہولت کے ہوتے ہوئے بھی وہ قیدی ہوتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ڈپریشن کے شکار ہوتے ہیں۔ کبھی بھی وہ بھڑک

سکتے ہیں اور بھڑک اٹھنے کے کئی واقعات دیکھ بھی چکا ہوں۔ اگر کوئی قیدی بھڑک اٹھے تو فوراً الارم بجا دیا جاتا ہے۔ تمام گارڈز مستعد ہو جاتے ہیں۔ یہ آواز گرمیت سنگھ کے کمرے کی طرف سے آرہی تھی۔ گرمیت سنگھ ایک قیدی تھا۔ میں ادھر ہی چل پڑا۔ موڑ مڑتے ہی چونک گیا۔ گرمیت سنگھ دروازے کے اندر ہی تھا مگر اس نے بٹ صاحب کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ آزاد کرانے کے جتن کر رہے تھے لیکن گرمیت سنگھ کی قوی جکڑ سے اپنا ہاتھ چھڑا نہیں پا رہے تھے۔ گرمیت سنگھ کی پاٹ دار آواز سے کلیارا گونج رہا تھا۔ میں تیزی سے ان کی جانب بڑھا۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ دیگر گارڈز مداخلت کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر گرمیت سنگھ کے ہاتھوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور ساتھ ہی ساتھ وارننگ دی۔ میری مداخلت پر گرمیت نے بٹ صاحب کی کلائی چھوڑ دی۔ اب اس کا رخ میری طرف تھا۔ وہ چیخنے کی حد تک تیز آواز میں بولا ”میں اپنے غم میں مبتلا ہوں اور یہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ قید کی وجہ سے پہلے ہی ڈپریشن کا شکار ہے۔ اسے اچھی بات بھی بری لگی ہوگی۔ اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے میں نے پوچھا۔ ”ہوا کیا ہے؟“

گرمیت سنگھ نے جھک کر زمین پر گرا ایک کاغذ اٹھایا اور بولا ”رات سے مجھے مایوسی نے گھیر رکھا ہے۔ مجھے اپنے بچے بہت یاد آرہے ہیں۔ میں دروازے سے لگا بیٹھا تھا کہ یہ آیا اور بولا۔ ”اتنے اداس کیوں ہو؟“

تو میں نے کہا کہ کل میری بچی کی سالگرہ ہے۔ ہر سال اس دن کو میں سلیبریٹ کرتا تھا۔ خوب دھوم دھام سے مناتا تھا، برا ہو ان امیگریشن والوں کا کہ انہوں نے مجھے قید کر لیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے گرمیت سنگھ کی پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔ ”اس میں غصہ والی بات کیا ہے۔ یہ تمہاری دلجوئی کرنا چاہتا ہوگا۔“

”یہ..... یہ ظالم شخص میری دلجوئی کرے گا۔ یہ تو میرے زخم کرید رہا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے تمہاری بیٹی کو اس دن دیکھا تھا۔ اس کی شکل میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ کہو تو اس کا اسکیچ بنا دوں۔ جب وہ ملنے آئے گی تو اس سے کہنا اس بار سالگرہ کا یہ تحفہ ہے۔ وہ اپنی تصویر دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔ میں نے تصویر بنانے کی اجازت دے دی۔ ایک گھنٹا تک یہ کاغذ پر پینسل چلاتا رہا۔ میرا اشتیاق بڑھتا رہا۔ درمیان میں جب بھی میں دیکھنے کی کوشش کرتا یہ مجھے روک دیتا۔ اب جب تصویر مکمل ہوئی تو یہ شکل تھی۔ کہہ کر اس نے اسکیچ سامنے کر دیا۔“

میں نے تصویر کو دیکھا اور اپنے سر کو پیٹنے پر غور کرنے لگا۔ گرمیت سنگھ نے کہا۔ ”یہ تصویر اسے دیکھو..... کیا یہ میرا مذاق اڑانا نہیں ہے۔ راون کسی ایلین کی تصویر بنا کر کہہ رہا ہے۔ یہ میری بیٹی کی تصویر ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

میں نے اس اسکیچ پر نظر ڈالی، نیچے لکھا تھا، میری پیاری بیٹی۔ پھر اس کی بیٹی کا نام تھا۔ اس تصویر کو دیکھنے والا نیچے کا کیپشن دیکھ کر دن بھر بھی کوشش کرتا ہے تو اس میں گرمیت کی بیٹی کا ہلکا سا عکس بھی تلاش نہ کر سکتا بلکہ سرے سے کسی انسانی شکل کو بھی تلاش نہ کر سکتا۔ آج بھی وہ منظر یاد کرتا ہوں تو ہنسی آجاتی ہے۔ اس وقت گرمیت کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بٹ صاحب کا گلا دبا دے۔ بڑی مشکل سے میں نے گرمیت کو ٹھنڈا کیا اور بٹ صاحب کو پہلے گیٹ پر بھیج کر خود اپنی سیٹ پر آگیا۔ یہ سیٹ میں نے خود ہی اس لیے منتخب کی تھی۔ میں نے کتاب کھول کر چہرے کے سامنے کر لیا تاکہ کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ لیکن میں بھول گیا تھا کہ میری قسمت میں ایسے کچھ لوگ لکھ دیے گئے ہیں جو اپنی معصومیت سے دل جلا دیتے ہیں۔ ڈی آئی خان کے شاہ جی میری گردن پر سوار رہے اور یہاں بٹ جی۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ بٹ صاحب میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ جب کہ میں بے نیاز بیٹھا تھا کہ بٹ صاحب میری جانب کھنچے چلے آئے اور بولے۔ ”آج میں تمہارا اسکیچ بناتا ہوں۔“ پھر کچھ دوری پر بیٹھ کر کاغذ پر لکیریں کھینچنے لگے۔ آدھ گھنٹے بعد جو مجھے دکھایا تو میں زمین میں گڑھ گیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی اس حرکت پر کینیڈا کے مروجہ قوانین کے مطابق ہتک عزت کا دعویٰ بنتا تھا۔ گرمیت سنگھ کی طرح اچھلا نہیں، خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا اگر ذرا سی بھی میری شبیہ ہوتی یا کرسی میز بھی واضح ہوتی تو میں کچھ نہ کچھ انہیں دے دیتا مگر وہ داد طلب نظروں سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ اس دن میں سوچتا تھا کہ کاش میں منہ پھٹ ہوتا اور سب بک دیتا جو میرے دماغ میں چل رہا تھا۔ میں نے بس اتنا کہا۔ ”پلیز اسے احتیاط سے رکھے رہیں میں اسے ایک دو دن بعد آپ سے لوں گا تاکہ فریم کرا سکوں۔“

انہیں میں نے واپس جانے کا اشارہ کیا اور گرمیت سنگھ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اگلی صبح ہم کیپن سینٹر جارہے تھے تو میرے پاس انٹرویو کی کال کی خبر تھی۔ یہاں انٹرویو کی کال کا آنا بھی ایک بڑی کامیابی سمجھا جاتا ہے۔ یہ خبر الزبتھ کو دی تھی اور بقول اس کے کہ اگر انٹرویو کی کال آتی ہے تو سب مل کر انٹرویو کی تیاری کروائیں گے۔

سرد موسم نے مجھے تھکا دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں ہمیشہ سے ایسے ہی موسم میں رہتا چلا آرہا ہوں اور آئندہ بھی یہی موسم اتنی ہی شدت سے سرد رہے گا۔ وقت رک سا گیا تھا۔ زندگی کولہو کے بیل کی مانند اپارٹمنٹ، کیپن سینٹر اور ہولڈنگ سینٹر کے بیچ میں پھنس گئی تھی۔ اس پر مستزاد، ہر وقت بچے اپنی زمین، شہر و گلیاں یاد آتیں۔

گو کہ موسم میں وہ شدت نہ رہی تھی جو شروع میں تھی۔ موسم برف زدہ تھا اور دل سلگتا تھا اور آسمان ٹھہر سا گیا تھا۔

زندگی کے آگے بڑھنے کا اندازہ سورج کے طلوع ہونے سے لے کر غروب ہونے تک کے سفر سے بھی ہوتا ہے۔ چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے بھی ہوتا ہے کہ دن گزر گیا ہے اور رات ڈھل چکی ہے مگر یہاں کئی ماہ سے نہ سورج نکلا تھا اور نہ چاند طلوع ہوا تھا۔ میرے لیے یہاں دن رات کی طرح تھا اور رات کسی اندھیری رات کی مانند تھی۔

اگر سرجی اور شہباز کا ساتھ نہ ہوتا تو نا معلوم میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔ خان قیصر اپنی فیملی کے آنے کے بعد مصروف ہو گیا تھا۔ واجد اور جمال سے ملنا صرف فون پر تھا۔ مطیع اللہ کا بھی کبھار فون آجاتا تھا اور ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ سن لیتے تھے۔ موسم کی شدت نے مجھے ارد گرد جھانکنے سے روکا ہوا تھا کیونکہ جب بھی کہیں آس پاس دیکھتا تو ایک ہی منظر نظر آتا جس میں صرف برف ہی برف تھی اور بے رنگ دھندلایا ہوا آسمان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بہار آتے ہی میں بھی پرندوں کی طرح اپنے گھونسلے سے پرواز بھروں گا اور آسمان سے برستے اور زمین پر پھیلے قدرت کے کئی رنگ دیکھوں گا۔

ہم آج کیپن سینٹر جارہے تھے۔ سرجی نے آج اپنے سائز سے بڑی جیکٹ پہنی تھی اور جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ سر پر پھندنے والی اونی ٹوپی پہنی تھی اور وہ پھندنا ان کی متوالی چال سے ہلتا تھا۔ وہ بس اسٹاپ پر ہم دونوں سے آگے آگے بھاگے جارہے تھے۔ شہباز نے پوچھا۔ "بس تو اپنے ٹائم پر آئے گی پھر اتنی جلدی کس بات کی ہے؟"

سرجی رک گئے اور بولے۔ "میں تیز چلوں تو اعتراض ہوتا ہے اور خود آہستہ چلیں تو ہم کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔"

سرجی کی شکایتیں بھی نرالی ہوتی تھیں۔ جن کا نہ سر ہوتا نہ پاؤں مگر جواب دینے کا جواز فوراً مہیا کر لیتے تھے۔

جواب دے کر سرجی نے پھر تیزی سے قدم اٹھائے تو سڑک کنارے پڑی برف پر ذرا سا پھسلے، پیچھے سے شہباز نے تھام لیا۔ اس پر وہ الٹا شہباز سے شکایت کرنے لگے۔ "تمہاری نظر مجھے لگی ہے۔"

شہباز بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یار اس کا سیاپا کب ختم ہوگا؟"

کیپن سینٹر پہنچے تو سرجی کا موڈ ٹھیک ہو چکا تھا اور وہ آس پاس کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ شہباز نے کہا۔ "قسم لے لو یہ پن کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

میں نے سرجی سے پوچھا۔ "کچھ کھو گیا ہے کیا جس کو تلاش کر رہے ہیں؟"

جیکٹ میں ہاتھ ڈالے ڈالے بولے۔ "اللہ کرے خیریت ہو۔ پن نظر نہیں آرہی۔"

اتنے میں پن کسی اوٹ سے نکلی اور سرجی کی رنگ برنگی ٹوپی دیکھ کر حیرت سے منہ کھولے کھڑی رہ گئی۔ سرجی واری ہونے کو پر تول ہی رہے تھے کہ میں نے بازو سے انہیں کھینچا اور ہمیشہ کی طرح گھسیٹتا ہوا کلاس روم کی طرف لے آیا۔ وہ احتجاج کرتے رہ گئے۔

ہم کلاس روم میں داخل ہو رہے تھے کہ نسرین ٹکرا گئی، مجھ سے نہیں بلکہ سرجی سے۔ سرجی نے کئی بار معذرت کی اور دھکیل کر مجھے آگے کر دیا۔ اب وہ نسرین سے مخاطب ہونے والے تھے اور ہاتھ جیکٹ کی جیبوں سے نکل کر ایسے جوڑے کھڑے تھے کہ جیسے نمستے کہہ رہے ہوں۔ ہم آپس میں ہیلو کہہ ہی رہے تھے کہ سرجی نے مداخلت کی اور نسرین سے بولے۔ "ندیم کو انٹرویو کی کال آگئی ہے، ماشاء اللہ۔"

اس وقت نسرین کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ خوشی سے منہ کھولے کھڑی تھی۔ شہباز اسے اتنا خوش دیکھ کر حیران ہو رہا تھا وہ سرجی سے کہنے لگا۔ "یا تو یہ کام سے گئی یا پھر ندیم۔"

نسرین میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوچھ رہی تھی۔ "ندیم! کیا یہ سچ ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ سرجی کو خدشہ تھا کہ کہیں نسرین سر عام گلے نہ لگ جائے اسی لیے وہ بیچ میں آگئے۔

میں اور نسرین الزبتھ کے پاس پہنچے جو کلاس کے کونے میں بیٹھی کچھ کاغذات کی پڑتال کر رہی تھی۔ سرجی بھی ہمارے

ساتھ ساتھ چلے آئے۔ اس سے پہلے میں الزبتھ کو اپنے انٹرویو کی کال کا بتاتا کہ سرجی یہاں بھی آگے بڑھ کر اسے یہ اطلاع دینے لگے۔

الزبتھ نے اپنا کام چھوڑ کر مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور مبارک باد بھی دی۔ بولی۔ ''یہ ہمارے سینٹر کا بھی ٹیسٹ ہے کہ تم اس انٹرویو میں کامیاب ہو۔''

اس کا پلان یہ تھا کہ میرے انٹرویو کی تیاری کروائی جائے گی اور یہ سب کلاس کے لیے ایک ٹریننگ سیشن بھی ہوگا۔

میں اور نسرین اکٹھے بیٹھ گئے۔ وہ بولی۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ یہ جاب تمہیں ملے گی اور تم نے اللہ کے بھروسے پر اپنی فیملی کو جو اسپانسر کیا ہے۔ یہ معاملہ وہیں سے چل پڑا ہے۔''

اس کے اتنے یقین پر میں خود حیران تھا۔

کلاس شروع ہوئی۔ سب اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ الزبتھ مسکراتی ہوئی آئی اور اسی مسکراہٹ کو سجائے یہ اعلان کیا۔ ''ہماری کلاس کے پہلے اسٹوڈنٹ ندیم کو انٹرویو کی کال آئی ہے۔ اس میں اس کی قابلیت تو ہوگی مگر ہمارے بنائے گئے Resume کا بھی کمال ہے۔''

اس پر سب نے تالیاں بجائیں۔ سرجی کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ شاید پڑھنے والوں کی نظر میں کسی انٹرویو کی کال کا آنا اتنی اہمیت نہ رکھتا ہو مگر جو تارکین وطن، ملک سے باہر نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں، وہ اس کی اہمیت کو شاید بہ خوبی جانتے ہوں گے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بھوکے فقیروں کا گروہ بھیک کے لیے پورا دن انتظار کرتا ہو اور شام سے پہلے کوئی نیک دل ایک کے کاسے میں دو روٹیاں ڈال جائے۔

الزبتھ کہہ رہی تھی کہ اب ہم نے مختلف مراحل کی اسے ٹریننگ کروانی ہے۔ سب سے پہلے یہ شکریے کا ایک خط کمپنی کو فیکس کرے گا۔ پھر وہ اس خط کے مندرجات بتانے لگی۔ سب لوگ اس میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ پھر ایک لیٹر تیار ہوا جس میں کمپنی کا شکریہ میں نے ادا کیا کہ مجھ ناچیز کو انٹرویو کے لیے انہوں نے کال کی۔ وہ خط ٹائپ ہوا اور پھر مجھ سے وہیں سینٹر سے فیکس کروا دیا گیا۔

پھر لیٹر فیکس کرنے کی اہمیت پر اس نے نہایت ہی اہم لیکچر دیا کہ جیسے ہی میں انٹرویو کے لیے پہنچوں گا تو ایک طرح سے متعارف بھی ہو چکا ہوں گا اور ان کے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ بھی ہوگا۔

یہاں کے نظام میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو سب کے سامنے پیش کیسے کرتے ہیں۔ آپ کی قابلیت معنی رکھتی ہے مگر آپ کا رویہ سب پر بھاری ہوتا ہے اگر آپ کم صلاحیت کے حامل ہیں تو وہ آپ کو ہر قسم کی ٹریننگ دے کر باصلاحیت بنا دیتے ہیں مگر جب کوئی اخلاق اور طریقے سے پیش نہیں آتا تو اس کی اصلاح کا انہوں نے کوئی ذمہ نہیں لیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے آپ کے بات کرنے کا انداز، نشست و برخاست، لباس اور آپ کے اعتماد کو دیکھا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کے تجربے اور تعلیمی استعداد کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ لیٹر فیکس کرنے کے بعد میری اگلے کچھ دن انٹرویو کے علاوہ انہی پہلوؤں پر ٹریننگ ہوتی تھی۔

کافی کا وقفہ ہوا تو سب سے پہلے مارک میرے پاس آیا اور گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر وش کیا۔ مایا جھومتی ہوئی آئی اور جھومتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اس آنے جانے میں شہباز اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ ین نے گلے لگ کر مبارک باد دی تو سرجی خفا ہو گئے۔ نسرین کی جانب آنکھ سے اشارہ کر کے بولے ایک کے ہوتے ہوئے دوسری پر ڈورے ڈال رہے ہو، یہ تو نری بے وفائی ہے۔

میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو میرا نسرین سے کوئی چکر نہیں ہے اور اگر آپ کو ین کا مجھے گلے لگانا برا لگا ہے تو یقین کرو، مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ ین میرے گلے لگی ہے یا آپ لگے ہیں۔'' وہ میری بات سمجھ نہ سکے اور خوش ہو گئے۔ کہنے لگے۔ ''یہ شہباز پھر مایا کے ساتھ لگا کھڑا ہے اور مایا کی بجائے خود شرما شرما کر پیلا ہو رہا ہے۔''

''اس کے شرمانے پر آپ کو اعتراض ہے یا پیلا پڑنے پر؟''

سرجی بولے۔ ''شہباز جب بھی کسی لڑکی کے ساتھ کھڑا ہو اور شرمانے لگے تو سمجھ لیں کہ اس کے دل میں کوئی کمینگی ہے۔''

''اور اگر نہ شرمائے تو؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ بولے۔ ''پھر کمینگی کے علاوہ اس کی نیت بھی خراب ہے۔''

مایا کو مارک نے اپنی جانب متوجہ کیا تو شہباز اب پیلا ہونے کے ساتھ ساتھ سرخ بھی ہو رہا تھا۔ مارک کی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہاری بات آگے بڑھی یا پیچھے کھسک گئی؟''

بولا۔ ''آگے بڑھتی ہے تو کوئی نہ کوئی سیاپا ہو جاتا ہے۔''

جیسے آج مارک آ دھمکا۔“

سر جی فوراً بولے۔ ”اپنے دل کی بات بے شرمی سے کہہ دو۔“

”نہ دل کی زبان سمجھتی ہے اور نہ آنکھوں کی اور نہ منہ کی۔“ شہباز نے جواب میں کہا۔

”لڑکیاں خطوں سے بہت پھنستی ہیں، ایسا ہی کوئی خط لکھ کر اس کے بیگ میں چپکے سے رکھ دو۔“ سر جی نے مشورہ دیا۔

شہباز کراہ کر بولا۔ ”جب سے اس کے بیگ سے برگر چرایا ہے، وہ اب میری جگہ بیگ کو اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہے۔“

”تمہیں سینے سے صرف کوئی بھینس ہی لگا سکتی ہے، نرم مزاج لڑکیاں یہ رسک نہیں لے سکتیں۔“

اس پر ایک جھگڑا شروع ہوگیا اور ہم شور شرابے میں سینٹر سے باہر نکل آئے۔

اپارٹمنٹ لڑتے جھگڑتے پہنچے اور وہاں جاکر ٹھیک ہو گئے۔ ایسی بے لوث رفاقتوں میں یہ کیفیتیں بہت بھلی محسوس ہوتی ہیں جب بلاوجہ جھگڑا کر کے پھر سے ایک ہو جائیں اور پچھلا سب بھول جائیں۔

اس برف زدہ موسم نے ہماری کمر توڑ دی تھی۔ ایک برف خانے میں ہم قید تھے۔ میں کہیں بھی جاتا یا کہیں سے بھی آتا تو ایک ہی حالت زار میں ہوتے۔ پاکستان کے میدانی شہروں کے رہنے والے موسم کی اس بے رحمی کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے جس کے وار میں سہہ رہا تھا۔

آج ذرا آرام کر کے اٹھا تو باہر وہی جمی ہوئی فضا تھی جو میں مدتوں سے دیکھتا چلا آرہا تھا مگر سر جی نے ہمیشہ کی طرح ڈرروال کا پردہ کھسکا رکھا تھا۔ آنکھیں شیشے کے پار سرد ہواؤں سے دوہرے ہوتے درختوں پر تھیں اور لبوں پر یہ گانا تھا۔ ”یہ موسم یہ مست نظارے...... پیار......“

میں نے سر جی کے گانے کا گلا اس طرح گھونٹا کہ ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھتے رہے مگر اپنا گانا جاری رکھا اور رکے نہیں۔ شہباز جو پہلے منہ بسورے بیٹھا تھا، اب ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا۔ ابھی سر جی گانا روک کر بولے۔ ”یہ ہاتھ جوڑے کیوں کھڑے ہو؟ چائے پینی ہے تو بنا دیتا ہوں؟ یا جلیبیاں بھی پڑی ہیں۔ وہ لا دوں۔“

”نہیں بس آپ اپنا یہ سرد ساز لپیٹ لیں۔“ میں نے

سر جی سے پوچھا۔ ''معلوم نہیں آپ پاکستان کے گرم موسم میں کس طرح رہتے ہوں گے؟''

''جس طرح آپ یہاں پر رہ رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر اپنا نامکمل گانا دوبارہ وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے یہ تھما تھا۔

اگر موسم آپ کی پسند کا ہو تو آپ باہر کھلی ہوا میں نکل کر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں مگر سر جی پر برف ایسے پڑتی جیسے دشمن اپنے جانی دشمن کو دبوچتا ہے۔ ان کو چند لمحوں میں برف باری اور سردی زمین بوس کر دیتی تھی۔ اسی لیے وہ شیشے کے اندر بیٹھ کر اپنی حسرتیں پوری کرتے تھے۔ باہر بھاگنے کو دوڑتے مگر ہم میں سے کوئی نہ کوئی انہیں پکڑ لاتا۔ اب تین تین بندے ان پر نظریں رکھتے تھے۔

اتنے میں مفتی آ پہنچا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا لفافہ تھا جس میں کچھ کپڑے لپٹے تھے۔ ہم سب چونک کر اس کے ہاتھ میں پکڑے تھیلے کو دیکھنے لگے جس میں کچھ سفید ملبوسات نظر آ رہے تھے۔ شہباز نے پوچھا۔ ''کیا وال مارٹ گئے تھے جو اتنی شاپنگ کی ہے؟''

سر جی اب شیشے کی دیوار سے ہٹ کر مکمل طور پر اپارٹمنٹ میں آ چکے تھے۔ تھوڑے سے چہکے اور کہا۔ ''ماشاء اللہ! کیا سفید شرٹس کی سیل لگی ہے؟''

مفتی دونوں کو گھور رہا تھا۔ ایک تو باہر کے ستم گر موسم کا ستایا ہوا لاغر مفتی اور آگے دو بے لگاموں کے برستے تبصرے..... وہ لفافے کو کمپیوٹر ٹیبل پر رکھ کر جھلایا ہوا کھڑا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ ان میں کیا ہے۔ مجھے بتا کر گیا تھا کہ آج وہ ہی موسال سے سٹیرائل (Sterile) لباس لے آئے گا تاکہ میری انٹرویو سے پہلے پہننے کی ٹریننگ کروا سکے۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ جگہ جہاں انجکشن یا کوئی اور قسم کی وہ میڈیسن تیار ہوتی ہے جو سیدھی انسانی خون میں رگوں سے داخل ہو تو اسے مکمل طور پر جراثیموں سے پاک رکھا جاتا ہے۔ اس کے لیے کام کرنے والوں کو خلابازوں کی طرز کے ایسے لباس پہننے پڑتے ہیں جو سو فیصد Sterile ہوتے ہیں یعنی ہر قسم کے جراثیم سے پاک ہوتے ہیں ...... اسی لباس کو پہن کر وہاں کام کرتے ہیں۔ اس کمرے کی ہوا تک کو ہر گھنٹے بعد ٹیسٹ کیا جاتا ہے کہ کوئی جراثیم تو موجود نہیں ہے۔ دیواریں اسٹیل کی بنی ہوتی ہیں۔ ان دیواروں کو چھو بھی نہیں سکتے۔ پورا چہرہ ڈھانپا ہوا ہوتا ہے کہ سانس سے جراثیم باہر کی ہوا میں پھیل نہ جائیں۔ جب ورکر کمرے سے باہر آتے ہیں تو وہ لباس ڈسٹ بن میں ڈال دیا جاتا ہے اور دوبارہ اندر جانے کے لیے پھر سے نیا لباس پہننا پڑتا ہے۔

مفتی میرے لیے وہی سفید لباس لایا تھا اور آتے ہی وہ ان دونوں کی زد میں آ گیا تھا اور اب کھڑا غصے میں لال پیلا ہو رہا تھا۔ سر جی سے بولا۔ ''کم از کم بیٹھنے تو دیتے، میرے اندر آتے ہی سوالات اور تبصرے شروع کر دیے۔''

سر جی کچن کی کھڑکی سے جھانک کر بولے۔ ''مفتی صاحب! آپ کی غصے والی عادت ابھی تک وہی ہے جو پاکستان میں تھی۔ وہاں تو ٹھنڈی بوتل پلا کر آپ کا غصہ ٹھنڈا کر دیتا تھا۔'' پھر کچھ دیر خلاؤں میں دیکھ کر سوچا اور پھر سے گویا ہوئے۔ ''سنا ہے کہ یہاں گرم بوتلیں پی کر غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔'' پھر اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر خود ہی استغفراللہ پڑھنے لگے۔

مفتی سر ہلاتا واش روم میں گھس گیا۔ میں نے کہا۔ ''سر جی! یہ گرم بوتلیں شاید پاکستان میں حلال سمجھ کر لوگ استعمال کرتے ہیں مگر یہ یہاں حرام بھی جاتی ہیں۔''

اب تکرار شروع ہو گئی۔ شہباز نے کہا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ اس سے غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔''

سر جی بولے۔ ''میں نے الیکٹریکل انجینئرنگ کرتے ہوئے پڑھا تھا۔''

''انجینئرنگ میں کیا گرم بوتلیں پڑھائی جاتی ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

وہ بولے۔ ''علم تو علم ہے۔ کہیں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔'' پھر ذرا چونک کر بولے۔ ''آپ لوگوں نے حرام چیزوں میں مجھے الجھا دیا، میں نے چولہے پر دال چڑھائی ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر کھڑکی خالی کر گئے۔

پاکستان سے جب بھی کوئی یہاں آتا ہے تو شروع میں ان رنگینیوں میں کھو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اپنے اصل راستے پر آ جاتا ہے۔ پاکستان میں اگر وہ کوئی برائی کرتا بھی تھا تو یہاں آ کر چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ پاکستان میں جو ایک الکوحل کی بوتل کے لیے جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اس میں بہا دیتے تھے مگر جب یہاں آئے تو ارزاں ہونے کے باوجود اس سے دور ہوتے گئے۔ جو نماز باقاعدگی سے نہ پڑھتا تھا، یہاں آیا تو پانچ وقت اللہ کو سجدہ کرنے لگا۔ میں غور کرتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ جو ہر بھٹکا ہوا کچھ نہ کچھ حد تک راہ راست پر آ جاتا ہے۔ کافی غور کرنے کے بعد جو مجھے سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ ہم اپنی زمین اور مٹی سے رابطہ تو کھو چکے ہوتے ہیں اور اس کا دکھ بھی ہوتا ہے۔

میں بھی اٹھتی ہے۔ اسی لیے اپنی پہچان برقرار رکھنے کے لیے جتنا ممکن ہوسکتا ہے مذہب اور وطن کی مٹی کو یاد کرتے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد مفتی نے میدان صاف کیا۔ بیگ سے سفید لباس نکالا اور سب کو دور دور کونوں میں بٹھایا۔ سرجی ایسے بیٹھے تھے جیسے بندر کا تماشا دیکھ رہے ہوں۔ شہباز دیوار سے ٹیک لگا کر بیزار سا بیٹھ گیا اور گہرے سانس لینے لگا جیسے اسے دمہ ہو۔

مفتی نے کارپٹ پر ایک سرخ رنگ کی ٹیپ سے لائن کھینچی۔ لائن کے پار پروڈکشن ایریا شروع ہوتا ہے جس میں داخل ہونے سے پہلے آپ کو سفید پینٹ، شرٹ، مخصوص جوتے اور پھر ان پر نیلے کور چڑھانے پڑتے ہیں اور سر کو ایک ململ کی ٹوپی سے ڈھکنا پڑتا ہے۔ جب آپ پروڈکشن ایریا سے Sterile روم میں جاتے ہیں تو وہ خلائی لباس پہنا ہوا ہوتا ہے۔

مفتی اس خلائی لباس کے علاوہ سفید پینٹ شرٹ بھی لے آیا تھا۔ مجھ سے بولا کہ اب تم لائن کے پار کھڑے ہو کر یہ پینٹ شرٹ پہنو گے۔ پھر جوتے پہن کر سر کو ایک جالی نما ٹوپی سے کور کرو گے۔ پھر ایک پاؤں کے جوتے پر نیلا کور چڑھاؤ گے اور اسی پاؤں کو لائن کے پار رکھ کر دوسرے پاؤں پر کور چڑھاؤ اور اس بات کا خیال رکھو گے کہ کور چڑھانے سے پہلے پاؤں زمین پر نہ لگے۔

میں نے پینٹ شرٹ اس وحشی عوام کے سامنے تبدیل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہا کہ نیکر پہن کر آجاؤں تو جواب دیا کہ ناممکن۔ اب ڈراما شروع ہوا۔ شہباز نے کہا۔

"سرجی کو پہنایا جائے۔"

سرجی بولے۔ "یہ کام تو میں گرم بوتل پی کر بھی نہ کروں۔"

پھر کسی نے کہا کہ شہباز کو تختہ دار پر لایا جائے تو سرجی نے کہا۔ "اس ریچھ کو آدھا ننگا دیکھنا ہی اپنے آپ کو ریچھ کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔"

پھر جرگے نے فیصلہ دیا کہ پینٹ شرٹ میں اندر سے تبدیل کر کے آؤں گا۔ میں نے اندر جا کر بانکوں والی سفید شرٹ اور پینٹ پہنی اور باہر آ کر ہنسنے لگا، کیونکہ باقی سب ہنسی سے لوٹ پوٹ تھے۔ مفتی اس سیریس کام کی بے حرمتی دیکھ کر شدید ناراض ہو رہا تھا۔

مجھے لائن کے پار کھڑے ہو کر اپنے پاؤں کی جرابوں پر کور چڑھانے تھے۔ ایک پاؤں میں کور چڑھا کر لائن کے پار وہ پاؤں رکھتے ہوئے دوسرا پاؤں خلا میں رکھ کر دوسرا کور چڑھانا تھا مگر یہ آسان نہ تھا۔ میں یہیں گر پڑتا تھا۔

میرے گرنے پر ہر جانب سے آوازیں کسی جاتیں اور مفتی مجمع کو چپ کراتا رہ جاتا۔ پھر مفتی خود یہ کرتب دکھا کر مجھے دکھلاتا اور پھر میں دوبارہ گر پڑتا۔ سب ہنسے تو اگلی بار میں جان بوجھ کر گر پڑا۔ مفتی نے پھر مشق دہرائی اور پرائمری اسکول کے ٹیچر کی طرح چیخ چیخ کر مجھے سب خود کر کے دکھایا اور میں نے اگلی بار سنجیدگی سے کور چڑھایا اور انتہائی سنجیدگی سے خود کو گرا دیا۔

مفتی کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ مجمع سمجھ چکا تھا کہ میں اب شرارت میں گر پڑ رہا ہوں اور مفتی اسے میری نااہلی سمجھ رہا ہے۔ عوام کی ہوکریں جاری تھیں کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سرجی کے دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے دو بار یہ عمل با آسانی کیا تاکہ مفتی کہیں اکڑ ہی نہ جائے۔ میری اس کامیابی پر مفتی لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اپنے میٹرس پر جا بیٹھا ابھی دروازے سے سیکیورٹی گارڈ مائیکل اندر داخل ہوا اور مجھے اس حلیے میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

سرجی ہمیشہ کی طرح مائیکل کو دیکھ کر کچن کی جانب دوڑے۔۔۔ تاکہ اس کے لیے کافی بنا لائیں۔ شہباز بولا۔ "ندیم کا یہ سیاپا ہماری جان نہیں چھوڑ رہا۔"

مائیکل اب کرسی پر بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا کیونکہ اسے مفتی نے اس جنگی مشق کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا۔

مفتی نے سفید خلائی لباس نکالا تاکہ اس کے پہننے کی ٹریننگ مجھے دے سکے۔ وہ لباس اپنی تہوں سے نکلا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایکسٹرا لارج ہے جس میں مجھ جیسے دو بندے با آسانی سما سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مفتی بے بسی سے سر تھام کر بیٹھ گیا کیونکہ وہ غلطی سے غلط سائز کا اٹھا لایا تھا۔ سرجی نے اپنی طرف سے مذاق کیا کہ مائیکل کو پہنایا جائے مگر سب نے ان کے بروقت صحیح مشورے پر ان کی پیٹھ ٹھونکی تو وہ اپنے مذاق پر سنجیدگی سے ڈٹ گئے۔

مائیکل سے کہا گیا تو وہ سمجھ نہ پایا کہ ہم سب چاہتے کیا ہیں۔ جب وہ سمجھا تو حیرتوں میں ڈوبا ہماری اس معصوم خواہش پر ششدر رہ گیا۔ اب ہم سنجیدگی سے اس سے اس نیک کام کی فرمائش کر رہے تھے۔ وہ ذہنی طور پر ہمارا احسان مند تھا۔ اس لیے راضی ہو گیا۔

پہلے وہ جھجکا کہ اس سے کیا کام کروایا جا رہا ہے۔ پھر

پریشان ہوگیا کیونکہ جب میں اپنا کیمرا ابھی نکال لایا تھا۔ اس کی ذہنی کشمکش اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔

اس کا سیاہ چہرہ پہلے سے زیادہ سیاہ پڑ چکا تھا۔ بمشکل اپنی جیکٹ اتاری۔ لائن کے پاس آ کھڑا ہوا۔ تو مفتی بولا۔ ''یار اس سے عجیب مہک آرہی ہے۔''

سرجی چھلانگ لگا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''وہ میرا پرفیوم کہاں ہے؟''

شہباز نے سرجی کو ڈپٹ کر بٹھا دیا۔ اب مائیکل مفتی کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ جب اس نے ڈانگری نما لباس زیب تن کیا تو سفید لباس میں مائیکل کا سیاہ رنگ لشکارے مارنے لگا۔ مفتی نے جھٹ سے سفید ٹوپی اسے پہنا دی۔ اب اس کی صرف سیاہ گھورتی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ یہ تصویر ابھی میرے سامنے پڑی ہے جب مائیکل وہ لباس پہن کر ہونق لگ رہا تھا اور مفتی اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ہنسی ہنسی میں میرے دوستوں نے ایک طرح سے مجھے ہیوسال کے ماحول سے آگاہ کر دیا اور یہ آشنائی میرے انٹرویو میں بہت کام آئی۔

اگلا دن ہفتے کا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کو میری ہولڈنگ سینٹر میں دن بارہ بجے سے رات بارہ تک کی جاب تھی۔ میں جلدی سونے چلا گیا مگر سرجی ایک بدروح کی طرح اپارٹمنٹ میں گھومتے رہے کیونکہ انہوں نے وہ سفید خلائی لباس پہن رکھا تھا۔ میں بستر پر لیٹا تو شہباز کی گالیاں بلا روک ٹوک کمرے میں آنے لگیں جو بقول سرجی وہ دیواروں کو دے رہا تھا۔

اگلے دن ہولڈنگ سینٹر پہنچا تو باجوہ ہیڈ گارڈ کی کرسی پر بیٹھا چوروں کی مانند قیدیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسلام بٹ بھی اس شفٹ میں حاضر تھا۔ تبھی گرنام ہاتھ میں چند اخبار پکڑے داخل ہوا اور مجھے اردو کا تازہ اخبار تھما دیا۔ گرنام جو پہلے صرف سردار جی کہنے پر برا مان جاتا تھا مگر اب مجھے نہیں روکتا تھا۔ باجوہ سے ہاتھ ملایا تو میرا ہاتھ دبا کر بولا۔ ''آج پھر خفیہ مشن پر جانا ہے۔'' یعنی اس کے لیے دو ڈالر کی لاٹری کی دو ٹکٹیں نیچے کے اسٹور سے خرید لانی ہیں۔ وہ مجھے اپنے لیے خوش قسمتی کی علامت سمجھتا تھا کیونکہ پچھلی بار میری لائی ٹکٹ پر دو سو ڈالر بنا چکا تھا۔

باجوہ لاٹری سے کروڑ پتی بننا چاہتا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا کہ میں نے کبھی لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ تمام عمر سونا بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ پورے محلے میں وہ خبطی مشہور ہوتے ہیں۔ آتا جاتا ان پر آوازیں کستا ہے مگر وہ اپنی سوچوں میں گم قریب سے گزر جاتے ہیں، باجوہ بھی اسی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ سالوں سے لاٹری پر امیر بننے کے خواب دیکھتے دیکھتے خبطی ہو چلا تھا۔ یہ ''خفیہ مشن'' سرانجام دے کر میں اسلام بٹ کے ساتھ آ بیٹھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے کوٹ کی جیب سے کچھ مڑے تڑے کاغذ نکال لیے۔ وہ اپنے اسکیچ دکھلانا چاہتا تھا۔

''شاہکار فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ میں خود حیران ہوں کہ میرا فن کہیں سے کہیں جا پہنچا ہے۔'' بٹ صاحب نے اپنی ہی تعریف میں قلابے ملانے شروع کر دیے۔

''یہ فن پارے اپنی بیٹی کو دکھلائے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں! وہ کہتی ہے کہ جب آپ امریکا آئیں تو پورا بنڈل لے آنا۔ میں آرام اور سکون سے بیٹھ کر دیکھوں گی۔''

''کیا اس کی کتاب چھپوائے گی؟''

''وہ تو بیٹی پر منحصر ہے کہ کتاب چھپواتی ہے یا کسی میوزیم والوں کو دیتی ہے۔''

''آپ کا میوزیم سے مطلب آرٹ گیلری ہے ناں؟''

''معلوم نہیں۔ وہ بیٹی کو معلوم ہے۔''

''پھر تو آپ بہت امیر بن جائیں گے؟''

''بیٹی بھی یہی کہتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا چوڑے ہوئے اور پھر کہا۔ ''تم یہ نئے اسکیچ تو دیکھو۔''

میں نے آخر کار بادل نخواستہ وہ کاغذ کے پرزے پکڑے اور جب اسکیچ دیکھا تو وہیں سر پکڑ لیا۔ معلوم نہیں کہ یہ مخلوق دنیا میں کہاں پائی جاتی ہے جب کہ وہ بضد تھے کہ یہ میری تصوراتی لڑکی ہے۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ آپ اپنے تصور کی مرمت کروائیں۔ میں نے ایک اسکیچ باجوہ کے حوالے کر دیا کہ وہ بھی اپنی رائے دے۔ وہ تادیر اسے الٹا پکڑ کر دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ ''بکری ایسی تو نہیں ہوتی۔''

وہ اسکیچ گرنام سنگھ نے باجوہ کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ اب اسے سیدھا پکڑے باجوہ کی طرح تادیر دیکھتا رہا اور بولا۔ ''یہ بکرا مگر لگتا ہے کہ اس کی جنس تبدیل ہو رہی ہے۔''

بٹ صاحب کو اپنے فن کی یہ بے حرمتی پسند نہ آئی اور انہوں نے وہ فن پارے گرنام سے لے کر اپنی کوٹ کی جیب میں دوبارہ سے محفوظ کر لیے۔

ہم ڈائننگ حال میں بیٹھے تھے جہاں قیدی ہمیشہ کی طرح میزوں کے گرد بیٹھے ایک دوسرے کی جانب خاموشی سے یا تو تک رہے تھے یا میز پر سر رکھے سوچ رہے تھے۔ لنچ بریک تھا۔ مجھے کچھ نئے قیدی نظر آرہے تھے۔ ان میں ایک

پاکستانی لگ رہا تھا۔ سفید رنگت، درمیانہ قد، بھاری وجود اور عمر کوئی پینتیس کے قریب ہوگی۔ میں سوچنے لگا کہ ایک اور شکار پولیس یا امیگریشن کے ہاتھ لگا ہے۔

آج موسم قدرے بہتر تھا۔ نیچے سے سپروائزر کا آرڈر آیا کہ سب قیدیوں کو باہر گراؤنڈ میں تازہ ہوا کے لیے لایا جائے۔ یہ حکم فون پر سن کر باجوہ حواس باختہ ہوگیا جس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ آسان مطلب یہ تھا کہ وہ بیٹھا رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اب گراؤنڈ تک جاتی راہداریوں کے ہر موڑ پر اسے ایک گارڈ کھڑا کرنا تھا۔ پھر سب قیدی ایک لائن بنا کر گراؤنڈ کی طرف جاتے اور ہر موڑ پر کھڑا گارڈ ان کی گنتی کرتا۔ باہر ایک چھوٹا گراؤنڈ تھا جس کے ارد گرد بارہ سے چودہ فٹ اونچی خاردار تاروں کی باڑ لگی تھی۔ وہ وہیں کچھ نہ کچھ کرتے۔ ان پر نظر رکھنی تھی اور پھر واپسی پر پھر وہی گنتی کرنے کا عمل دہرانا تھا۔ یہ مشقت باجوہ کے بس سے باہر تھی۔ گرنام اور میں مل کر اس کی مدد کر رہے تھے اور وہ لاٹری والا رجسٹر بغل میں دبائے بوکھلایا ہوا بھاگتا پھرتا تھا۔

باہر سردی تو تھی مگر اس میں آج وہ کاٹ نہ تھی تو پچھلے کئی دنوں بلکہ مہینوں سے چلی آرہی تھی۔ درجہ حرارت منفی تین سے چار ہوگا اور یہ خوش گوار موسم تھا۔ کوئی باسکٹ بال کھیل رہا تھا اور کوئی ورزش کر رہا تھا۔ کچھ گم صم بیٹھے آسمان کی وسعتوں میں تک رہے تھے اور کچھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک ہندوستان کا عبداللہ تھا۔ اس کی چھوٹی سیاہ داڑھی اور چھوٹا قد تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ میں نے حسب عادت اس سے حال احوال پوچھا اور پھر سوال کیا۔ ”انڈیا میں مسلمانوں کے ساتھ کیا بہت ظلم ہوتے ہیں؟“

”آپ ہماری فکر چھوڑ دیں۔ پہلے اپنے ملک کو سنبھالیں۔ ہم آپ لوگوں سے آس لگائے بیٹھے ہیں اور آپ لوگوں نے اپنے ملک کا حشر کر دیا ہے۔“ عبداللہ کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

اس کا اشارہ دہشت گردی اور کرپشن کی جانب تھا۔ کرپشن تو خیر انڈیا میں بھی کوئی کم نہیں مگر دہشت گردی کا ناسور ان کے ہاں کم ہے۔ میں شرمندہ کھڑا اس کا منہ دیکھنے لگا۔

اتنے میں بٹ صاحب اپنے اسکیچ لیے نزدیک آئے پھر اسے دکھلا کر داد وصول کی۔ وہاں سے داد وصول کر کے دوسری جانب بڑھے۔ وہ جس جانب بھی بڑھتے وہاں کا پر راستہ صاف ہو جاتا۔ اب قیدی بھی منہ پھیر لیتے تھے۔

ہم واپس آکر لابی میں اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ لابی میں مدھم لائٹ کی روشنی تھی۔ کمروں کی روشنیاں گل تھیں کیونکہ کھیل کود سے سب تھک چکے تھے اور اب آرام کر رہے تھے۔

میں لابی کے آخر میں اپنی پوسٹ پر جا بیٹھا۔ یہ آخری کونے والی سیٹ سب سے آرام دہ ہوتی ہے کیونکہ کسی کا آنا جانا نہیں ہوتا۔ میں ہمسوسال کے انٹرویو کے لیے کیمسٹری اور انڈسٹریل ٹیکنالوجی کی کتابیں لے آیا تھا۔ انہیں پڑھنے پر باجوہ کو کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ ابھی تک میرے لائے ہوئے اس کی لاٹری کے ٹکٹ نکل رہے تھے اور وہ مجھ پر مہربان تھا۔ اس لیے بیٹھنے کے علاوہ میرا ان دنوں کوئی کام نہ تھا اور ہاں باجوہ نے مجھے اس سازش کا سراغ لگانے کا کام بھی سونپا ہوا تھا جو اس کے خیال میں اس کے خلاف ہو رہی تھی۔ وہ روزانہ رازدارانہ انداز میں پوچھتا۔ ”کوئی سن گن ملی۔ کاکا اقبال۔“

میں کہتا۔ ”کچھ پر شک ہے مگر جب تک پکا ہاتھ نہیں پڑتا، کچھ یقین سے کہہ نہیں سکتا۔“

ایک بار کہنے لگا۔ ”مجھے وین کے ڈرائیور حسن پر شک ہے۔“

میں دم بخود رہ گیا کہ ایک بے چارہ ڈرائیور جو پورا دن قیدیوں کو گاڑی پر ایئرپورٹ سے ڈھو کر لانے میں لگا رہتا ہے، وہ کس طرح اس کے خلاف کسی قسم کی سازش بن سکتا ہے۔ حسن عراق کا رہنے والا ایک نفس کھ انسان تھا۔ معلوم نہیں بیدی اور باجوہ دونوں اس کے خلاف کیوں تھے۔

میں اپنی پوسٹ پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اور دس میٹر دور دوسری پوسٹ پر بیٹھے بٹ صاحب کچھ اسکیچ بنا رہے تھے۔ کبھی کبھی اونگھنے لگتے اور پھر ہڑبڑا کر جاگ جاتے اور دور سے مجھے اپنا بنایا اسکیچ دکھاتے۔ میں بھی دور ہی سے سیدھے ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر واہ کا اشارہ کرتا۔ داد پا کر یا تو دوبارہ سے اونگھنے لگتے یا دوبارہ سے فن کاری میں جت جاتے۔

میں پڑھتے پڑھتے تھک گیا اور کتابیں میز پر رکھ کر آنکھ بند کر کے آرام کرنے لگا۔ ساتھ ہی کمرے کا دروازہ تھا۔ ادھر نظر اٹھی تو دیکھا وہ نیا پاکستانی قیدی کھڑا مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”کچھ چاہیے؟“

جواب ملا۔ ”نہیں۔“ پھر بولا۔ ”میرا نام جنید ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ دروازے سے ٹیک لگائے میرے قریب کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

حسب عادت میں نے پوچھا۔ ”کیا پاکستان سے آتے وقت پکڑے گئے ہو؟“ لیکن جو کچھ اس نے مجھے بتایا تو میں...

ششدر رہ گیا۔

وہ بتا رہا تھا اور میں سنتا جا رہا تھا۔ وہ آٹھ سال پہلے امریکا آیا اور پھر کسی وجہ سے وہاں سے نکلا یا نکالا گیا تو ٹورنٹو پہنچ گیا۔ بہت محنت کی اور دو تین ٹیکسیاں (کیب) خرید لیں۔ ایک کیب خود چلاتا تھا۔ زندگی مزے سے گزر رہی تھی اور پیسے بھی اچھے بن رہے تھے۔ کل جمعہ کی شام کو ایک کلب سے سیاہ فام تماش بین اٹھائے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ انہیں لے کر ینگ اسٹریٹ سے گزر رہا تھا۔ وہ تمام سواریاں نشے میں دھت تھیں اور کیب میں شور مچایا ہوا تھا۔ ان کا شور سن کر ایک پولیس کی گاڑی نے اسے روک لیا۔ جنید سے پوچھا کہ یہ سواریاں تمہیں تنگ تو نہیں کر رہیں اور کیا میری مدد کی ضرورت ہے؟ اس نے پہلے نہیں میں جواب دیا اور پھر مدد پر شکریہ ادا کیا۔ وہ پولیس والا جاتے جاتے رک گیا۔ کچھ سوچ کر واپس آیا اور جنید سے ڈرائیونگ لائسنس مانگا۔ اس نے لائسنس دیا۔ پولیس والا اپنی گاڑی میں گیا اور کمپیوٹر پر چیک کیا۔ دوبارہ آیا اور جنید کو وہیں ہتھکڑی لگا دی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کینیڈا میں غیر قانونی ہے۔ ان کالوں کے لیے ایک اور ٹیکسی منگوائی اور انہیں چلتا کیا۔ اتنے میں کئی پولیس کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔ ٹیکسی بمع جنید کے پولیس اسٹیشن لے آئے۔ پوچھ گچھ کی اور پھر امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اسے یہاں لا کر بند کر دیا۔ اب جنید کو یقین تھا کہ اس کو پاکستان ڈی پورٹ کر دیا جائے گا۔

اس نے اپنی آپ بیتی سنائی تو رونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میری ساری کمائی مٹی میں مل جائے گی اگر مجھے واپس بھیج دیا گیا۔ وہ بتانے لگا کہ اس کا تعلق پنڈی سے ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا ماں حیات ہے؟“

بولا۔ ”جی ہے۔“

”تم آٹھ سال سے اس سے نہیں ملے۔“

”نہیں بس خط لکھ لیتا ہوں۔“

”کیا خط سے اس کی تسلی ہو جاتی ہے؟“

”معلوم نہیں۔“

”گھر میں اور کون ہے؟“

”میں اکیلا بیٹا ہوں، وہ خالہ کے گھر پچھلے آٹھ سال سے رہتی ہیں۔“

میں نے پھر اپنا سر پکڑ لیا۔ اب اس سے کیا کہتا کہ اپنی ماں جیسی ہستی کو جو اللہ کے بعد سب سے زیادہ تم سے محبت کرتی ہے۔ ضرورت پڑے تو اپنا گوشت بھی تمہارے لیے کاٹ لے۔ جس کے ہاتھ تمہارے لیے اللہ کے سامنے اٹھیں تو آسمان بھی لرز پڑے۔ جس کی نگاہ اپنے بیٹے پر پڑے تو وقت منجمد ہو جائے۔ بیٹا ذرا سا دکھی ہو تو وہ غم کے پہاڑ اپنے ناتواں کاندھے پر اٹھا لے۔ بیٹا ہنسے تو اس کے لیے پوری کائنات جھوم اٹھے۔ بیٹا پیاس سے بے حال بلبلائے تو وہ ننگے پاؤں صفا اور مروہ کی سنگلاخ اور دہکتی چٹانوں کے بیچ ننگے پاؤں پانی کی تلاش میں بھاگتی پھرے۔ وہ ماں جس کے بارے میں اللہ کہتا ہے کہ کسی کے سامنے نہ جھکو مگر صرف میرے مگر جھک کر ماں کے پاؤں پکڑ لو کیونکہ اس کی خدمت میں جنت ہے اور تو بدبخت اس جنت کو چھوڑ آیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس نے تمہارے لیے رو رو کر اپنی آنکھیں اندھی کر لی ہوں گی۔

میرے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کہنے لگا۔ ”میرا ایک کام کرو گے۔“ پھر پوچھنے لگا۔ ”تنخواہ کتنی ہے؟ اگلے دس سال میں کتنا کما لو گے؟“

”تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟“ میں نے استفسارانہ لہجے میں پوچھا۔

”زندگی بھر کام کرتے رہو تو پچاس ہزار ڈالر جمع نہیں کر پاؤ گے۔“ پھر رازدارانہ لہجے میں اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”مجھے کہیں سے دو ڈالر کا گلاس کٹر لا دو۔ میں کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر بھاگ جاؤں گا اور کٹر لانے سے پہلے پچاس ہزار تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔“

”دوسری منزل سے چھلانگ لگاؤ گے تو تمہاری ٹانگ ٹوٹ جائے گی اور پھر کس طرح بھاگو گے۔“ میں نے کہا۔

دراصل میرا تجسس بڑھ رہا تھا کہ یہ سب کیوں اور کس طرح سے کرنا چاہتا ہے۔ وہ بتانے لگا۔ ”میرے آدمی وقت پر نیچے پہنچ جائیں گے اور وہ مجھے اسی دن البرٹا یا منی ٹوبا کہیں چھوڑ آئیں گے۔“ پھر کہنے لگا۔ ”میں تمہاری شفٹ میں بھی نہیں بھاگوں گا تاکہ کسی کا تم پر شک نہ گزرے۔“

پچاس ہزار ڈالر کی قیمت کینیڈا میں وہ لوگ بہتر جانتے ہیں جو مزدوری یا کوئی چھوٹی موٹی جاب کر رہے ہوتے ہیں۔ میں جتنے بھی خواب لے کر کینیڈا آیا تھا وہ تمام پچاس ہزار ڈالر میں پورے ہو سکتے تھے بلکہ خواب پورے ہونے کے بعد بہت کچھ ڈالر بچ بھی جاتے۔ اس کے بدلے مجھے دو ڈالر کا کٹر لا کر اس کے حوالے کرنا تھا اور رقم میرے پاس ایک دن پہلے ہی پہنچ جاتی۔ میرا ایمان ذرا سا ڈگمگایا کہ اس کے بھاگنے سے میرا یا کسی کا بھی کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ پاکستان سے بھی کوئی غداری نہیں تو کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا

لوں۔ کیا معلوم قدرت نے کسی نیکی کا انعام میرے لیے رکھا ہو۔

پھر کچھ اور سوالات ذہن میں ابھرے کہ جس ملک نے تم کو اپنے ہاں رہنے کی جگہ دی ہے۔ ہر قدم پر تمہاری مدد کر رہا ہے تو اس سے غداری کیا غداری نہ ہوگی؟ اور اگر وہ میری شفٹ میں نہیں بھاگتا مگر دوسری شفٹ میں کوئی پاکستانی کام کر رہا ہو اور جنید اس کی شفٹ میں بھاگ جائے تو کیا پھر بھی کوئی کسی پاکستانی کو جاب دے گا؟ پہلے بھی یہ الزام ہے کہ پیسے کے لیے پاکستانی کچھ بھی بیچ سکتے ہیں۔

میں نے انکار کر دیا اور اس سے کہا۔ ''مجھے اس سے ہمدردی ہے کیونکہ اس کی ماں کو بیٹے کی ضرورت ہے جو پچھلے آٹھ سال سے اس کی راہ تک رہی ہے۔ یہی پیسے پاکستان لے جاؤ اور کوئی عزت کا کام کرو اور ماں کی دعائیں بھی لو مگر پھر تو وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ میرے پاؤں پکڑنے لگا۔ میں نے بٹ صاحب سے سیٹ تبدیل کروالی۔ بٹ صاحب اسے اپنے بنائے ہوئے اسکیچ دکھلاتے اور وہ موقع پا کر ڈوبتی آنکھوں سے التجا بھری نظروں سے مجھے دیکھتا رہتا۔ کبھی ہاتھ جوڑے دور سے بیٹھ کر رونا شروع کر دیتا۔ دوسرے دن بھی وہ میرے پیچھے پڑا رہا۔ میرا اٹھنا بیٹھنا اس نے حرام کر دیا تھا۔ میں اس کی شکایت بھی نہیں لگانا چاہتا تھا مگر وہ میری منتیں کرتا رہا۔ اس نے پھر رقم بھی ساٹھ ہزار ڈالر کر دی تھی مگر میں بھی ڈٹ گیا۔ پھر دوبارہ جاب پر کچھ دن بعد آیا تو معلوم ہوا کہ جنید کو پاکستان ڈی پورٹ کر دیا گیا ہے۔ مجھے افسوس ہوا مگر یہ تسلی ہوگئی کہ کسی ماں کو اس کا کھویا ہوا بیٹا تو مل گیا ہوگا۔

تھک ہار کر اپارٹمنٹ پہنچا تو سب لیونگ روم میں بیٹھے ٹی وی پر مفتی کا پسندیدہ شو دیکھ رہے تھے۔ شو کی نوعیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ تینوں ایک دوسرے کی جانب کن انکھیوں سے دیکھتے، پھر ٹی وی کی اسکرین میں کھو جاتے۔ سرجی لال بھبوکا ہو رہے تھے اور شہباز جذبات میں یرقان زدہ لگ رہا تھا۔ میرے اندر آنے کا کسی نے نوٹس نہ لیا۔ میں بھی کپڑے تبدیل کر کے ان کے ہمراہ بیٹھ گیا جو کچھ کچن میں بنا تھا وہی کھا کر اپنی بھوک مٹانے لگا۔ جن باتوں کو ہم زندگی میں چھپاتے ہیں، وہی باتیں اس شو میں بے باکی سے بیان کی جارہی تھیں۔ مجھے اب کچھ دخل در معقولات کرنی تھی۔ اسی لیے سوچا کہ سرجی اور شہباز کو آپس میں الجھایا جائے۔ میں نے سرجی سے پوچھا۔ ''ٹی وی دیکھتے ہوئے شہباز کی آنکھوں میں ہوس دیکھی ہے۔''

میں سمجھا کہ سرجی شہباز پر کوئی فقرہ کسیں گے اور پھر ایک شور وغوغا شروع ہو جائے گا مگر سرجی نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ ''تم سو جاؤ۔ کل کین سینٹر بھی جانا ہے اور ہمیں آپس میں مت لڑاؤ کیونکہ یہ ٹائم کسی کے ساتھ جھگڑا کرنے کا نہیں ہے بلکہ......'' کچھ کہتے کہتے پھر شو کی بھول بھلیوں میں غرق ہو گئے۔

میں بارہ گھنٹے کی جاب کر کے آیا تھا اور شدید تھکاوٹ ہو رہی تھی۔ رات کا ایک بج چکا تھا اور صبح سات بجے پھر جاگنا تھا۔ ان کو جلدی سونے کی تاکید کر کے سونے چلا گیا۔

صبح سرجی تیار ہوئے تو مفتی کا پرفیوم چپکے سے بہت سارا اپنے اوپر چھڑک لیا بلکہ چھڑکاؤ کر لیا۔ اپنے طور پر خوش تھے کہ مفتی نے کچھ نہیں دیکھا۔ سرجی کو شاید یہ اندازہ نہ تھا کہ اس کی کیا سب کی سونگھنے والی حس خاصی تیز ہے۔ سوتا ہوا مفتی جاگ اٹھا اور اپنے میٹرس پر پڑا پہلے کچھ سوچتا رہا اور ساتھ ناک سکیڑے سونگھتا بھی رہا۔ میں اور شہباز کارپٹ پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو شہباز کے نتھنوں سے ٹکرائی تو بولا۔ ''آج سرجی کا سیاپا مفتی کے ساتھ ہو کر رہے گا۔''

مفتی کے حواس بیدار ہوئے تو وہ چھلانگ لگا کر میٹرس سے اتر آیا اور واویلا کرنے لگا۔ ''یہ میری پرفیوم کی بوتل کس نے توڑ دی؟'' یہ کہہ کر وہ واش روم کی طرف لپکا جہاں سے سرجی پُرمست ہو کر باہر نکل رہے تھے۔ دروازے پر ہی دونوں کا ٹکراؤ ہو گیا۔

سرجی نے تو قسمیں کھانا شروع کر دیں کہ اس نے کوئی بوتل نہیں توڑی بلکہ یہ الزام شہباز پر تھوپ دیا کہ ہو سکتا ہے اس نے توڑی ہو؟

شہباز ناشتا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''سرجی کو سونگھو۔ اس نے بوتل توڑی نہیں بلکہ خود پر انڈیل لی ہے۔''

مفتی اپنی پرفیوم کی آدھی بھری شیشی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سرجی اپنے سر پر پھندنے والی اونی ٹوپی اور میرے والا لمبا گرم کوٹ پہنے، سر جھکائے کھڑے تھے۔ بہ مشکل ہم نے سرجی کو ناشتا کروایا۔ مفتی کو دوبارہ لٹا کر اس پر کمبل ڈالا اور ٹورنٹو کی سرد ہواؤں میں نکل آئے۔

چلتے تو سرجی خاموش تھے مگر کین سینٹر پہنچنے تک وہ پھر سے چہچہا رہے تھے۔ شہباز نے پوچھ لیا۔ ''یہ ندیم کا لنڈے والا لمبا کوٹ آج کیوں پہن رکھا ہے؟''

پہلے تو کہتے رہے کہ یہ راز ہے مگر جب زیادہ زور لگایا گیا تو لمبے کوٹ کی گہری جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا

جس میں ریوڑیاں بھری تھیں۔ ہم دونوں حیران تھے کہ یہ کہاں سے اور کیوں لے آئے۔ بالآخر بتایا کہ پچھلے جمعے کو نماز پڑھنے گیا تو جلیبیوں کے ساتھ یہ بھی خرید لایا کہ آج ین کو تحفہ دوں گا۔ یہ سن کر ہمارے چلتے قدم وہیں جم گئے۔ شہباز تو برف پر باقاعدہ لڑکھڑا گیا۔

"عاشق تو شہباز بھی مایا کا ہے اور بے ہودہ بھی ہے، شاید چغد بھی ہو مگر آپ تو حدیں پھلانگ گئے۔" پھر میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "خبردار جو اس چینی لڑکی کو یہ ریوڑیاں دیں۔"

سرجی اب اداس کھڑے تھے۔ کہنے لگے۔ "ماشاء اللہ خالص گھی کی بنی ہوئی ہیں اور چکوال میں پہلوان نے خود بنائی ہیں۔ ین کو بہت پسند آئیں گی۔"

میں نے سختی سے سرجی کا کندھا جھنجوڑا اور کہا۔ "کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ نے زہریلی دوائی ین کو دے کر مارنے کی کوشش کی ہے اور پولیس کیس بھی بن سکتا ہے۔"

"پہلے میں خود کھا کر ین کو دکھلاؤں گا اور پھر اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں ریوڑی ڈالوں گا۔"

میں نے کسی طرح وہ لفافہ ان سے لے کر اپنے بیگ میں رکھ لیا اور شہادت کی انگلی ان کے ماتھے پر رکھی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں پر بولا کچھ نہیں مگر وہ میرا کچھ نہ کہا سمجھ گئے۔

مجھے یہ اندازہ تھا کہ کسی کو انجان ذائقے والی مٹھائی دینا اور وہ بھی کھلی ہوئی، یہ حرکت بہت ناپسند کی جاتی ہے۔ اب سرجی بضد تھے کہ میں یہ ریوڑیاں نسرین کو دے دوں۔ ان کی منطق یہ تھی کہ اس سے پیار بڑھتا ہے۔ میں نے دوبارہ ہلکا سا ڈانٹا تو شہباز سے کہنے لگے۔ "تم مایا کو دے دینا۔"

وہ جواب میں کہنے لگا۔ "وہ پہلے ہی نشہ کر کے آتی ہے اور میٹھے سے نشہ زیادہ بڑھتا ہے۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

سرجی نے چاروں جانب مایوسی سے برفوں کو دیکھا اور کین سینٹر کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

آج سینٹر کے ہال کی ترتیب بدلی ہوئی تھی۔ اشوک کاؤنٹر پر ملا تو کہنے لگا کہ آج ندیم کو انٹرویو کی تیاری کروانے کا پروگرام ہے۔ اس خوشی میں وہ ریوڑیاں اشوک کو دے دیں۔ وہ خوش ہو کر اس بھاری لفافے کو اپنے داہنے ہاتھ پر تولنے لگا جیسے اس کے ہاتھ ہیرے لگے ہوں۔

ہم ہال میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ یہاں کا منظر تبدیل ہے۔ دروازے کے ساتھ کونے میں ایک پردہ لٹکا تھا اور اس کے پیچھے ایک میز اور کرسی تھی۔ میز پر فون رکھا تھا۔ ہال میں سب میزوں کو جوڑ کر ایک ترتیب میں رکھا گیا تھا اور سب کرسیاں ارد گرد رکھی تھیں جیسے کسی بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہو اور سامنے ایک کرسی تھی جیسے چیئرمین کے لیے رکھی گئی ہو۔

آج مایا کسی اور روپ میں نظر آئی۔ آنکھوں کے گرد حلقے بھی نہ تھے۔ سنہری بال کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں دو دو انگوٹھیاں تھیں۔ نیلی جین اور سفید شرٹ پر گلابی جیکٹ اور چمکتا لشکارے مارتا رنگ۔ یہ سب کے لیے انوکھی بات تھی۔ نسرین میرے ساتھ کھڑی کہہ رہی تھی۔ "کہیں تمہارے دوست کے ہاتھوں پگھل تو نہیں گئی۔"

میں بولا۔ "جب نشے میں نہیں بدلی تو ہوش میں کیسے کرے گی؟"

شہباز اور سرجی کونے میں سر جوڑے کھڑے تھے۔ شہباز کی نظروں کی زد میں مایا تھی اور سرجی شہباز کے کان میں کھسر پھسر کر کے مایا پر للچائی نظریں ڈال لیتے تھے۔ میں اور نسرین نہایت ہی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ شہباز پہلے ہی مایا کے ساتھ والی کرسی پر اپنا بیگ رکھ کر اپنی پوزیشن مضبوط کر چکا تھا اور اب سرجی سے عشق کا کوئی سبق پڑھ رہا تھا۔

شہباز، سرجی سے کچھ سیکھ کر مایا کے ساتھ پسینے میں تر بیٹھا متواتر شرما رہا تھا اور سرجی، ین کے ساتھ بیٹھے اپنی پھندنے والی ٹوپی کو کھجلا رہے تھے۔ مایا نے شہباز کو ساتھ بیٹھے دیکھا تو پہلے اپنا بیگ کھسکا کر اپنے قریب کر لیا۔ اس پر شہباز زیادہ شرما کر لال بھبھوکا ہو گیا۔ شاید مایا کو اپنے سینڈوچ کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ سرجی اب شہباز کو اشارے کر کے کچھ کرنے پر اکسا رہے تھے اور شہباز کچھ نہ کچھ کرنے پر تیار بیٹھا تھا مگر اتنے میں اللہ کا شکر ہوا کہ الزبتھ ہال میں آ گئی اور سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

پہلے جوش سے اپنے دونوں ہاتھ ملے اور بولی۔ "آج آپ ایک نئے تجربے سے روشناس ہوں گے کیونکہ ندیم کا اگلی جمعرات کو انٹرویو ہے اور ہم نے اسے فون کا انٹرویو اور پھر زبانی انٹرویو کی تیاری کروانی ہے۔"

پھر مجھے نسرین کے پہلو سے اٹھا کر چیئرمین والی کرسی پر بٹھا دیا۔ اتنے میں ایک ویڈیو کیمرا لگا دیا گیا جس سے ساری کارروائی کو ریکارڈ کرنا تھا۔ میں گھبرا گیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں نروس ہو گیا تھا۔ الزبتھ نے سب سے کہا کہ ہر کوئی ایک ایک سوال ندیم سے پوچھے گا اور مجھے کہا گیا کہ میں اپنے قدرتی اسٹائل میں جواب دوں یعنی کوئی رنگ بازی نہ

دکھاؤں۔ میں لوگوں کی نظریں مجھ پر گڑی تھیں اور سامنے کیمرے کے پیچھے اشوک کھڑا اپنی پلکیں جھپکا رہا تھا۔

مجھے الزبتھ نے کہا کہ اپنے ہاتھ میز پر رکھتے ہیں اور بالکل سیدھا بیٹھنا ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جوابات دینے ہیں اور چہرے کو پُرسکون رکھنا ہے۔ سب سے کہا گیا کہ اپنے سوالات تیار کریں۔ الزبتھ نے سوالات پرکھے اور پھر مجھ پر چاروں جانب سے حملے ہونا شروع ہو گئے۔ مجھے یہ چیز تقویت دیتی تھی کہ یہ سب ڈراما ہے اور کوئی مجھے جوابات دینے پر جاب سے محروم نہیں کر سکتا۔ میں ریلیکس ہو گیا اور ایسے جوابات دینے لگا کہ جیسے دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہوں۔ میرے ہاتھوں کی حرکت میرے الفاظ سے ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ اللہ کا کرم یہ ہوا کہ میرے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ سننے والے سارے سر جی ہیں تو میں نے جی بھر کر خوب سنائیں۔ کسی نے پوچھا کہ آپ کیوں یہ سمجھتے ہیں کہ آپ اس جاب کے لیے سب سے زیادہ مستحق ہیں؟ کسی نے پوچھا کہ آپ کو پہلے کسی ٹیم کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ ہے اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ٹیم کے ساتھ کام کرنا آسان ہے یا اکیلے میں؟ کسی نے یہ پوچھا کہ آپ میں کون کون سی خصوصیات ہیں؟ ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کے منفی پہلو کیا ہیں؟ ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کی آج تک سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟ سر جی کا سوال تھا کہ آپ کے ساتھ رہنے والے آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ نسرین کا سوال تھا کہ آپ کے پرانے دوست ابھی تک آپ کے دوست ہیں یا نئے بنا لیے ہیں؟

میں اپنے طور پر گپ شپ کرتا رہا اور جب سوالات ختم ہوئے تو پہلی تالی الزبتھ نے بجائی اور پھر سب نے کھڑے ہو کر میرے لیے تالیاں بجائیں۔ الزبتھ کہنے لگی کہ اس انٹرویو کی ریکارڈنگ اب ہماری آئندہ کی کلاسوں کے نصاب کا حصہ ہو گی۔ نسرین نے خوشی سے مجھے گلے لگا لیا تو سر جی نے اسے کھینچ کر دور کیا اور پھر مجھ سے خود چمٹ گئے۔

ین بولی۔ ''ندیم یہ جاب تم کو مل جائے گی۔''

مارک گرم جوشی سے آیا، ہاتھ ملایا اور پھر آنکھ مار کر بولا۔ ''بات کہاں تک پہنچی؟'' اشارہ نسرین کی جانب تھا۔

ایک بات میں نے کینیڈا اور امریکا میں بھی نوٹ کی کہ جب کوئی کسی لڑکی سے بات کرتا ہے اور متواتر بات کرتا ہے تو یہاں بھی باتیں بنتی ہیں۔ اس لیے پاکستان میں رہنے والے اپنے آپ کو مظلوم نہ سمجھیں۔ ین ملنے آئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سر جی درمیان میں آ کھڑے ہوئے۔ شہباز مایا کے ساتھ ساتھ آیا اور ساتھ ہی اس کے ہمراہ واپس چلا گیا۔

مجھے آج کے دن نے ایک نیا حوصلہ دیا تھا۔ اللہ میری مدد کر رہا تھا۔ دعائیں کام آ رہی تھیں۔ وہ بندہ جو تین ماہ پہلے دو الفاظ بھی نہ بول سکتا تھا آج کیمرے پر اپنا کامیاب انٹرویو ریکارڈ کروا چکا تھا۔ سر جی نے لانگ کوٹ پہن رکھا تھا جو ان کے جوتوں کو چھو رہا تھا اور وہ اسی حلیے میں ین پر ڈورے ڈال رہے تھے اور وہ کچھ خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ کافی کا وقفہ تھا اور سب کا موضوع میں نہ تھا بلکہ میرا انٹرویو تھا۔

وقفے کے بعد ہم دوبارہ سے ہال میں آ بیٹھے۔ اب مجھے پردے کے پیچھے کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا اور الزبتھ نے کہا۔ ''فرض کرو کہ آج انٹرویو کا دوسرا دن ہے اور تم نے کمپنی کو فون کر کے ان کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ مجھے انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔''

ہال میں الزبتھ دوسرے فون پر بیٹھ گئی۔ میں نے گھنٹی بجائی تو اس نے فون اٹھایا۔ میں نے شکریہ ادا کیا، کچھ تعریف کی، کمپنی کے ماحول کو سراہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے الزبتھ نے سمجھایا تھا کہ ایک منٹ سے زیادہ بات نہیں کرنی اور اگر آگے سے کوئی بات لمبی کرنا چاہے تو پھر بات بڑھانی ہے۔ اس شکریے کے فون پر بھی بہت سی داد سمیٹی۔ الزبتھ اس طرح خوش ہو رہی تھی جیسے کہ آج اسے سالوں دھکے کھانے کے بعد کوئی جاب ملی ہے۔ میں خود حیران تھا کہ جیسے سب یہاں اس لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ اس جاب کے لیے میری مدد کریں اور تو اور ایرانی رضا بھی مبارک باد دینے آ پہنچا۔ ''میں کسی کے معاملات میں زیادہ مداخلت نہیں کرتا مگر مجھے یقین ہے تمہیں یہ جاب مل جائے گی۔'' یہ کہہ کر مبارک باد دینے کے لیے اپنا سرد ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

میں نے انتہائی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تو بولا۔ ''Take is easy man.''

آج مجھے ہولڈنگ سینٹر نہیں جانا تھا اور میں جانا بھی نہ چاہتا تھا کیونکہ پچھلے دو دن لگاتار بارہ بارہ گھنٹے کی جاب کر کے تھک چکا تھا۔ فروری کا مہینا اپنے دوسرے حصے میں تھا اور سردی وہی تھی جو ہمیں دسمبر میں ملی تھی۔ اتنے طویل جاڑے اور برف باری نے ہر چیز کو منجمد کر دیا تھا اور ہر بندہ ایک سنو مین نظر آتا تھا۔ ایک سرد دیوار پر چڑھتے چڑھتے ہر کوئی تھک چکا تھا۔ ہر بدن مضمحل تھا۔ ہر قدم منوں وزنی تھا۔ ہر سوچ ٹھٹھر چکی تھی۔ ہر جذبہ سرد پڑ چکا تھا۔ قوت اور سکت دم توڑ رہی تھی۔ سوچیں

جکڑی جا چکی تھیں اور ہم تینوں اپارٹمنٹ جانے کے لیے باہر نکلنے سے کترا رہے تھے کیونکہ برف ایک قہر کی مانند گر رہی تھی۔
اتنے میں نسرین قریب آئی اور ہم سب چوکنے ہو گئے۔

اس کا مخاطب میں تھا۔ ''کافی پینے چلنا ہے؟''

جواب سرجی کی جانب سے آیا۔ ''ہاں ہاں! کیوں نہیں۔''

نسرین تعجب انگیز نظروں سے سرجی کو دیکھنے لگی جن کی ٹوپی کا پھندنا ان کی ہاں کے ساتھ ساتھ خوشی سے لہرا رہا تھا۔ شہباز نے سرجی کو کہنی سے ٹہوکا لگایا تو وہ ایک قدم آگے بڑھ کر نسرین کے پہلو میں جا کھڑے ہوئے۔ اب وہ ہم سے اجنبی بن کر نسرین کے ساتھ کافی پینے کو تیار کھڑے تھے۔ صورت حال پیچیدہ ہونے لگی۔ شہباز کی مایا آج مچھلی کی طرح پھسل کر مارک کے ہمراہ کہیں جا چکی تھی اور شہباز پہلے سے ہی بیزار کھڑا تھا۔ حالانکہ سرجی نے شہباز کو کافی بہلایا تھا کہ مارک دراصل مایا کو بہن کہہ کر بلا رہا تھا مگر شہباز کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ اب سرجی کو نسرین سے لگا دیکھ کر ٹھیٹھ پنجابی کی گالیاں دے رہا تھا۔

نسرین اس نئی صورت حال سے پہلے کچھ گھبرائی اور پھر وقت کی نزاکت کو جان کر سب کو کافی پلانے کی دعوت دے ڈالی۔ اب سرجی کھڑے ہماری جانب دیکھ کر یہ بڑبڑا رہے تھے۔ ''اسے اتارش لگانے کی کیا ضرورت تھی؟''

کچھ دیر بعد ہم سب اسی کافی شاپ میں بیٹھے تھے جہاں کچھ دن پہلے میں اور نسرین آ چکے تھے۔ فرق یہ تھا کہ سرجی اب نسرین کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے تھے اور سامنے میں اور شہباز انہیں غصے سے گھور رہے تھے مگر وہ ہم دونوں سے بے نیاز تھے۔ شیشوں سے پار گرتی برف نے ماحول میں رومانیت بھر دی تھی تبھی تو سرجی نے کافی کے آرڈر دینے سے پہلے اپنی ٹوپی اتاری اور میز پر دے ماری۔ بائیں ہاتھ سے اپنے بقایا بالوں کو سنوارا اور نسرین سے بولے۔ ''یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی لڑکا کافی کے پیسے لڑکی کو ادا کرنے دے۔ آج بھی اور آج کے علاوہ جب بھی ہم کافی پینے آئیں گے تو ادائیگی میں ہی کیا کروں گا۔''

شہباز نے ان کی ٹوپی میز پر سے اٹھا کر انہیں پکڑا دی اور انہوں نے دوبارہ سے اپنے سر پر جما لی۔

''آئندہ کی ادائیگی کا چھوڑیں لیکن آج کی ادائیگی ضرور کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' یہ کہہ کر نسرین نے کافی کے ساتھ ایک کیک کا آرڈر بھی کر دیا۔

میں مسکرا اٹھا۔ شہباز نے ایک کیک پیک کرنے کا بھی کہہ دیا کہ مفتی کیوں اس اعزاز سے محروم رہے۔ اب سرجی اس افتاد پر ہونقوں کی طرح ہمیں تک رہے تھے۔

نسرین نے سرجی سے پوچھ لیا۔ ''آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

سرجی اس نئی آفت کے لیے تیار نہ تھے۔ انہیں یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ پہلا سوال ہی بچوں کا پوچھے گی۔ وہ بغلیں جھانکنے لگے۔

شہباز نے کہا۔ ''اب جواب تو دیں۔ دیکھو کتنے پیار سے پوچھ رہی ہے۔''

سرجی کے چہرے پر رنگ آ جا رہے تھے۔ سرجی کی جانب سے جواب نہ آیا تو نسرین نے دوسرا سوال پوچھا۔ ''آپ کی شادی تو ہوئی ہے ناں؟''

''ماشاءاللہ شادی بھی ہوئی ہے اور تین بچے بھی ہیں مگر میں ابھی تک کنوارہ ہوں۔'' شہباز جلدی سے بولا۔

نسرین نے پوچھا۔ ''وہ مایا سے جو چکر چل رہا ہے، وہ کہاں تک پہنچا؟''

اب وہ دونوں خاموش تھے۔

نسرین اور میں مسکرا رہے تھے۔ ہم سب نے کافی پی، کیک کھایا۔ ایک کیک شہباز نے پیک کروایا۔ بل سرجی نے ادا کیا اور سب نے اپنے گھروں کی راہ لی۔ سرجی نے تمام راستے کسی سے بات نہ کی۔ شاید اپنے ہی جال میں پھنس جانے پر انہیں قلق ہو رہا تھا۔

دو دن بعد میرا ایمبوسال میں انٹرویو تھا۔ مجھ کو جب بھی کسی طوفان کا سامنا کرنا پڑا یا کوئی پہاڑ جیسے مسائل سامنے آئے تو میں نے اللہ سے رجوع کیا اور آس پاس کے لوگوں کے ایک طرح سے پیچھے پڑ گیا کہ میرے لیے دعا کریں۔ ایک انسان دوسرے کو زیادہ سے زیادہ کیا دے سکتا ہے؟ میری نظر میں دعا، پیار اور تسلی کے علاوہ کچھ نہیں۔ باقی جو ایک کو دوسرے سے ملتا ہے وہ اس کا نصیب ہوتا ہے۔ کسی کی مالی مدد کرنے والا اگر یہ سمجھتا ہے کہ وہ لینے والے کا وسیلہ بن رہا ہے تو میری نظر میں یہ اسے شدید غلط فہمی ہوتی ہے۔ وسیلہ تو لینے والا دینے والے کے لیے بن رہا ہوتا ہے۔ اس کی بخشش کا، اس کی نجات کا۔ دینے والا تو اس کی دعاؤں کا محتاج ہوتا ہے۔ میں خود دعا کرتا تھا مگر زیادہ تر میں دعاؤں کے وسیلے تلاش کرتا۔ سب کو فون کرتا کہ میرے لیے دعا کریں، حالانکہ میں کسی کے بھی کوئی خاص کام نہ آیا تھا۔ میری خوش قسمتی یہ بھی رہی کہ جس سے بھی کہا تو اس نے میری دعا کی التجا کو رد نہ کیا۔ اب بھی میں

پاکستان میں سب سے رابطہ کر رہا تھا۔ بہن، بھائی، بیوی، بچے اور سب جاننے والے جت گئے تھے۔ ان دنوں نیو یارک میں تمنا بھابی روزانہ مجھے فون کرتیں۔ ہمت بندھاتیں اور دعائیں کرتیں۔ وظیفے تو وہ اٹھتے بیٹھتے پڑھتی تھیں۔ میرا چچازاد بھائی طارق بھی مجھے ہر دوسرے دن فون کرتا اور مجھے تسلی دیتا تھا۔ ادھر اپارٹمنٹ میں سرجی، شہباز اور مفتی میرے لیے خیر خواہ بن چکے تھے۔ مفتی ہیموسال کی ٹیکنالوجی کے بارے میں معلومات دیتا اور سرجی دعا کرنے کے بدلے جلیبیاں کھاتے اور کھا کھا کر اتنے ہی رہے جتنے پہلے دن تھے۔ شہباز اپنی سیکیورٹی کی جاب سے واپس آ کر کارپٹ پر لیٹا لیٹا ہر وقت یہ کہتا رہتا۔ ”تمہاری اس جاب کا سیاپا ختم ہو تو میں بھی اپنے بارے میں کچھ سوچوں۔“

ان دو دنوں میں کین والے سب مل کر میرے انٹرویو کی تیاری کرواتے۔ عموی طور پر جو سوالات پوچھے جاتے ہیں، وہ ڈھونڈ کر لاتے اور ساتھ ہی مل کر کوئی مناسب جواب تیار کرتے اور مجھ کو بٹھا کر سب ایک ایک کر کے سوالات کرتے اور میرے جوابات کی تصحیح کرتے۔ عجیب دن تھے۔ ہر ایک میرا خیر خواہ بن گیا تھا۔

میں بھی یہ سب سوالات اور جوابات ایک نوٹ بک پر اتارتا جا رہا تھا اور بعد میں کئی ایک کی میں نے انٹرویو کی تیاری اسی نوٹ بک سے کروائی اور ماشاء اللہ ان سب نے جاب حاصل کر لی اور آج اپنی زندگی میں خوش و خرم ہیں۔ مجھے اپنے دوستوں سے جو کچھ ملا، میں نے اسے آگے بڑھا دیا۔ یہی اپنے دوستوں سے کچھ پانا اور اپنے دوستوں میں یہی بانٹنا، میری زندگی کا حاصل بن گیا۔

دوسرے دن میرا انٹرویو تھا۔ مفتی نے اپنی جاب سے چھٹی کی تھی۔ سرجی کو تو اللہ جاب سے بھاگنے کا موقع دے، انہوں نے آج اپنی سیکیورٹی کی جاب چھوڑ دی تھی۔ مفتی مجھ سے ٹیکنیکل سوالات پوچھ رہا تھا اور میں کسی امیدوار کی طرح بیٹھا جوابات دے رہا تھا۔ کتابی علم میرا اچھا خاصا تھا، بس اسے انٹرویو میں بیان کرنے کا ڈھنگ سیکھنا تھا جو کین والوں نے سکھلا دیا تھا۔

سرجی سے پوچھا گیا۔ ”آپ نے آج چھٹی کس خوشی میں کی ہے۔“

وہ پلٹ کر بولے۔ ”ہمت بندھانے کے لیے۔“

آج ساری نمازیں ان کی امامت میں ادا کی گئیں۔ ڈور وال کے باہر برف متواتر گر رہی تھی۔ آج اس برف باری میں ٹھنڈ کی شدت محسوس نہ ہو رہی تھی بلکہ خلوص اور دھیان آسمان سے برس رہا تھا جس میں نرمی تھی۔ سرجی نے بڑے اہتمام سے کھانا بنایا۔ جب لائے تو چکن میں انڈے ڈالے تھے، ساتھ چاول بھی ابالے تھے اور ہم سب نے خوشی خوشی کھا لیے۔

آج انٹرویو تھا اور برف باری ہلکی پڑ چکی تھی۔ ایک بجے انٹرویو دینا تھا۔ مجھے کسی دولہا کی طرح تیار کیا گیا۔ مفتی نے اپنا کوٹ پہنایا اور میچنگ کرتی ٹائی میرے گلے میں ڈال دی۔ سرجی کہتے رہے کہ میرا پرفیوم آپ لوگوں نے پھینک دیا تھا ورنہ آج ہیموسال میں قیامت ڈھا دیتے۔ شکر ہے کہ میں اس قیامت ڈھانے سے بچ گیا۔ مفتی نے سرجی کی پہنچ سے چھپایا ہوا اپنا پرفیوم کہیں سے نکالا۔ مجھ پر کہیں کہیں چھڑکا اور پھر دوبارہ سے کسی نامعلوم مقام پر چھپا دیا۔ پھر مجھے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ سرجی تو قرآن پاک اٹھا لائے جیسے دلہن کو ماں باپ گھر سے رخصت کرتے ہیں، میں بھی ایسے ہی رخصت ہوا۔

باہر ہلکی برف پڑ رہی تھی اور میں نے کوٹ پر اپنی لیدر کی جیکٹ چڑھا لی تھی۔ ہیموسال ہمارے اپارٹمنٹ کے قریب تھی۔ ڈکسن روڈ پر جہاں سے ہولڈنگ سینٹر کی گاڑی ہمیں اٹھاتی تھی، وہاں سے کچھ آگے اسی روڈ پر ایک پل کراس کرنے کے بعد بائیں جانب اسکائی وے روڈ پر ہیموسال کی دو بلڈنگز تھیں۔ دونوں ایک منزلہ عمارتیں سرخ اینٹوں سے بنی تھیں۔ پہلی عمارت میں پروڈکشن ہوتی تھی اور دوسری میں ہیومن ریسورس کا دفتر تھا۔ دونوں کے بیچ پارکنگ لاٹ تھا۔

میں وقت سے پہلے پروڈکشن پلانٹ کے استقبالیہ پر پہنچ گیا۔ آج میرا انٹرویو پروڈکشن مینیجر اور سپروائزر نے کرنا تھا۔ اگر یہ مرحلہ نمٹ جاتا تو پھر ہیومن ریسورس والے انٹرویو کرتے اگر وہ بھی مجھے کلیئر کر دیتے تو آخر میں میرے دیے گئے ریفرنس پر فون کر کے میرے کردار اور کام کے بارے میں انکوائری کرتے تب کہیں جا کر جاب کی آفر مل سکتی تھی۔

استقبالیہ پر ہمیشہ کی طرح ایک گوری بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں اپنی جیکٹ ہینگر پر لٹکا کر کسی فرماں بردار کی طرح لیدر کی ایک آرام دہ کرسی پر سست کر بیٹھ گیا۔ میں مرکزی دروازے کے ساتھ بیٹھا باہر گرتی برف کو دیکھ رہا تھا جو دھیمے دھیمے زمین پر گر رہی تھی۔ باہر سڑک ویران تھی اور برف کی سفید چادر نے پورے ماحول کو ڈھانپ رکھا تھا۔ عمارت کے اندر سب ایک شرٹ میں گھومتے نظر آ رہے تھے اور باہر برف

باری نے اپنا سحر طاری کیا ہوا تھا۔ میں اس منظر میں کھو سا گیا تھا اور کچھ لمحوں کے لیے اپنے انٹرویو کو بھی بھلا بیٹھا تھا۔

اتنے میں ایک عمر رسیدہ مگر قیمتی سوٹ میں ملبوس شخص میرے قریب سے گزر کر گیا اور دوبارہ پلٹ آیا۔ نام پوچھا اور پھر کہا۔ "تم وقت سے پہلے آ گئے ہو۔"

میں خاموش بیٹھا رہا پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں ایک چمکدار راہداری میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ رکا اور مڑ کر خجالت سے بولا۔ "سوری! میں اپنا تعارف کروانا بھول گیا۔ میں مائیک شولٹ ہوں۔ یہاں کا اسسٹنٹ پروڈکشن منیجر۔" وہ پھر سے چل پڑا اور میں مؤدب ہو کر اس کے پیچھے ہولیا۔

ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ سامنے لنچ روم تھا جہاں سفید پینٹ شرٹ میں ملبوس پروڈکشن کے لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مائیک کہنے لگا۔ "پہلے میں تمہارا انٹرویو کروں گا اور پھر سپروائزرز سے تمہارا انٹرویو ہوگا۔"

کین سینٹر کی ٹریننگ سے جو خود اعتمادی میں نے سیکھی تھی، اسی کو لے کر میں بیٹھ گیا۔ بیس منٹ بعد وہ مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اگر میں نے فائنل کرنا ہوتا تو تمہیں ابھی رکھ لیتا۔" یہ کہہ کر سامنے ایک کمرے میں مجھے چھوڑ گیا جہاں لورین اور فریڈ سفید یونیفارم میں بیٹھے شاید میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ وہی پروڈکشن سپروائزر تھے جنہوں نے میرا انٹرویو کرنا تھا۔

جو ریسرچ وہ لوگ کر رہے تھے اور جس قسم کا پروسس وہ کرتے تھے وہی میری اپنی ماسٹر ڈگری میں ریسرچ تھی اور وہی کچھ میں یونیورسٹی میں پڑھاتا چلا آیا تھا۔ اب اللہ کی مدد سے میں نے جو تھیوری پیش کی اپنے ریسرچ پیپرز دکھائے تو وہ منہ کھولے حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگے۔ لورین بہت مہذب اور درمیانے قد اور درمیانی عمر کی خوش گفتار عورت تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "لگتا ہے کہ ہمیں اب تم سے بہت کچھ سیکھنا پڑے گا۔" پھر فریڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم کیا کہتے ہو؟"

فریڈ اپنا سر کھجا رہا تھا۔ "اگر ہیومن ریسورس کا انٹرویو نہ ہوتا تو میں یہی کہتا کہ کل سے ہی جوائن کر لے۔"

لورین کہنے لگی۔ "ہم نے بس تم کو سلیکٹ کر لیا ہے۔ آگے صرف کچھ کمپنی کے تقاضے ہیں جو پورے کرنے ہوتے ہیں۔ ورنہ تم آج ہی سے اپنے آپ کو ہیموسال کا حصہ سمجھو۔" یہ کہہ کر مجھ سے بے پناہ گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "وہ جو ہیومن ریسورس کی منیجر ہے، وہ آج چھٹی پر ہے ورنہ میں ابھی اس سے تمہارا انٹرویو کروا لیتی۔"

فریڈ نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "ہیموسال میں ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔"

میں وہاں سے نکلا تو پہلے جذبات سے خالی تھا۔ جس انٹرویو اور جاب کے لیے میں نے اپنا اور سب کا جینا حرام کر رکھا تھا، اسی کی کامیابی پر میں ایسے سمندر کی طرح پُرسکون تھا جس کی تہوں میں لہریں ہوتی ہیں۔ میں سفید برف کی چادر پر اپنے قدم رکھتا سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا تو فضا دھواں دھار تھی۔ آسمان کی وسعتیں نظر نہیں آ رہی تھیں مگر میرے رب کے جلوے برف کے ہر ذرے میں نمایاں تھے۔ پھر میں ہر ذرے کا شکر گزار بنتا گیا۔ ٹورنٹو کی سرد ہوائیں جو پہلے مجھے کاٹا کرتی تھیں، اب کچھ مہربان ہو گئیں۔ میں ان کی کاٹ سے کانپ نہیں رہا تھا بلکہ اپنے اندر تازگی کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ میں چلتا جا رہا تھا اور پھر یقین کا احساس ہونے لگا کہ پچھلے ایک گھنٹے میں میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ میں برف پر اپنا ماتھا ٹیکنا چاہتا تھا۔ مجھے انٹرویو کی کامیابی سے زیادہ اپنے رب کی رحمت اور اس کی مدد ملنے کی زیادہ خوشی تھی۔ میں نے اپنی اور سب کی دعاؤں کا اثر دیکھ لیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ رب کس طرح ہم سب کی سنتا ہے۔ ہم مانگنے والے تو بنیں۔ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے سرنڈر تو کریں۔ اپنی ذہنی غلاظی سے باہر تو نکلیں۔ چاروں جانب سے یہی صدائیں میرے کانوں میں آتی تھیں۔ وہی میرا اور سب کا رب ہے۔

میرے اپارٹمنٹ پہنچتے پہنچتے برف باری رک چکی تھی اور ایک سرد خاموشی فضا میں اٹکی تھی۔ ہوا بند تھی اور سرجی اکیلے کمبل اوڑھے سنگی بت بنے شیشوں سے پار بکھری برف سے متاثر ہوئے بیٹھے تھے۔ انہیں میرے اندر آنے کا علم بھی نہ ہوا۔ میرے سلام کرنے پر پُرجوش انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ "انٹرویو ماشاءاللہ کیسے ہوا؟" میرے جواب کا انتظار کرنے سے پہلے ہی کہنے لگے۔ "نسرین کا فون آیا تھا، انٹرویو کا پوچھ رہی تھی۔" پھر مجھے طنزیہ نظروں سے مسکرا کر اپنی آنکھیں مٹکانے لگے۔ کچھ دیر اپنی آنکھیں مٹکاتے رہے اور پھر رک گئے اور دوبارہ سے پوچھا۔ "انٹرویو کا تو بتایا بھی نہیں؟"

''انٹرویو اللہ کے کرم سے بہت اچھا ہوا۔'' میں نے زیادہ تفصیل سے نہ بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ انہوں نے مجھے منتخب بھی کرلیا ہے۔ دراصل ابھی کچھ اور مراحل باقی تھے۔ اس سے پہلے میں کوئی بات نہیں بتانا چاہتا تھا۔ شہباز اپنی جاب پر صبح ہی جا چکا تھا اور مفتی کسی کام سے باہر گیا تھا۔

میں آج کا دن کمرے میں لیٹ کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس جہد مسلسل نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میں کمرے میں آیا تو سرجی اپنا کمبل لپیٹے میرے پیچھے پیچھے آ گئے اور بولے۔ ''کہیں گھومنے پھرنے نہ جائیں؟''

میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا؟'' سرجی کی خواہشیں بھی نرالی ہوتی تھیں۔ باہر منجمد کر دینے والی سردی تھی اور انہیں باہر گھومنے کا شوق چڑھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں بہت تھکا ہوا ہوں اور پلیز مجھے بے آرام نہ کرنا۔''

کہنے لگے۔ ''نسرین کا فون دوبارہ آئے تو بھی؟''

''جی ہاں تو بھی۔ کل اس سے ملاقات ہو جائے گی۔''

وہ کچھ کہنے لگے تھے مگر میرے تیور دیکھ کر یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ ''انٹرویو بھی اچھا ہوا ہے، نسرین کا فون بھی آیا مگر مزاج ہیں کہ آسمان پر ہیں۔''

وہ چلے گئے تو میں مسکرا پڑا۔ کپڑے تبدیل کر کے بڑی آسودگی سے اپنے میٹرس پر کمفرٹر لپیٹے پڑا تھا۔ کمرے کی ڈور وال کے پردے کھینچ کر ان خشک جھاڑیوں کو دیکھ رہا تھا جن کو برف نے ڈھانپ دیا تھا۔ باہر زمین اور درختوں کو ڈھانپتی برف نے ایک خوبصورت منظر تخلیق کر ڈالا تھا۔ ایک سکوت اور مطمئن نظارہ میرے اندر کی خاموشی میں مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ اپارٹمنٹ میں سکوت تھا۔ میں اب آرام سے پڑا اپنی تھکاوٹ سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ آج احساس ہو رہا تھا کہ موسم انسان کے اندر ہوتا ہے، باہر تو اس کا عکس دکھتا ہے۔

بے فکری اور آسودگی کا احساس قوی ہو گیا تھا۔ میں اپنے میٹرس پر آنکھیں موندے پڑا تھا۔ نوکری ابھی نہیں ملی تھی مگر میں سکون میں آ گیا تھا۔ گو کہ اب تک میں جہد مسلسل میں تھا۔ کینیڈا کے بیکراں سمندر میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے حرکت میں رہنا ضروری ہے۔ اس لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر اب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک پرسکون نہر کی سطح پر آ گیا ہوں اور آہستگی سے ہچکولے لیتا بہتا چلا جا رہا ہوں۔

میرا سفر ابھی تمام نہیں ہوا تھا بلکہ یہ تو ابھی شروع ہوا تھا مگر لگتا تھا کہ وقت کی ڈور میرے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ میں اسے کہیں بھی موڑ سکتا ہوں۔ حقیقت میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں یہ احساس میرے اندر کب اور کیسے پیدا ہو گیا تھا کہ اب میں وہ نہ رہا جو تین ماہ پہلے تھا۔ بہت کچھ میرے اندر سے ابل رہا تھا۔ مگر میں اسے لفظوں میں ڈھال نہیں پا رہا تھا۔ کیونکہ ذہن پر عجیب سی کیفیت چھا گئی تھی۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر میں اس احساس کو الفاظ میں ڈھال بھی لوں تو کیا پڑھنے والے میرے جذبات کو سمجھ سکیں گے؟ اس لیے اس بات کو ادھر ختم کرتا ہوں اور ذرا آگے بڑھتا ہوں۔

باہر والے کمرے میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ کمرے کے فون کی بیل میں نے آف کی ہوئی تھی۔ کچھ لمحے بعد سرجی نے دروازہ کھولا اور اپنا سر اندر لائے۔ کہنے لگے۔ ''نسرین تو نہیں لگتی مگر کوئی لیڈی ہے جو آپ کا پوچھ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نام ہی پوچھ لیتے۔''

ذرا شرما کر بولے۔ ''خواتین سے ان کا نام پوچھنا معیوب سی بات ہے۔''

میں نہ چاہتے بھی اٹھ گیا اور فون کی بیل کو آن کیا اور ریسیور اٹھایا تو تمنا بھابی تھیں۔ پہلے پوچھا کہ انٹرویو کیسا رہا۔ میں نے کہا۔ ''بہت اعلیٰ، اتنا بہترین کہ بتا نہیں سکتا۔'' اتنا سنتے ہی وہ خفا ہو گئیں کہ مجھے بتا تو دیتے۔ میں نے صبح سے مصلہ پکڑا ہوا ہے۔ میری معذرت قبول کر کے کہنے لگیں۔ ''طارق بھی کہہ رہا ہے کہ جاب شروع کرنے سے پہلے نیویارک کا چکر لگا لوں کیونکہ جاب کے بعد نکلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''

بات شاید وہ ٹھیک کر رہی تھیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ جاب سے پہلے میں ضرور آپ لوگوں سے ملنے آؤں گا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک آٹھ سالہ شہروز اور دوسرا ایک سال سے بھی کم ارشیان۔ مجھے ان سے ملنے کا شوق تو تھا اور اصل کشش امریکا دیکھنے کی بھی تھی۔

سرجی میرے لیے چائے بنا لائے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک گزارش تھی جو میں سمجھ نہ سکا تھا۔ میں فون بند کر کے باہر لیونگ روم میں آیا تو کہنے لگے۔ ''ایک کہنا مانیں گے؟''

''کیا۔''

''باہر بہت برف پڑی ہے۔ آج دونوں بھائی مل کر کوئی سنومین بنائیں؟''

''ایک شرط پر، میں سنومین بناؤں گا اور آپ سنو وومین۔''

''میرے پاس وہ ہنر نہیں کہ میں وومین بناؤں۔'' سر

جی بولے۔ پھر مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ ان کی مونچھوں سے پھسل کر لبوں پر آگئی۔ کہنے لگے۔ ''آپ اپنے ہنر تو آزما ہی رہے ہیں، آج اپنے داؤ پیچ بھی آزما لیں۔ یہ کام میرے بس کا نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''سر جی! مجھے اکثر شک پڑتا ہے کہ آپ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔''

''قسم لے لو۔'' وہ کچھ اور کہتے کہ میں نے بات کاٹی۔

''مگر آپ جیسے میرے ایک دوست پاکستان میں ہیں اور ان کا نام شاہ جی ہے۔''

''مگر میں شاہ تو نہیں۔''

''شاہ نہیں بلکہ ڈبل شاہ ہیں۔''

کچھ دیر بعد ہم دونوں اپنے آپ کو لپیٹے باہر لان میں بچھی برف کو اکٹھا کر کے کچھ بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ برف چیڑ کے درختوں پر بھی اٹکی تھی اور کبھی کبھار ہم پر آ گرتی۔ پورے ماحول میں خاموشی تھی اور صرف سر جی کی چھلانگیں تھیں جو وہ برف پر مار رہے تھے۔ انہوں نے کسی خمار میں آ کر عورت کا مجسمہ برف سے بنایا۔ یقین کریں کہ اتنا فحش لگا کہ میں نے ایک ہی لات میں گرا دیا اور کہا۔ ''گو یہ کینیڈا ہے مگر فحاشی یہاں بھی کھلے عام شاید بری سمجھی جاتی ہے۔''

پھر وہ گرے ہوئے مجسمے پر اچھل کود کرنے لگے۔

سر جی تھکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ بمشکل انہیں گھسیٹ کر اندر اپارٹمنٹ میں لایا۔ کھانا وہ پہلے ہی بنا چکے تھے۔

اتنی دیر بیگار بھگتا تھا اس لیے بری طرح تھک گیا تھا۔ تھکن اتارنے کے لیے کارپٹ پر لیٹ گیا۔

ابھی میں لیٹا ہی تھا کہ شہباز کمرے میں داخل ہوا۔ اندر آتے ہی اس نے انٹرویو کی کامیابی پر مبارک باد دی۔ پھر سر جی کو دیکھا تو بولا۔ ''ان کی آنکھوں میں کچھ خمار اور کمینگی نظر آ رہی ہے، کہیں کچھ پی پلا تو نہیں آئے۔''

سر جی نے کئی بار لاحول پڑھا۔ پھر کچھ خفا ہوئے اور پوچھا۔ ''اس بات کا مطلب کیا تھا؟''

''مطلب یہ ہے کہ آنکھوں میں نرا سیاپا بھرا ہے۔''

سر جی جواب میں کچھ کہتے کہ دروازہ کھلا اور مفتی داخل ہوا اور اندر آتے ہی اس نے انٹرویو کی تفصیل پوچھی اور بہت خوش ہوا۔

دوسرے دن جاب سے آیا تو کہنے لگا کہ لورین بتلا رہی تھی کہ کل ہم نے بہت اچھے اور تجربہ کار ورکر کا انٹرویو کیا ہے اور وہ کہہ رہی تھی کہ چند ہی دنوں میں وہ جوائن بھی کرلے گا۔

میں پاکستان میں تھا تو طارق نے مفتی کے ساتھ میری رہائش کا انتظام کر کے مجھے بتا دیا تھا۔ ''مفتی کہہ رہا ہے کہ شاید میری کمپنی میں ندیم کی جاب بھی ہو جائے۔'' مجھے اس وقت ایک یقین سا ہو گیا تھا کہ ایسا ہی ہوگا اور آج ایسا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ یہ سب ایسے ایک ترتیب سے ہو رہا تھا کہ میں خود بھی ششدر ہو کر رہ گیا تھا۔

دوسرے دن صبح کین سینٹر جانا تھا جبکہ ہولڈنگ سینٹر میں کل جاب رات بارہ سے صبح آٹھ تک تھی۔ رات کی جاب بہت مشکل ہوتی ہے۔ خاص کر اس حالت میں کہ کرنے کو کچھ نہ ہو۔

کین سینٹر میں پہنچے تو سب کے پاس میرے لیے ایک ہی سوال تھا کہ انٹرویو کیسا ہوا۔ میں نے پہلے انٹرویو کی کامیابی کا بتایا تو سب خوش ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ نسرین نے مبارک باد دی اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ میں اس کے غیر متوقع رویے پر حیران تھا۔ البتہ نیک تمناؤں کا اظہار کر رہی تھی۔ اشوک ملا تو کہنے لگا۔ ''البتہ اور ہمارے سینٹر کو تمہاری جاب ملنے سے بہت خوشی ہوگی۔''

میں حیرانگی سے بولا۔ ''وہ کیوں؟''

بولا۔ ''ہم رپورٹ بھیجیں گے کہ ایک اسٹوڈنٹ کی یہاں انٹرویو کی تیاری کروائی گئی اور ٹریننگ کے دوران ہی اس کی جاب ہوگئی۔''

''تو اس سے کیا ہوگا؟'' میں مسلسل حیران تھا۔

''سینٹر کے فنڈز رکیں گے نہیں۔ اس سے حکومت پر ہمارا اچھا تاثر پڑے گا کہ یہاں وقت کا زیاں نہیں ہوتا۔'' پھر آنکھ دبا کر بولا۔ ''سمجھا کرو یہاں ہر جگہ پر کام کارکردگی پر چلتا ہے۔''

نسرین خفا تھی کہ میں نے فون کیا اور تم نے واپس کال بیک بھی نہیں کی۔ میں تو انٹرویو کا پوچھ رہی تھی۔ میں اس کی بات پر خاموش رہا۔ غلطی میری تھی کہ واپس فون نہ کیا۔ میں نے معذرت کی اور کہا۔ ''میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے کہ اس کوتاہی کی کوئی وجہ بھی بیان کروں اگر معاف کر دو گی تو میرے دل پر سے تمہاری اس ناراضگی کا بوجھ اتر جائے گا۔'' جو ردعمل اس نے دیا اس کی توقع میں نہ کر رہا تھا۔ وہ رونے لگی۔

اسے روتے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ اس لیے کہ اس کی یہ حرکت کسی کی نظروں میں آ گئی تو مفت کی بدنامی گلے میں

آجائے گی۔ بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔
شہباز تو اپارٹمنٹ میں رک گیا تھا کیونکہ اس پر آج پھر ڈپریشن سوار ہوگیا تھا مگر سرجی وقت گزاری کے لیے آگئے تھے اور ہر روز کی طرح آس پاس گھوم رہے تھے۔ انہوں نے نسرین کو روتے دیکھا تو دوڑے چلے آئے اور کہنے لگے۔ ''ننھی سی جان کو رلا دیا ناں۔''

ان کی اس بے موقع مداخلت مجھے اچھی نہ لگی۔ میں نے ذرا سا گھورا تو واپس چلے گئے۔ میں اب پریشان تھا کہ رو کیوں رہی ہے؟ کسی مشکل میں تو نہیں؟ میں نے پہلی بار اس کا ہاتھ پکڑا اور اشوک کے دفتر میں لے آیا۔ اشوک نے اسے آنسو بہاتے دیکھا تو دفتر کا دروازہ کھول دیا۔

اسے کرسی پر بٹھایا اور خود میز سے ٹک کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے آنسو پونچھ لیے تھے۔ کہنے لگی۔ ''کلاس شروع ہونے والی ہے، واپس چلتے ہیں۔''

''ایسے نہیں۔ پہلے بتاؤ کیا سب ٹھیک ہے ناں؟''
سر ہلایا۔ ''سب ٹھیک ہے۔''

''پھر رو کیوں رہی ہو؟'' میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کیا میرے فون نہ کرنے پر؟''

وہ میری جانب دیکھ کر بولی۔ ''نہیں! فون کرنے پر نہیں بلکہ اس پر کہ اب تم یہ سینٹر چھوڑ جاؤ گے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ تمہیں یہ جاب مل جائے مگر اس شہر میں صرف تم ہی میرے دوست ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جانے کے بعد واپس پلٹ کر ادھر دیکھو گے نہیں اور نہ کبھی یاد کرو گے۔ بس چند دن اور...... اور پھر تم بھی ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ گے۔''

اس کے ان الفاظوں پر میں اسے بیوقوف بنا سکتا تھا۔ اسے خواب دکھلا سکتا تھا۔ لوہا بھی گرم تھا، بس ایک چوٹ لگانی تھی مگر دماغ کی ہدایت تھی کہ ایسا کرنا بھی نہیں کیونکہ اگر یہ چوٹ لگا دی تو تاعمر اس کا درد خود سہنا ہوگا۔ اس کی گہری آنکھیں اور سرخ رنگت کسی کو بھی گھائل کر سکتی تھیں مگر دھوکا اور فریب کبھی کسی کو خوشی نہیں دے سکتے۔ میں ایک جدوجہد سے گزر رہا تھا۔ میں ایک شادی شدہ انسان تھا اور دو بیٹیوں کا باپ بھی تھا۔ کسی نئے پیار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ پیار کیا نہیں جاتا بلکہ ہو جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہوتا نہیں کیا جاتا ہے، خاص کر اس وقت جب آپ وقت کی چکی میں پس رہے ہوں اور کوئی آپ کا پیچھے انتظار بھی کر رہا ہو۔ نسرین معلوم نہیں مجھے کیا سمجھتی تھی اور میں اسے کیا سمجھ بیٹھا تھا مگر اب میری سمجھ میں جو کچھ آرہا تھا وہ ٹھیک نہ تھا۔ مجھے یہیں رکنا تھا۔ میں کوئی ایسا دلکش انسان بھی نہ تھا کہ لڑکیاں مجھ پر کھنچی چلی آئیں مگر یہ حالات کی ستائی ہوئی تھی اسی لیے پگھل رہی تھی۔ میں اس سے دور رہنے کے لیے جواز ڈھونڈنے لگا، اس کے باوجود دل کا ایک گوشہ نرمی اور گرمی سے موم کی طرح پگھلتا جارہا تھا۔ ایک عملیت پسند انسان کے بارے میں جتنی تھیوریاں میں نے گھڑی تھیں وہ اب شیشے کی طرح چٹختی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ دل کہتا کہ اتنی سرد مہری بھی اچھی نہیں۔ میں نے یہ سوچا کہ اس وسیع کائنات کے بے کراں حجم میں ہم دو حقیر ذروں کی مانند ایک لمحے کے لیے ٹکرائے، ذرا دیر کو ایک ہوئے اور پھر دوسرے لمحے تو فنا ہو ہی جائیں گے۔ میں اس زاویے پر سوچتا کہ چند دن کی رفاقت بنانے میں حرج ہی کیا ہے؟ کچھ لمحے اچھے گزار لوں۔ پھر شرمندہ ہوتا کہ یہ دھوکا ہے مگر پھر دوبارہ سے وہی سوچنے لگتا۔

میں نے اس کا مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور کچھ کہنے لگا مگر وہ اٹھی اور مجھ سے لپٹ کر دوبارہ سے رونے لگی۔ میں باقاعدہ گھبرا گیا۔ اسے چپ کرانے کے لیے منتیں کرنے لگا۔ زبردستی علیحدہ بھی نہ کرنا چاہتا تھا اور مجھے اس کا لپٹنا برا بھی نہ لگ رہا تھا، اسی لیے کچھ نہ سمجھ آنے پر اسے تھپکیاں دینے لگا۔

اتنے میں اشوک نے اندر جھانکا اور یہ سب دیکھ کر واپس چلا گیا۔ وہ خود ہی الگ ہوگئی۔ اس نے اپنے بیگ سے رومال نکالا اور اپنی آنکھیں صاف کیں اور بھیگی آنکھوں سے مسکرانے لگی۔ میں خود کسی عجیب سی کیفیت میں کھڑا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اتنے میں اشوک نے پھر کمرے میں جھانکا اور مجھ سے کہا۔ ''شہباز کا پیغام آیا ہے کہ ہیوسال میں ثمارا کو فون کرلوں۔''

اشوک کی بات سن کر جس نظروں سے نسرین نے مجھے دیکھا وہ میں آج تک نہ بھول سکا۔ کچھ شکایت تھی یا کوئی دکھ تھا جو ان آنکھوں میں ٹھہر گیا تھا۔ اشوک کا کہنا ایک پیغام تھا کہ کیمپ سینٹر سے میرے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا نقارہ بج چکا ہے۔

میں نے اشوک کے کمرے کا فون استعمال کیا۔ سلسلہ ملتے ہی ثمارا نے پوچھا۔ ''کل کیا تم انٹرویو کے لیے آسکتے ہو۔'' میں نے سہ پہر تین بجے کا کہا تو وہ راضی ہوگئی۔

مجھے آج رات ہولڈنگ سینٹر میں جاب کرنی تھی اور صبح واپس آنا تھا۔ میں کچھ دیر آرام کر کے انٹرویو پر جانا چاہتا تھا۔ فون

کر کے میں فارغ ہوا تو دیکھا کہ نسرین غائب ہے۔ اشوک نے بتایا کہ وہ سینٹر سے نکل گئی ہے شاید گھر چلی گئی ہے۔ اب میرا رکنا بھی محال تھا۔ سرجی کو بتائے بغیر میں بھی نکل پڑا واپس اپارٹمنٹ میں آیا اور اندر آ کر میٹرس پر گر پڑا۔ کافی دیر تک نم آنکھوں سے چھت کو تکتا رہا تھا اور تند ہوا ڈور وال کے شیشوں پر ایسے دستک دے رہی تھی جیسے کوئی ہولے سے پکار رہا ہو۔

میں اکیلا رہنا چاہتا تھا تاکہ کوئی میری تنہائی میں مخل نہ ہو۔ مجھے بچے یاد آرہے تھے۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا کہ انہیں یاد نہ کروں۔ نسرین کا معاملہ بیچ میں آیا تو میں اس کے خلوص اور اپنائیت سے متاثر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ملنے کا اشتیاق رہتا تھا مگر ایسا ہرگز نہ تھا کہ میں پچھلے رشتوں سے منہ موڑ لوں۔ آج جو ردِعمل اس نے دیا تو میں افسردہ تو ہوا مگر اپنے آپ سے خوف زدہ بھی ہو گیا تھا۔

بہت دیر تک میں اپنی سوچوں میں گم اپنے میٹرس پر کروٹیں بدلتا رہا اور پھر نہ جانے کب نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔ اٹھا اس وقت جب سرجی کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے جگانے کی خاطر ڈور وال کھول دی ٹھنڈی ہوا اندر آنے لگی تو دونوں بازو دروازے کے سامنے پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ غصے سے بولا۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”آپ نے پہلے اس ننھی جان کو رلایا اور پھر کہیں لے جا کر اس کو منانے کی کوشش کی۔“ وہ اب آنکھیں مٹکا مٹکا کر بات کر رہے تھے اور بے ہودگی سے مسکرا بھی رہے تھے۔

”اس دروازے کو بند کر دیجیے۔“ مجھے واقعی غصہ آرہا تھا۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا مگر ٹھنڈ ایک بار کمرے میں گھسی تو نکلنے میں گھنٹوں لیتی ہے۔ میں اٹھ کر لیونگ روم میں آگیا۔ شہباز کہیں گیا ہوا تھا۔ اب سرجی مجھ سے اگلوانا چاہتے تھے کہ آج سینٹر میں نسرین کے ساتھ کیا ہوا جو وہ آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے جھوٹ بولا۔ ”اس کے بیٹے کو بخار تھا، اسی لیے پریشانی میں وہ رو پڑی تھی۔“

”اگر وہ بیمار تھا تو سینٹر میں کون سا ڈاکٹر بیٹھا ہے جس سے دوائی لینے آئی تھی۔“ وہ مکمل جرح کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ”وہ میرے انٹرویو کا پتا کرنے آئی تھی اور پھر واپس چلی گئی۔“

”کوئی رشتہ تھا جو انٹرویو کا پتا کرنے آئی تھی۔“ وہ چھیڑنے پر تلے تھے۔ ”ماشاءاللہ روتے ہوئے بالکل شبنم لگ رہی تھی اور سسکیاں بھی ویسے ہی لے رہی تھی۔“

میں چونک کر پوچھنے لگا۔ ”کون شبنم؟“

”وہی فلموں والی۔“ جواب آیا۔

میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میرے سر میں درد کر دیا، اب چائے ہی پلا دو۔“

وہ اٹھے اور یہ کہتے کچن کی طرف بڑھ گئے۔ ”آئینہ فلم میں چائے تو شبنم نے بھی بنائی تھی۔“

☆......☆

رات گیارہ بجے میں ہولڈنگ سینٹر کی جاب کے لیے اپارٹمنٹ سے نکلا۔ یہ جاب رات بارہ بجے سے صبح آٹھ بجے تک تھی۔ رات کی جاب میں پہلے بھی کر چکا تھا اور میرے لیے بہت بورنگ تھی گو کہ کہیں آنا جانا نہ ہوتا تھا۔ نہ ملاقاتی آتے اور نہ قیدیوں کو لنچ روم یا باہر گراؤنڈ میں لے جانا پڑتا۔ وہ سب سوتے رہتے اور ہم سب اونگھتے رہتے۔

اس وقت بسیں بھی ویسے کم ہوتی ہیں۔ میں باہر نکلا تو برف کے ڈھیر پڑے تھے۔ منظر جم سا گیا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ گھروں کے مکین گھروں میں دبکے تھے اور میں اکیلا بس اسٹاپ پر ٹھٹھرتا کسی سواری کا انتظار کر رہا تھا جو مجھے ڈکسن اتار دے۔ جو لوگ گاڑیوں میں فراٹے بھرتے گزر رہے تھے وہ سب مجھے انتہائی خوش نصیب لگ رہے تھے۔ جو سفر میں بسوں میں ایک گھنٹے میں طے کرتا تھا، وہ اپنی گاڑی میں پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہ تھا۔

میں نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں لپیٹا تھا مگر ٹھنڈ پھر بھی جسم میں گھسی جا رہی تھی۔ میں شکر ادا کرتا کہ یہ سختیاں میں اکیلا جھیل رہا ہوں۔ کوئی مجھے اس ٹائم دیکھ لیتا تو اسے یقین نہ آتا کہ میں وہی ہوں جس نے اب تک اپنی حد تک آسائش کی زندگی گزاری ہے۔

ایک بس آئی اور مجھے اٹھا کر ڈکسن کے اسٹاپ پر اتار پھینکا۔

آج بیدی ہیڈ گارڈ تھا وہ میری بہت عزت کرنے لگا تھا۔ ہولڈنگ سینٹر میں مہیب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیدی دیکھتے ہی مجھے کہنے لگا۔ ”چاہو تو آج نیچے بیٹھ جاؤ۔“ نیچے سے مطلب یہ تھا کہ جہاں عورتوں کو رکھا جاتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ ”کسی عورت کو لائے ہیں؟“

آنکھ دبا کر کہنے لگا۔ ”نیچے جاؤ اور عیش کرو۔“

میں عیش کا مطلب یہ سمجھا کہ وہاں کوئی آنے جانے والا نہیں ہے اور نہ کوئی روک ٹوک۔ سب کو معلوم تھا کہ میں ہمیشہ

مطالعہ کرنے میں مصروف رہتا ہوں اور وہ جگہ کتاب پڑھنے یا کچھ لکھنے کے لیے سب سے موزوں ہے۔ آج رات کی شفٹ میں عظمت بھی تھا۔ وہ اوپر رہ گیا اور میں اپنا بیگ پکڑے نیچے آ بیٹھا۔ رجسٹر دیکھا تو ایک ہی عورت سامنے والے کمرے میں مقید تھی۔ مطلب یہ کہ میں اس پر نظر رکھوں ساتھ ہی گنتی بھی بیٹھے بیٹھے کرنی تھی۔

میں ویران اور بے آباد لابی میں ایک کمرے کے باہر کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ پاؤں میز پر تھے اور دونوں ہاتھوں کو سر کے پیچھے لے جا کر سر کو سہارا دے دیا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا۔ ڈائری ہر وقت میرے پاس رہتی تھی جذبات الفاظ کی شکل اختیار نہیں کر پا رہے تھے۔ نسرین نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ چاہتی کیا ہے اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں اس کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں۔

میں رشتوں سے جڑا تھا اور وہ کٹی پتنگ تھی۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں کوئی بری نیت نہیں رکھتا اور نہ وہ رکھتی ہے۔ وہ اپنے دکھ بانٹنا چاہتی ہے اور شاید میں اس کے درد سمیٹنا چاہتا ہوں مگر اس کا انجام کیا ہوگا؟ شاید وہی وہ ان دو حقیر ذروں کا جو کائنات کی عظیم وسعتوں میں ایک لمحے کے لیے آپس میں ٹکرا کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اس کی روتی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ کاجل گھل گیا ہو۔ میں نے اس سیاہ رنگ کو آنکھوں سے بہتے دیکھا تو یہ سوچ کر نرم پڑ گیا تھا کہ کون ہمیشہ یہاں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ کیوں نہ چند دن ہنس کر اس کے ساتھ گزار لوں۔ پھر سوچتا کہ کیا میں ایسے تعلق میں بندھ رہا ہوں جس میں نہ ملنے پر بے چینی ہو اور یہی کیفیت مجھے ڈراتی تھی۔ کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم ایسے ہی ہمیشہ ملتے رہیں۔ پہلے تو وہ یہی کہتی رہی تھی کہ مجھے کسی ایسے دوست کی تلاش ہے جو مجھے گائیڈ کر سکے مگر اب ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے ایک ایسے گائیڈ کی تلاش ہے جو گائیڈ سے زیادہ اس کا دوست ہو۔ میں ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں نے کتاب کھول لی اور پھر اپنے دماغ میں آئی سوچوں کو جھٹکنے کے لیے اس میں غرق ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

خواتین کے کمروں کے دروازے بند رہتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اندر کس قسم کی خاتون ہے اور کہاں سے لائی گئی ہے۔ مجھے اس سے کچھ سروکار بھی نہ تھا۔ اتنے میں اس کے

1882ء میں اپنے جیولس میرے نے تصویریں کھینچنے کے لیے Photographic gun ایجاد کی جس سے تصویر کشی میں مزید آسانی ہوگئی۔ 1887ء میں مشہور و معروف سائنسداں تھامس ایلوا ایڈیسن نے بھی متحرک تصاویر کے سلسلے میں تجربات شروع کیے اور قلیل عرصے میں ہی انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوگئی حتیٰ کہ 3 اکتوبر 1889ء کو نیوجرسی کے علاقے ویسٹ اورنج میں واقع اپنی تجربہ گاہ میں انہوں نے اپنے تجربے کا کامیاب مظاہرہ کیا اور اس کا نام انہوں نے کنیما ٹوگراف رکھا۔ انہی دنوں جب ایڈیسن متحرک تصاویر کے سلسلے میں نئے نئے تجربات کر رہے تھے۔ انگلستان میں بہت سے سائنسدانوں نے بھی اس میدان میں قدم رکھا۔ اس میں ولیم فریز گرین خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں انہوں نے 1889ء میں لندن کے مشہور ہائیڈ پارک کی متحرک تصاویر کھینچ کر لوگوں کو دکھائیں اور پھر 1890ء میں اپنے اس کیمرے کو پیٹنٹ کرایا اور اب دنیا کا بھی سب سے پرانا موی کیمرے کا پیٹنٹ ہے اگرچہ گرین نے یہ کیمرا ایجاد کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود بھی وہ اس سے روپیہ نہ کما سکے اور آخر معاشی بحران سے تنگ آکر انہوں نے ایک ہزار روپے میں اپنا کیمرا بیچ دیا۔ گرین کی زندگی پر مبنی فلم ''میجک باکس'' سے پتا چلتا ہے کہ اس کے آخری دن بہت تنگ دستی میں گزرے۔

ایڈیسن نے 1891ء میں متحرک تصاویر کھینچنے کے لیے ایک کیمرا بھی تیار کیا تھا لیکن اس سے کھینچی جانے والی تصاویر شیشے پر اتاری جاتی تھیں جس کی وجہ سے بہت وقت صرف ہوتا تھا اور کبھی کبھی وہ پلیٹیں ٹوٹ بھی جاتی تھیں۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے جارج ایسٹ مین نے (جو ایسٹ مین کلر کے موجد ہیں) شیشے کے بجائے سلولائیڈ پر تصاویر کھینچنے کا طریقہ اپنایا۔ اس کے ساتھ ہی ایڈیسن کے کیمرے میں کچھ نقائص دور کر کے سلولائیڈ پلیٹوں پر چھوٹی چھوٹی تصاویر بنانی شروع کردیں چونکہ ان تصویروں کو ایک وقت میں صرف ایک ہی فرد دیکھ سکتا تھا لہٰذا جون 1895ء میں تھامس آرمٹ نامی امریکی سائنسداں نے ایڈیسن اور فرانسیسی سائنسداں لومیر سے مختلف پروجیکٹر تیار کیا۔ اس پروجیکٹ کے

کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا تو ایک جھٹکے سے اپنی کرسی سے بے ساختہ کھڑا ہوگیا۔

پتلا سیاہ رنگ کا گاؤن پہنے ایک گلابی، سرخ اور سفید رنگت کی انتہائی خوبصورت لڑکی دروازے پر کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ تیکھے نقش انتہائی جاذب تھے۔ پتلی ناک اور سیاہ بال۔ نکلتا ہوا قد اور معلوم نہیں کیا کیا تھا جس کی وجہ سے میں کھڑا اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اتنی خوبصورتی پر صرف ایک پتلا اور سیاہ گاؤن پڑا تھا جو اسے ڈھانپنے کے لیے ناکافی تھا۔ وہ پہلے مسکرائی اور پھر ایک دل آویز مسکراہٹ مجھ پر ڈالی۔ میں سوچنے لگا یا اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے کہ دن میں نسرین اور رات میں یہ مہ جبین۔

مجھے میرے ایک دوست کی نصیحت یاد آگئی کہ اپنی جاب پر کبھی بھی کوئی بے ہودگی نہ کرنا بلکہ ایک وقار سے رہنا۔ میں اسی دوران اسی وقار کو اپنے پر لانے کی جدوجہد کرنے لگا۔

''میرے واش روم کا شاور ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ کیا آپ اسے ٹھیک کرسکتے ہیں؟'' اس کے لالیں لب ہلے اور مجھ تک آواز پہنچی۔

اس وقت کوئی پلمبر موجود نہ تھا۔ اسے صبح تک انتظار کرنا تھا اس لیے وہ شاور چیک کرنے میں خود چلا گیا مگر مجھے اس شاور میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ وہ باتھ روم کے دروازے پر کھڑی تھی۔ سیاہ بال کھلے ہوئے تھے اور میں اپنی نظریں اس سے بچا کر رکھ رہا تھا۔ وہ دروازے سے نہ ہٹی تو میں نے اسے آگے سے ہٹ جانے کا کہا تو ایک طرف ہوئی اور میں برآمدے میں اپنی کرسی پر یہ سوچتا ہوا آبیٹھا کہ رات کے تیسرے پہر اس کو شاور لینے کی ضرورت کیوں آپڑی ہے؟

میں کچھ ہی دیر بیٹھا تھا کہ وہ سیاہ ناگن پھر سے آنمودار ہوئی۔ کہنے لگی۔ ''نیند نہیں آرہی ہے۔ سوچا گرم پانی سے شاور کرلوں تو پھر آرام سے سوجاؤں گی۔'' پھر ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ ''شاور بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے۔'' اپنی بات اس نے ختم نہ کی۔ ''کیا میں دوسرے کمرے میں جا کر شاور لے سکتی ہوں۔''

میں نے بیدی کو فون کیا اور اس کی فرمائش بتائی تو وہ کہنے لگا۔ اکیلی نہیں جاسکتی۔

میں بیدی کے لہجے میں چھپی بات.... سمجھ گیا تھا۔ اس کالے گاؤن میں لپٹی گلابی لڑکی سے کہا۔ کہا۔ ''اس کی اجازت نہیں ہے اور تمہیں صبح ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

ذریعے بہت سے افراد پردے پر ان متحرک تصاویر کو دیکھ سکتے تھے۔ اس ایجاد کو ویٹا اسکوپ کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ تھامس ایرمٹ کی ایجاد سے ایڈیسن بے حد متاثر ہوئے اور پھر انہوں نے ایرمٹ کے ہی اصرار پر ایڈیسن ویٹا اسکوپ بنایا تھا۔ تھامس ایرمٹ کے علاوہ لندن کے پال نے بھی 1895ء میں پروجیکٹر بنایا اور 28 فروری 1896ء کو اس کا شاندار مظاہرہ کیا اور اس کا نام ''تھیٹروگراف'' رکھا۔

فرانس کے مشہور فوٹو گرافر لوئی لومیئر نے بھی اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی متحرک تصاویر کی ریل تیار کی۔ اس کامیابی پر اس کے بھائی آگسٹے لومیئر نے سوچا کہ کیوں نہ اس ریل کو دکھا کر پیسا کمایا جائے لہٰذا وہ پیرس آئے اور 28 دسمبر 1895ء کو کیفے کاپوسینے نامی ریستوران میں 120 افراد کے سامنے اس چھوٹی سی فلم The Sharge of the Dragons کی نمائش کی اور اس طرح فرانسیسی عوام پہلی بار سنیما سے محظوظ ہوئے۔ اس کے کچھ دنوں بعد 23 اپریل 1896ء کو نیویارک میں ایڈیسن نے 50 فٹ کی ریل عوام کو دکھائی جس نے اہل امریکا کو مسحور کر دیا۔ اس کامیابی پر ایڈیسن بہت خوش ہوئے۔ اب انہیں متحرک تصاویر کا مستقبل روشن دکھائی دینے لگا۔ لہٰذا مزید فلمیں بنانے کے لیے انہوں نے ایک فلم اسٹوڈیو تعمیر کیا جس کی دیواریں سیاہ کاغذ سے ڈھکی تھیں۔ یہ اسٹوڈیو چاروں طرف گھومتا رہتا تھا تاکہ اداکاروں کے چہرے سورج کی روشنی کی طرف رکھے جاسکیں اس اسٹوڈیو میں 1903ء میں ایڈیسن نے ''ایک امریکی زندگی'' نامی فلم تیار کی۔ اسی سال انگلستان میں ''چارلس کی زندگی اور موت'' نامی فلم تیار کی گئی۔ 1904ء میں امریکا میں ایڈون ایس پورٹر نے ''دی گریٹ ٹرین رابری'' فلم تیار کی۔ اس کو فلمی تاریخ میں پہلی اسٹوری فلم مانا جاتا ہے اس سے ایک سال بعد انگلستان میں ایک ہزار فٹ لمبی ریسکیوڈبائی ریور نامی فلم تیار کی گئی جسے انگلستان کی پہلی فیچر فلم کہا جاتا ہے۔

اقتباس: پاکستان فلم ڈائریکٹری۔ از یاسین گوریجہ
مرسلہ: ارباز خان۔ پشاور

پھر اس نے دل آویز نشیلی نگاہیں مجھ پر ڈالیں۔ میں بے تاثر کھڑا رہا۔ اس نے اپنے گاؤن کو ذرا سا کھول کر پھر سے کسا تو میں نے اپنی کتاب اٹھائی اور کرسی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

پڑھنے والے یقین کریں کہ اس دوران، میں متعدد بار آیتہ الکرسی پڑھ کر خود پر پھونک چکا تھا۔ میرے جواب نہ دینے پر وہ وہیں کھڑی رہی اب میں اسے ایک حسین لڑکی نہیں سمجھ رہا تھا جو دعوت نظارہ دے رہی تھی بلکہ میں ایک عام قیدی کی طرح اس سے پیش آرہا تھا۔

حسب عادت میں نے اپنی ڈائری کے ورق بھرنے کے لیے سوالات پوچھے تو بتانے لگی۔ اس کا تعلق یوکرائن سے ہے۔ کسی چکر میں کینیڈا آ پہنچی۔ اس کا کیس امیگریشن میں تھا۔ اسی دوران اسے کام کرنے کی اجازت نہ تھی مگر وہ آفت کی پرکالا باز نہ آئی اور کسی اسٹرپ کلب میں ڈانسر بن گئی۔ آج اسٹیج پر اپنے کرتب دکھا رہی تھی کہ پولیس کا چھاپا پڑا اور وہ اسے کلب سے پکڑ کر سیدھا یہاں لے آئے۔ اسی لیے اس نے کلب والا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اب میں بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ بات کرنا چاہتی تھی۔ میں کہنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ تمہارے سونے کا وقت ہے اسی لیے اس وقت تم جاگ نہیں سکتیں۔

اس نے مجھے لبھانے کے لیے مختلف طریقے اپنائے، اپنے جلوے دکھلائے۔ ہر قسم کی مسکراہٹ پھینکی مگر میں سنجیدگی سے بیٹھا رہا۔ وہ باز نہ آرہی تھی تو میں تنگ ہونے لگا۔ بیدی کو فون کیا اور خود اوپر چلا گیا۔ اس نے عظمت کو نیچے بھیج دیا۔

اوپر پہنچا تو بیدی پوچھنے لگا۔ ''کیا نیچے دل نہیں لگا؟''

میں نے کہا۔ ''لگا تا ہی نہیں تھا اگر لگا تا ہوتا تو آج صبح ہی لگا چکا ہوتا۔''

میرا اشارہ نسرین کی طرف تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھا اور نہ ہی میں نے اسے کچھ سمجھانا تھا۔

میں اپنی پوسٹ پر آبیٹھا، جہاں اب میں سکون سے شہاب نامہ پڑھ رہا تھا۔ صبح آٹھ بجے شفٹ ختم ہوتی اور مجھے ایک بجے ہیموسال ثمارا کے پاس انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ میں کچھ آرام کر کے جانا چاہتا تھا۔

آٹھ بجے شفٹ ختم ہوئی۔ اپارٹمنٹ پہنچ کر بارہ بجے کا الارم لگایا اور وردی سمیت بستر میں گھس گیا۔ شہباز اور سرجی کین سینٹر گئے تھے اور مفتی لیونگ روم میں اپنے میٹرس پر سویا ہوا تھا۔

دو تین دن بعد میں ہولڈنگ سینٹر جاب کے لیے پہنچا تو

سب گارڈ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ اتنے میں نیچے سے سپروائزر کا میرے لیے فون آیا۔ سب گارڈ پھر سے کن انکھیوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ اب میں باقاعدہ پریشان ہونے لگا تھا۔ نیچے آفس میں گیا تو دیکن ہٹ کے ہیڈ آفس سے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ مجھے بٹھایا گیا اور پھر سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ سوال یوکرائن کی کلب ڈانسر سے متعلق تھے کہ اس نے مجھ سے کیا کیا پوچھا، کیا سروس مانگی، میرے کیا جوابات تھے اور اسی قسم کے دوسرے سوالات ہو رہے تھے۔

میں حیران و پریشان بیٹھا ان سوالات کے جوابات دے رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ میں ایک آدھ گھنٹا یہ پیشی بھگتا کر اوپر آ گیا۔ وہاں گرنام سنگھ بھی تھا۔ میں نے کشیدہ صورتِ حال کو تو آتے ہی بھانپ لیا تھا جب سب گارڈ کن انکھیوں اور شک بھری نظروں سے میری جانب دیکھ کر کھسر پھسر کر رہے تھے۔

گرنام نے بتایا کہ تم نے رات کو نیچے ڈیوٹی کی اور پھر تم نے بیدی سے اپنی پوسٹ تبدیل کرنے کی درخواست کی تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوا۔

میں نے پوچھا۔ ''آخر ہوا کیا ہے؟''

گرنام بتانے لگا۔ ''عظمت کو نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔ اس رات تمہارے اوپر آنے کے بعد عظمت نیچے اس پوسٹ پر گیا تو اس کلب ڈانسر نے اس پر الزام لگایا کہ مجھے شاور لینا تھا۔ عظمت مجھے دوسرے کمرے کے باتھ روم میں لے آیا اور دست درازی کرنے لگا۔ میں نے روکا تو کہنے لگا کہ یہاں سے نکلنے میں تمہاری مدد بھی کروں گا۔ اس لڑکی نے صبح شکایت لگا دی۔ عظمت کو اسی وقت نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس لڑکی نے میرے بارے میں یہ بیان دیا تھا کہ اس نے میری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور میرے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتا رہا تھا۔

خیر یہ بات تو درست نہ تھی کہ اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا مگر یہ صحیح تھا کہ اس کے جال میں پھنس نہ سکا تھا۔ جو کچھ اپنے پر پڑھ کر پھونکتا رہا تھا، وہی مجھے بچا گیا تھا ورنہ اس لڑکی نے مجھے بھی لبھانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ عظمت نے دست درازی نہیں کی ہوگی۔ بس یہ کیا ہوگا کہ اسے دوسرے کمرے کے واش روم میں جانے کی اجازت دے دی ہوگی۔ اب اس لڑکی نے جنسی ہراسمنٹ (Hrasmant Sexual) کا کیس امیگریشن کینیڈا پر

کر دیا تھا۔ اسے یہی موقع چاہیے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اسے کینیڈا سے ڈی پورٹ کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اب وہ حکومت سے ہرجانہ بھی لیتی اور ڈٹ کر کلبوں میں ڈانس بھی کرتی بھلے اسے کچھ پہننا پڑے یا نہیں۔ مجھے یہ بات کھٹک رہی تھی کہ اس نے اپنے کمرے میں شاور کیوں نہ لیا تو معلوم یہ ہوا کہ واقعی اس کمرے کا شاور خراب تھا۔ وہ شاور لیتے ہوئے دعوتِ نظارہ دینا چاہتی تھی۔

میں نے شروع میں بتایا تھا کہ آگے چل کر بتاؤں گا کہ عظمت کے ساتھ کیا عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ واقعہ یہ تھا۔ نام اس کا کچھ اور تھا میں نے اس کی عزت رکھنے کے لیے ہی اسے عظمت کا جعلی نام دیا ہے۔ اندر کی بات میرا رب بہتر جانتا ہے مگر میں اپنے طور پر عظمت کو بے گناہ سمجھتا ہوں۔

الارم بارہ بجے جاگ اٹھا اور میں بھی اٹھ بیٹھا۔ جلدی سے تیار ہوا۔ مفتی کے دیے ہوئے کپڑے زیبِ تن کیے۔ مفتی نے بھی ایک بجے ہیوسال جاب پر پہنچنا تھا۔ ہم نے ساتھ ناشتا کیا۔ مفتی نے کہا کہ آج صرف وہ تم سے ریفرنس مانگے گی۔ پھر ان ریفرنس پر فون کر کے تمہاری رپورٹ لے گی اور اگر سب ٹھیک ہوا تو پھر جاب کی آفر کریں گے۔

آج سورج کی روشنی تو تھی مگر حرارت نہ تھی۔ ہیوسال کی دوسری عمارت جو ایک بڑے پارکنگ لاٹ کے دوسرے کونے پر تھی، وہاں تمارا کا دفتر تھا۔ قدرے فربہ کالے بلاؤز اور اسکرٹ میں ملبوس تمارا مجھے رات والی کلب ڈانسر لگ رہی تھی۔ تمارا میں گریس اور کلب ڈانسر میں خوبصورتی زیادہ تھی۔

مجھ سے اس طرح گرم جوشی سے ہاتھ ملایا کہ میں سہم گیا کہ اگلے لمحے کو مجھے بھینچ ہی نہ لے مگر اس نے مجھے بڑی عزت سے اپنے آفس میں بٹھایا اور پھر میز کے پار بیٹھ کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں اپنے آپ کو چغد سمجھ رہا تھا کہ وہ کہیں سے بھی تو بات شروع کرے۔ پھر وہ لائن پر آ گئی۔ اطلاع دی کہ سپروائزر مجھے منتخب کر چکے ہیں۔ ایک دو بار مبارک باد دی۔ مجھ سے ریفرنس مانگے۔ ایک میں نے الزبتھ کا دیا اور دوسرا طارق کا دیا جو نیو یارک میں تھا۔ وہ کچھ اور پوچھتی رہی جس میں کینیڈا کا کلچر، ٹیم ورک، میری اچھائیاں اور خامیاں کیا ہیں۔ یہ باتیں مجھے الزبتھ نے رٹا دی تھیں اور نسرین نے بھی بڑی مدد کی تھی۔ میں فر فر اپنے بارے میں بولنے لگا۔ خامیاں بھی ایسی تھیں کہ جو میری نظر میں تو خرابیاں تھیں مگر کمپنی کے لیے اچھائیاں ہی تھیں۔ یعنی کہ جب کام وقت پر پورا نہ ہو تو میں بے چین ہو

جاتا ہوں۔ میں اپنے ساتھ والے ورکر کی شکایت بھی لگا لیتا ہوں جب اس کے کام سے کمپنی کا نقصان ہو رہا ہو۔ بہرحال ثمارا کے انٹرویو نے مجھے قطعاً پریشان نہ کیا، کیونکہ ہم دونوں کو معلوم تھا کہ یہ ایک خانہ پری ہے۔ اصل کام ہو چکا ہے اور میرے نزدیک اللہ کی طرف سے بندش نہ آئے تو یہ جاب میری ہی ہوگی۔

ثمارا نے جس طریقے سے میرا استقبال کیا تھا، اس سے زیادہ بھرپور انداز میں مجھے رخصت کیا۔

میں خوش و خرم اپارٹمنٹ پہنچا تو سرجی اور شہباز کیئر سینٹر سے واپس آ چکے تھے۔ سرجی ملتے ہی بولے۔ ''نسرین کی آنکھیں ماشاء اللہ آج سوجی ہوئی تھیں، جیسے رات بھر روتی رہی ہو اور آنکھوں سے بجلی سی کوند رہی تھی۔''

مجھے معلوم تھا کہ سرجی مجھے بتانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ''مایا کی آنکھیں کیسی لگ رہی تھیں؟''

کہنے لگے۔ ''اس کو تو شہباز کے پیار نے تباہ کر دیا ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی جان دے دے گی۔''

اتنے میں شہباز واش روم سے گنگناتا ہوا نکلا۔ سرجی بھی وہی گانا اس کے ساتھ مل کر گنگنانے لگے۔ شہباز چپ ہو گیا اور غصے سے سرجی کو دیکھنے لگا۔ پھر مجھ سے ان کی شکایت کرتے ہوئے بولا۔ ''اب یہ مجھے مایا کے قریب اکیلے بھٹکنے بھی نہیں دیتے۔ جب بھی جاتا ہوں، یہ پہلے سے وہاں کھڑے مسکرا رہے ہوتے ہیں۔ میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ایک خوشی زندگی میں ملی اور وہ بھی انہیں چبھ رہی ہے۔''

میں نے سرجی سے پوچھا۔ ''یہ آپ شہباز پر اتنا ظلم کیوں ڈھا رہے ہیں۔'' میں نے دراصل سرجی کو نسرین سے ہٹا کر مایا کی طرف موڑ دیا تھا۔

سرجی بولے۔ ''جب سے یہاں کے سخت قوانین کے بارے میں بتا گیا ہے تو مجھے شہباز کی سخت فکر لگی رہتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ کیوں۔''

وہ کہنے لگے کہ جب بھی یہ مایا کے قریب حریص نظروں سے کھڑا ہوتا ہے تو مجھے اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کی نظریں مایا کے برگر پر ہیں یا مایا پر بس یہی ڈر رہتا ہے کہ کہیں مایا پر جھپٹ ہی نہ پڑے۔'' پھر سرجی منتی کے اس تکیے کا وار نہ سہہ سکے جو شہباز کے ہاتھوں سے اڑتا ہوا آیا تھا اور سرجی تکیے سمیت ڈور وال کے شیشے سے جا لگے تھے اور ساتھ ہی اپارٹمنٹ 103، شہباز کی پنجابی میں ثقیل قسم کی گالیاں سہنے لگا اور میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس دی تھیں اور سرجی لاچارگی سے وہی تکیہ اٹھائے ان کو بجتی گالیوں کو تولتے اور ان کے مطلب تلاش کر رہے تھے۔

میں نے طارق کو فون کر کے بتایا کہ تمہارا ریفرنس دیا ہے اور تمہیں کوئی کال آئے تو مجھے ضرور اطلاع دے۔ اس نے دوبارہ مجھ سے کہا کہ جوائن کرنے سے پہلے نیویارک ضرور آنا، جب ایک بار جاب میں پھنس گئے تو سالوں نہیں آسکو گے۔

نیویارک اور امریکا کے خواب دیکھتے ہوئے تو میں کینیڈا آبسا تھا۔ سب ان جاننے والوں سے مل چکا تھا جو امریکا ہو آئے تھے۔ ان سے وہاں کے قصے سنتا، ایک تخیل بناتا اور اس نئی دنیا میں کھو جاتا تھا۔ یہی سوچتا تھا کہ یہ نئی دنیا ہماری دنیا سے بہت مختلف ہوگی۔ کبھی گمان ہوتا کہ یہ لوگ اس سیارے پر بستے ہی نہیں ہیں۔ اگر یہیں کہیں بستے ہوتے تو کچھ تو ہم ان کی طرح ہوتے یا وہ ہماری طرح۔ ہم ایک دوسرے سے کیا، ہر چیز میں جدا تھے۔

کینیڈا آ کر امریکا دیکھنے کے شوق میں وہ شدت نہ رہی تھی جو پاکستان میں ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی کوئی چنگاری بھڑک رہی تھی کیونکہ کینیڈا میں جو بھی ملتا یہی کہتا۔ ''امریکا تو امریکا ہے۔''

دوسرے دن کیئر سینٹر ہمیشہ کی طرح ٹھٹھرتے ہوئے پہنچے۔ کیئر سینٹر کی روٹین اور جاب کو ہم ایڈجسٹ کر لیتے تھے۔ جہاں دونوں متصادم ہوتے وہاں جاب کی اہمیت زیادہ ہوتی کیونکہ ایک دن کی جاب کا مطلب ایک ہفتے کا حقہ پانی تھا۔ میں پچھلے کئی دن لگاتار جاب کر چکا تھا اور میرے دونوں ساتھی ایک ہفتہ کام کر کے اپنے مہینے کا خرچا اکٹھا کر چکے تھے۔ باقی جاب کی کمائی بچت تھی اور اب یہ فکر نہ تھی کہ پاکستان سے لائے ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ میں تو ایک کامیاب ہوتا ہوا انٹرویو بھی دے چکا تھا جس کی تنخواہ میری ہولڈنگ سینٹر سے دوگنا تھا اور اوقات کار بھی لگے بندھے تھے۔ مجھے سیکیورٹی کی جاب کی طرح ہر روز فون نہ کرنا پڑتا۔ یہ سو سال کی جاب ایک مستقل نوعیت کی تھی۔ بچوں کو بھی اسپانسر کر چکا تھا اور اسی لیے میرا ذہنی دباؤ اور گھٹن ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اسی کیفیت میں ہم آج کیئر سینٹر پہنچے تو سب سے زیادہ میں چہک رہا تھا۔ اس لیے کہ غیب کا علم صرف خدا کو ہے اگر وقت سے پہلے حالات کا علم انسان کو ہونے لگے تو پتا نہیں انسان کتنی پریشانیوں میں گھر جائے۔

(جاری ہے)

# ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

میرے باپ کو پھانسی دینے کا ڈیتھ وارنٹ جاری کیا جا چکا تھا۔

وہ پچھلے پانچ سال سے جیل میں تھا، خطرناک مجرموں کو سزائے موت دینے کا قانون بحال ہوا تھا تو اس کی لپیٹ میں میرا باپ بھی آ گیا تھا۔ ورنہ ایک اُمید تھی کہ کبھی نہ کبھی تو میرا باپ جیل کی سلاخوں سے باہر ہو گا۔ اور اس کے لیے ہم اپنی سی مقدور بھر کوشش بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اب تو ان کی رہائی کی امید بھی قوی نظر آنے لگی تھی، بہ قول ایڈوکیٹ راجا رحیم اور ان کی اسسٹنٹ زتیرہ فاطمہ کے۔ ہاں ایک اور شخصیت بھی تھی جسے میں اہم سمجھتا تھا، وہ تھی انور شاہ کی۔ یہ میرے باپ کا دوست تھا۔ ایسا ویسا دوست نہ تھا، جگری دوست تھا، بہت پرانا۔ اتنا پرانا کہ اس کے ڈانڈے بچپن سے جا ملتے تھے۔ ہم اسے چاچا انور شاہ کہتے تھے۔ میرے باپ کی طرح وہ بھی یہ کہتا تھا۔ احمد حسین بے گناہ ہے۔ اس نے رفعت خانم کا قتل نہیں کیا۔ لیکن بدقسمتی سے سارے شواہد میرے باپ کے خلاف تھے۔ تین سال اس پر ایک ملزم کی حیثیت سے قتل کا یہ کیس چلتا رہا تھا۔ صحت جرم سے انکاری ہونے اور رحم کی اپیلوں کے باعث بھی یہ کیس التوا میں پڑا رہا تھا۔ مگر پھر رانا بشیر کے اثر و رسوخ اور دباؤ کے باعث بالآخر اسے پھانسی کی سزا ہو گئی۔ لیکن پھر۔ سزائے موت کالعدم قرار دیے جانے کی وجہ سے یہ مزید دو سال لٹکا رہا۔ پھر ملک میں ایک ناخوشگوار واقعے کے باعث۔ قتل کے خطرناک مجرموں کو دوبارہ پھانسی دینے کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کی لپیٹ میں میرا باپ بھی آ گیا۔ پانچ دن بعد میرے باپ کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ گویا گھن کے ساتھ گیہوں پسنے لگا تھا۔

آپ ذرا اس بات کا تصور کریں۔ ایک بے گناہ کو ملنے والی پھانسی۔ پر خود میرے باپ کی کیا حالت ہو گی؟ اور سب سے بڑھ کر اس کے کنبے پر کیا بیت رہی ہو گی؟ میں، میری ماں، میرا چھوٹا بھائی اور بہن، ہم سب رانا بشیر کے ہاں بھی گئے۔ میری ماں نے اس کے آگے اپنی میلی چیکٹ چوٹی پھیلا دی، میری چھوٹی بہن عاصمہ نے رو رو کر رانا بشیر کے آگے ہاتھ جوڑ کے فریاد کر ڈالی۔ میں اور میرا بھائی فہیم، رانا بشیر کے پیروں پہ گر گئے۔ مگر اس سنگ دل انسان کے سر پر جوں تک نہ رینگی اسے رحم نہ آیا۔ اس نے اپنے نوکروں سے کہہ کر دھکے دے کر ہمیں اپنی کوٹھی سے بے عزت کر کے نکلوا دیا۔

☆☆☆

اس روز جیل انتظامیہ نے ابا سے ہماری آخری ملاقات کروائی تھی۔ چاچا انور شاہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان کی عمر پچاس پچپن کے درمیان رہی ہو گی۔ جسم بھاری، رنگ سانولا اور قد درمیانہ تھا۔ بھاری جثہ ہونے کے باعث وہ ٹھگنے ہی نظر آتے تھے۔ طبیعت کے سادہ اور شفیق انسان تھے۔ وہ ہمیشہ شلوار قمیص میں ہوتے اور بائیں کاندھے پر ایک رومال نما کپڑا ڈالے رکھتے تھے۔ وہ ہنوز تجرد کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ لاری اڈے میں منشی تھے اور اسٹارٹر بھی۔

یہ سہ پہر تین بجے کا وقت تھا۔

جیل انتظامیہ نے ہمیں دو ٹولیوں میں بانٹ کر باری باری ملنے کی اجازت دی تھی، مگر چاچا انور شاہ نے کسی کی مٹھی گرم کر کے ہم سب کو ابا سے ایک ساتھ ہی ملوانے کا بندوبست کرا دیا تھا۔

ابا کو ایک الگ کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ یہ کال کوٹھڑی تھی۔ اس کا ماحول دیکھ کر ہی ہم دہل گئے تھے۔ دن میں بھی اس کی مختصر گہرائیوں میں بہت تاریکی کا راج تھا اور اسی تاریکی سے ابا آہستہ آہستہ ابھر کر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ میں غور سے ابا کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ یہ وہی مہربان اور شفیق چہرہ تھا۔ جس نے اپنی خواہشات کو مار کے ہماری پرورش کی تھی اور جس نے ایک کنبے کا بوجھ اپنے پُر مشقت کاندھوں پر اٹھا کر ہماری زندگیوں کا بار ہلکا کیا تھا اور ہمیں ہر طرح سے راحت پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ آج یہ چہرہ کس قدر مایوس، افسردہ اور خوف زدہ سا دکھائی دیتا تھا۔ جانتا تھا میں ابا کے چہرے کا یہ خوف اپنے لیے نہیں ہمارے لیے تھا۔ کہ ان کے بعد ہمارا کیا بنے گا؟

ابا کے سلاخ دار دروازے کے قریب آنے کی دیر تھی کہ دفعتاً ہی۔ سنسان راہداری میں سسکیاں گونج اٹھیں۔ یہ عاصمہ اور امی جان کی آہیں تھیں۔ ماں نے سلاخوں کے ساتھ اپنا سر لگا دیا۔ اور عاصمہ اپنی پیشانی ابا کی ان انگلیوں سے رگڑنے لگی، جنہوں نے دروازے کی سلاخوں کو تھامے رکھا تھا۔ میں اور بھائی فہیم نے اپنا ایک ایک ہاتھ اندر ڈال کر ابا کے ساتھ لگنے کی اپنی سی کوشش چاہی تھی اور پھر ہم بھی رو پڑے۔

بے شک ہم غریب تھے، اور ایک اوسط درجے کی

زندگی کی لکیر سے بھی ذرا نیچے ہی کی بسر کر رہے تھے۔ مگر اس میں راحت تھی، سکون اور خوشیاں تھیں۔ اور وہ سب کچھ ہی تو تھا، جو ایک حلال اور محنت کی روزی کی کمائی میں اللہ اپنی برکتوں کے وسیلے ایسی دولت سے نواز دیتا ہے، جو بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں والوں تک کو بھی شاید نصیب نہ ہوتی ہوں۔

ابا ایک شریف النفس اور کاری انسان تھے۔ محنت کرتے تھے اور بہت محنت کرتے تھے۔ اپنے لیے کچھ نہیں بناتے مگر ہمیں کسی شے کی کوئی کمی نہیں آنے دیتے تھے۔ ایسا مہربان، شفیق اور ایثار پیشہ باپ۔ ہم سے بچھڑنے والا تھا۔ اور وہ بھی کیسے۔ ایک بے گناہ کی صورت۔ پھانسی چڑھنے والا تھا۔

ہم سب رو پڑے تھے۔ چاچا انور شاہ ایک طرف خاموش اور سر جھکائے کھڑا تھا اور بار بار اپنے کاندھے پہ دھرے رومال نما کپڑے سے اپنے آنسو پونچھ لیتا تھا۔

''میں اب سے تھوڑی دیر پہلے تک بہت دکھی اور پریشان تھا۔'' معاً ہماری آہوں اور سسکیوں کے درمیان ابا کی ڈبڈباتی ہوئی آواز ابھری۔ ''مگر اب نہیں ہوں۔ شاید اس لیے کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ جو خدا کو منظور۔ ہاں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ میری بدقسمتی کہ میں دنیا کو اپنی بے گناہی کا یقین تو نہ دلا سکا اور میں ان کی عدالت میں ایک مجرم کی حیثیت سے تو پھانسی چڑھ رہا ہوں مگر میرا ضمیر تو مطمئن ہے کہ میں اپنے رب کی بارگاہ میں ایک مجرم ایک قاتل کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ ایک فریادی کی حیثیت سے پیش ہونے والا ہوں۔ اسی لیے میرے بچو! تم بھی غم نہ کرو اور میرے لیے بس دعا کرو۔''

ابا کے ان درد بھرے اور جگر پاش الفاظ نے جیسے ہم سب کو ہی تڑپا کے رکھ دیا۔ اور ایسے میں جب میں کچھ کہنے والا ہی تھا تو ابا نے فوراً سلاخوں سے اپنا ایک ہاتھ باہر نکال کر میرا شانہ پکڑ لیا۔

''نعمان بیٹا! اب تمہارے کاندھوں پر تمہاری ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا بوجھ آن پڑا ہے مگر میں تمہیں ایک اور ذمے داری بھی آج سونپنا چاہتا ہوں لیکن پہلے وعدہ کرو مجھ سے تم اس ذمے داری سے پہلوتہی نہیں کرو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں ابا۔ میں اپنی کسی بھی ذمے داری سے چشم پوشی نہیں کروں گا۔'' میری آواز بھرا گئی۔ میں اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ تب ابا بولے۔ ''نومی بیٹے! میں بہرحال ایک کلنک اپنے اندر ضرور لے کر اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں کہ میرے کنبے کی پیشانی پہ ایک داغ لگ جائے گا لیکن نومی بیٹے! مجھ سے وعدہ کرو۔ تم یہ داغ دھونے کی کوشش کرو گے۔ تم دنیا کے سامنے میری بے گناہی ثابت کرو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ دنیا والے تمہیں میرے حوالے سے ایک خونی قاتل کے خاندان سے تعلق رکھنے والا کہیں۔ کیوں کہ اس داغ کے ساتھ دنیا کہیں تم لوگوں کا بھی جینا نہ دوبھر کر دے۔ یہی کلنک مرنے کے بعد بھی مجھے بے چین ہی رکھے گی۔''

اتنا کہہ کر ابا نے میرے شانے سے اپنا ہاتھ ہٹا دیا اور فوراً دوسری طرف اپنا منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ وہ اپنے آنسو چھپا رہے تھے۔

میں ان کی بات سمجھ گیا تھا۔ اور جب میں نے بھی عقب سے ابا کے کاندھے پر اپنا لرزتا ہاتھ رکھ دیا۔ ابا پلٹے۔ ان کی آنکھیں نمناک تھیں۔ وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں ان کی طرف۔ باپ بیٹے کی نگاہیں چار ہو رہی تھیں۔ عجیب بات تھی کہ میرے منہ سے ایک لفظ بھی برآمد نہیں ہو سکا تھا۔ مگر شاید ایک باپ اپنے جوان بیٹے کی آنکھوں سے مترشح ہوتے، جوش، تڑپ اور ایک مقصد کی بھڑکتی آگ کو ایک تپش کی صورت میں۔ اچھی طرح۔ بہت اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ اور مجھے ابا کے چہرے کے تاثرات میں اپنے جوش و تحرک کا عکس بھی صاف نظر آ رہا تھا۔

اسی وقت فرش پر ایک سنتری نے زور سے ڈنڈا بجا کر ملاقات ختم ہونے کا اعلان کیا تھا اور پھر چاچا انور شاہ آگے بڑھا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کے گلے میں اپنے بازو ڈال لیے تھے اور میں نے دیکھا۔ بہت غور سے دیکھا تھا کہ سلاخوں کے بیچ کے خلا سے دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی پیشانیاں جوڑ لی تھیں اور بہت قریب سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھے۔ تب ہی ابا کی لرزتی سی آواز ابھری تھی۔

''انور شاہ! بچپن سے اب تک مجھے تیری بے غرض و بے لوث دوستی پر فخر رہا ہے۔ اور میری امید بھری نظریں اب تیرا چہرہ تک رہی ہیں۔ تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔'' وہ ابا کا اشارہ سمجھ کر بہ یک ترنت بولا۔

''احمد حسین! میرے یار! مجھے معاف کر دینا۔ میں بھی تو تیرے لیے۔ کچھ نہ کر پایا۔'' وہ گلوگیر ہو گیا۔ ''مگر تو

نا امید کی بات کیوں کرتا ہے رے۔! تجھے یقین کر لینا چاہیے کہ بھائی اور بچوں کے سر پر تو میں نے اسی روز اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا جب ان سلاخوں کے پیچھے تو نے ایک رات گزاری تھی۔''

اس کی بات سن کر میرا باپ پورے اطمینان سے مسکرایا تھا۔

اسی وقت ملاقات ختم ہوگئی۔ اور ہم گھر آگئے۔

☆☆☆

وہ بڑی سنگین رات تھی، یوں لگا تھا جیسے باپ کے ساتھ صبح چھ بجے ہم سب پھانسی پر چڑھنے والے ہوں۔ اس کے ساتھ ہم بھی سولی پر لٹکے ہوئے تھے۔ وہ بڑی خوفناک اور برستی رات تھی۔ اس رات بڑا تیز طوفان آیا تھا۔ ماں کہتی تھی، جب کسی بے گناہ کو پھانسی لگنے والی ہو تو ایسا ہی طوفان آیا کرتا ہے۔ وہ رات بھی بڑی تھرا دینے والی تھی۔

امی جان باوضو ہو کر ساری رات مصلے پر بیٹھی رہیں۔ عاصمہ بہنا اور بھائی فہیم میرے ساتھ بیٹھے سسکتے رہے۔ ہمیں جیل انتظامیہ نے صبح ساڑھے چھ بجے لاش لے جانے کا کہہ رکھا تھا۔

وہاں ایک فلاحی ادارے کی ایمبولینس پہلے سے موجود تھی۔

وقت ایک بری گھڑی کی طرح ہمارے سروں پہ مسلط ہو گیا تھا اور کسی بھاری سل کی طرح ہمیں پیستا، دھیرے دھیرے ہی سرک رہا تھا۔ ایسے میں درد بھرے دل سے بس دعا ایک حسرت بن کر نکلی تھی کہ کاش! کوئی معجزہ ہو جائے، کچھ ایسا ہو جائے کہ ابا کی پھانسی دینے کے احکامات منسوخ کر دیے جائیں، آخر کو ایسا ہوتا رہا ہے، عین وقت پر پھانسی دینے کے آرڈر منسوخ یا مؤخر کر دیے جاتے ہیں پھر اب ایسا کیوں نہیں ہو رہا؟

''بھائی جان! یہ کیسا قانون ہے؟ ابا بے گناہ ہے، اور انہیں پھانسی۔''

میرے قریب بیٹھا چھوٹا بھائی مارے رقت و کرب کے اپنا جملہ پورا نہ کر سکا تھا اور اسی وقت باہر مختصر سے صحن میں بجلی کا زوردار کڑاکا ہوا تھا۔ بہنا عاصمہ دہل کر میرے قریب ہو گئی۔ اس بے چاری کا پورا وجود خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ گھر میں وہ ابا کی لاڈلی تھی۔ سب کی پیاری بھی۔ میں اور فہیم اسے پیار سے بہنا کہتے تھے۔ غم میں اس کی آنکھیں بھی سوجھ گئی تھیں۔ ابا کی کیا حالت تھی، وہ بیان سے باہر تھی۔ اگر وہ تسبیح اور مصلہ نہ سنبھالتیں تو شاید اپنے آپے میں ہی نہ رہتیں۔

''کاش! ابا واقعی قاتل ہوتے۔ انہوں نے واقعی قتل جیسا جرم کیا ہوتا، پھر شاید ہمیں اتنے عذاب اور کرب سے نہ گزرنا پڑتا۔ کاش!'' فہیم نے اس بار بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ عاصمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور چلا کر بولی:

''بھیا! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ پاگل ہو گئے ہو؟'' وہ آخر میں سسک پڑی۔

فہیم مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ میری طرح زمانے کی تلخیوں کا اسے بھی ادراک تھا۔ آج کا زمانہ فاسٹ تھا۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ، چوبیس گھنٹے چلنے والے نجی چینلز کی بھرمار اور اسمارٹ فونز کی بجلیاں۔ ان سب نے آج کی نسل کو وقت سے پہلے جوان ہی نہیں بلکہ کچھ اوراک شعور بھی عطا کیا تھا۔ اور زمانہ، جو پہلے چیونٹی کی رفتار سے اپنے پرت در پرت چہرے کو دکھاتا تھا، اب کسی تیزی سے چلتے فلمی منظر کی طرح دکھاتا جاتا ہے۔

لہٰذا میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا۔ میں اسی لیے چپ رہا۔

میری بھینچی بھینچی اور دم بہ خود سی خاموشی پر عاصمہ نے مجھے جھنجوڑا۔

''بھائی جان! بھائی کیسی باتیں کر رہا ہے۔ آپ اسے ڈانٹتے نہیں؟''

ہم تینوں بہن بھائی اس چھوٹے سے کمرے میں قریب قریب بچھی دو چارپائیوں کو چھوڑ کر ایک چارپائی کو کھڑا کر کے دیوار سے لگائے، زمین پر بچھی دری پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ میں بھی جیسے بے حس سا بیٹھا تھا۔ بہنا کی بات پر میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ فہیم اتنا کہہ کر اپنے سکیڑے ہوئے گھٹنوں میں دوبارہ سر دیے رو پڑا۔ میری طرح، کچھ تو بہنا بھی گئی تھی، اسی لیے وہ اس کی طرف سرک کر اس کے سر پہ دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگی اور اپنے سوتی دوپٹے سے آنکھوں کے بہتے آنسو پونچھنے لگی۔

''بھائی جان! کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟'' بہنا نے اپنی سسکیوں کے درمیان میری طرف تکتے ہوئے ہولے سے کہا۔ میرے لیے بہن کا یہ ایک بڑا کرب ناک سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ اب کوئی معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔

ہم نے ابا کو بچانے کے لیے اپنی سی کوششیں کر کے دیکھ لی تھیں۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ سنگ دل اور بے حس رانا بشیر کے آگے ہاتھ جوڑ کر اس کے پاؤں پکڑ کر اپنی عزت نفس تک مجروح کروالی تھی۔ کیا کچھ نہیں کیا تھا ابا کو بے گناہ پھانسی سے بچانے کے لیے۔ قابل وکیل تک کی مدد لی گئی۔ جو جمع پونجی تھی، ان مقدمات اور اپیلوں میں لگ گئی۔

امی کا زیور تک بک گیا جو انہوں نے عاصمہ کی شادی کے لیے بچا رکھا تھا، اب بس ایک یہ چھوٹا سا دو کمروں والا گھر ہی بچا تھا۔ شکر تھا کہ یہ اپنا ہی تھا۔ اس کا بھی سودا ہو رہا تھا کہ۔ چاچا انور شاہ نے ہمیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ آفرین ہے اس آدمی پر جو اب تک میرے ابا سے اپنی بچپن کی دوستی نبھا رہا تھا۔ اس مشکل اور مصیبت کی گھڑی میں اس نے ہمیں بالکل تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہمارے ہر دکھ سکھ میں ساتھ تھا۔ پیسا اس نے بھی خرچ کیا تھا، اور اب تک کر رہا تھا۔ مقدمے بازیوں کی بھاگ دوڑ میں بھی شروع ہی سے وہ ہمارے ساتھ تھا۔ خود وہ بھی کوئی اتنی بڑی حیثیت کا مالک نہ تھا۔

دکان بند ہونے کے بعد اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ لاری اڈے پر لگا دیا تھا۔ وہاں میں پرچی کلرک بھی تھا اور بسوں اور باربردار ٹرکوں پر لادے جانے والے سامانوں (گڈز) کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ وہ بھی ملیر میں ہی رہتا تھا۔

ٹھیک چھ بجے ہمیں یوں لگا جیسے ہمارے گلے میں پھندا اٹک گیا ہو۔ عاصمہ دوپٹے میں اپنا روتا ہوا منہ دیے وہاں سے گئی تو اچانک ان کی تھرا دینے والی چیخ سنائی دی۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ دوسرے کمرے میں ماں جی مصلے پر بے سدھ پڑی تھیں۔ ٹھیک چھ بجے ان کی بھی روح پرواز کر چکی تھی۔

ابا کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ ایک گھر سے بیک وقت دو جنازے اٹھے تھے اور محلے میں کہرام مچ گیا تھا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیات ہو رہی تھی۔ ایک آنسو تک میری آنکھ سے نہیں ٹپکا تھا۔ بہنا نے کہا۔ ''بھائی! کیا آپ کی آنکھیں خراب ہو گئی ہیں؟'' میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میری آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔

کفن دفن تک چاچا انور شاہ ہمارے ساتھ رہا تھا۔ اسے بھی میری طرح ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

☆☆☆

مجھے شاید اپنی پوری داستانِ دل.... سنانے کے لیے چند برس پیچھے جانا پڑے گا۔

ہم متوسط زندگی کی لکیر سے تھوڑا نیچے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مگر اس میں خوشی اور راحت تھی۔ سکون تھا۔

کراچی کے علاقے ملیر میں ہمارا چھوٹا دو کمروں والا گھر تھا۔ میرے باپ کی تالے چابی بنانے کی دکان تھی، دکان بھی کیا تھی، بس، ایک ٹھڑے پر اوزاروں کا ایک زنگ آلودہ باکس۔ ایک سالخوردہ سا بورڈ، بڑا سا ایک چوبی فریم، جس میں بھانت بھانت کی تالے چابیاں لٹکی جھولتی رہتی تھیں۔ حیرت کی بات تھی ابا نے کبھی مجھے یا فہیم کو اس دھندے میں نہیں ڈالا تھا، میں اور فہیم اسکول جاتے تھے۔ بس۔ واجبی سی ہی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور ہمارا باپ خوش تھا کہ اس کے دونوں بیٹے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ آدمی تو نئے دور کا تھا مگر پتا نہیں اسے یہ اندازہ کیوں نہیں تھا کہ بھلا ایک غریب کا بچہ کتنا پڑھ لے گا۔ بہت ہوا میٹرک۔ یا پھر بارہ جماعتیں۔ یہاں تو کتنی بڑی بڑی ڈگری والے جوتیاں چٹخاتے پھر رہے تھے۔ ایک دو کے ساتھ تو میری بھی دوستی تھی۔ وہ ماسٹرز تھے، ان کا حال دیکھ کر ہی میرا بھی پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ ان میں ایک سکندر تھا دوسرا عارف، ایک نے پان سگریٹ کا چھوٹا سا کیبن لگا لیا تھا دوسرا رکشا چلانے لگا تھا۔

میرا دل تو پڑھائی سے کھٹا تھا مگر میرے چھوٹے بھائی فہیم کو شوق تھا، وہ دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔

میرا قد و قامت اپنے باپ پر گیا تھا۔ میں اسی کی طرح دبلا پتلا اور لمبا تھا۔ مگر کاٹھ کا مضبوط نظر آتا تھا۔ باپ ہی کی طرح سادہ فطرت اور کم گو تھا۔ بلا وجہ کسی سے نہیں الجھتا تھا۔ نارمل طبیعت کا مگر خاموش طبع انسان تھا۔ ہاں، اللہ نے شاید مجھے سوچنے والا ذہن ضرور عطا کیا تھا۔ کوئی بھی میرا چہرہ دیکھتا تو یہی سمجھتا تھا کہ میں کسی گہری سوچ میں غلطاں ہوں۔ غرضیکہ اپنی ذات میں، میں ایک کھویا کھویا سا لڑکا تھا۔

سنا تھا کہ سوچنے اور خاموش طبع ذہن رکھنے والا انسان کبھی مار نہیں کھاتا۔

البتہ میرے مقابلے میں میرے چھوٹے بھائی فہیم احمد ذرا جوشیلا اور جذباتی سا تھا۔

میں نے باپ کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کی تو اس نے منع کر دیا۔ انہوں نے اپنی مدد کے لیے ایک ''چھوٹو ٹائپ'' کا لڑکا رکھا ہوا تھا۔ چاچا انور شاہ اکثر

میرے باپ کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ بلکہ گھر بھی آتا تھا۔ اسی نے ہی مجھے سمجھایا تھا کہ پڑھائی صرف نوکری کرنے کے لیے نہیں کی جاتی، زمانے کے ساتھ چلنا ہے تو پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ تمہاری سوچ غلط ہے، مجھے اس کی بات اچھی لگی۔ میں نے چاروناچار پڑھائی میں دل لگانا شروع کردیا۔ مگر بات نہ بنی۔ میں آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ دوستیاں بھی تھیں۔ میری عمر بائیس برس تھی۔

ایک دن کوئی خاتون لمبی سی کار میں میرے باپ کی دکان پر آئی تھی۔ میں اس وقت ابا کے لیے گھر سے کھانے کا ٹفن کیریر لایا تھا، وہ عورت میرے باپ کو اپنے ساتھ لے گئی۔

اس کی کوٹھی کا کوئی قیمتی تالا خراب ہوگیا تھا یا لاک ہو گیا تھا اور چابی اندر بھول گئی تھی۔

اگلے دن یہی خاتون قتل ہوگئی اور چوری کی بھی واردات ہوئی اور الزام میرے باپ پر آیا۔ اس کا شوہر رانا بشیر ایک بڑے اثر ورسوخ والا آدمی تھا۔ وہ ایک کاروباری آدمی تھا۔ اور اس کا بڑا خاندان تھا۔

باپ کی پھانسی کے بعد۔ گھر کی ساری ذمے داری مجھ پر آن پڑی تھی۔ سوچتا تھا کہ میں کیا کروں؟ باپ نے اپنا ہنر مجھے سکھایا نہیں تھا کہ دکان ہی سنبھال لیتا۔ تب تک پھر بھی میں جیسے تیسے انٹر اور بی اے کر ہی چکا تھا۔ کلرکی کے لیے تو کیا یہاں چپڑاسی بھرتی ہونے کے لیے بھی تگڑی سفارش یا پیسا چلتا تھا، جو دونوں ہی میرے پاس نہیں تھے۔

میں شاید بھول رہا ہوں۔ مجھ پر صرف گھر کی ذمے داری ہی نہیں آن پڑی تھی۔ ایک اور اہم ذمے داری بھی تھی۔ جسے پوری کیے بنا میں چین سے سو بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنے خاندان کی پیشانی سے یہ داغ دھونا تھا۔ میرے ذہن میں سوال ابھرتا تھا کہ یہ معما حل ہونا چاہیے۔ اگر میرا باپ بے گناہ تھا تو پھر رفعت خانم کا قتل کس نے کیا تھا؟

ساتھ ہی مجھے اپنی کم مائیگی کا بھی احساس تھا۔ ظاہر ہے رانا بشیر کے مقابلے میں بھلا میری کیا حیثیت تھی؟ آجا کر ایک ایڈووکیٹ راجا رحیم تھے، وہ بھی کیا کرسکتے تھے؟ انہیں اپنی فیس سے غرض تھی وہ بھی چاچا انور شاہ ہی اسے دیتے تھے۔ ہمارے پاس تو اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ دکان تو کب کی بند ہوچکی تھی۔

اس اندوہناک واقعے کے بعد۔ میرے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی دیکھنے میں آئی۔

اب پتا نہیں یہ ایک خود ساختہ تبدیلی تھی یا پھر وقت کی چال اور زمانے کا ڈھب تھا کہ میں نے چند دن بعد ہی اپنے اندر سے غم اور دکھ کا یہ غبار نکال پھینکا۔ اور کم از کم میرے لیے یہ ضروری بھی تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اب باپ کے بعد میں ہی اپنے گھر کا سربراہ تھا اور مجھے چاہے اپنے اوپر ایک خول ہی چڑھالینا مقصود سہی، لیکن ایسا کرنا لازمی بھی تھا، کیوں کہ میرا اس طرح غم زدہ اور خاموش رہنا، میرے اپنوں کو مایوسی کی طرف دھکیلنے کے ہی مترادف ہوتا۔

بہنا عاصمہ اور فہیم اب میری ذمے داری تھے۔ میں اگر افسردہ رہتا تو ان دونوں پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے۔ مجھے اپنا غم اپنا جوش اور اپنے اندر کی آگ کو خود تک ہی محدود رکھنا تھا۔

تب پھر میں نے رفتہ رفتہ گھر میں چھائی ہوئی حزن و ملال کی فضا کو کاٹنا شروع کردیا۔

فہیم احمد کو اپنی پڑھائی جاری رکھنے کا کہا، جبکہ عاصمہ بھی کالج جانے لگی تھی، وہ میٹرک کرچکی تھی اور اب اس نے فرسٹ ائیر پری میڈیکل میں داخلہ لیا تھا۔ فہیم کی طرح اسے بھی پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ جبکہ فہیم کو کمپیوٹر انجینئرنگ کے شعبے میں دلچسپی تھی۔ وہ سافٹ ویئر انجینئرنگ میں ڈپلوما کورس کر رہا تھا۔ اور خود میں بھی پرائیوٹ طور پر واجبی سی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اگر چہ گھر کی گاڑی چلانے میں عاصمہ اور فہیم بھی میرا ساتھ دیے ہوئے تھے۔ عاصمہ شام کو گھر پہ ہی محلے کے چند بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی اور فہیم بھی شام میں ایک کوئی چھوٹی موٹی جاب کرنے لگا تھا۔

اب ہم تینوں بہن بھائی ہی ایک دوسرے کا سب کچھ تھے۔ دونوں میرا احترام کرتے اور میرے فرماں بردار تھے۔

رانا بشیر کے ساتھ ابھی میرا معاملہ "انتقام" لینے کی حد سے دور تھا، جب تک کہ اس حقیقت سے پردہ نہیں ہٹ جاتا کہ آیا آخر رفعت خانم کو کس نے قتل کیا تھا؟ اور کیوں میرے بے گناہ باپ کو اس سازش میں پھنسایا گیا تھا، اور کیا واقعی یہ ایک سازش ہی تھی یا محض غلط فہمی؟

درپردہ کیا راز تھا، یہی نقطہ ہر وقت میرے ذہن میں کلبلاتا ضرور رہتا تھا کہ جب تک اصل سازشی لوگوں (اگر

یہ واقعی ایک سوچی سمجھی سازش تھی) کا کھوج نہیں لگایا جائے گا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

وقت کو بے رحم کہنے والے درحقیقت خود بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ وقت تو مہربان ہوتا ہے کہ گزرتا جاتا ہے اور غم ہلکے کرتا جاتا ہے، مگر دنیا والے زخم ہرا کیے رکھتے ہیں۔ ابا کی پھانسی کے حوالے سے محلے میں ہمیں بھی اب رفتہ رفتہ طعن وتشنیع کا نشانہ بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ میں تو ایک صلح جو انسان تھا، درگزر کر جاتا، مگر چھوٹے بھائی فہیم میں برداشت کا مادہ کم ہی تھا۔

باہر آتے جاتے لوگ ہمیں چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے۔ کچھ لوگوں کو میں نے خوف زدہ بھی دیکھا، جیسے ہم کوئی بدمعاش ہوں۔

تاہم سب ہی ایسے نہیں تھے۔ جو میرے باپ کی شرافت اور دیانت داری کے قائل تھے۔ وہ اب بھی ہماری عزت کرتے تھے۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ محلے میں شر پسند لوگوں کا ایک ٹولہ ہمارے خلاف سرگرم ہو گیا تھا۔ اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب میں لاری اڈے سے شام میں گھر کی طرف چلا۔

وہ جون کی ایک حبس زدہ شام تھی۔ میں منی بس میں ہی آتا جاتا تھا۔ اسٹاپ سے گھر تک مجھے اچھا خاصا پیدل سفر کرنا پڑتا تھا۔ اسی لیے خاصا تھکا ہوتا تھا۔ مگر یہ وقت محلے میں خاصی چہل پہل کا ہوتا تھا۔ میں خاموشی سے گھر کی طرف چلا جارہا تھا کہ اچانک ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''ہاں بھئی! کیا کہتے ہو پھر؟''

میں رک گیا۔ تخاطب اچانک ہی میرے قریب آگیا تھا۔ وہ ارشاد تھا۔ محلے میں ارشاد مٹن کے نام سے شہرت رکھتا تھا۔ بلکہ یہ شہرت اسے اپنے ڈھابہ نما ہوٹل سے ملی تھی۔ جہاں کی تنوری روٹیاں اور مٹن کڑاہی زیادہ مشہور تھی۔ ایک اوسط درجے کی غریبانہ زندگی گزارنے والے محلے میں بکرے کے مہنگے گوشت کی اور وہ بھی پکی پکائی عیاشی سستے داموں فروخت کرنا، اسے شہرت نہ دیتا تو کیا دیتا؟ لوگ وہیں بیٹھ کر کھاتے بھی تھے اور گھروں کو پارسل کروا کے لے بھی جاتے تھے۔

محلے میں سب سے زیادہ رش اسی کے ہوٹل پر ہوتا تھا اور بھی ہوٹل تھے۔ جو بعد میں نہ چل سکے تھے۔ محلے کے لچھوں بیچ اس ہوٹل کو بھی اس لیے برداشت کیا جارہا تھا کہ اس کی شہرت گھروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور پھر ارشاد مٹن ایک چرب زبان اور چالاک انسان بھی تھا۔ اپنے اخلاق اور اطوار سے اس نے محلے میں اچھی عزت بنا رکھی تھی۔ محلہ کمیٹی کی بزرگ شخصیت حاجی کریم بخش سے بھی اس نے اچھے خاصے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔

حاجی کریم بخش ایک باریش انسان تھے اور محلے میں انہیں بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

''ارے۔ ارشاد بھائی! آپ کیسے ہیں؟'' میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

مجھے اس کا اس طرح تخاطب کرنے کا انداز پسند تو نہیں آیا تھا، (اور میں اس کے اس انداز کی وجہ بھی جانتا تھا) پھر بھی میں نے اس کے ساتھ خوش اخلاقی کا ہی مظاہرہ کیا تھا۔

ارشاد مٹن ایک سیاہ رنگت کا چالیس پینتالیس سالہ چالاک اور مغرور سا شخص تھا۔ قد کا ٹھگنا اور موٹا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں تو دولتیوں والی کم ظرفی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس نے شلوار قمیص کے ساتھ واسکٹ پہن رکھی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم بتاؤ۔ یہ گھر کب فروخت کر رہے ہو؟'' اس کا لہجہ ابھی تک رعونت آمیز اور اکھڑا ہوا تھا۔ اس نے میرے گھر کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔ مجھے اس کی بات پر حیرانی اور پھر غصہ آیا۔ جانتا تھا میں یہ کس بات اور کس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ لہٰذا غصہ دکھانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ یہ منافقوں کی دنیا تھی دل میں بغض رکھ کر چہرے پہ مسکراہٹ کا خنجر لے کر قتل کرنے والی دنیا۔

''آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم یہ گھر فروخت کر رہے ہیں۔ ارشاد مٹن والا صاحب؟''

میں نے اس کی طرف دیکھ کر اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ اثنائے راہ۔ گھر کا دروازہ کھلا اور فہیم باہر نکلا۔ ہمارے دروازے کے قریب کھڑے ہونے کے باعث وہ ہماری آوازیں سن کر ہی باہر نکلا تھا۔

ارشاد مٹن نے بس ایک ہی نگاہ فہیم پر ڈالی تھی پھر میری طرف نخوت سے دیکھ کر بولا۔ ''تو اور اب ایسی صورتِ حال میں یہ نہیں کرو گے تو اور کیا کرو گے تم لوگ؟''

''کیا ہو گیا بھئی؟ کیسی صورتِ حال؟ اور آپ کو کیا تکلیف ہے ہمارے گھر سے؟'' فہیم جو کہ میری طرح اس کی

بات کا مطلب سمجھ گیا تھا، اپنے مزاج کے عین، اس سے تیز لہجے میں بولا تھا۔

ارشاد مٹن نے فہیم کو بڑی خرانٹ نظروں سے گھورا تھا پھر میری طرف دیکھ کر اسی لہجے میں زہریلے طنز سے بولا۔

''چھوٹے میاں کو شاید ابھی تک آنے والے کا بھاؤ نہیں معلوم ہوا۔ تم تو اب گھر کے بڑے ہو۔ کیا تم بھی نہیں جانتے کہ پورا محلہ تم لوگوں کو کیسی نگاہ سے دیکھتا ہے؟ یہ تو شکر کرو میں نے ہی تمہیں پوچھ لیا۔ ورنہ تو ایسے حالات میں لوگ اپنا گھر ہی خالی چھوڑ جاتے ہیں۔''

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ اس کی لغو بیانی پر فہیم کا چہرہ تپنے لگا تھا مگر میں نے فوراً معاملہ فہمی کے انداز میں ارشاد مٹن سے کہا۔ ''دیکھو بھائی! آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، ہم نہ یہ گھر فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ ہی یہاں سے جا رہے ہیں۔''

''سوچ لو میاں! تمہارے باپ کی پھانسی کے بعد اب اس محلے میں تم لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں بچی ہے۔ غیرت اسی میں ہی ہے کہ چپ چپاتے یہ گھر مجھے بیچ کر چلتی گلی سے نکل لو۔ ڈیڑھ لاکھ دے دوں گا اس گھر کے، یہ بھی بہت ہیں۔ تم لوگوں کے حالات کی وجہ سے اس گھر کی ویلیو بھی کم ہی ہوگئی ہے۔ کوئی بھی زیادہ قیمت نہیں دے گا۔''

اسی وقت میرے قریب کھڑا فہیم آپے سے باہر ہو گیا اور آگے بڑھ کر اس نے بدطینت ارشاد مٹن کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور غصے سے تنک کر بولا۔

''اب اگر تم ہمارے گھر کے دروازے پر نظر بھی آئے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

مارے ذلت اور طیش کے ارشاد مٹن والا کی آنکھوں کی جیسے پتلیاں چڑھ گئیں۔ میں نے یک دم آگے بڑھ کر فہیم کے ہاتھ سے ارشاد مٹن کا گریبان چھڑایا تو وہ اپنے کرتے کے کالر کو درست کرتے ہوئے اور بڑی کینہ توز نظروں سے ہم دونوں کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔ ''اب تو گئے تم لوگ۔ اس گھر سے بھی اور ڈیڑھ لاکھ کی رقم سے بھی۔ دیکھ لوں گا۔''

وہ یہ تہدید کر کے چلتا بنا۔ فہیم ایک بار پھر غصے سے اکھڑنے لگا اور اس کے پیچھے لپکا۔ میں نے اسے روک لیا۔

اسی وقت عاصمہ پریشان اور ہراساں سی دروازے پر ابھری۔ میں ان دونوں کو لیے اندر آ گیا۔

''بھائی جان! ایسا نہیں چلے گا، ہمیں ان کا منہ توڑنا ہوگا۔ آخر کب تک ہم یہ سب سہیں گے؟'' فہیم بولا۔ اس کے لہجے سے اب تندہی کے ساتھ دکھ کی آمیزش بھی شامل ہو گئی تھی۔ عاصمہ بھی ہمارے قریب افسردہ سی کھڑی تھی۔

میں نے فہیم سے کہا۔ ''ایسا ہی چلے گا۔ میرے چھوٹے بھائی!''

وہ میرے عجیب سے لہجے پر قدرے چونک کر میری طرف تکنے لگا۔ مگر بولا کچھ نہیں تھا۔ تب پھر میں نے اس کے کاندھے کو محبت سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو فہیم! محلے میں تم نے گٹر بنے تو دیکھیں ہوں گے۔ آنے جانے والے لوگ اس سے بچ کر گزرتے ہیں۔ لیکن اگر تم گٹر کے اندر ڈنڈا گھماؤ گے تو اس کا تعفن ختم ہونے کی بجائے وہ اور ابھرے گا۔ ہمارے معاشرے میں بھی جگہ جگہ ایسے گٹر بنے ہوئے ہیں اور ہمیں ان میں ڈنڈا گھمانے کی بجائے بچ کر آگے نکل جانا چاہیے۔ اگر تم یہاں ہر ایک سے اسی طرح الجھتے رہو گے تو خود تمہارا اپنا نقصان ہوگا۔ باقی کتوں کا کام تو ہوتا ہی بھونکنا ہے۔''

''لیکن بھائی جان! یہ آخر کب تک بھونکتے رہیں گے؟ اور ہم کب تک سنتے رہیں گے؟''

فہیم میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''آج تو بات یہاں تک آ گئی ہے کہ لوگوں نے ہمیں اپنے ہی گھر سے بھی بے دخل کرنے کا کہہ دیا۔ جیسے یہ ان کی باپ کی ملکیت ہو۔ کیا ہم ان کا کھاتے ہیں؟'' اس کا ابال کم نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کی طرف بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے نرم مسکراہٹ سے کہا۔

''ہاں! اس پر سوچا جا سکتا ہے۔ اور مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ محلے میں ہمارے خلاف شرانگیزی یہی ارشاد مٹن والا ... پھیلا رہا ہے اور آج میں اس کا مقصد بھی جان گیا ہوں کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اگر میں بھی غصہ دکھاتا تو ہم کبھی یہ بات نہیں جان سکتے تھے کہ اس شرانگیزی کی اصل وجہ وہ نہیں ہے جو ہم پر باور کرائی جا رہی ہے۔ بلکہ یہ شیطان ارشاد مٹن ہمارے خلاف ایسے حالات پیدا کر کے ہمارا گھر کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارا گھر کاروباری لحاظ سے اس کے لیے بہترین ہے۔''

''کچھ بھی ہو۔ ہمیں اس رذیل کو سخت جواب دینا چاہیے۔ تاکہ وہ دوبارہ ایسی جرأت ہی نہ کرے۔'' فہیم

بولا۔ میں اسے جو نقطہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اس پر ڈٹا رہا اور آگے بولا۔
"سخت جواب سے اگر تمہاری مراد ہاتھا پائی ہے تو اس میں سراسر اسی شرپسند کا ہی فائدہ ہوگا۔ ابھی تو وہ یک طرفہ ہی لوگوں کو ہمارے خلاف اکسانے اور ورغلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ضروری نہیں لوگ اس کی باتوں پر کان بھی دھرتے ہوں۔ مگر ہاتھا پائی سے ہماری پوزیشن محلے میں خراب ہو جائے گی۔ یہ ارشاد منن بہت مکار آدمی ہے اور بے جیسی معصومانہ مگر مکار چال چل رہا ہے۔ خود کو ستی ساوتری ثابت کرنے کے لیے یہ تم سے مار بھی کھانا پسند کرے گا۔ مگر پھر کیا ہوگا؟ وہ مار کھا کے اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو جائے گا اور تم۔"
"آپ کا کیا خیال ہے۔ بھائی جان! یہاں جو لوگ ہمیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنا رہے ہیں وہ ہم سے مذاقاً ایسا کر رہے ہیں؟" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔
کبھی کبھی مجھ سے باتیں کرتے ہوئے فہیم کا لہجہ بھی تلخ ہونے لگتا تھا۔ ہماری عمروں میں بھی تو صرف ایک دو سال کا ہی فرق تھا۔ میں نے اس بار اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے اس سے کہا۔ "دیکھو بھائی! وہ لوگ بھی اسی کے ہی آدمی ہیں اور دانستہ ایسا کر رہے ہیں۔"
"آپ کو کیسے پتا؟"
"تم کیا سمجھ رہے ہو فہیم! کہ مجھے کچھ معلوم نہیں؟ میں بس گھر سے اڈے تک اور اڈے سے گھر تک اپنی پہنچ رکھتا ہوں؟" میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "مجھے سب پتا ہے۔ آنکھیں میں بھی کھلی رکھتا ہوں۔ محلے میں ابو کی بھی عزت کرتے تھے۔ ہمارا گھرانہ غریب سہی مگر اس کا شرفاء میں شمار ہوتا ہے۔ یہ سارا گند ارشاد منن پھیلا رہا ہے۔ آج اگر میں بھی تمہاری طرح اس کو غصہ دکھاتا تو اس کا مقصد کبھی عیاں نہیں ہوتا۔ اب تم دیکھنا میں۔ اس کی گولی اسی پر ہی آزماؤں گا۔"
"بھائی جان ٹھیک کہہ رہے ہیں فہیم! ہمیں اپنے مسائل سوچ سمجھ کر اور ٹھنڈے دماغ سے حل کرنا ہوں گے۔ گرم مزاجی، ہمارے مسائل میں اضافے کا ہی باعث بنے گی۔" قریب کھڑی عاصمہ نے بھی میری تائید کی تو فہیم نے اپنا سر جھکا کر ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔ میں نے بے اختیار محبت سے اپنے دونوں بازوؤں میں فہیم اور عاصمہ کو بھر لیا اور خود سے لگاتے ہوئے بولا۔ "تم دونوں میرے ہوتے ہوئے کسی بات کی فکر نہ کرو اور صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ میں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہوئی ہیں اور تم پر میں ایک ذرا آنچ بھی نہ آنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔" اور دونوں کے لبوں سے "بھائی جان" کے الفاظ یک بیک ادا ہوئے تھے۔

☆☆☆

مجھے خود پر تیس مار خاں یا پھنے خاں کا دعویٰ نہیں تھا۔ مگر شروع ہی سے حساس طبیعت اور سوچ و غور کرنے کی عادت نے میرے اندر اتنی قوت تو ضرور پیدا کر دی تھی کہ میں زمانے کے چلن اور وقت کی چال کو سمجھنے اور اس کے مطابق خود کو ڈھال کر آگے بڑھنے کی سکت اپنے اندر ضرور رکھتا تھا۔ دنیا کی منافقت کو بھی سمجھتا تھا اور مکاری کو بھی۔ کب کیا کرنا چاہیے، کس وقت کون سا قدم اٹھانا چاہیے۔ اس کا میں بہ خوبی ادراک رکھتا تھا۔
یہ میری فطرت کا خاصا تھا یا پھر کمزوری کہہ لیں کہ حالات چاہے جیسے بھی رہیں، میری طبیعت میں ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت رہتی تھی، یعنی میں یک دم بھڑک نہیں اٹھتا تھا۔ بہت غور سے حالات کو سمجھنے اور جانچنے کی کوشش کرتا تھا۔
بلاشبہ مجھے بھی فہیم اور عاصمہ کی طرح اس تلخ حقیقت کا اندازہ تھا کہ محلے میں لوگ ہمارے لیے کیسی رائے رکھتے تھے؟ نیز ہم پر طنز کرنے والے کون تھے؟ اور کیوں تھے؟
جلد ہی مجھے اپنی پر غور معاملہ فہمی اور زود حسی سے اندازہ ہو گیا کہ ایسے لوگ جو ہمارے خلاف تھے وہ مٹھی بھر ہی مگر فتنہ سازی میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ مخالف کی ذرا سی غلطی پر سب کو اپنا "ہم خیال" بنا لینے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔
اس مخالف ٹولے کے ایک اہم کردار کو میری مسلسل خاموشی اور بہ ظاہر لاپروانہ انداز نے بالآخر آج آشکارا کر ڈالا تھا۔
میں صرف ایک حد تک برداشت سے کام لیتا تھا اس کے بعد نہیں۔ اگرچہ برداشت کا مادہ مجھ میں زیادہ ہی تھا مگر سمجھتا بھی تھا معاملے کو زیادہ ڈھیل دینا بھی مناسب نہیں ہوتا۔
وہ دن خیریت سے گزر گیا۔ لیکن اگلی صبح جب میں لاری اڈے پہ جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگا تو ذرا ٹھٹک گیا۔ سامنے سے محلہ کمیٹی کے صدر حاجی کریم بخش چلے

آرہے تھے، ان کے ہمراہ دو افراد بھی تھے۔ ایک تو ان کا ہی آدمی تھا، ظاہر ہے اسے بھی میں جانتا ہی تھا۔ جبکہ دوسرا وہی مکار شخص ارشاد مٹن تھا۔ میں اندر سے تھوڑا پریشان ہو گیا۔ شاید اس کمینے مٹن والا کا داؤ چل گیا تھا؟ گھر میں اس وقت عاصمہ اور فہیم موجود تھے، مطلب، وہ آج کالج نہیں گئے تھے۔ ورنہ وہ دونوں مجھ سے پہلے نکلتے تھے۔

میں اندازہ لگا چکا تھا کہ ان تینوں کا رخ میری طرف ہی تھا۔ اسی لیے میں ان کا استقبال کرنے کے لیے اپنے گھر کے دروازے سے ذرا چند قدم آگے بڑھا۔ تب تک وہ تینوں بھی میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے فوراً چہرے پہ خوش اخلاقی کی مسکراہٹ سموتے ہوئے پہلے حاجی صاحب کو سلام کیا، اور ساتھ ہی بہ غور ان کے باریش چہرے کا بھی جائزہ لیا، جو مجھے خاصا ''بھرا'' ہوا محسوس ہوا۔ اس کی وجہ میں جانتا تھا۔

''نعمان صاحب! ہمیں آپ سے کچھ کہنا تھا۔ آپ کہیں جا رہے ہیں شاید؟'' حاجی صاحب نے سنجیدگی سے مجھے تکتے ہوئے مخاطب کر کے کہا۔

''جی ہاں حاجی صاحب! میں ڈیوٹی پر ہی جا رہا تھا۔ لیکن کوئی بات نہیں، کیا کام ہے مجھ سے؟'' میں نے اپنا خلیقانہ رویہ برقرار رکھا۔

وہ پہلے ایک نگاہ اپنے ساتھ کھڑے ارشاد مٹن پر ڈالنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر خاصے اکھڑے ہوئے لہجے میں بولے۔

''ہمیں بہت افسوس ہوا ہے یہ سن کر کہ اب تم دونوں بھائی محلے میں غنڈہ گردی بھی کرو گے۔ ارشاد میاں جیسے شریف اور معزز آدمی کے ساتھ کل شام تم دونوں... بھائیوں نے جو کچھ کیا۔ اس کے لیے ہم نے پہلے تو یہی فیصلہ کیا تھا کہ یہاں آنے کی بجائے سیدھے تھانے کا رخ کرتے مگر یہ اس کے لیے بھی تمہیں ارشاد صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ ہمیں وہاں لے جانے کی بجائے یہاں لے آئے۔''

''دیکھو میاں! یہ شرفاء کا محلہ ہے۔ یہاں کسی بدمعاش کی گنجائش نہیں۔'' حاجی کریم بخش کی دیکھا دیکھی ان کے ساتھ آنے والے معزز نے بھی ارشاد مٹن کی کسی مخفی ''مہربانی'' کا نمک حلال کرنا ضروری سمجھا۔ اس کا نام خورشید خاں المعروف منے میاں تھا۔ محلے میں اس کی دودھ دہی کی بڑی سی دکان تھی، جس کی پیشانی پر اس نے ''جلی قلم'' سے لکھ رکھا تھا۔ ''نا خالص دودھ ثابت کرنے والے کو دس ہزار روپے کا نقد انعام دیا جائے گا۔'' محلہ کمیٹی میں اس کا شمار بھی چند ''معززین'' میں ہوتا تھا۔

بہرطور۔ میں نے بڑے تحمل اور توجہ سے ان دونوں ''حضرات'' کی گفتگو سنی اور پھر حاجی صاحب سے کہا۔ ''مجھے آپ صرف چند سیکنڈ عنایت کردیں میں ابھی اندر سے ہو کر آتا ہوں۔''

میں پلٹ کر اندر صحن میں آ گیا۔ ''فہیم! ذرا ادھر آنا۔'' میں نے ہولے سے بھائی کو پکارا۔ وہ کمرے سے باہر نکلا۔ مجھے لوٹا دیکھ کر وہ چونکا تھا، عاصمہ بھی صحن میں آ گئی تھی۔

''کیا بات ہے بھائی جان؟ آپ۔'' فہیم کی آواز حلق میں اٹک گئی، میں پہلے ہی دھیرے سے بول پڑا تھا۔

سب سے پہلے تو میں نے اسے باہر دروازے پر موجود تینوں افراد کے ''آمدم برسر مطلب'' کے بارے میں بتایا، اس کے بعد اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''میں صرف اسی لیے اندر آیا ہوں کہ تمہیں سمجھا سکوں، کل شام والی تمہاری ارشاد سے گرما گرمی کی وجہ سے اس رذیل کو گل کھلانے کا موقع مل گیا ہے، مگر اب اس ڈر سے کہ کہیں تم پھر ہماری باتوں کی آواز سن کر باہر نہ نکل آؤ، میں اندر آ گیا، خود پر قابو پائے رکھنا، ورنہ وہ کمینہ اپنی چال میں کامیاب ہو جائے گا۔ اور خبردار۔ جب تک میں تمہیں آواز نہ دوں باہر مت آنا۔''

میری بات پر فہیم کے چہرے پر پہلے تو تلخی کے آثار ابھرے تھے مگر پھر اس نے میری طرف دیکھ کر خود کو پرسکون کیا اور ہولے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

میں باہر آ گیا۔ حاجی کریم بخش اور منے میاں سخت بیزار اور چڑے ہوئے نظر آ رہے تھے، جبکہ ارشاد مٹن کے چہرے پر اب کچھ الجھن کے آثار طاری ہونے لگے تھے۔

میں نے حاجی کریم بخش سے پہلے تو اس زحمت کی معذرت چاہی، پھر بولا۔ ''حاجی صاحب! کمال ہے! آپ نے مٹن بھائی کے یکطرفہ بیان پر، ہمیں صفائی کا موقع دیئے بغیر ہمارے لیے اتنی بڑی بات کہہ ڈالی؟ لیکن اس پر بھی مجھے آپ کی اجازت ہی درکار ہوگی کہ آیا آپ لوگ مجھے اس کا حق دیتے ہیں یا نہیں؟''

میں نے بڑے اخلاق کے پیرائے میں ایک جوتا لپیٹ کر مارا تھا، جو سیدھا ان دونوں کی پیشانی پر لگا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ دونوں ہی جز بز سے دکھائی دینے لگے، حاجی کریم بخش تو محض ہولے سے کھنکار کر رہ گئے البتہ ان کے

ساتھ کھڑے منے میاں نے میری طرف دیکھ کر روکھے اور طنزیہ لہجے میں کہا۔
''محلے میں ارشاد بھائی کو بھی جانتے ہیں اور ان کی محلے بھر میں عزت بھی ہے۔ بھلا کون ان کی بات کو غلط اور جھوٹ قرار دے سکتا ہے؟'' مجھے اس کی بات پر تذلیل کا احساس ہوا، یہی معاشرتی رویہ ایک امن پسند اور صلح جو انسان کو گمراہ کرنے کا بھی باعث بنتا ہے، میں دعا کر رہا تھا کہ اندر موجود کان لگائے کھڑے فہیم یہ نہ سن لے اور اگر سن لے تو طیش میں باہر نہ نکل آئے، تاہم مجھے یقین تو تھا کہ وہ میرا حکم نہیں ٹال سکتا تھا۔
''آپ یہ زیادتی کر رہے ہیں۔ خورشید بھائی!'' میں نے صبر اور تحمل سے کام لیتے ہوئے شاکیتی لہجے میں اس سے کہا۔ ''آپ کی بات کا کیا مطلب ہے، ہم کوئی چور اچکے ہیں؟''
''اب یہ کون نہیں جانتا کہ تم لوگ کیا ہو؟ اس بات کو چھوڑو۔'' حاجی کریم بخش کو بھی زہر اگلنے کا موقع ملا، مجھے غصہ تو بہت آیا مگر پی گیا۔ وہ آگے بولے۔
''میاں! یہ بتاؤ، آخر تم دونوں بھائیوں نے ارشاد صاحب کے ساتھ کل شام ہاتھا پائی کیوں کی؟''
''ہم نے تو ان کے ساتھ کوئی ہاتھا پائی نہیں کی تھی اور کرتے بھی کیوں؟'' میں نے تیزی کے ساتھ سوچتے ذہن سے حاجی کریم بخش کو جواب دیا۔ اور ساتھ ہی سوالیہ نظروں سے۔ پاس کھڑے ارشاد مٹھن کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلا کر بولا۔
''واہ! یہ بھی خوب کہی۔ ایک گھر کے بارے میں ہی تو پوچھا تھا تم لوگوں سے اور تمہیں اتنا غصہ آ گیا کہ مجھ سے شریف آدمی کو گریبان سے پکڑ کر پٹائی لگا دی۔''
اس خبیث کے اس سفید جھوٹ پر تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب تب میں اندر سے فہیم نکلا اور معاملہ بگڑنے کی پھر کیا دیر ہوتی؟
''کیوں میاں! کیا گھر کا فروخت کرنے کا پوچھنا گناہ ہے؟ آپ کی چیز ہے، آرام سے اور صاف انکار کر ڈالتے۔ ایک شریف آدمی سے ایسی مارا ماری؟ توبہ ہے حد ہے بدمعاشی کی بھی۔'' خورشید خاں المعروف منے میاں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ تو میں نے حاجی کریم بخش کو ساری کتھا سنا ڈالی کہ اس شام ارشاد مٹھن کا خود اپنا لہجہ انتہائی اکھڑ اور تاؤ دلانے والا تھا۔ بلکہ یہ مکان بیچنے کے لیے بلیک میلنگ سے کام لے رہا تھا نیز دباؤ ڈالنے کے لیے دھمکی سے بھی کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔
عیار ارشاد مٹھن نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیے اور صاف مکر گیا۔
کسی متوقع بحث سے بچنے کی خاطر حاجی کریم بخش اور منے میاں آخر میں مجھے ہی تادیب کر گئے کہ اگر ایسا دوبارہ ہوا تو نہ صرف محلے میں ہمارا مکمل طور پر سوشل بائیکاٹ کر دیا جائے گا بلکہ پولیس کو بھی مداخلت کے لیے بلا لیا جائے گا۔
مجھے حاجی کریم بخش اور منے میاں کی اس دوغلی اور یک طرفہ پالیسی پر طیش تو بہت آیا۔ مگر میں ان کے نظروں سے اوجھل ہونے تک چپ ہی کھڑا رہا۔ پھر جب واپس پلٹ کر گھر میں داخل ہوا تو حسب توقع میں نے عاصمہ کی آنکھوں میں دکھ کے آنسو اور فہیم کا چہرہ غصے سے سلگتے ہوئے پایا۔

☆☆☆

میں اس روز اسی وجہ سے ذرا دیر سے ہی لاری اڈے پر پہنچا تھا۔ چاچا انور شاہ وہاں موجود تھے۔
کل شام اور آج والے تازہ کارواقعے کی وجہ سے میرا چہرہ اترا اترا سا تھا، جسے بھانپ کر چاچا انور شاہ نے بڑی ملائمت آمیزی سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے نوی بیٹے؟ آج تمہیں آنے میں دیر ہو گئی؟''
''سوری چاچا! کچھ کام پڑ گیا تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔
''ارے بیٹا! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے اسی لیے نہیں کہا۔ میرا مطلب تھا۔ خیریت تو ہے ناں؟ بھائی اور بہن ٹھیک تو ہیں ناں؟'' وہ پُرشفیق لہجے میں بولے۔
''جی ہاں چاچا! وہ دونوں ٹھیک ہیں۔'' میں نے جواب دیا اور اپنی کوٹھری نما آفس میں جا گھسا۔
آج گڈز کی رسیدیں بنانا تھیں اور سپلائی چیک کرنا تھی۔ میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ باروسیع وعریض میدان میں بسیں اور ٹرک کھڑے تھے، ان کے ہارن بھی گونج رہے تھے۔ مسافروں کی آوازیں، کنڈکٹروں کا شور۔ میں اب ان آوازوں کا عادی ہو گیا تھا۔
آج ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ میں بے دلی سے کام کر رہا تھا۔ چاچا انور شاہ اگرچہ میری کیفیت کو نوٹ کر رہا تھا مگر بولا کچھ نہیں تھا۔ نہ ہی میں نے اسے کل اور آج والے واقعے

کے بارے میں کچھ بتانا ضروری سمجھا تھا۔

میرا دھیان بار بار ارشاد مٹن کی طرف جا رہا تھا اور یہی دعا کر رہا تھا کہ کہیں اس کی دوبارہ فہیم کے ساتھ مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ اب تو محلہ کمیٹی کے صدر نے بھی دھمکی دے دی تھی کہ دوبارہ ایسا ہوا تو ہمیں پولیس کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ساتھ ہی میں ارشاد مٹن کی چیرہ دستیوں کا جواب بھی تلاشنے میں مجور رہا تھا۔ مجھے ہی اس مسئلے کا حل نکالنا تھا۔ کیوں کہ اب اسے اپنا گل کھلانے کی اچھی خاصی "شہہ" مل چکی تھی۔ میں نے بہت غور و خوص کے ساتھ یہ عین اسی طرح سے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ جس طرح ارشاد مٹن نے ہماری کمزوری کو ہتھیار بنانے کی کوشش کی تھی میں بھی اسی طرح اس کی کمزوری تلاشنے کی سعی کرنے لگا اور اس دوران میں نے اپنے ذہن میں کچھ خاکے تیار کیے تھے۔ اب ان میں عملی طور پر رنگ بھرنے کی دیر تھی۔ اور پھر جو شبی ابھر کر سامنے آنے والی تھی۔ وہ میری توقع کے مطابق بڑی کریہہ ہوتی۔

میں نے سب سے پہلے اس نقطے پر غور کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ آخر یہ ارشاد مٹن نے بکرے کا اس قدر مہنگا گوشت اور پھر اس کی کڑھائی، کس طرح سستے داموں بیچ کر اپنا اور اپنے ہوٹل کا نام بنا رکھا ہے؟ جبکہ بکرے کا گوشت اس وقت سب سے مہنگا جانا جاتا تھا، اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ بھی آج کل کے اس مہنگائی کے دور میں بکرے کا گوشت شاید کم ہی کھاتے ہوں۔ نقطہ بظاہر عام سا ہی تھا، مگر مجھے اس کے حاصل بڑے "زرخیز" دکھائی دیتے تھے۔

میں آج ایک ایسی ہی مہم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور یہی سب کچھ سوچنے کے دوران میرے اندر ایک جھماکا ہوا تھا۔ جتنے بھی سارے غلط کام ہوتے ہیں وہ رات کے اندھیرے میں کیے جاتے ہیں۔ ارشاد مٹن والا اپنے ڈھابے کو باقاعدہ ایک ہوٹل میں بدلنے کے لیے ہمارا گھر اونے پونے خریدنے کی مذموم کوشش میں تھا۔ ہمارا گھر جس لوکیشن پر تھا۔ وہ بیک وقت کمرشل اور ریزیڈنشل ویلیو کا حامل تھا۔ تھا تو ایک سو بیس گز پر ہی مگر اس کے آگے چالیس اور ساٹھ گز کی انکروچمنٹ کی جا سکتی تھی۔ نیز ہوٹل بننے کی صورت میں اسے دو تین منزلہ اوپر بھی لے جایا جا سکتا تھا۔ یہی سب کچھ اس مکار اور چالاک غاصب انسان ارشاد مٹن والا نے سوچ رکھا تھا۔

میں نے ابھی ذکر کیا تھا کہ اکثر غلط کام رات کے اندھیرے میں انجام دیے جاتے ہیں۔ ارشاد مٹن ایک غلط آدمی تھا۔ اس کی کسی کمزوری کو پکڑنے کے لیے رات کا وقت بہترین تھا۔ مگر کیسے؟ اس پر ابھی میں غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک میری نظر اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر پڑی جدھر چند لاریاں اور اکا دکا ٹرک کھڑے تھے۔ بیشتر روانہ کیے جا چکے تھے۔ شام پڑنے لگی تھی اور چاچا انور شاہ۔ گڈز کی عمارت میں ہونے والی ایک ٹرانسپورٹرز کی میٹنگ میں بیٹھے تھے۔

وہ وائیٹ کلر کی مہران کار تھی۔ میں اسے پہچان کر چونکا تھا اور پھر اس کے اندر سے میں نے جس لڑکی کو اترتے دیکھا تھا وہ میری شناسا ہی تھی۔

"اوہ۔ یہ اس وقت یہاں کیا کرنے آئی ہے؟ کیا مجھ سے ملنے؟" میں ہولے سے سوالیہ انداز میں خود کلامیہ بڑبڑایا تھا۔ میری میز کھڑکی کے قریب ہی تھی۔ میرے سامنے میز پر مختلف رجسٹرز کھلے ہوئے تھے۔ اور کچھ رسید بکس بکھری ہوئی تھیں۔ میں انہیں ذرا ترتیب دینے لگا اور ساتھ ہی کھڑکی کے پار دیکھتا رہا۔ وہ لڑکی اب وہاں کھڑے کسی آدمی سے کچھ پوچھتی نظر آ رہی تھی، اسی آدمی نے میری کوٹھڑی نما کمرے کی طرف اشارہ کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھ سے ہی ملنے آئی تھی۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔ مگر اب یہ مجھ سے کیوں ملنے آئی تھی؟ اب تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا؟

میں الجھا رہا۔ اور پھر دانستہ ایک رجسٹر میں سر جھکا لیا۔

"میں اندر آ سکتی ہوں۔" مجھے اپنے عقب میں اس کی مترنم سی آواز سنائی دی۔ میں چونکنے کی ایکٹنگ کرتا ہوا پیچھے گھوما۔

"ارے۔ آپ زنیرہ صاحبہ! تشریف لائیں۔ پلیز۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا اور ساتھ ہی اس کا استقبال کرنے کے لیے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ ایڈووکیٹ راجا رحیم کی اسسٹنٹ زنیرہ فاطمہ تھی۔ وہ میری ہم عمر ہی تھی۔ اور وکالت کے میدان میں نام کمانے اور شاید پیسا بھی، اس میدان میں پورے جوش و جذبے سے وارد ہوئی تھی۔ خاصی اسمارٹ اور قبول صورت تھی اور بولڈ بھی۔ رنگ گندمی تھا۔ قد مناسب، بال بوائے کٹ تھے۔ شخصیت کے اعتبار سے وہ کھلنڈری اور شوخ ہی نظر آتی

تھی۔ میرے باپ والے مقدمے میں یہی راجا رحیم کو اسسٹ کرتی تھی۔ اور بڑے زرخیز نقطے نکالتی تھی۔ مگر مجھے کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ میرا باپ تو باوجود ان کی کوششوں سے، بے گناہ پھانسی چڑھ ہی چکا تھا۔ مذکورہ کیس کے دوران میری اس سے کسی حد تک بے تکلفی بھی ہوگئی تھی۔ مگر اس میں ہنستا ہنسانا شامل نہیں تھا۔ بس کیس ہی کے سلسلے میں ہماری اکثر بے دھڑک ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں وہ بھی راجا رحیم صاحب کی آفس تک ہی محدود رہی تھیں۔

ہاں، البتہ شخصیت کے حوالے سے زنیرہ کے لیے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس میں ایک تحیر پایا جاتا تھا۔ اس کے کومل سے چہرے کی ملاحت سے یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ ایسی نازک اندام دوشیزہ بھی وکالت جیسے خشک اور دماغ سوز پیشے سے تعلق رکھ سکتی ہے۔ اسے تو کورٹ جیسی خشک فضاء میں سر کھپانے کے بجائے خواہشوں اور آرزوؤں کے پُر بہار گلشن میں، شوخ و چنچل سی فضاؤں کے سنگ اپنے کسی من موہنے سے خوابوں کے شہزادے کا محوِ انتظار ہونا چاہیے تھا۔ بھلا عدالت کی اس خشک فضاء میں اس سندر رنگیلی اور قوسِ قزح کے رنگوں والی تتلی کا کیا کام؟ مگر وہ "تتلی" عزمِ صمیم کی طرح اپنے سماج سدھار کاز پر ڈٹی ہوئی تھی۔ لیکن وہ شوخ رنگوں سے مبرا تھی۔ اس کا بظاہر نرم وجود جو سیاہ گاؤن میں ملفوف تھا۔ بڑی بڑی آندھیوں کے آگے خم ٹھونک کر ان سے نبرد آزما ہونے کا عزم رکھتا تھا۔ وہ بمشکل پچیس چھبیس کے پیٹے میں تھی۔ چہرے میں گہری جاذبیت اور کشش تھی۔ تو ایک طرف یہی چہرہ سنجیدہ اور بیک وقت بردبارانہ سی مسکراہٹ کا مظہر بھی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی گندمی سی رنگت میں بھی ایک انوکھا نکھار سا تھا۔

"ارے بھئی تم کدھر غائب ہوگئے تھے۔" وہ اندر آتے ہی ایک نگاہ گردوپیش پر ڈالتی ہوئی مجھ سے بولی۔ میں نے پھیکی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور بیٹھنے کے لیے اسے کرسی پیش کی اور اسی لہجے میں بولا۔

"میں نے بھلا کہاں غائب ہونا تھا زنیرہ صاحبہ! بس اسی شہر کے گردشِ وایام میں مصروف ہوں۔ آپ سنائیں کیسی ہیں آپ اور... خیریت؟ کیا کوئی فیس وغیرہ رہ گئی تھی؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ جانے کیوں تلخ سا ہوگیا تھا۔ میری اس بات پر زنیرہ کی جبیں پر خجالت آمیز شرمندگی کی سلوٹیں ابھری تھیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ ایک دم سنجیدہ سی ہو کر بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔

"بہت تلخ ہوگئے ہو تم؟"

"حالات اور گردشِ دوراں انسان کو ایسا بنا ہی دیتے ہیں۔ ویسے میں نے تو کوئی ایسی تلخ بات نہیں کہی۔" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ فیس والی بات کیوں کہی تم نے؟" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ بال کی کھال نکالنا اس کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ میں نے بھی جوابی کارروائی جاری رکھی، بولا۔ "آپ کے کیس ہارنے اور ابو کی پھانسی چڑھنے کے بعد، اب بھلا ملاقات کا مقصد کیا رہ گیا تھا؟ یہی خیال ذہن میں آیا تھا میرے کہ شاید آپ لوگوں کے کچھ واجبات رہ گئے ہوں؟" میں نے بالآخر صاف گوئی سے کہہ دیا۔ میرے لفظ لفظ میں تلخی کا زہر اور لہجے سے ایک بھنچا بھنچا سا دکھ مترشح ہونے لگا تھا۔"

میری بات پر زنیرہ نے ایک گہری ہنکاری خارج کی تھی۔ اور میں نے صرف ایک نظر ہی اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔ اس کی بہ ظاہر عام سا تاثر دیتی آنکھوں میں جو گہرائی میں اکثر محسوس کرتا تھا، وہ اس کے دبے دبے حسن کی کشش انگیزی کو ہمیشہ دوچند کرتی ہی مجھے نظر آتی تھی۔

"کیا واقعی تم نے ہار مان لی ہے نعمان؟" کہتے ہوئے اس کے لہجے میں چھپی ہمدردں بھری گیرائی مجھے ایکا ایکی کسی ہمدم دیرینہ کی سنگت کا احساس دلا جاتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے اسے ابو کے کیس کے سلسلے میں ایڈووکیٹ راجا رحیم کے مقابلے میں زیادہ پُرجوش دیکھا تھا۔ وہ اس کیس میں اس طرح سرگرم رہی تھی جیسے یہ کیس اس کے کسی اپنے کا ہو۔ یا پھر یہ اس کی سرشت تھی کہ وہ ہر کیس میں ایسی ہی دلچسپی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ بہرحال ابھی میں اس کی کوئی توجیہہ پیش کرنے سے قاصر ہی تھا۔

"شاید نہیں۔" میں نے بھی بلاتعویق وتامل کہہ ڈالا۔ تب ہی اس کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت کی رمق کو میں نے ابھرتے محسوس کیا تھا۔

"شکر ہے، کہ تم نے ہمت نہیں ہاری۔" اس کے لبوں سے دلکش انداز کی تحریک ابھری۔ مجھے حیرت تھی۔ یہ اب کیا کرنا چاہتی تھی۔ بولا۔

"مگر اب کیا ہوسکتا ہے؟ ابو تو اس دنیا میں نہیں رہے؟"

پتا نہیں میں نے کیا سوچ کر ایسا کہا تھا۔ حالاں کہ... پھانسی سے ایک دن پہلے ہونے والی آخری ملاقات میں مجھے

ابو کے ان الفاظ کی بازگشت ابھی تک گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جب انہوں نے مجھ سے اس بات کا وعدہ لیا تھا کہ میں، ان کے مرنے کے بعد سچائی کو دنیا کے سامنے لانے اور ان کے خاندان کی پیشانی سے یہ داغ دھونے کی پوری کوشش کروں گا اور بلاشبہ میں نے اس کا عزم صمیم بھی کر رکھا تھا۔

مگر زنیرہ سے شاید میں نے یہ اس لیے کہا تھا، جیسے اس سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں بھلا اب اور کیا کر سکتی تھی؟

اس نے یونہی ایک گردشی سی نگاہ اس کوٹھڑی نما کمرے پہ ڈالی۔ پھر شاید دانستہ کچھ ثانیوں کے اس بوجھل موضوع کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہلکے سے مسکرا کر بولی۔
''تم یہاں کب سے کام کر رہے ہو؟''
''کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ لیکن کام مجھے پسند ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''ہاں! جگہ تو واجبی سی ہے مگر اسے اچھا کر کے بنایا گیا ہے۔ پکی دیواریں، ایک کونے میں رکھا ہوا روم کولر، چھوٹا فریج، بہت کلاسک انداز کا آفس ہے تمہارا۔'' وہ ہنسی، میں بھی ہولے سے مسکرا دیا۔
''کتنی تنخواہ ہے تمہاری؟''
''تنخواہ تو اتنی زیادہ نہیں ہے مگر آتی جاتی گاڑیوں اور آف لوڈنگ اپ لوڈنگ سے کمیشن ٹھیک ٹھاک بن جاتا ہے۔''
''گڈ۔''
''سوری میں تو پوچھنا ہی بھول گیا۔ کیا لیں گی آپ؟ ٹھنڈا یا چائے؟''
''بالکل نہیں اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ بولی۔ پھر اپنے ہینڈ پرس سے ایک کارڈ نکالا اور مجھے تھمانے سے پہلے بولی۔ ''میں دراصل تمہارا عندیہ لینے آئی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم پُرعزم ہو۔ حقیقت سامنے آنی چاہیے۔'' پھر اس نے کارڈ میری طرف بڑھا دیا اور آگے بولی۔ ''یہ میرا کارڈ ہے۔ اس میں میری ذاتی رہائش گاہ کا بھی پتا درج ہے اور لینڈ لائن کے علاوہ میرا موبائل نمبر بھی لکھا ہے۔ تم اپنا بھی سیل نمبر مجھے دے دو۔''

ایسا پہلی بار ہوا تھا، ورنہ تو اکثر میں اس سے آفس میں ملتا تھا، اکثر چاچا انور شاہ بھی میرے ساتھ ہوتے تھے۔ میں نے کارڈ اس کے ہاتھوں سے لے لیا اور اپنا سیل نمبر اسے سیو کرا دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ بات گڑے مردے اکھاڑنے والی سہی مگر ضروری ہے کہ اگر تمہارے والد واقعی بے گناہ تھے تو اس حقیقت سے پردہ ضرور اٹھنا چاہیے اور اصل قاتل کو کیفر کردار تک پہنچنا چاہیے۔ کیوں کہ آخر تک وہ اپنے جرم سے انکاری تھے۔''

وہ بولتی رہی اور میں یک ٹک اس کے چہرے کو تکتا رہ گیا۔ میں اس سے پہلے اسے بھی ایک غیر جذباتی وکیل کی صورت ہی دیکھتا آیا تھا جسے صرف اپنی فیس سے غرض ہوتی ہے اور بس مگر آج یہ بات کہہ کر اس نے مجھے پہلی بار متاثر کیا تھا ورنہ کسے کیا پڑی تھی کہ وہ ایک کیس ہار جانے کے بعد، گڑے مردے اکھاڑنے لگتا؟ فی زمانہ یہ فرض شناسی ہی نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت اور سماج سدھار کی ایک اعلیٰ مثال تھی جسے میں زنیرہ فاطمہ کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔

تب میں نے بھی کہا۔ ''زنیرہ صاحبہ! ایک مرتا ہوا انسان جھوٹ نہیں بولتا۔ پھر ابا کو تو ہم بھی جانتے تھے، وہ تو کسی سے بحث و مباحثے سے بھی گریز کرنے والے انسان تھے اور کسی کو قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔ اپنی فطرت میں سادہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ایک محبت کرنے والے امن پسند انسان مگر بدقسمتی سے سازش کرنے والوں نے ایسی گہری چال چلی کہ سارے شواہد ان کے خلاف ہی قرار پائے۔ اور۔'' میں غم کے ایک بوجھ تلے رکا۔ پھر بولا۔ ''شاید آپ کے علم میں نہیں ہے کہ ابو نے آخری ملاقات میں، مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا کہ میں اپنے خاندان کی پیشانی سے یہ داغ دھونے اور ابو کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کوشاں رہوں گا۔''

میری بات سن کر زنیرہ کے چہرے پہ طمانیت کی ایک لہر سی دوڑ گئی اور اسی لہجے میں بولی۔ ''اب مجھے اور تسلی ہوگئی یہ سن کر۔ ویسے مجھے بھی یہی لگتا تھا کہ وہ بے گناہ ہی تھے۔ کیوں کہ جب میں نے پہلی بار جیل میں اپنے باس (ایڈووکیٹ راجا رحیم) کے ساتھ تمہارے باپ احمد حسین سے وکالت نامے پر دستخط وغیرہ لینے گئی تھی تو وہ مجھے کہیں سے بھی قاتل تو کیا ایک عام مجرم بھی نہیں لگتے تھے۔ پھر ان کی باتیں بھی میں نے سنی تھیں۔ باس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی، مگر کم از کم مجھے یہی لگا تھا کہ انہیں کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت ہی پھنسایا گیا ہے۔''

''ہاں! وہ ہم سے بھی آخر وقت تک یہی کہتے رہے تھے۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ آخر ایسا ان کا کون

دشمن پیدا ہو گیا تھا جس نے یہ سب ابو کے ساتھ کیا؟ حالاں کہ ہماری کسی کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہیں تھی؟''

میری بات پر زنیرہ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''انہیں قربانی کا بکرا بھی بنایا جاسکتا ہے۔ شکاریوں کے لیے ایسے قربانی کے بکرے تاڑنا کیا مشکل ہے۔''

میں اس کی بات پر چونکا تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی جبکہ میں اب تک یہی سمجھتا آرہا تھا کہ بات صرف دشمنی تک بھی نہیں سوچی جاسکتی تھی۔ بعض شکاری قسم کے لوگ سادہ لوح اور شریف انسانوں کو اپنے کریہہ مقاصد کے لیے قربانی کا بکرا بھی بناتے ہیں۔

زنیرہ کی ان باتوں نے میری سوچ کو بہت مہمیز کیا تھا۔ کہاں تو ابا کو پھانسی لگنے کے بعد سے... میری دلچسپی زنیرہ کے معاملے میں بالکل صفر ہو کر رہ گئی تھی مگر اب۔ وہ ایک دم میرے لیے ان حوالوں سے اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ لہٰذا میں نے بھی پورے تہہ دل اور دل جمعی کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''زنیرہ صاحبہ! اگر آپ واقعی میرے اس نیک مقصد میں ساتھ دینا چاہتی ہیں تو میں اسے آپ کا ایک ایسا احسان سمجھوں گا جسے میں تو نہیں اتار پاؤں گا شاید لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کا اجر آپ کو اللہ ضرور دے گا۔''

''تم نے صحیح کہا نعمان! میں بھی نیک نیتی کے ساتھ اور صرف انسانیت کی خدمت کے جذبے سے ہی وکالت کے شعبے میں آئی تھی مگر میں نے صلہ کا لالچ صرف اپنے خدا کے سوا اور کسی سے نہیں رکھا۔ تو پھر تم اس مشن میں میرا ساتھ دے رہے ہو ناں؟''

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی تو میں بولا۔ ''یہ مشن تو خالصتاً میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ زنیرہ صاحبہ! بھلا میں کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہوں۔''

''ڈن'' اس نے مسکرا کر اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر میری طرف کیا اور میں نے بھی مسکرا کر اپنے ہاتھ کا مکا بنا کر اس سے ٹکرا دیا۔ وہ چلی گئی۔

آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ کہاں تو میں مایوس سا تھا اور یہ سوچ سوچ کر پریشان ہی ہوتا رہتا تھا کہ آخر میں اپنے اس مشن کی ابتدا کدھر سے کروں؟ پہلے کون سا قدم اٹھاؤں؟ مگر آج زنیرہ کی باتوں نے میری ہمت کو گویا سوا کر دیا تھا۔ وہ واقعی ایک نڈر اور پُر عزم عورت تھی۔ حالاں کہ اس نے ابھی تک اس مشن کے سلسلے میں کسی لائحہ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی کوئی مجھے کوئی راستہ سجھایا تھا لیکن باوصف اس کے۔ وہ میری ہمت کو میرے عزم کو سوا کر گئی تھی۔ کسی نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ ایک کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ چاہے وہ ماں کے روپ میں ہو یا دوست کی صورت ہو۔ زنیرہ انسانیت اور اپنے پیشے اور فرض کی خاطر ہی سہی۔ میری دوست بن چکی تھی۔

☆☆☆

میں اسی روز شام کو حسب معمول گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابھی میں اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''کیا کہتے ہو اب؟'' میں اس جانی پہچانی آواز پر مڑا۔ اور بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ وہی بدبخت ارشاد منن ہی تھا۔

وہ مکار ہمیشہ مجھ سے ایسے وقت ہی ملتا تھا جب وہاں لوگوں کی آوک جاوک کم ہی ہوتی تھی۔ اس کے کلے میں گلوری دبی ہوئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ کی بیماری روشنی میں، اس کی سرخ نظر آتی باچھیں، جہاں پیک چمک رہی تھی، بہت کریہہ محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے میرے آگے کوئی ذومبی (zombi) کھڑا ہو۔ یوں بھی وہ ایک ذومبی سے کیا کم تھا۔ جو غریب یتیم اور دکھی بہن بھائیوں کی چھت پر غاصبانہ قبضے کے خواب دیکھے ہوئے تھا۔

''آپ نے کچھ کہا؟''

''میاں اب اتنے انجان نہ بنو۔ جانتے ہو اچھی طرح میں تم سے کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''

وہ مکاری سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اندازہ تو تمہیں بھی ہو ہی چکا ہوگا اب تک کہ میری محلے میں کتنی اٹھتی ہے۔ کل تک ڈیڑھ لاکھ کی قیمت لگائی تھی میں نے تمہارے گھر کی مگر تمہارے دبنگ خان قسم کے بھائی نے میرے ساتھ بدتمیزی کر ڈالی اور اب صرف ایک لاکھ۔ بولو منظور ہے ورنہ۔ یاد رکھو۔ تم تینوں بھائیوں کا میں یہاں جینا ہی حرام نہیں کروں گا بلکہ تم تینوں کو رسوا کر کے یہاں سے خالی ہاتھ ہجرت کرنے پر مجبور بھی کردوں گا۔''

کل کی ''شبے'' پر آج وہ پوری طرح کھل گیا تھا اور بدمعاشی پر اتر آیا تھا۔ ہمارے گھر کی لینڈ کاسٹ ویلیو دس سے بارہ لاکھ کے قریب تھی اور یہ بدبخت، موقع پرست

اسے کوڑیوں کے دام خریدنا چاہ رہا تھا۔ وہ بھی سماجی بلیک میلنگ کے ذریعے۔

اس کی اس کھلی چیرہ دستی پر میرے دماغ میں دھواں سا بھرنے لگا۔ جی چاہا اس خبیث آدمی کے جبڑے پر ایک گھونسا رسید کر ڈالوں۔ مگر بڑی مشکل سے میں نے اپنے طیش پر قابو پایا تھا کہ یہی میرا مزاج تھا ورنہ معاملہ بگڑ جاتا۔ اس کا کیا تھا۔ یہ شیطان فطرت تو چاہتا ہی یہی تھا کہ مظلوم بن کر محلہ کمیٹی سمیت سب کو ہمارے خلاف کر کے اپنا مقصد حاصل کر لے۔

کسی نے غلط تو نہیں کہا ہے کہ ہم سب سماجی درندے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ رل مل کے رہنا، زندگی بسر کرنا ہماری معاشرتی مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی۔ ہم ان سے الگ ہو کر نہیں رہ سکتے۔

میں نے اپنی طبیعت کے مطابق پہلے تو اپنے اندر کے ابال پر قابو پایا، اس کے بعد صرف اس قدر بولا۔ ''مٹھن بھائی! کیا تم مجھے کچھ دن کے لیے سوچنے کا موقع دے سکتے ہو؟''

وہ شاید میری آنکھوں میں اور میرے ٹھہرے لہجے میں چھپی جنگجویانہ سی سرد مہری کو نہیں بھانپ سکا تھا۔ یک دم فاتحانہ مسرت سے بولا۔ ''میاں! اب کی نا عقل مندی کی بات۔ پوچھو تو سچی کہتا ہوں۔ میں تم بہن بھائیوں کے بھلے ہی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ یوں تو تم جانتے ہی ہوں گے کہ تمہارے قاتل باپ کی پھانسی کے بعد سے محلے بھر کے لوگ...''

''مٹھن بھائی! میں ایک لاکھ روپے میں سودا ڈن کرنے کو تیار ہوں۔ بس! تھوڑی مہلت دے دیجیے۔'' میں نے اس کی لغو بیانی کو ادھر ہی بریک لگانے کی غرض سے بات کاٹ ڈالی تھی کہ کہیں میری برداشت بھی نہ جواب دے جائے۔

وہ مکارانہ ہنسی کے ساتھ پان کی جگالی کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔

''اس کا بھی اب بندوبست کرنا پڑے گا۔'' میں ہولے سے دانت پیس کر خود کلامیہ بڑبڑایا تھا اور پھر گھر کی راہ لی۔

عقاب جو چٹانوں میں بسیرا کرتے ہیں اور وہیں اپنے گھونسلے میں اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ رزق تلاش کرتے ہیں اور اپنے پوٹے میں چوغا بھر کے لا کر اپنے بچوں کے منہ میں ڈالتے ہیں مگر انہیں اڑنا اس طرح سکھاتے ہیں کہ وہ بلندی سے انہیں اپنے گھونسلے سے دھکا دے دیتے ہیں پھر کھلی فضائے بسیط میں بچے گرنے سے بچنے کے لیے اپنے پروں کو تیز تیز حرکت دیتے ہیں اور اس طرح وہ اڑنا سیکھتے ہیں۔

مجھے لگتا تھا شاید تقدیر نے بھی مجھے کسی بلندی سے ایک دم نیچے، ناسا عد حالات کے دھارے پر پھینک دیا تھا۔ ایسی بلندی سے جہاں میں کچھ دن پہلے تک بڑی پرسکون اور ہنگاموں سے پاک زندگی بسر کر رہا تھا مگر اب مجھے اڑنا سیکھنا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح شاہین کے بچے سیکھتے ہیں۔

میں گھر پہنچا اور خاموشی سے کھانا ختم کر کے باہر آ گیا۔ ایک چکر میں نے محلے کا لگایا اور پھر ارشاد مٹھن کے ڈھابے کی طرف چل دیا مگر اس طرح کہ کسی کی نگاہ مجھ پر بس سرسری سی ہی پڑے۔ اس وقت بھی اس کے ڈھابے پر گاہکوں کا رش نظر آ رہا تھا۔ دائیں بائیں چھوٹی موٹی دکانیں کھلی پڑی تھیں اور محلے میں ایک معمول کے مطابق خاصی رونق دیکھنے میں آتی تھی۔ ایسے ہی میری نظر اچانک ڈھابے پر پڑی وہاں مجھے ارشاد مٹھن دکھائی نہ دیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گلے پر بیٹھا تھا اور گاہکوں سے پیسوں کی وصولی او۔ لینا دینا وہی کر رہا تھا۔ چار پانچ ملازم بھی نظر آ رہے تھے۔ مجھے ارشاد مٹھن کا کچھ زیادہ حدود اربع نہیں معلوم تھا۔ اس کا کبھی وقت نہیں ملا تھا، نہ ہم بہن بھائی زیادہ باہر کبھی نکلے تھے۔ بس ناموں کی حد تک ہی جانتے تھے محلے داروں کو اور کبھی کسی سے آتے جاتے سلام دعا ہو جاتی۔

میں ذرا ڈھابے کے قریب سے گزرنے لگا تو اچانک ایک تیز سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہیکے! (عتیق) دو سیر کڑھائی بھیج دے پندرہ تنوری روٹیوں کے ساتھ؟''

''کدھر؟ مجھے تو نہیں پتا؟'' ارشاد مٹھن والے کا بیٹا عتیق عرف ہیکا نفی میں اپنا سر ہلا کر بولا تو آنے والا بولا۔

''ابے بھول گیا؟ تیرا ابا نہیں بتا کے گیا تجھے؟ کدھر ہے وہ؟''

''گھر گیا ہے۔ ابھی آتا ہو گا۔ پر تو بتا تو کدھر بھیجنی ہے دو سیر کڑھائی؟ ابھی دے دیتا ہوں، میں جانتا ہوں تمہیں۔''

''ہاں۔ ہاں۔ مجھے کیسے نہیں جانے گا تو۔ حاجی

صاحب اور منے میاں کے گھر ایک ایک سیر۔"

"او۔ اچھا ایسا بولو ناں۔ وہاں تو روز لنچ ہی جاتی ہے۔ بنا ہے مجھے۔ تیار ہے لے جاؤ۔" ٹیکے نے کھیسیں نکالتے ہوئے کہا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا۔

"ہنہ۔ تو یہ معاملہ ہے۔ کیا ہر روز ان دونوں حضرات کے ہاں مٹن کڑھائی جاتی ہے باقاعدگی سے؟" میں نے دل میں سوچا۔ "اور یقیناً فری کی جاتی ہوگی، تبھی تو روزانہ جاتی ہے۔"

میں ذرا ایک طرف کو کھڑا ہو کر رک گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ تھوڑی دیر بعد ہی اسی لڑکے کو ایک بڑی سی شاپر میں روٹیاں اور سالن باندھ کر دے دیا گیا۔ میں اس کے پیچھے چل دیا۔ اس نے ایک شاپر پہلے منے میاں کے اور دوسرا... حاجی کریم بخش کے گھر پکڑا دیا۔ میں غصے سے دانت پیستا ہوا پھر اسی کے ڈھابے کے قریب سے گزرتا ہوا واپس گھر کی طرف جانے لگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دن تو قائیو کاواسا کی موٹر بائیک پر دو لڑکے اترے۔ خاصے غصے میں نظر آرہے تھے۔ ایک نے اپنے ہاتھ میں بڑا سا شاپر پکڑے رکھا تھا۔ دونوں بائیک سے اترے، اسے اسٹینڈ لگایا، اور بھناتے ہوئے دکان پر چڑھ دوڑے۔

یہ دونوں نوجوان میرے ہم عمر تھے۔ صورت و شکل سے کچھ اچھے قماش کے نظر نہیں آتے تھے، ایک نے شاپر گھما کر ارشاد مٹن کے بیٹے عتیق عرف ٹیکے کے منہ پر مارا اور پُر طیش لہجے میں بولا۔ "ابے سالوں! یہ کیا گدھے کا گوشت بکرا کہہ کر بیچ رہے ہو؟ صرف چند گھنٹے پڑا رہا تو بدبو چھوڑ گیا اور بھی ایسی کہ جیسا مرا ہوا گدھا ہو۔"

بلاشبہ اس نوجوان نے غصے اور روا روی میں ہی ایسی بات کہی ہوگی مگر مجھے اندر سے کھٹکا گئی کہ میں تو پہلے "کھٹکا" ہوا تھا۔

میری بھانپتی ہوئی نظروں نے دیکھا، اس کی بات پر ٹیکے کے چہرے سے ہوائیاں اڑنے لگیں۔ حالاں کہ ٹیکا خود بھی کم تگڑا نہیں تھا۔ اگرچہ اپنے باپ کی طرح وہ بھی ٹھگنا ہی تھا مگر جسم جاندار تھا۔ وہ ان دونوں، نوجوانوں کو، جو میری طرح دبلے پتلے تھے، ٹھکائی لگا سکتا تھا، فوراً ان کی خوش آمد پر اتر آیا۔ بولا۔ "ارے۔ توبہ۔ توبہ۔ بھائیو! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ہم مسلمان ہیں۔ بھلا ایسا حرام کام کس طرح کر سکتے ہیں۔ مگر بھائی! گوشت کھلا پڑا رہے زیادہ دیر تو خراب ہو ہی جاتا ہے۔ اب تو ہمارے پاس بھی ختم ہو گیا ہے ورنہ اور دے دیتا۔ کوئی بات نہیں میں آپ کے پیسے واپس لوٹا دیتا ہوں۔"

اس کی بات پر ان دونوں نوجوانوں کا طیش کچھ کم ہوا۔ ٹیکے نے جلدی جلدی گلے سے پیسے نکال کر انہیں تھما دیے۔ وہ جس طنطنے سے آئے تھے اسی طرح واپس لوٹ گئے۔

فی زمانہ کوئی بھی دکان دار اتنا شریف نہیں ہوتا کہ خراب شے واپس لیتا تو در کنار اس کی پوری رقم بھی اتنی شرافت سے لوٹا دے۔

لیکن میں نے ٹیکے کے چہرے سے جس قسم کا خوف اور ڈر ابھرتے محسوس کیا تھا وہ کوئی اور ہی کہانی بتا رہا تھا۔ میری بھانپتی ہوئی نظروں نے اس کے چہرے سے کچھ ایسے ہی تاثرات مترشح ہوتے دیکھے تھے جیسے کسی کی چوری پکڑی جاتی ہو۔

میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں ایک آئیڈیا بنایا اور آگے بڑھا۔ آدھا کلو کڑھائی میں نے بھی پارسل کروالی اور گھر لوٹ آیا۔

عاصمہ کو میں نے وہ تھماتے ہوئے سختی سے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ "بہنا! اسے نہ فریج میں رکھنا اور نہ ہی اسے تم نے کھولنا ہے۔ بس کسی کھلی جگہ پر رکھ دو اور کل صبح مجھے ڈیوٹی پر جاتے ہوئے دے دینا۔"

وہ حیران ہو کر بولی۔ "لیکن بھائی جان! یہ ہے کیا؟"

میں جو کرنا چاہتا تھا وہ خاموشی سے کرنے کا عادی تھا اس میں عاصمہ اور نعیم کو شامل کر کے بلاوجہ پریشان نہیں کرتا تھا، لہٰذا سنجیدگی سے بولا۔ "بہنا! ابھی چھوڑو اس بات کو۔ بس وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔"

پھر اپنے کمرے میں آیا اور وقت دیکھا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ میں نے زنیرہ کے سیل فون پر میسج کیا۔ "میں آپ سے کل ملنا چاہتا ہوں۔"

میں سمجھا تھا وہ مجھے اس کا فوراً ریپلائی دے گی مگر ایسا نہ ہوا، اس نے کال ہی کر ڈالی۔

"خیریت؟" اس نے جیسے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھ لیا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو آپ سے معافی چاہوں گا کہ اس وقت آپ کو..."

"لیو اٹ۔ بتاؤ۔ کیا بات ہے۔" اس نے میری بات

کافی تو میں نے کہا۔

"آپ سے ایک چھوٹی مدد درکار تھی۔ میرے اتنی رسائی نہ تھی، خیر! میں نے کسی چیز کا کیمیائی تجزیہ کروانا تھا۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرسکتی ہیں؟"

"چیز کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کھانے کی کوئی چیز ہے۔"

"مقدار؟"

"آدھا کلو بکرے کے سالن کا گوشت ہے۔"

"اوکے، کام تو ہوجائے گا مگر یہ ہے کیا چکر؟"

"اس کی رپورٹ آنے کے بعد آپ کو بتاؤں گا۔"

"ہوں۔ لگتا ہے تمہاری طبیعت جاسوسی کی طرف مائل ہو رہی ہے۔" وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔ "رانا بشیر کے خلاف کوئی کلیو ملا ہے تمہیں؟"

"ابھی تو کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔"

"اوکے۔ اچھے جا رہے ہو۔ کل صبح میری آفس میں وہ دے جانا۔ میں کوشش کروں گی کہ شام تک اس کی تجزیاتی رپورٹ مل جائے۔"

"بہت شکریہ آپ کا۔" میں نے ممنون بھرے لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

میں زنیرہ سے بات کرکے مطمئن ہوگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ زنیرہ کے لیے یہ کام چنداں مشکل نہ ہوگا۔ کیسز کے سلسلے میں، میں نے اسے فرانزک رپورٹس وغیرہ میں اکثر سرگرم دیکھا تھا۔

اگلے دن میں خلاف معمول ذرا سویرے جاگ گیا۔ اڈے پر مجھے دس بجے پہنچنا ہوتا تھا۔ اس کے لیے میں صبح نو بجے ہی اٹھتا تھا مگر اب چوں کہ راجا رحیم کے آفس بھی جانا تھا اسی لیے سات بجے ہی جاگ گیا تھا، بہنا نے مجھے ناشتا بنا کے دیا اور پھر گوشت کا شاپر تھامے آٹھ بجے میں گھر سے نکل گیا۔

میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ بائیک لے رکھی تھی۔ اسی پر میں پہلے راجا رحیم کی آفس پہنچا، وہ تو ابھی نہیں آئے تھے جبکہ زنیرہ موجود تھی۔ اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا تھا۔ میں نے وہ مختصر سا پارسل اسے تھما دیا جسے اس نے سنبھال لیا، پھر مجھ سے بولی۔

"میں نے ابھی تک کوئی ایسا مربوط لائحہ عمل تو تیار نہیں کیا ہے، لیکن اُمید قوی ہے کہ آج یا کل تک میں اسے کر لوں گی، مگر مجھے لگتا ہے تم مجھ سے پہلے ہی کسی ڈگر پر چل پڑے ہو؟" اس نے پھر مجھے کریدنے کی کوشش چاہی۔

اگرچہ میں اس وقت کسی اور معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ میں اپنے اصل مشن سے ہٹ چکا تھا۔ یہ ناممکن بات تھی کہ میں نے اپنے باپ سے جو وعدہ کیا تھا اسے بھول جاتا۔ وہی تو میری زندگی کا ایک اہم مقصد تھا۔ ہاں البتہ ارشاد مٹھن والے معاملے کی اگر بات کی جاتی تو مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ مجھے آگے چل کر جن سماجی درندوں سے نبرد آزما ہونا تھا، ان میں ارشاد مٹھن جیسے لوگ یا اس سے بھی زیادہ خطرناک لوگوں سے میرا واسطہ پڑسکتا تھا جنھوں نے معاشرے کو ناسور بنا رکھا تھا۔ اور ارشاد مٹھن کا معاملہ میرے لیے ایک آزمائشی کیس تھا۔

میں نے جواباً مسکراتے ہوئے زنیرہ فاطمہ سے کہا۔

"ایسا ہی سمجھ لیں۔ میں جاسکتا ہوں؟" وہ الوداعی انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرادی۔ اگر میں اپنی زندگی کے درد انگیز دور سے نہ گزر رہا ہوتا تو مجھے یقیناً زنیرہ کی اس دلکش مسکراہٹ سے لطف اندوز ہونا چاہیے تھا۔

میں وہاں سے سیدھا لاری اڈے پہنچا۔ چند ضروری اور اہم کام نمٹانے کے بعد میں نے چائے منگوائی۔ جو یہیں بنا کرتی تھی۔ چاچا انور شاہ مجھے کچھ پریشان سے نظر آنے لگے میں یہی سمجھا شاید کل ہونے والی ٹرانسپورٹرز کی میٹنگ میں کچھ بدمزگی ہوئی ہوگی۔

استفسار کرنے پر کچھ اور ہی معاملہ نکلا۔ بولے۔ "یہ دنیا بھی کسی کو جینے نہیں دیتی۔ بس ہر کوئی ایک دوسرے کو اپنے مفادات اور ذاتی غرض کی بھینٹ چڑھانے کے درپے رہتا ہے۔ جیو اور جینے دو کا تو مقولا ہی لوگ بھول گئے ہیں۔ کر بھلا ہو بھلا جیسی سوچ بالکل ہی ناپید ہوکر رہ گئی ہے۔"

زمانے اور حالات نے چاچا انور شاہ کو بھی تلخ سا بنا دیا تھا۔ وہ بھی زمانے کی بے رحمیوں کے چکھے ہوئے تھے۔

بہرطور انہوں نے مجھے بتایا کہ لاری اڈے کو شہر سے باہر منتقل کرنے کی سازش کی جارہی تھی۔ میں نہیں سمجھ پایا تھا۔ مجھے دن ہی کتنے ہوئے تھے یہاں پر؟ تاہم میں نے اپنی محدود سوجھ بوجھ کے مطابق کہا۔ "تو کیا اس سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے چاچا؟"

"نقصان! بیٹا ہم سب بھوکے مر جائیں گے۔" وہ جیسے ہولناک لہجے میں بولے۔

"لاری اڈے کی منتقلی سے ہم چھوٹے ملازمین کو بہت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کیوں کہ جس جگہ ہمیں

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اڈا منتقل کرنے کا کہا جا رہا ہے۔ وہ شہر کے بالکل مضافات میں ہے۔

وہاں تک پہنچنے کے لیے لوگوں کو رکشوں اور بسوں کا اضافی کرایہ بھگتنا پڑے گا۔ تکلیف الگ اٹھانی پڑے گی۔ جبکہ ہم نے تو عام اور غریب آدمی کے لیے لاری جیسی سستی سواریوں کا بندوبست کر رکھا تھا کہ جو بے چارے لگژری کوچوں کے مہنگے اور منہ مانگے کرایوں کی استطاعت نہیں رکھتے وہ ہماری سستی سواری کا انتخاب کرتے ہیں۔ اب وہ بے چاری عوام کدھر جائے گی؟ ہمیں الگ نقصان ہوگا۔ ہمارے ٹرانسپورٹر چھوٹی سطح کے ہیں وہ یہ نقصان برداشت نہیں کر سکیں گے۔ آخر کار انہیں یہ سب چھوڑنا پڑے گا۔ اس سے کئی لوگ بیروزگار ہو جائیں گے۔"

"یہ تو بہت اہم ایشو ہے چاچا!" میں نے متفکر لہجے میں کہا۔ "ہمیں انتظامیہ کو یہ اہم نقطہ سمجھانا ہوگا۔"

"سب کچھ کر کے دیکھ لیا ہے۔" وہ بولا۔ "مگر ان کے سروں پہ تو جوں تک نہیں رینگتی۔"

"اور وہ بھلا کیوں ہماری بات سمجھیں گے؟"

"تو پھر اس سلسلے میں انتظامیہ کا کیا موقف ہے؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تو چاچا بولا۔

"اس ضمن میں وہ لوگ تو یہی کہتے ہیں کہ ہم نے یہ سب عام عوام کی بھلائی کے لیے ہی کیا ہے۔ کیوں کہ بیچ آبادی میں قائم یہ اڈا، کسی مجرمانہ سرگرمی کا شاخسانہ بن سکتا ہے۔ اور بھی نقصانات انہوں نے گنوا دیے تھے جو محض لغو بیانی کے سوا کچھ نہیں تھے۔"

"مجھے تو یہ کسی بڑے ہاتھی کی سازش لگتی ہے جس کا پاؤں ہم سے بڑا ہے۔" میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو چاچا انور شاہ بھی اپنے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"لگتا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے مگر۔" وہ تھما، پھر بولا۔ "خیر تم پریشان نہ ہو۔ ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد بڑے منشی کے ساتھ ایک اہم میٹنگ ہے، دیکھو۔ کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ تمہیں بھی شرکت کرنا ہوگی۔"

میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

میں اپنی میز پر آ بیٹھا۔ مگر اس نئی صورت حال پر میں بھی پریشان سا ہو گیا تھا۔ نوکری میری ضرورت تھی۔ اور مجھے یہاں سے اچھی خاصی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ پھر چاچا انور بھی یہاں چھوٹے منشی تھے اور میرا خیال رکھتے تھے۔

معاملہ اصل کیا تھا۔ اڈے کی منتقلی کے پیچھے کیا واقعی سازش تھی یا پھر مقامی انتظامیہ کو اس میں شہر کی غریب عوام کی کوئی بھلائی مقصود تھی، جس کی ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

اس اڈے میں تقریباً دو ڈھائی سو چھوٹے بڑے ملازمین روزگار سے لگے ہوئے تھے۔ ان سب کا روزگار داؤ پر لگ سکتا تھا۔ بلکہ لگ چکا تھا۔ خود میں بھی پریشان تھا۔ اگر یہ نوکری بھی ہاتھ سے چلی جاتی تو میں کیا کرتا؟ پہلے ہی نوکری کا کال تھا۔ یہ تو چاچا انور شاہ کی مہربانی کی بدولت میں یہاں اچھی جاب سے لگا ہوا تھا۔ پھر عاصمہ اور فہیم تھے، اگرچہ مقدور بھر وہ بھی کما رہے تھے۔ مگر میری یہ نوکری جانے سے گھر کے چولہے کی "خدمت" ماند پڑ سکتی تھی۔ جس پر ہم تینوں یتیم بہن بھائیوں کی زندگی کی ہانڈی کندن بن رہی تھی۔ ظاہر ہے میں اس زندگی کو کندن بنتا ہی کہوں گا۔ جو ہمیں خالصتاً جینے کا ڈھنگ سکھا رہی تھی۔ اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ۔

ہم جیسے عام طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والوں کی مثال، کند ہم جنس، باہم جنس پرواز جیسی ہی تھی کہ جن کی کسی اعلیٰ تک رسائی نہیں ہوتی، ہم نے جو کرنا ہوتا ہے وہ اپنے بل بوتے پر، اپنے محدود رسائی تک ہی کرنا ہوتا ہے۔

آ جا کر ہمارے ایک سچے خیر خواہ چاچا انور شاہ ہی تھے۔ ہاں! ازنیرہ بھی تو تھی۔ مگر دیکھا جاتا تو ان دونوں کی بھی کیا حیثیت تھی؟ ہمارے اس اقربا پرور معاشرے میں، جو اپنی بے حسی کی وجہ سے اعلیٰ و ادنیٰ میں بٹ چکا تھا۔ اس میں ہم جیسوں کی کیا حیثیت تھی۔ بڑی مچھلیاں اپنا پیٹ بھی ہم جیسوں کو کھا کر بھرتی تھیں۔ ہم جیسے لوگ ان کی خوراک تھے۔ اور میں نے کم از کم یہ تہیہ تو اپنے اندر کر ہی رکھا تھا کہ خود کو نہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو، ان بڑی مچھلیوں کی خوراک کبھی نہیں بننے دوں گا۔

بڑے منشی کی میٹنگ میں شرکت کی تو اس کے اختتام تک میں ان کے کسی بھی ایجنڈے سے متفق نہیں تھا۔ اگر چاچا انور شاہ نے مجھے میٹنگ میں بولنے اور اپنی رائے دینے سے منع نہیں کیا ہوتا تو۔ میں بڑے منشی کی ہر بات سے اختلاف کرتا۔ اس بڑے منشی کا نام۔ وادن خان تھا۔ یہ وادو کا رہنے والا تھا اور وہ اس کا آبائی شہر تھا۔ یہاں ملیر میں اس نے ایک گھر لے رکھا تھا۔ اور بال بچوں والا تھا۔

بڑے منشی کی معیت میں ہونے والی اس میٹنگ میں بڑے جارحانہ قسم کے فیصلے کیے گئے تھے۔ یعنی بات چیت

اور شہری انتظامیہ سے پُرامن مذاکرات کی بجائے ان سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا جس میں ہنگامہ اور نقصِ امن پیدا کرنے کی کوشش بھی شامل تھی۔

میں نے بڑے غور سے بڑے منشی کی جارحانہ تقریر سنی تھی اور مجھے یہ بات محسوس ہوئی تھی کہ وہ اپنے اس جارحانہ ایجنڈے میں بار بار اسی بات پر ہی زور دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہمیں اپنے حقوق کے لیے، سب کو ڈنڈے سونٹوں کے ساتھ انتظامیہ اور سرکاری اہلکاروں کے سامنے ڈٹ جانا ہوگا۔ آخر تنگ آ کر انتظامیہ خود ہی اپنے اس غاصبانہ فیصلے سے ہٹ جانے پر مجبور ہو جائے گی۔ مگر میں اس سے بالکل بھی اتفاق نہیں رکھتا تھا۔ کیوں کہ میرے نزدیک یہ انتظامیہ یا ان لوگوں کا جو اس سازش میں شریک تھے، کا کام آسان کرنے والی بات تھی۔

جب میں نے اس کا اظہار چاچا انور شاہ سے کیا تو انہیں بھی اپنا حامی پایا اور مجھے بتایا کہ بعد میں انہوں نے اپنے ''بڑے بھائی'' یعنی بڑے منشی دادن خان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، جس کا حسبِ توقع الٹا اثر ہوا تھا، اور دادن خان نے انہیں بڑی بے نقط سنا دی تھی۔

یہ سن کر مجھے بڑے منشی پر غصہ تو بہت آیا تھا۔ وہ تھا بھی بدمزاج اور بدتمیز قسم کا۔ اسی لیے چاچا انور شاہ مجھے اس سے کم ہی سامنا کرنے کی نصیحت کرتے رہتے تھے۔

اس میٹنگ کے فوراً بعد بڑے منشی کے حکم کے مطابق سب نے اپنے اپنے طور پر ڈنڈے، سونٹے اور پتھر اکٹھے کرنا شروع کر دیے۔ تاکہ انہیں یہاں سے زبردستی بے دخل کرنے کے لیے جو بھی سرکاری اہلکار آئے، ان پر چڑھ دوڑیں۔

اس صورتِ حال نے مجھے ہی نہیں چاچا انور شاہ کو بھی پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ پتا نہیں اب یہ ''ٹاکرا'' کب اور کس دن ہونے والا تھا۔ البتہ چاچا انور شاہ نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ میں بروقت یہاں سے کھسک جاؤں۔

شام ہوئی تو اس ایک نئی پریشانی سے میرا دماغ بوجھل اور اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔

میں ابھی وہاں سے رخصت ہی ہونے کو تھا کہ میرے سیل پر زنیرہ نے فون کر کے بتایا کہ میں آج صبح اسے جو گوشت دے کر گیا تھا۔ اس کی کیمیائی رپورٹ آ چکی ہے اور بڑی سنسنی خیز رپورٹ ہے۔ ''یہ آخر معاملہ کیا ہے۔ نعمان! کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟''

میں نے لاری اڈے سے گھر جانے کی بجائے سیدھا ایڈووکیٹ راجا رحیم کے چیمبر کا رخ کیا تھا۔ اور زنیرہ کے کمرے کا ہی رخ کیا تھا۔ وہ میری ہی منتظر تھی۔ اس کی میز پر ایک بڑا سا مہر بند لفافہ رکھا تھا جو اب کھولا جا چکا تھا۔ اس پر پہلے تو زنیرہ نے معذرت کرنی چاہی تھی، جبکہ میں نے ایک دوستانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ تب وہ مجھ سے یہ بولی تھی اور میں دبے دبے جوش سے مسکرا کے بولا۔ ''آپ سے میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ پہلے مجھے بتائیں تو۔ رپورٹ کیا ہے؟''

میری بات پر زنیرہ نے مجھے جو بتایا اسے سن کر میرا دل بے پایاں مسرت سے دھڑک اٹھا تھا۔ میری کم مائیگی کے باوجود، تقدیر مجھے ان سماجی درندوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور عقل بخش رہی تھی۔

رپورٹ نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ارشاد منن ایک عرصے سے اپنے ڈھابہ نما ہوٹل پر بکرے کے نام پر گدھے کا گوشت فروخت کر رہا تھا۔

میں نے زنیرہ کو اصل حقیقت بتا دی اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایک عجیب سے جوش تلے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ بولی۔

''نعمان! اٹس سو گریٹ۔ تم نے اپنی عقل اور سوجھ بوجھ سے اپنے ایک دشمن کے خلاف جو جال بچھایا تھا، اس میں تم سو فیصد کامیاب رہے۔ اب تو مجھے پوری امید ہے کہ تم اپنی اسی ذہنی فراست اور سمجھ کو ان لوگوں کے خلاف بھی کرو گے، جو تمہارے اصل مجرم ہیں۔''

میں اس کی بات سن کر اور پورے اعتماد سے مسکرایا تھا۔ پھر میز سے لفافہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا سوچا تو اس کی تنبیہ یاد آگئی۔ اس نے مجھے سختی سے منع کر رکھا تھا اور ایک دن ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''یہ تمہارا بار بار شکریہ ادا کرنا اب مجھے پہاڑہ رٹنے جیسا محسوس ہوتا ہے۔ پلیز۔ اب ایسا نہ کرنا۔''

بلاشبہ اس کی اس تنبیہ میں ایک دوستانہ پن محسوس ہوتا تھا مجھے۔ اور میں بے اختیار ہنس دیتا تھا۔ اگرچہ وہ مجھ سے تین چار سال کے فرق سے بڑی تھی۔ اور تعلیم اور عہدے سے کسی قدر معتبر بھی، لیکن کبھی بھی اس نے میرے ساتھ کوئی غرور آمیز برتاؤ یا بات نہیں کی تھی۔

میں بولا۔ ''زنیرہ صاحبہ! بے شک آپ کی باتوں سے مجھے اپنا حوصلہ بڑھتا ہوا ہی محسوس ہوتا ہے۔''

''اب تم مجھے زنیرہ صاحبہ بھی کہنا چھوڑ دو۔'' وہ کومل سی مسکراہٹ سے بولی۔ میں جھینپ گیا مگر مجھے آج اس کی یہ مسکراہٹ اجنبیت سے مانوسیت کی طرف جاتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ شاید میری دانش مندی سے کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ رہی تھی۔

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ وہ خبیث اور بلیک میلر ارشاد مٹن والا قانون کے چنگل سے نہ بچ پائے، اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو اپنی اس قبیح حرکت کے باعث کم از کم اتنا بدنام تو ضرور ہو ہی جائے کہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہے۔''

وہ خاموش مگر بھیدوں بھری نگاہوں سے میرے اندر کے جوش اور ابال کو تولتی رہی پھر بولی۔ ''ہاں! ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اور ایسا ہی ہوگا۔'' میرا عزم اور میرا جوش جیسے اس کے ساتھ مماثل ہونے لگا۔ اس نے اس کی صراحت بتاتے ہوئے اضافہ کیا۔

''اپنے پیشے کی مجبوری یا رعایت سے میری میڈیا میں اچھی جان پہچان ہے۔ ایک نجی ٹی وی چینل ایسا ہی ایک پروگرام کرتا ہے۔ جس میں کھلے عام ارشاد مٹن جیسے ناسوروں کو براہ راست اپنے کیمرے کی آنکھ سے عوام الناس کو اس کے کالے کرتوت دکھائے جاتے ہیں۔ سزا اور جیل، لگ ہوتی ہے۔''

میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''میں نے بھی ٹی وی پر بعض ایسے پروگرام دیکھے ہیں، اگر ایسا جلد ہو جائے تو بہت بہتر ہوگا۔''

اسی شام میں رات تک بہت مسرور سا گھر پہنچا۔ زنیرہ نے مجھے بتایا تھا کہ ارشاد مٹن کا دھڑن تختہ کرنے والے۔ پہلے اپنے طور پر بھی ریکی کریں گے کہ آخر یہ گدھے کا گوشت ارشاد مٹن کو ملتا کہاں سے ہے۔ وغیرہ۔

بہر طور۔ میں مطمئن تھا۔ کیوں کہ ارشاد مٹن والا بہت جلد اپنے انجام کو پہنچنے والا تھا۔

میں گھر پہنچا تو فہیم نے مجھے بتایا۔ ''اس بدبخت نے دو بار اپنے ڈھابے سے چھوکرا بھیجا تھا۔ آپ کو بلوانے کے لیے۔'' میں جان گیا کہ فہیم کسے بدبخت کہہ رہا تھا۔'' آخر میں اس کا چھوکرا یہ پیغام چھوڑ گیا تھا کہ آپ جیسے ہی گھر آئیں۔ تو ہوٹل پر پہنچ جائیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں کھانا کھا کے مل آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور عاصمہ کو کھانا لگانے کا کہا۔

''نہیں بھائی جان! کیا اس کمینے آدمی سے ملنا ضروری ہے؟'' فہیم نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ تو میں نے کسی خیال کے تحت اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے پوچھ لیا۔

''تم نے اس کے چھوکرے سے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہہ دی تھی؟''

''نہیں بھائی جان! مجھے آپ کی نصیحت یاد تھی۔'' وہ بولا۔

''شاباش! اچھے بچے ہو تم'' میں پیار سے مسکرا کے بولا۔

''لیکن بھائی جان! آپ ان سے ملنے نہ جائیں۔ ہم کیا اس کے نوکر ہیں۔ مجھے پتا ہے وہ بھاجی بلیک میلر آپ سے کیا بات کرے گا؟''

''مجھے بھی پتا ہے۔''

''اس کے باوجود آپ اس سے ملنے کے لیے جا رہے ہیں؟''

''ہاں!''

''اس طرح تو یہ خبیث ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔''

''بہت جلد یہ ہمارا ہی نہیں بلکہ اس محلے والوں کا بھی پیچھا چھوڑنے والا ہے۔ تم دیکھتے جاؤ۔ بس۔'' یہ کہہ کر میں کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

کھانا کھا کر میں چہل قدمی کے انداز میں ارشاد مٹن والا کے ڈھابے پر پہنچ گیا۔ حسب توقع وہ مجھ سے بڑے پُرغرور اور اکھڑ پن سے ملا اور آنکھیں چڑھا کر مجھ سے اس طرح مخاطب ہوا جیسے میں اس کے ڈھابے پر کام کرنے والا کوئی ملازم ہوں۔ میں بھی اچھے وقت کے انتظار میں ضبط و تحمل سے کام لے رہا تھا۔

''کیوں بے! کب کر رہا ہے مکان میرے حوالے؟ دیر کرے گا تو پہلے ڈیڑھ سے ایک لاکھ ہوا تھا اب کے پچاس ہو جائیں گے۔ لینے کو تو میں مفت میں بھی لے سکتا ہوں تجھ سے۔''

ایک جاہل آدمی کا مجھ جیسے پڑھے لکھے انسان سے اس طرح کا رویہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ قرب قیامت کی یہ بھی ایک نشانی تھی کمینہ، احمق اور جاہل شخص معزز کہلانے لگے گا۔ اگر میں برداشت سے کام نہ لیتا تو میرے لیے ہی نہیں یہ میرے چھوٹے بہن بھائی کے لیے بھی برا

ہوتا، جبکہ میں پہلے ہی اس مردود ارشاد مٹن کی قبر کھود چکا تھا۔ لہٰذا اب بات بڑھانے اور ایک کتے کے منہ لگنے کا کیا فائدہ؟ میں نے کہا۔ ''ارشاد بھائی! بس اب ایک دن کی مہلت اور دے دیں۔ نیا کرائے کا گھر اور شفٹنگ میں کچھ تو وقت لگتا ہی ہے۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ مگر یاد رکھنا۔ ایک دن سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''ارشاد بھائی! اب اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ اب آپ کو ہی دینا ہے گھر۔ بے فکر رہیں۔'' میں یہ کہہ کر چلا آیا۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج، محلے والوں کے لیے بڑی سنسنی خیزی لے کر طلوع ہوا تھا۔

وہ دن بھی میری چھٹی کا تھا۔ میں گھر پر ہی تھا۔ ابھی شام کے پانچ ہی بجے تھے کہ محلے میں شور سا مچ گیا۔ عاصمہ گھر پہ محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی اور فہیم بھی باہر ہی تھا۔ میں اپنے گھر سے نکلا اور گلی سے باہر آ گیا۔

محلے میں، بالخصوص ارشاد مٹن کے ڈھابے کے باہر اخباری رپورٹر، جو لائیو کوریج میں مصروف تھے، ان کے ہمراہ انتظامیہ کے سرکاری اہلکار اور اسسٹنٹ کمشنر بھی موجود تھے۔

ارشاد مٹن کا پول کھولا جا چکا تھا اور اب وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا۔ اس کی حالت بڑی دیدنی حد تک قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ محلے والے بھی اسے جوتے پھینک پھینک کر مار رہے تھے، اور محلہ کمیٹی کے صدر حاجی کریم بخش نے تو اس کی گردن تک دبوچ رکھی تھی۔ اور ہاتھ میں ان کے جوتا تھا۔ ''ابے نا ہنجار! تو ہمیں بکرے کے نام پر اب تک گدھے کا گوشت کھلاتا رہا۔ لعنت ہے تجھ پر بے شمار۔ آخ تھو۔''

غرضیکہ۔ ارشاد مٹن کی ٹھیک ٹھاک سے بھی زیادہ دھنائی ہوگئی۔ اسے بڑی کڑی سزا ملنے کی پوری توقع تھی۔ پولیس اسے گرفتار کر کے اپنی موبائل میں بٹھا کے لے گئی۔ اس کا ڈھابہ ہمیشہ کے لیے سیل کر دیا گیا۔

پورے محلے میں اب ارشاد ایک قابلِ نفرین شخص بن چکا تھا۔ اس کے گھر والے بھی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے تھے۔

''خس کم جہاں پاک'' میں ہولے سے بڑبڑاتا ہوا گھر آ گیا۔

فہیم لوٹا تو اسے بھی گھر واپسی تک ساری حقیقت کا پتا چل چکا تھا۔ وہ خوش اور حیرت زدہ سا گھر میں داخل ہوا اور مجھ سے بولا۔ ''بھائی جان! آپ کو معلوم ہے باہر ہر طرف اس رذیل انسان ارشاد مٹن پر تھو تھو ہو رہی ہے؟''

میں اس وقت اپنے کمرے میں چارپائی پر نیم دراز کسی اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بولا۔ ''ہاں! مجھے معلوم ہے۔ بلکہ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا۔''

اس اثناء میں عاصمہ بھی اندر آگئی تھی۔ میں معنی خیز انداز میں یہ کہتا ہوا اخبار لپیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ میری بات پر فہیم کو ایک حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ اور وہ میری طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے۔ بولا۔ ''تت۔ تو کیا۔ یہ آپ نے۔''

''ششش۔ شی شی۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے انگلی سے اشارہ کیا اور۔ وہ بھی ہنس پڑا اور بولا۔

''بھائی جان! یو آر جینئس۔'' میں مسکرا دیا۔ اور قریب کھڑی عاصمہ بھی ہنسنے لگی۔

یہ اس سے اگلے دن کی صبح کا ذکر تھا۔ میں گھر سے ڈیوٹی جانے کے لیے نکلنے لگا تو گلی میں ہی مجھے حاجی کریم بخش مل گئے،، میں نے انہیں اخلاقاً سلام کیا۔ انہوں نے بھی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ وہ چہرے سے کچھ شرمسار سے نظر آ رہے تھے۔ بولے۔ ''بھئی نعمان میاں! ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا۔ ہم بھی اس ناہنجار ارشاد کی باتوں میں آ گئے تھے، کم بخت ہمیں گدھے کا گوشت کھلاتا رہا۔''

''ارے نہیں۔ ایسا کہہ کر آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ باقی جھوٹ تو نہیں چھپتا۔ سچ پوچھیں تو مجھے پہلے ہی اس پر شبہ تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اب بھلا کوئی بتائے اس مہنگائی کے زمانے میں اتنا سستا اور وہ بھی بکرے کا گوشت۔ بھلا یہ ممکن ہے۔''

''ہاں بھئی۔ بس! ہماری ہی آنکھوں میں پٹی بندھ گئی تھی۔'' وہ بولے۔ ''ورنہ تو اللہ بخشے تمہارے باپ احمد حسین کی شرافت سے کون واقف نہیں، تم لوگ اتنے عرصے یہاں رہتے چلے آ رہے ہو۔ کبھی کوئی شکایت کا موقع تک نہیں دیا۔''

میں نے حاجی صاحب کی خیر خواہی چاہی اور پھر انہیں ارشاد مٹن کی بلیک میلنگ سے آگاہ کر دیا۔ وہ پھر

شرمساری سے بولے۔ ''بس نعمان بیٹے! ہماری ہی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی کہ اس کمینے کی چال نہ سمجھ سکے۔ سچ پوچھو تو اس ناہنجار اور بدبخت انسان کا تو نام لینے سے ہی جی متلی کرنے لگتا ہے۔''

''بس جی دفع کریں اب اس موضوع کو بھی۔ آپ تشریف لائیں ناں گھر پہ۔ آپ کو چائے پلاؤں؟''

''بہت شکریہ بیٹا! پھر کسی وقت چلتا ہوں۔ جیتے رہو۔''

وہ کہتے ہوئے آگے کی راہ ہو لیے اور میں سید عالا لاری اڈے جا پہنچا۔

لاری اڈے کی تو فضا ہی مجھے بدلی ہوئی محسوس ہوئی، جیسے میں کسی جنگ کے میدان میں آگیا ہوں۔ ہر کسی نے اپنے اپنے پاس ڈنڈے، ہاکیاں اور بڑے بڑے پتھر سنبھالے رکھے تھے۔ یہاں تک کہ میں نے دو تین کے پاس ٹی ٹی پسٹل تک دیکھے۔ ایسا ماحول یہاں کا بنتا دیکھ کر مجھے ایک تشویش آمیز پریشانی نے گھیر لیا۔ جب میں چاچا انور شاہ سے ملا تو وہ بھی مجھے کچھ کم پریشان دکھائی نہ دیے۔ وہ میرے ہی کمرے میں تھے۔

''چاچا! یہ سب کیا ہے؟ اس طرح تو معاملہ اور بگڑ جائے گا؟'' میں نے کہا تو وہ خود بھی پریشانی سے بولے۔

''میں خود کب اس کا قائل ہوں؟ مگر کیا کریں یہ بڑے منشی کا حکم ہے۔''

''یہ ان کا غلط حکم ہے۔ ہمیں انہیں سمجھانا چاہیے۔ وہ اس طرح ہم سب کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

انور شاہ بولا۔ ''یار! مجھے تو تیری فکر ہو رہی ہے۔ تو ایک کام کر۔ کچھ دنوں کے لیے خود کو بیمار ظاہر کر کے چھٹیاں لے کر گھر بیٹھ جا۔'' وہ مجھے اکثر بے تکلفی سے یار بھی کہہ دیا کرتے تھے۔

میں نے ان کی بات سے اختلاف کیا۔ بولا۔ ''نہیں چاچا! یہ مسئلے کا حل تو نہیں ہوگا۔ ہمیں اس کا حل ڈھونڈنا ہو گا۔ میرا خیال ہے ہمیں ضلعی صدر عطا محمد سے ملنا چاہیے۔ وہ ایک سلجھا ہوا سمجھدار آدمی ہے۔ وہ شاید ہماری بات سمجھ لے اور بڑے منشی کو لگام ڈال دے۔''

چاچا انور شاہ نے غور کرنے والے انداز میں میری طرف دیکھا پھر اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''بات تو تمہاری بھی غلط نہیں ہے۔ مگر اس طرح بڑا منشی وادن خان برا مان جائے گا اور پھر تم جانتے ہو ہم یہاں اسی کے حکم تلے رہتے ہیں، وہ ہمیں ہر بات پر اپنی نظروں میں رکھے گا اور کینہ پروری پر اتر آئے گا۔''

''مگر یہ اس بڑی آفت سے بدرجہ بہتر ہو گا جو یہاں ڈھائی تین سو افراد پر کسی بھی وقت ٹوٹنے والی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ ایسا کریں۔ میں خود ان سے مل لیتا ہوں۔ آپ نہ جائیں۔ بعد میں منشی پوچھے تو کہہ دینا، آپ کے علم میں تھا ہی نہیں۔ وہ مجھے نظروں میں رکھے گا نا۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔''

''اوہ نہیں یارا! میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ اس طرح تیری بات میں وہ وزن نہیں ہوگا۔''

ہم نے بلا دیر۔ ٹرانسپورٹ کے صدر عطا محمد سے ملاقات کی۔ میں اس سے پہلے کبھی ملا تو نہیں تھا اور نہ ہی مجھے کبھی براہ راست اس سے بات کرنے کا موقع بھی ملا تھا لیکن میں اسے دیکھ چکا تھا۔ ویسے وہ واقعی ایک بھلا مانس آدمی تھا۔ جسم کا بھاری اور مناسب قد و رنگ گورا تھا۔ سگریٹ بہت پیتا تھا۔

ہم اس کی رہائش گاہ پر جا کے اس سے ملے تھے۔ جو قائد آباد میں واقع تھی۔ دو سو چالیس گز پر اس کا دو منزلہ بنگلا نما مکان تھا۔ سن رکھا تھا کہ اس نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ بچے کتنے تھے؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔

میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ اس سے کیا بات کرنا تھیں۔

وہ بڑے تپاک انداز میں ہم سے ملا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ چاچا انور شاہ کی بے حد عزت کیا کرتا تھا۔ بہر طور۔ موجودہ صورت حال پر وہ بھی پریشان تھا۔

ہم اس کی رہائش گاہ کی پُرتزئین نشست گاہ میں بیٹھے تھے اور کمرے میں اے سی آن تھا۔

مختصر سے رسمی کلمات کے بعد ہم نے فوراً مطلب کی بات چھیڑ دی۔ اس سے پہلے انور شاہ نے میرا اس سے مختصر تعارف بھی کروا دیا تھا۔

''وادن خان نے یہ قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے اس کی اجازت لے رکھی تھی۔''

عطا محمد نے گولڈ لیف کا ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے انور شاہ کی پوری بات سننے کے بعد کہا۔ اور ایک گہرا کش بھی لیا۔

''مگر عطا صاحب! یہ طریقہ تو درست نہیں ہے۔ اس میں ہمارے ہی آدمیوں اور ملازموں کی سر پھٹول ہو سکتی

ہے۔ گرفتاریاں بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔" انور شاہ نے پرزور لہجے میں کہا۔ میں دانستہ ابھی خاموش تھا اور منتظر تھا کہ کب انور شاہ گفتگو کو اس نہج پر لاتا ہے جب میرے بولنے کی باری ہوگی۔

"ہم مذاکرات بھی کر کے دیکھ چکے ہیں انتظامیہ کے افسران سے۔" عطا محمد نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لگا کر کہا۔ "مگر ان کے سر پہ جوں تک نہیں رینگی۔ آخر کار ہمارے پاس ایک ہی جارحانہ راستہ بچا تھا انتظامیہ پر دباؤ ڈالنے کا۔"

"اگر یہی دباؤ عوام کی طرف سے ڈالا جائے تو اس کے بہتر نتائج سامنے آنے کی امید بندھ سکتی ہے۔ اور یہی طریقہ کارآمد بھی ہوگا۔ بجائے اپنے ہی ملازمین کے ہنگامہ کرنے کے۔" بالآخر میں نے موقع ملتے ہی لب کشائی کی تو عطا محمد میری طرف بہ غور دیکھنے لگا۔ پھر ہولے سے مسکرایا۔ سمجھنے لگا تھا وہ شاید کہ اصل بات چیت کرنے اس سے میں ہی آیا ہوں۔ بولا۔

"تمہاری بات بھی غلط نہیں ہے نوجوان! سچی بات تو یہی ہے کہ بڑے منشی دادن خان کو بھی میں نے یہی مشورہ دیا تھا۔ لیکن اس نے اس پر بہت وقت اور خرچا لگنے کا کہہ کر مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ اپنے ملازمین کو کسی بلوے میں جھونکنے کا تو میں بھی قائل نہیں ہوں۔"

"آپ یہ کام مجھے سونپ دیں جناب عطا صاحب! میں اسے کم سے کم مدت اور اخراجات میں کرلوں گا۔" میں نے فوراً ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ تو عطا ہی نہیں انور شاہ بھی میری طرف چونک کر دیکھنے لگا۔ اسے تو یہ امید ہی نہیں تھی کہ میں اتنی بڑی بات کہہ جاؤں گا۔ جبکہ میں بہت پہلے ہی اپنے ذہن رسا میں ایک لائحہ عمل تیار کر چکا تھا۔ اور اسی کے مطابق ہی عطا محمد سے بات کر رہا تھا۔

اس کمرے سے شاید ایک دوسرا کمرا بھی متصل تھا۔ جس کا دروازہ تھوڑا وا تھا اور وہاں ایک دبیز پردہ جھول رہا تھا۔ چوں کہ وہ عطا محمد کی عین پشت کے پیچھے تھا، اسی لیے اس سے بات کرنے کے دوران میری ایک دو بار غیر ارادی نظریں اس طرف بھی اٹھی تھیں، مجھے وہ پردہ تھوڑا ہلتا ہوا محسوس ہوا تھا، میں یہی سمجھا تھا کہ اندر چلنے والے کسی پنکھے کی ہوا سے ہل رہا ہوگا۔

"نوجوان! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟" وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"نعمان احمد۔"

"ہاں نعمان! اگر ایسا تم کر سکتے ہو تو پھر سمجھو تم نے میری آدھی پریشانی ہی ختم کر والی۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوگا جناب چیئرمین صاحب!" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ اسی دوران پھر میری ترچھی نظریں، غیر ارادی طور پر مذکورہ کمرے کے پردے کی طرف پل بھر کو اٹھی تھیں اور اس بار تو مجھے کسی سائے کی جھلک بھی محسوس ہوئی تھی، میں نے کوئی توجہ نہ دی۔

"اس سلسلے میں تمہیں کتنے دن اور کتنے اخراجات درکار ہوں گے؟" عطا نے سگریٹ کا کش لیا۔

"آپ پہلے رقم کا بتائیں۔ کتنی دے سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ سے زیادہ دو لاکھ۔" وہ بولا۔

"آپ صرف ایک لاکھ کا بندوبست کرلیں۔ میں یہ کام دو دنوں کے اندر اندر انجام دے ڈالوں گا۔" میں نے بھرپور اعتماد سے کہا۔

انور شاہ کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ جبکہ عطا محمد کے چہرے اور پریشانی کی سلوٹیں عنقا ہونے لگی تھیں اور وہ خاصا اور پُراُمید نظر آنے لگا تھا۔ تاہم مجھے بار بار وہ جانچتی ہوئی سی نظروں سے بھی دیکھ رہا تھا۔

"تم وہی کرنا چاہتے ہو جو میں بھی چاہتا تھا۔ اسی لیے میں تمہیں دو لاکھ ہی دوں گا۔ مگر یہ کام کامیابی سے اور بر وقت ہونے کا متقاضی ہے نوجوان۔" وہ بولا۔

"میری کوشش ہوگی کہ میں کم سے کم مدت میں اور کامیابی سے یہ کام نمٹا لوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن آپ خدا کے لیے بڑے منشی دادن خان کو منع کردیں کہ وہ ایسا غلط قدم نہ اٹھائے۔ اس سے معاملہ مزید بگڑ جائے گا۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں ابھی خود تمہارے ساتھ اڈے پر چلتا ہوں اور جیسا تم کہو گے سب ویسا ہی کریں گے۔ دادن خان کو بھی میں تمہاری مدد کے لیے شامل کرنے کا حکم دوں گا۔"

"ایک آخری بات عطا صاحب!" میں نے کہا تو وہ فوراً اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے قدرے جھکا اور اپنی سگریٹ سامنے میز پر دھری ایش ٹرے میں مسلنے لگا، تب ہی مجھے اس پردے کے مہین کناروں کے ساتھ کسی کی گوری مخروطی انگلیوں کی جھلک دکھائی دی اور۔ میرے سینے میں

پہلی بار اچھل پتھل سی ہونے لگی۔

سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ ہاں۔ نوجوان! بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ اب مجھ سے خاصا مطمئن نظر آرہا تھا۔

میری نظریں اب پردے سے ہٹ کر عطا محمد کے چہرے پہ ثبت ہوگئی تھیں۔ بولا۔ ''جناب! کیا آپ نے اس گمبھیر مسئلے کے پس منظر میں یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ یہ کسی کی شرارت بھی ہوسکتی ہے۔ پتا تو چلے۔ ہوسکتا ہے کسی سربرآوردہ شخصیت نے انتظامیہ کو اکسایا ہو؟ کیوں کہ عموماً ایسا ہوتا رہا ہے کہ اس طرح کے سرکاری محکمے بلا کسی سبب اتنا بڑا اسٹینڈ نہیں لیتے۔ جب تک کوئی انہیں اپنے ذاتی مفادات کے لیے اکسائے نہیں۔''

''خدا کی قسم نوجوان! تم بالکل ٹھیک سمت پر سوچ رہے ہو۔'' عطا محمد میری بات سن کر ایک دم جوش سے بولا۔ اور ایک نئی سگریٹ سلگالی۔ ''کیوں کہ مجھے بھی اس بات کا پورا شبہ تھا کہ یہ کسی کی شرارت ہی ہوسکتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے میں اس کا کھوج نہ لگا سکا اور پھر میری توجہ بھی اس طرف کم ہی رہی، مگر تم نے آج میرے منہ کی بات چھین لی۔''

''عطا صاحب! یہی ہمارے مسئلے کا اصل حل ہے۔'' میں نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ اور اس بار حد درجہ پردے کی جانب دیکھنے سے اجتناب ہی برتا کہ میری نظریں غیرارادی طور پر بھی اس طرف نہ اٹھیں۔

''جب تک وہ آدمی بے نقاب نہیں ہوگا۔ اس مسئلے کی تلوار ہمارے سر پر جھولتی رہے گی۔ وہ پردے میں چھپا اپنی کٹھ پتلیاں ہلاتا رہے گا اور ہمیں پریشان کرتا رہے گا۔ میں ابھی تو فوری طور پہلے مرحلے کو کامیاب بنانے کی کوشش کروں گا اس کے بعد ہی اس بات کا کھوج لگانے کے لیے کوشاں رہوں گا۔ ویسے اگر اس کے پیچھے کسی اہم شخصیت کا ہاتھ نہ بھی ہوا تو ہمارا پہلا مرحلہ کامیاب ہوتے ہی سارا معاملہ خود ہی حل ہوجائے گا۔''

میری بات پر لاری اڈا ٹرانسپورٹ کا صدر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار مجھ سے بغل گیر ہوگیا۔

''تم بہت ذہین ہو نوجوان! لیکن حیرت ہے مجھے کہ تمہارے جیسے پڑھے لکھے اور ذہین آدمی کو انور شاہ نے کلرکی کی اتنی چھوٹی پوسٹ پر کیوں رکھا ہے؟'' اس نے انور شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کھڑا ہوگیا تھا، جلدی سے خوش ہوکر بولا۔

''جناب! پھر آپ اسے منشی لگادو ناں۔''

مجھے چاچا انور شاہ کا اس طرح بولنا اچھا نہیں لگا۔ مجھے کچھ ''آک ورڈ'' سی حرکت محسوس ہوئی تھی یہ۔

''ہرگز نہیں۔ منشی بھی اس جیسے ذہین اور قابل انسان کے لیے کافی نہیں ہوگی۔ بہرحال ہم سوچیں گے تمہارے لیے۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

''نوجوان! میں سمجھتا ہوں تمہیں بھی اچھی طرح ہمارے نقصان کا اندازہ ہے۔ بلکہ یہ ایک مشترکہ نقصان ہے۔ ہم سب کی بربادی ہی سمجھ لو۔ اور مجھے بھی یہ ایک گہری چھپی ہوئی سازش ہی لگتی ہے۔ اڈے کی منتقلی ہم سب کی بربادی ہے۔ اگر تم نے ہمیں اس بحران سے نکال دیا تو یہ تمہارا ایک بڑا کارنامہ ہی نہیں بلکہ ہم سب پر احسان بھی ہوگا۔'' وہ رکا اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ''بیٹھو۔ میں تو اس قدر پریشان تھا کہ کچھ کھانے پینے کا پوچھنا ہی بھول گیا۔''

''نہیں جناب! اس کی ضرورت نہیں۔ پھر کبھی سہی۔ آپ بس اب ہمیں اجازت دیں، ہم نے ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔'' میں نے کہا۔ وہ خود بھی گوں ناگوں حالات کے باعث پریشان تھا۔ لہٰذا وہ بھی اسی وقت ہمارے ساتھ لاری اڈے پر چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔

نرم نرم سی گداز اور گوری مخروطی انگلیوں کا میٹھا تصور ہنوز میرے اندر چٹکیاں لے رہا تھا۔ حسن مخفی کی ایک عجیب اور بڑی دلفریب صاعقہ بار جھلک تھی وہ۔ بالکل یہی سبب تھا کہ نشست گاہ سے نکلتے وقت اس بار میرے دل کے کسی گوشے نے خود ہی چٹکی لی اور میں نے دروازے کی طرف مڑتے وقت کن انکھیوں سے مذکورہ کمرے کے جھولتے پردے کی طرف دیکھا کہ پتا چلے ''پردے کے پیچھے ماجرا کیا ہے؟'' اور تب ہی جیسے میری سانسیں تھمنے لگیں۔ ہلتے پردے کی پُرتجسس کہانی، مخروطی گوری گوری انگلیوں کی جھلک سے لے کر بالآخر ایک رمزیہ رخ ماہ جبیں پر منتج ہوئی تھی۔ وہ بھی کچھ اس طرح کہ معاملہ اب بھی شوق دید اور فطری تجسس کو ہوا دیتا ہوا اس شعر کی کھلی تفسیر بن گیا تھا کہ

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

وہ چہرہ نصف وا تھا، اور باقی آدھا رخ تھیں پردے کی بدلی میں چھپے چاند کی طرح پوشیدہ تھا۔ مگر جتنا ظاہر تھا۔ وہ ہی اتنی ضیا پاشیاں بکھیرتا محسوس ہوا کہ آنکھیں چکا چوند ہو کے رہ گئیں۔ رکنے یا لمحہ بھر سے زیادہ ٹھہرنے کا یارا

نہ تھا۔ ہوتا تو معیوب جانا جاتا۔ سو آگے بڑھ گیا۔
میں جو شاعری اور رومانی داستانوں اور قصوں کو من گھڑت سمجھنے والا۔ اپنی فطرت میں مختلف ایک ٹین ایجر ہونے کے باوصف۔ اپنی ذات میں سنجیدہ خو اور مست رہنے والا نوجوان اب جیسے ایکا ایکی ہی کچھ اور ہونے لگا تھا۔
بس، یہ ایک ادائے دل آراء کا ہی شاخسانہ تھا کہ میں اس طرف پورے پورے جی جان اور روح تک سے متوجہ ہو گیا تھا۔ شاید ادھورا تجسس اور آدھا سچ یہی حال کرتا ہے۔ جو میرا اس وقت ہو رہا تھا، ورنہ تو۔ میں ایسا مرنجا مرنج اور شرمیلا تھا کہ کسی عورت یا لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہ تھا۔ نہ کوئی دلچسپی محسوس کرتا تھا۔ دل۔ جسم کے کس کونے میں رکھا تھا، کچھ احساس نہیں ہوتا مگر اب جیسے ڈھونڈ کر تھام بیٹھا تھا اور پتا بھی نہ چلا کہ ہم کب اور کس گاڑی میں بیٹھ کر لاری اڈے پہنچے تھے۔
سفید رنگ کی ٹویوٹا پروبکس سے ہم اترے تو جیسے سب لوگ ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کوئی بھاگ کر بڑے منشی دادن خان کو بھی بلا لایا تھا۔ وہ آیا تو اس کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا، مگر ہمیں صدر ٹرانسپورٹ کے ساتھ دیکھ کر اس کا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے پہ کچھ الجھن کے تاثرات ایسے ہی تھے جس میں ناپسندیدگی کے جذبات بھی دیکھے جا سکتے تھے۔
صدر ٹرانسپورٹ عطا محمد نے وہیں کھڑے ہو کے سب سے پہلا حکم تو یہ صادر کر دیا کہ کوئی بھی ہنگامہ یا بلوا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اگر کسی نے ایسا کیا تو ہم اس سے لاتعلقی کا اعلان کر دیں گے۔ دوسرا اعلان انہوں نے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے یہ کیا کہ موجودہ حالات ... میں، نعمان احمد نے میرے مشورے کے ساتھ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا ہے، الہٰذا میرا یہ حکم ہے کہ ہم سب کے بہتر مفاد کے لیے نعمان جو بھی کرے گا آپ سب لوگوں کو اس کا ساتھ دینا ہوگا اور ایک آخری اعلان کہ میں بڑے منشی دادن خان اور چھوٹے منشی انور شاہ کو نعمان کی مدد کے لیے شامل کرتا ہوں۔
میں نے دزدیدہ نظروں سے دادن خان کی طرف دیکھا تھا، میری توقع کے عین مطابق اس کے چہرے پر سخت خفگی کے آثار نمایاں ہوئے تھے۔ مگر وہ کچھ کہنے کی جسارت نہ کر سکا تھا۔ البتہ جب عطا محمد اپنی بات ختم کر چکا تھا تو دادن خان نے انہیں اپنے کمرے میں آنے کی درخواست کی جہاں ایک ہلکی پھلکی "بیٹھک" کا اس نے بندوبست کر رکھا تھا۔ مجھے اس نے دانستہ شامل نہیں ہونے دیا تھا اور نہ ہی انور شاہ کو۔ مگر انور شاہ بھی ایک کائیاں تھا اس نے اپنا ایک آدمی ان کی "سوں" پہ لگا دیا۔
اسی آدمی نے انور شاہ کو بتایا کہ بڑے منشی دادن خان کے ساتھ عطا محمد کی یہ "بیٹھک" محض چند سیکنڈوں تک محیط رہی تھی جس میں دادن خان نے عطا محمد کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست کرنا چاہی تھی لیکن اس نے بڑی خفگی اور ناگواری سے دادن کے مشورے کو رد کر دیا تھا۔ اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔
"نعمان بیٹے! تم نے دیکھ لیا نا کہ یہ بڑا منشی دادن خان کس قدر منافق انسان ہے۔ اس نے صدر صاحب کو "کونے" میں لے جا کر پوری طرح ورغلانے اور اپنے طریقہ کار پہ رضامند کرنے کی بھی کوشش چاہی تھی لیکن عطا محمد صاحب نے ان کی بات سنتا تو کجا اس کے پاس محض چند سیکنڈوں سے زیادہ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔"
"ہاں چاچا! میں تو پہلے ہی اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ کر یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔
"یار نعمان! ایک بات تو بتا، تو نے بلاشبہ ایک بڑی ذمے داری اپنے کاندھوں پہ اٹھائی ہے۔ میری تو دعا ہے کہ اللہ تجھے اس نیک مقصد میں کامیابی عطا فرمائے، لیکن یارا! کیا واقعی تو۔ یہ اتنا بڑا کام کر لے گا؟"
چاچا انور شاہ کی بات پر میں ہولے سے مسکرایا اور فقط اتنا ہی بولا۔ "اللہ مالک ہے چاچا! بس تو میری کامیابی کی دعا کرتا رہ ہے۔"
بہر طور۔ عطا محمد کے اس اعلان کے بعد لاری اڈے پر تو بڑے منشی دادن خان کا ہی حکم چلتا تھا لیکن موجودہ صورت حال کی حکمت عملی میرے سپرد تھی اس سے وہ بھی روگردانی نہیں کر سکتا تھا۔
وقت کم تھا اور کام زیادہ۔
عطا محمد کے جاتے ہی دادن خان میرے پاس آیا، چاچا انور شاہ بھی موجود تھا۔ دادن میری طرف کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم دونوں نے یہ اپنے صدر صاحب کو یہ کیا پٹی پڑھا دی ہے؟ اس سے کیا ہوگا؟ کیا انتظامیہ اپنا فیصلہ بدل لے گی؟"
"فیصلہ بدلے نہ بدلے لیکن منشی صاحب! ہم ایک

بڑے جرم اور جانی نقصان سے ضرور محفوظ ہو گئے ہیں۔"
میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا تو وہ میرا تمسخر اڑانے والے انداز میں بولا۔
"ہونہہ۔ یہ صرف تمہارے کچے ذہن کا خوف تھا۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ چلو دیکھ لیتے ہیں کہ تم کون سا تیر چلاتے ہو۔ مگر بھئی۔ مجھے کوئی زحمت مت دینا اس سلسلے میں۔ مجھے اپنے کام بہت ہیں، جو کرنا ہے خود ہی کرو۔"
"آپ کو ہم زحمت دیں گے بھی نہیں منشی صاحب! آپ بس اپنا کام سنبھالیں اور بس۔"
میں نے اس کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ وہ زچ ہو کر لوٹ گیا۔

☆☆☆

میں دادن خان کی طرف سے جس کھٹک کا شکار تھا اسے ابھی میں خود تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔
سب سے پہلے میں نے چاچا انور شاہ کو ایک کام یہ سونپا کہ وہ علاقے کے کسی ایسے سماجی کارکن سے رابطہ کرے جو غیر سیاسی ہو اور اپنے طور پر بھی کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے شہر کے کچھ معززین سے ملاقاتیں کرے۔
ایک ہی دن میں بہت سے عوامی سطح کے لوگ ہمارے ساتھ آن ملے تھے۔
اس کے فوراً بعد میں نے زنیرہ سے ملاقات کی اور اس سے گزارش کی کہ وہ کسی اخباری ٹیم کی ہمیں سپورٹ دلا دے، یوں بھی ایسے کاموں کے لیے یہ ٹیمیں متحرک رہتی ہی تھیں، یہ وہی ٹیم تھی جس نے ارشاد منن کا دھڑن تختہ کیا تھا۔
ایک دھواں دھار پریس کانفرنس کے علاوہ اس اخباری ٹیم نے علاقے کے لوگوں سے لائیو رائے لینا شروع کر دی کہ عوام کو سستی سواری کی سہولت دینے والے لاری اڈے کو کیا واقعی شہر سے دور منتقل ہونا چاہیے؟
سوائے چند ایک کے سب نے اس کی نفی کی تھی، بلکہ پُرزور مطالبہ کیا تھا کہ عوام سے یہ سہولت نہ چھینی جائے۔ میں نے ایک پروپیگنڈہ سے بھی کام لیا تھا۔ جس پر عوام مزید بھڑک اٹھے تھے کہ اگر انتظامیہ نے اپنا یہ فیصلہ نہ بدلا اور اڈا زبردستی منتقل کیا گیا تو غریب عوام کو سستی سواری دینے والی یہ "لاری سروس" ہی بند کر دی جائے گی۔
اس سے یہ معاملہ عوامی حلقوں میں مزید بھڑک اٹھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک مقامی سیاسی شخصیت بھی اس... معاملے میں ہماری مدد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اسی نے ہی بعد میں اصل سازش سے پردہ چاک کیا۔ وہ کسی نے کہا ہے ناں کہ سنار کو سونا اور لوہے کو لوہار پہچانے۔ یہ بھی معاملہ ہوا۔

بہرطور۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس دن انتظامیہ کے اہلکار ہمیں بے دخل کرنے وہاں پہنچے تو ہماری بجائے عام عوام اور علاقے کی معتبر شخصیات ان کا پہلے راستہ روکے کھڑی تھی۔ ہم پس منظر میں چلے گئے۔ مذکورہ سیاسی شخصیت کے ووٹ بینک سے تعلق رکھنے والی "عوام" نے بھی ہمارا پورا ساتھ دیا۔
اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتظامیہ کے اہلکار عوام کی اس بھاری دیوار کو پار کرنے کی جرأت نہ کر سکے اور نہ ان کے پُرزور نعروں اور احتجاج کے آگے نہ ٹھہر سکے۔
اس طرح فوری طور پر اور سردست یہ معاملہ تو ٹل گیا۔ مگر مجھے پورا اندازہ تھا کہ یہ ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہوا تھا۔ تاہم مجھے اس کے درپردہ عواقب ٹٹولنے کا وقت ضرور مل گیا تھا۔

## ذہانت

ایک مفلس اور بے اولاد شخص جس کی والدہ آنکھوں کی بینائی سے محروم تھیں کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے لیے دعا کی درخواست کی۔
بزرگ نے اسے نہایت شفقت سے اپنے پاس بٹھایا اور اس کی پریشانی دریافت کی۔
ضرورت مند شخص نے احترام سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔
میرے حق میں صرف اتنی دعا کیجیے کہ میری اندھی ماں اپنے پوتوں کو سونے کی پیالیوں میں دودھ پیتے ہوئے دیکھے۔
بزرگ، دعا کے الفاظ سن کر حیران رہ گئے اور بہت دیر تک اس شخص کی ذہانت کی تعریف کرتے رہے کہ ایک مختصر فقرے میں اس نے اپنی ماں کی آنکھوں کی روشنی، اولاد اور دولت غرض سب کچھ سمو دیا تھا۔
دانیہ ریحان...... ڈیرہ اسماعیل خان

لاری اڈے کے ملازمین مجھ سے بے حد خوش ہوئے تھے کہ بغیر کسی بلوے اور مار کٹائی کے میں نے یہ معاملہ بہ خیر و خوبی حل کروا دیا تھا۔ نیز اب وہ خطرہ بھی انہیں سر سے ٹلتا ہوا ہی نظر آنے لگا تھا جس کے تحت انہیں بیروزگاری کا ڈر تھا (اگرچہ میری ابھی یہ تلوار سروں پہ لٹکی ہوئی ہی نظر آتی تھی)۔

عطا محمد تو جیسے میرا مرید بن کے رہ گیا تھا۔ اس نے میرے اور انور شاہ کے لیے اپنے گھر پہ باقاعدہ ایک پر تکلف ڈنر کا اہتمام بھی کر ڈالا تھا۔

عطا محمد کی اس دعوت نے ایک بار پھر میرے دل کو میٹھی میٹھی چٹکیاں لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ایک حسین اپسرا کا نصف خیالی اور آدھا اجمالی تصور جو ہنوز دل و دماغ میں جاگزیں تھا، پھر سے گویا تجدید تصور جاناں کیے دے رہا تھا، بالکل ایسے ہی میں ضمیر نے چبھن لگائی تھی کہ میری حیثیت ایک میزبان کے ہاں مہمان کی سی تھی اور میں یہ کیا سوچ رہا تھا کہ اپنے ہی میزبان کے گھر میں سیندھ لگا رہا تھا۔ اس خیال نے مجھ جیسے حساس انسان کو بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ضمیر کی طرف سے لگایا گیا یہ ایک روح کش چیرا تھا جس نے میری خودداری اور انانیت کو مجروح سا کر کے رکھ دیا تھا۔ میں اپنے ضمیر سے بھی سمجھوتا کرنے کا قائل نہ تھا۔ نہ مصلحتاً کسی خود ساختہ توجیہ و تاویل کے بھی۔ جو بات غلط تھی وہ غلط تھی بس۔ میرے اندر کا جیالا اور ضدی پن ایک دم ابھر آیا تھا۔ ایسے میں دل نے ضمیر کے سامنے وکالت کی۔ ''تم نے کیا غلط حرکت کی ہے؟ کیا اپنے میزبان کی بیٹی کو ورغلایا ہے؟ یا تمہاری نیت میں کوئی پہلے سے فتور تھا؟ یہ تو یک طرفہ محض دید و نگاہ کا تصادم تھا۔ اور پہل تمہاری طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی تمہیں خود اس نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اسی نے ہی تمہارے اندر کو متلاطم کیا تھا۔ اور پھر وہ تھی کون؟ اس کا بھی تمہیں کیا پتا؟ ضروری تو نہیں کہ وہ تمہارے میزبان کی بیٹی ہی ہو۔ کیا خبر اس سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہ ہو؟

کچھ بھی تھا۔ ضمیر کی ایک ذرا ملامت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا اور پھر میں نے اس طرف سے یکسر اپنی توجہ بانٹ لی۔

ویسے مجھے خود اپنے آپ پر حیرت تھی کہ یہ آخر ہوا کیا تھا میرے ساتھ؟ میں کیوں ایک ادھورے دیدار پر ایسا بے کل و بے چین ہو گیا تھا؟ کیا یہ ادھورے پن کا شاخسانہ تھا۔ ایک بے محل تجسس، جو ایکا یکی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

میں نے تمام خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور چاچا انور شاہ کے ساتھ اس شام تیاری کے ہلکے پھلکے اہتمام کے ساتھ عطا محمد کے گھر جا پہنچا۔

میں نے بلیو جینز اور اوپر بلیک کلر کی راؤنڈ نیک کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کچھ دبلا پتلا سہی لیکن کاٹھی میری چوڑی تھی اور سینہ بھی فراخ تھا، دیکھنے میں مضبوط ہاتھوں پیروں والا نوجوان ہی نظر آتا تھا۔ سر کے بال چھوٹے مگر سلیقے سے سیٹ کر رکھے تھے۔

میں اور انور شاہ اپنے میزبان کے گھر پہنچے تو نجانے کیوں میرے اندر کی سرد مہری، جس کا میں اندر داخل ہونے سے پہلے تہیہ کر کیا تھا کہ اس میں ذرا برابر فرق نہ آنے دوں گا، مجھے وہ سر بہ سر تحلیل ہوتی محسوس ہونے لگی۔

نشست گاہ میں ہم بیٹھے تھے۔ اور وہیں ہماری عطا محمد سے گفتگو ہوتی رہی وہ میری تعریفوں کے پل باندھے نہیں تھک رہا تھا۔ اور مجھے کوفت سی ہو رہی تھی۔ حقیقت بھی تھی کہ زیادہ تعریفیں بھی میرے لیے کوفت کا سبب بنتی تھیں۔ میرے خیال میں ایسا انسان جب تھوڑی سی بھی کوتا ہی دیکھتا ہے تو پھر اپنا رویہ بدلنے میں دیر نہیں لگاتا۔ ممکن ہے یہ صرف میرا خیال ہو۔ مگر میں ایسا ہی سوچتا تھا۔

عطا تو اسی بات پر ہی خوش اور مطمئن تھا کہ یہ معاملہ عارضی طور پر ہی سہی ٹل تو گیا تھا۔ مگر میں ایسا نہیں سوچتا تھا۔ اور بار بار اس کا اشاروں کنایوں میں عطا کے سامنے اظہار بھی کر رہا تھا کہ ابھی ہم نے اس معاملے کی اصلیت سے پردہ اٹھانا ہے۔ تاکہ ہمیشہ کے لیے اس مسئلے سے جان چھوٹ جائے۔

''یہ بھی تم بہ خوبی کر لو گے نوجوان! مجھے تم پر اور تمہاری ذہنی فراست پر پورا بھروسا ہے''۔ عطا محمد پوری تسلی سے بولا تھا۔

''ویسے کیا تمہیں واقعی ایسا کوئی شبہ ہے؟''

''جی ہاں عطا صاحب! مجھے اس سازش کے پیچھے ایک پوری لینڈ مافیا کا ہاتھ لگتا ہے، جو اس زمین کو ہتھیانا چاہتی ہے اور اس کی پشت پر کسی بڑی شخصیت کا ہاتھ ہے۔'' میں نے گہری متانت سے کہا تو وہ بھنوئیں اچکا کر بولا۔

''تمہاری بات میں وزن ہے نعمان میاں! ایسا ممکن ہے۔ اسی لینڈ مافیا نے عام اور غریب عوام کا جینا بھی دوبھر کر

رکھا ہے۔''

نشست گاہ میں اب بھی ہمارے بیٹھنے کی پوزیشن وہی تھی۔یعنی دوسرے ملحقہ کمرے کا دروازہ بھی میری آنکھوں کے سامنے تھا اور وہ جھولتا ہوا پردہ بھی۔مگر اب اس میں کوئی جنبش نہیں ابھری تھی نہ ہی وہاں کسی کی ادھوری جھلک بھی نمودار ہوئی تھی۔اس ''غیاب'' پر دل جیسے مسوس سا ہونے لگا۔اور وہی پرانی اور روایتی مثل دے کر چڑانے لگا۔''یہ خوش فہمی کے سوا کچھ بھی نہ تھا نعمان میاں!''

ہونا تو خوش چاہیے تھا مجھے کہ چلو بار ضمیر اور تکرار دل سے نجات ملی مگر یہ بھی تھا کہ دل نامعلوم سی اداسی محسوس کرنے لگا۔کیا واقعی کوئی ایک ہی بار اس قدر ''گھر'' جاتا ہے کہ دوبارہ دیکھنے کی تمنا کرے؟

بات یہی تھی کہ میں بھی نوجوان تھا اور میرا دل بھی ایسے ہی انداز میں دھڑکتا تھا۔اور ایسے میں بھلا کسے چاہ نہیں ہوتی کہ جنس مخالف کا کوئی فرد اس میں دلچسپی لے۔اسے دیکھے اور وہ اسے دیکھے۔بھرپور اشتیاق کے ساتھ۔

میں نے فوراً خیالات ذہن سے جھٹکے اور ابھی دوران اندر کہیں کسی گوشے سے ایک مترنم سی آواز ابھری۔''بابا! کھانا لگا دیا گیا ہے۔''

بڑی نرم، میٹھی، سریلی اور گنگناتی ہوئی آواز تھی وہ۔جیسے جھرنوں کا سنگیت ہو، جیسے بارش کے بعد طاری سناٹے میں آب ایستادہ کی خاموش سطح پر کسی نم آلود درخت کی گیلی شاخوں سے ٹپکتے قطروں کا جلترنگ ہو۔اپنے اس روز کی ادھوری جھلک سے ہم آہنگ اس آواز میں بھی ایک شناسا سا کھنک تھی۔وہی دل وجاں کو موہ لینے والا، کھینچ لینے والا مقناطیسی تاثر۔پتا دیتا تھا کہ یہ اسی زہرہ جبیں کی آواز ہے۔جس کے دیدار نصف تمنا نے میرے اندر اتھل پتھل کیے رکھا تھا۔

آواز اسی کمرے سے آئی تھی، جس کے ادھ کھلے دروازے پہ جھولتے پردے نے بے چینی کو ہوا دے رکھی تھی۔

''بہت بہتر ابھی آتے ہیں بیٹا۔'' عطا محمد کی آواز ابھری۔میں خیالات سے چونکا۔

''بیٹا'' یقیناً انہوں نے اپنی بیٹی کو ہی محبت سے کہا ہو گا۔اغلب خیال ہی سچ نکلا، اگرچہ اب بھی تھوڑا ابہام تھا۔مگر اس کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔اب تو گویا

## صحت مند زندگی کی 20 علامات

☆بھرپور نیند ☆صبح جاگنے پر پھرتی اور امنگ ظاہر ہونا ☆پاخانہ باقاعدہ اور صاف، وبندھا ہوا آنا ☆بھوک کی نوعیت نارمل رہنا ☆تمام دن کے افعال و مشاغل میں دلچسپی کا برقرار رہنا ☆پیٹ، چھاتی سے کم ہونا ☆تیلی اور متحرک اشیا کی خواہش کا پیدا نہ ہونا ☆دلی طور پر خوشی محسوس ہونا اور روحانی طور پر مطمئن رہنا ☆بغیر تھکاوٹ کے کئی گھنٹوں تک کام کرنے کی صلاحیت کا ہونا ☆بڑھ چڑھ کر تعمیری کاموں میں حصہ لینا ☆خوش مزاج ہونا، چڑچڑا نہ ہونا ☆چہرے پر رونق اور طبیعت کا ہشاش بشاش ہونا ☆آنکھوں میں چمک اور بے خوفی کا نمایاں ہونا ☆چہرے پر مسکراہٹ رہنا ☆جسم میں ہمیشہ جواں ہمتی اور قوت کا احساس رہنا ☆ہر حال میں تعمیری نظریات رکھنا ☆تمام جسمانی افعال بہ آسانی انجام دینا ☆جسم صاف ستھرا اور بے داغ ہونا ☆بال و جلد صحت مندی کی طرف مائل رہنا ☆تحمل مزاج ہونا۔

## بیمار جسم کی 20 علامات

ذیل میں بیس ایسی علامات بیان کی جارہی ہیں جو بیمار جسم کی غماز ہیں ☆کسی بھی جسمانی فعل کا غیر فطری ہونا ☆گہری و پرسکون نیند کا نہ آنا ☆پاخانہ پتلا یا گانٹھ دار آنا ☆بھوک کا نہ لگنا ☆افعال و مشاغل سے بوریت ہونا ☆پیٹ بڑھا ہوا ہونا یا موٹاپا ہونا ☆تیلی اشیا کی شدید خواہش رکھنا ☆انسان افسردہ اور مردہ دل رہنا ☆تھوڑا سا کام کرنے سے تھکاوٹ ہو جانا ☆تعمیری کاموں میں دلچسپی نہ ہونا ☆چڑچڑاپن غالب رہنا ☆چہرہ بے رونق رہنا اور سردرد رہنا ☆آنکھوں میں سردنی چھائے رہنا ☆چہرے سے افسردگی نمایاں ہونا ☆جسم میں ہمیشہ نقاہت و تھکاوٹ کا رہنا ☆مختلف وجوہ کی بنا پر تخریبی خیالات غالب رہنا ☆جسمانی افعال کو کرنے سے نفرت ہونا ☆جسم سے بدبو آنا اور چہرے پر داغ دھبے نمایاں ہونا ☆بال گرنا اور جلد عموماً خشک رہنا ☆بہت جلد غصہ آنا۔

دیکھنا یہ تھا کہ پردہ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے؟ آیا وہ بھی ہوتا ہے کہ نہیں؟ میں شاید پھر بھٹکنے لگا تھا۔ میں نے فوراً خود کو سنبھالا۔

''آپ نے تو خوامخواہ کا تکلف کر دیا۔ اس کی ضرورت تو نہیں تھی جناب عطا صاحب!''

چاچا انور شاہ نے کسر نفسی سے کہا تو میں بھی ان سے بولا۔ ''ہم نے تو واقعی آپ کو زحمت دے ڈالی۔''

''بالکل نہیں، آج ہمارا دل بے حد خوش ہے اور ہم اس خوشی کو فراغ دلی کے ساتھ تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتے ہیں۔ آؤ۔ شاباش۔'' عطا محمد نے میرے شانے پر بڑے دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ناچار میں نے اور چاچا انور شاہ نے اس کے ساتھ ہی آگے قدم بڑھا دیے۔

عطا محمد کی سنگت میں سب سے پہلے میں آگے بڑھا، اور دھڑکتے دل سے مذکورہ کمرے میں داخل ہوا۔

''السلام علیکم!''

میں اس کو سلام کا جواب دینا ہی بھول گیا، سچ تو یہ کہ میں نے جو سامنے دیکھا تو جیسے خود کو ہی بھول گیا۔ جیسے اپنا اطراف بھول گیا اور وہ سب کچھ بھی جو اب تک یاد تھا مجھے۔ بس! میں تھا اور وہ تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے جیسے ایک ''تڑاخا'' ہوا تھا اور پھر ہر سو جیسے ایک سناٹا سا پھیل گیا، جی چاہا یہاں سے الٹے پاؤں دوڑ لگا دوں اور گھر جا کر ہی دم لوں۔

وہ پردہ چاک ہو گیا تھا، جس کا میں نے حسین و رنگین تصور کیے رکھا تھا۔ اور ایسا چاک ہوا تھا کہ اپنی تمام تر تلخ حقیقت سے آشکارا بھی کر گیا تھا۔

''کیوں میاں نعمان! نظر آ گئے تارے دن میں؟ بس۔ اتر گیا بھوت عشق کا سر سے؟ اور کیا چاہیے تھا دیکھنے کو تمہیں؟ دیکھ لو وہ حسن کا مرقع تمہارے سامنے ہے۔ پردے نے تم سے جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔ مگر۔ ادھورے نظر آنے والے چاند کے داغ کب نظر آتے ہیں۔'' میرے اندر کسی نے استہزائیہ ہنسی سے کہا۔

صرف پل کے پل۔ یہ سب کچھ ہوا تھا۔ مگر لگا ایسا ہی تھا جیسے صدیاں بیت چلی ہوں۔ عقل و دماغ نے فوراً ہی خرد کا یارا پکڑ لیا تھا۔ ورنہ اس طرح اسے تکتا پا کر معتوب قرار پاتا۔ وہ بھی ایک میزبان کے گھر میں۔

میں نے خاموشی سے اپنا سر جھکا کے اپنی طرف والی کرسی سنبھال لی اور اس پر براجمان ہو گیا۔ عطا محمد میرے سیدھے ہاتھ کی ڈائننگ ٹیبل کی ''سربراہ'' کرسی پر براجمان ہو گئے جبکہ چاچا انور شاہ نے میرے بائیں ہاتھ کی کرسی سنبھال لی تھی۔ اس نے انور شاہ کو بھی سلام پیش کیا تھا اور انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کر ''جیتی رہو بیٹی'' کہا تھا۔

یاد نہیں کہ میں نے اسے سلام کا جواب دیا بھی تھا یا نہیں۔

''کیا پتا یہ وہ نہ ہو؟'' میرے اندر کسی نے ہلکے سے سرگوشی کی مگر قرائن سے زیادہ احساس اور خوشبو سے لگتا تھا کہ وہ ہی تھی۔

''بابا! کسی شے کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔''

اس کی پھر مترنم سی آواز ابھری، اور میں پھر چونکا، اسی دوران میری نظروں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ شاید میرے ''اندر'' کی طرح اس کا چہرہ بھی بجھا بجھا سا ہو گیا تھا۔ کہاں اس نے جب میری طرف دیکھ کر سلام کیا تھا تو مجھے اس کا پر صباحت چہرہ ہی نہیں بلکہ آنکھیں بھی اس کی مسکراتی محسوس ہوئی تھیں۔ مگر ایک ساعت تک، اور وہی ایک ساعت جو تجانے کتنی ساعتوں پر بھاری تھیں۔ پھر جیسے روشنی کا سوئچ آف ہو گیا۔

وہ اپنی خودکار وہیل چیئر کو تھوڑا بیک کر کے جھولتے پردے سے چھوتے ہوئے گھر کے اندرونی گوشے میں غائب ہو گئی۔

وہیل چیئر پہ اس کی موجودگی بتا رہی تھی کہ وہ پیروں سے معذور تھی۔

''یہ میری بیٹی تھی فوزیہ، مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے۔'' عطا نے بتایا۔ ''حالاں کہ گھر میں ملازم بھی ہیں۔ مگر میرے کام، میرا کھانا پینا، میری دوائیوں کا معمول، میری دیکھ بھال بھی کرتی ہے، اپنے ہاتھوں سے۔ افسوس ایک۔ حادثے میں بے چاری چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔'' عطا نے بڑے دکھ سے بتایا تو چاچا انور شاہ ازراہ تاسف بولا۔

''بہت افسوس ہوا یہ سن کر، ماشاءاللہ پیاری اور نیک دل بچی ہے اور باپ سے محبت کرنے والی بھی، باوجود اس حالت میں اسے اپنے باپ کا کس قدر خیال رہتا ہے۔ آفرین ہے اس بیٹی پر۔''

''ہاں! ویسے تو اس کے ساتھ اس کی ایک دوست بھی

ہوتی ہے، جو فوزیہ بیٹی کی بچپن کی سہیلی ہے۔ مگر فوزیہ بیٹی کے کام اور معمولات سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کی معذوری اس کے لیے رکاوٹ کا باعث ہے۔" اس نے کہا، پھر ایک دم جیسے قدرے چونک کر بولا۔

"ارے۔ لیکن یہ بچی چلی کیوں گئی؟" اس نے تو اپنے نعمان میاں کا شکریہ ادا کرنا تھا۔"

میں اس کی بات پر چونکا، اور ایک نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"دراصل اس مسئلے کی وجہ سے میں بہت پریشان رہنے لگا تھا، اسی وجہ سے میرا شوگر لیول بڑھ گیا تھا، اسٹریس کے باعث بلڈ پریشر اور معدے کی تکلیف بھی بڑھ گئی تھی میری۔ فوزیہ بیٹی فکر مند ہوگئی، اسی دوران نعمان نے یہ مسئلہ حل کر ڈالا تو میری طبیعت کافی سے زیادہ سنبھل گئی۔ فوزیہ کو معلوم تھا کہ نعمان احمد نے اس مسئلے کو حل کرنے کا عزم کیا تھا۔ فوزیہ نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہارا شکریہ ادا کرے گی۔" وہ رکا۔ پھر خجالت آمیز انداز میں بولا۔

"لو بھلا۔ میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ چلو بسم اللہ کرو، کھانا سامنے ہو تو شروع کر دینا چاہیے۔ بیٹے نعمان! تم بسم اللہ کرو، شاباش۔"

کھانا شروع ہوا۔ اس دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ عطا محمد کی یہ بات میرے دل و دماغ میں گردش کرتی رہی۔ اس کی بیٹی، یعنی فوزیہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر پھر وہ لوٹ کیوں گئی؟ کیا اس نے میرے چہرے سے بجھا بجھا پن بھانپ لیا تھا؟ لیکن اگر ایسا تھا بھی تو۔ کیا ہوا؟ ابھی تو میری اس سے کوئی بات تک نہیں ہوئی، وہ کم از کم شکریے کے دو بول تو بول ہی سکتی تھی۔ کیا اس روز پردے کے پیچھے پہنچنے والی نگاہ پسندیدگی ان کہے انداز میں بدل چکی تھی جس کی اثر پذیری نے اس "بجھے پن" کو فوراً محسوس کر لیا تھا؟ محسوسات کی بے زبانی اپنے اندر کتنے الفاظ رکھتی ہے کہ کچھ کہے بنا بھی انسان بہت کچھ سمجھ لیتا اور جان لیتا ہے۔

"نعمان میاں! کیا کھانا اچھا نہیں بنا؟" معاً عطا محمد کی آواز پر میں چونکا۔

"آں۔ نن۔ نہیں تو۔ کھانا تو بہت اچھا بنا ہے۔ ماشاء اللہ بہت ذائقے دار ہے" میں نے خیالات سے چونکتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"تو پھر تم اتنی بے دلی سے کیوں کھا رہے ہو؟"

## حاضر جوابی

حضرت خواجہ حسن بصری (21 تا 110ء)

فرماتے ہیں کہ ایک شام ڈھلے میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ شمع روشن کیے جا رہا ہے۔ میں نے اس کو روک کر پوچھا "بیٹے! تم بتا سکتے ہو کہ یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے؟"

میرا سوال سنتے ہی بچے نے ایک لمحے توقف کیا پھر فوراً ہی پھونک مار کر شمع گل کر دی اور مجھ سے کہنے لگا۔

"آپ مجھے بتائیے کہ روشنی کہاں چلی گئی؟ تو میں آپ کو بتا دوں گا کہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔"

آپ فرماتے ہیں کہ یہ جواب سن کر میں لاجواب ہو گیا۔

انتخاب: امتیاز احمد، کراچی

## مافوق الفطرت

"مافوق الفطرت" سے مراد ایسی قوت ہے جو فطرت (Nature) سے ماورا ہو، طبعی قوانین سے بالاتر ہو یا وہ چیزیں جو انسان کی عقل و ادراک سے بالاتر ہوں مافوق الفطرت کہلاتی ہیں، انگریزی میں انہیں سپر نیچرل (Supernatural) کہتے ہیں۔

لغت میں شیطان کے معنی ہیں سرکش، شریر۔ قرآن حکیم میں شیطان کے لیے "ابلیس" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ شیطان شطن سے بنا ہے، جس کے معنی دور ہونے کے ہیں اس لیے اسے شیطان کہتے ہیں یہ لفظ شیطان شط سے بنا ہے جس کے معنی جلنے کے ہیں چونکہ وہ آگ سے بنا ہے اور آگ میں ہی داخل ہوگا اس لیے اسے شیطان کہا گیا۔ آگ چونکہ اس کا مادہ تخلیق ہے اس لیے اس میں قوت غضبیہ اور فخر مذموم زیادہ ہے۔ یہی اوصاف حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے روکنے والے تھے۔ سرکش، جس میں انسان اور حیوان بھی شامل ہیں کو شیطان کہتے ہیں۔ شریر جن کو شیطان کہتے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں ہے (اور ایسے ہی ہم نے شریر "جنوں" اور "انسانوں" کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "حسد شیطان ہے اور غصہ شیطان ہے۔"

انتخاب: سرفراز احمد، پھالیہ

''میں اسی طرح ہی آہستہ آہستہ کھانے کا عادی ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

پھر ذرا دیر بعد میں نے ہی اس سے پوچھ لیا۔

''عطا صاحب! پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی بیٹی کو ایسا کیا حادثہ پیش آیا تھا کہ اس کی ٹانگیں۔'' مجھ سے جانے کیوں جملہ پورا نہ ہو سکا۔ بعد میں احساس بھی ہونے لگا کہ یہ ایک بے محل سوال تھا۔ مگر شاید میرے اندر کی بے چینی کے سبب یہ زبان پر آ گیا تھا۔

وہ جواباً ایک گہری ہمکاری لے کر بولا۔

''بس نعمان میاں! کیا بتاؤں۔ وہ حادثہ تھا نجانے کیا تھا۔ فوزیہ بیٹی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کہیں گھومنے گئی تھی کہ واپس لوٹی تو بالکل گنگ تھی۔ اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا، ہم یہی سمجھے تھے کہ شاید تھکاوٹ کے باعث ایسا ہے تھوڑا آرام کرلے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر آرام... کرنے کے بعد۔ یہ جاگی تو۔ وہیل چیئر پر۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ فضا کچھ افسردہ سی ہونے لگی۔ دل چاہا اس موضوع کو ادھر ہی ختم کر دوں۔ لیکن معذوری کی اس عجیب اور پُراسرار وجہ نے میرے تجسس کو ہوا دے ڈالی۔ میں نے کہا۔

''آپ نے ضرور کسی ڈاکٹر کو تو دکھایا ہوگا۔ کیا کہا تھا انہوں نے؟''

''کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا میں نے۔'' اس نے کہا۔ ''کسی نے کہا کہ اسے بخار ہوگا۔ تیز بخار، اور اسی حالت میں اسے ہوا لگ گئی۔ کوئی کہتا اسے وائرل اٹیک ہوا ہے جس نے دماغ کے خلیات پر اثر کیا جو نروس سسٹم کی خرابی کا باعث بنا اور ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے کو متاثر کر گیا۔''

''بہتری کی کوئی امید دی کسی ڈاکٹر نے؟'' اس بار چاچا انور شاہ نے پوچھا۔

''بس! اتنا ہی کہتے ہیں کہ اللہ سے دعا کرو۔ ری کوری کے چانسز نا ہونے کے برابر ہیں۔''

''آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟'' یہ وہ سوال تھا جو میری زبان پہ آتے آتے رہ گیا تھا اور میں محض سوچ کر رہ گیا تھا۔

موضوع تبدیل تب ہوا جب دو نوجوان میری عمر کے لڑکے اندر داخل ہوئے۔ دونوں کو دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ انہیں ''برے زمانے'' کی ہوا لگی ہوئی تھی۔ دونوں نے ٹائیٹ جینز اور اسی طرح کی چست رنگین قسم کی ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں۔ جیبوں میں اسمارٹ فونز اس طرح اڑسے ہوئے تھے کہ ان کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ کانوں میں ہیڈ فونز لگے ہوئے تھے۔ انڈین فلموں کے دبنگ ایکٹرز کی چھاپ نمایاں طور پر ان کے گیٹ اپ اور بالخصوص ان کے ہیئر اسٹائل سے ظاہر ہوتی تھی۔ دونوں گورے چٹے تھے اور عمروں میں ایک دو سال کا ہی فرق ہوگا۔ لاابالی اور بے پرواہ سے دکھتے تھے کہ ہماری طرف دیکھے اور سلام کیے بغیر عطا محمد سے پیسے مانگنے لگے۔

دونوں یقینی طور پر اس کے بیٹے تھے۔ عطا بھی ان کے مزاج کا عادی تھا۔ تاہم اس نے اپنے دونوں بیٹوں سے سرسری تعارف کروا دیا تھا۔ ایک کا نام جہانزیب تھا اور دوسرے کا شاہ رخ۔ دونوں کالج گوئنگ تھے۔ عطا محمد نے انہیں ٹوکا بھی نہیں تھا کہ موجود مہمانوں سے ایک ذرا ہائے، ہیلو ہی کر دیتے۔

عطا نے پیار سے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''فوزیہ بیٹی سے کہہ دیتے۔ وہ تمہیں دے دیتی پیسے۔ کہیں جا رہے ہو تم دونوں؟''

ایک نے منہ بنا کر کہا۔ ''ہاں بابا! باہر ہمارے کچھ دوست آئیں ہیں ان کے ساتھ ہی جا رہے ہیں۔ اپنی گاڑی میں۔ اور پیسے ہمیں آپ ہی دے دیں۔ ہم اس کرسی والی سے نہیں مانگتے۔''

''نہیں بیٹا! بری بات۔ اپنی بہن کو ایسا نہیں کہتے۔'' عطا نے انہیں پیار سے ٹوکا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ دونوں اپنی بہن فوزیہ کو ''کرسی والی'' کیوں کہہ رہے تھے۔

صاف لگتا تھا کہ عطا محمد کے بے جا لاڈ پیار نے انہیں بگاڑ رکھا تھا۔

''اچھا پھر تھوڑی دیر رک جاؤ۔ میرا والٹ کمرے میں رکھا ہے۔ میں ابھی کھانا کھا کر۔''

''اوہ۔ بابا! ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ باہر دوست کھڑے ہیں۔'' پہلے والے نے کہا۔

اسی وقت گھنگھروؤں کا جلترنگ ابھرا اور میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ اپنی خود کار ''کرسی'' میں نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کے لیدر کا مردانہ جیبی پرس تھا۔ اپنی وہیل چیئر کو باپ کی ڈائننگ چیئر کے پاس لا کر اس نے پرس اسے تھما دیا۔ عطا نے پیار سے اس کے سر

پہ ہاتھ پھیرا اور۔ ’’جیتی رہو بیٹی!‘‘ کہہ کر اس میں سے کچھ بڑے نوٹ نکال کر بیٹوں کو تھما دیے، وہ اپنی ’’کرسی والی ‘‘بہن کی طرف منہ چڑانے کے انداز میں دیکھتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

’’دیکھا آپ نے۔ میری بیٹی میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔ مجھے کھانے کی میز سے بھی نہیں اٹھنے دیا۔ اس نے‘‘۔ ہمیں بتاتے ہوئے اس کے لہجے میں فخر تھا۔

’’ماشاء اللہ آپ کی بیٹی بہت فرماں بردار ہے۔ جو اولاد ماں باپ کی دعائیں لیتی ہے وہ بانصیب ہوتی ہے۔‘‘ چاچا انور شاہ نے فوزیہ کی طرف دیکھ کر پرشفیق لہجے میں کہا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب وہیل چیئر پر بیٹھی فوزیہ نے ایک ذرا نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا، یوں جیسے اپنے نصیب کو دیکھ رہی ہو۔

وہ واپس مڑ کر جانے لگی تو: اس کے باپ نے روک لیا۔ بولا۔

’’بیٹی! یہ نعمان احمد ہے۔ تم ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی ناں؟‘‘

اس نے پھر اپنی نگاہوں کی چلمن اٹھا کر میری طرف دیکھا، اس کی پلکیں بہت گھنی اور سیاہ تھیں جس کے تلے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں رمزیہ گیرائی ایک دلکش سا تاثر دیتی محسوس ہوتیں، جیسے دور کسی ویران جنگل کے وسط میں بنی خاموش جھیل پر چھتنار درختوں نے اپنی گھنیری شاخیں جھکا رکھی ہوں۔

گورے رنگ میں تھوڑا گلاب اور شہد ملا دو تو ایسا ہی رنگ اس کے حسین چہرے کا دکھائی پڑتا تھا۔ انہی رنگوں میں سے شہد رنگ چرالو تو وہی اس کے دراز گھنے ریشمی بالوں کا تھا جو سلیقے سے اس کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔

’’آپ کا شکریہ۔ نعمان صاحب!‘‘ خاموش جنگل میں جیسے کوئل کوکی ہو، اور اس کوک میں ایک ہوک ہو۔

وہ براہ راست مجھ سے مخاطب تھی، اس کی گھنیری پلکوں کی جھالر تلے آنکھوں کی دلکشی میرے اندر اترنے لگی۔ میں تھوڑا نروس سا ہونے لگا۔ فطری شرمیلا پن اور جھجک آڑے آنے لگی، فوراً بولتا تو جملے بے ربط سے ہو جاتے۔ لہٰذا بہت ٹھہر کے اور اس کی آنکھوں کی دلکشی میں اپنی نظریں گاڑ کر پتا نہیں کتنی دور سے بولا۔

’’بس۔ شکریے کی کوئی بات نہیں، عطا صاحب کا ایک ملازم ہونے کی غرض سے یہ میرا فرض تھا پھر اس میں ہم سب کی بھلائی تھی۔‘‘

اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اپنی خودکار وہیل چیئر کی سیدھے ہاتھ کی ہتھی پر لگے ایک لیور کو آہستگی سے حرکت دی اور چلی گئی۔

بعد میں، میں نجانے کتنی دیر تک اپنے جملے پر غور کرتا رہا کہ میں نے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہہ دی تھی جو کسی غلط فہمی یا غلط مطلب کا باعث بنتی۔ بس میرا پاگل پن ہی تھا۔

جو رقم اس کام کے لیے مجھے عطا صاحب نے دی تھی، اس میں سے کافی روپے باقی بچے تھے وہ میں نے وہاں سے رخصت ہوتے وقت انہیں لوٹانا چاہے تو وہ انہوں نے لینے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ تم ہی رکھ لو تمہارا انعام ہے مگر میں نے لینے سے معذوری ظاہر کر دی، شاید میرے پُرقطعیت لہجے نے ان کو بھی اصرار کرنے نہیں دیا۔

میں اور چاچا انور شاہ واپس ہو لیے۔

☆☆☆

وہ ساری رات میں بستر پر فوزیہ کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ میں اپنے اندر اس کے لیے ایک ان کہے تعلق خاطر کا جذبہ محسوس کرنے لگا تھا، باوجود اس کے کہ وہ پیروں سے معذور تھی اور ہمارے ضلعی صدر کی بیٹی تھی۔ پتا نہیں یہ میرا فوزیہ سے جذبہ محبت تھا یا صرف ابھی ایک عام اور روایتی پسندیدگی تک محدود تھا مگر کچھ تو تھا کہ میرے دل کی یہ بے چینی بے سبب نہ تھی۔

وہ جو اسے وہیل چیئر پر دیکھ میرے اندر ایک چھناکا ہوا تھا وہ احساس نجانے کیوں اب عنقا سا ہونے لگا تھا۔ شاید اس بار اس کے حسن کی دلکشی اور ہوشربائی کو میں نے کھل کے دیکھا تھا۔ یہ نہیں کہ میں حسن پرست تھا، ممکن ہے ایک عام آدمی کی طرح میرے اندر بھی ذوق جمال کی خوبو ہو سکتی تھی لیکن اصل بات فوزیہ کے حسن میں اس کی دل موہ لینے والی شخصیت میں مجھے محسوس ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کا جادو، آواز کی ترماہٹ، لہجے کی کھنک اور گلابی ہونٹوں کا ان کہا رمزیہ ارتعاش۔ اور پھر وہ جوان کڑیل بیٹوں کی موجودگی میں باپ کی اس قدر خدمت اور اس سے محبت، ایسی حالت میں بھی۔ یہی وہ سارے عوامل تھے جس نے اس کی شخصیت کا جادو مجھے متاثر کیے دے رہا تھا۔

اگلے دن میں لاری اڈے پر جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ اور منی بس پکڑنے کے لیے اسٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک سیاہ رنگ کی ٹویوٹا کرولا میرے بالکل

قریب آن رکی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

ڈرائیور کے برابر والی سیٹ میری طرف تھی اور اسی کھڑکی کا شیشہ خودکار انداز میں نیچے ہوا تو اسی طرح عقبی نشست کا بھی نیچے ہوا۔ وہاں بڑی بڑی گھنی مونچھوں اور دہشت ناک چہروں والے دو گن بردار آدمی براجمان تھے اور بڑی تیز اور شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورنے لگے، جبکہ اگلی سیٹ پر ایک بھاری بھرکم اور سانولی رنگت کا کرخت چہرے والا آدمی براجمان تھا جو میرے لیے اجنبی ہی تھا۔ بڑی غیظ آلودہ نظروں سے مجھے گھورتا ہوا کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''اوئے چھوکرے! نعمان احمد تیرا ہی نام ہے ناں؟''

میں کبھی ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ پہلے میں ان کی اس حرکت کو ان کی غلط فہمی پر محمول کر رہا تھا۔ مگر اپنے نام پر میں چونکا تھا، بولا۔ ''جی ہاں! میرا نام ہی نعمان احمد ہے۔''

''تو پھر ہماری بات غور سے سنو! ہم سے ٹکر لینے کا انجام تمہارے تصور سے بھی زیادہ بھیانک نکل سکتا ہے، بہتر یہی ہے کہ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ ہٹا دیے جاؤ گے۔''

''آپ لوگ ہیں کون؟ اور یوں مجھے سرعام دھمکی کیوں دے رہے ہو۔ میں تو آپ لوگوں کو نہیں پہچان رہا؟''

میں نے اپنے دل کی بڑھتی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ تو وہی شخص بولا۔ ''اسے دھمکی مت سمجھو۔ وارننگ ہے یہ تمہارے لیے۔ ہم کون ہیں اسے چھوڑو، تم کون ہو، کیا کر رہے ہو، یہ ہم جانتے ہیں، اور یہ بھی کہ تمہارا ایک بھائی اور جوان بہن عاصمہ بھی ہے۔ بس! کافی ہے اتنا۔''

اس کے بعد سیاہ ٹنٹڈ شیشہ اوپر چڑھ گیا اور کار آگے بڑھ گئی۔ میں اپنی جگہ سن کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی دھمکی اور اس کی زبان سے اپنی بہن کا نام سن کر میرا دماغ گرم ہونے لگا تھا۔

میرا خدشہ درست نکلا تھا، یہ لینڈ مافیا کے ہی لوگ تھے۔ اور انہیں میرے اور میری ''کارگزاری'' کا علم ہو چکا تھا مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہیں میرا کیسے پتا چلا؟ میرا نام، میرے بہن بھائی، وغیرہ۔ یہ سب اسے کس طرح پتا چلا؟ بے شک ان میں کچھ باتیں ایسی تھیں جن کا ان کے لیے جان کاری حاصل کرنا کوئی مشکل نہ تھا لیکن ان کی چند باتوں سے ایسا کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے آئندہ کے ان عزائم سے بھی اچھی خاصی جان کاری رکھتے تھے، جس کے لیے میں ایک مربوط حکمت عملی ترتیب دے چکا تھا۔ ایسا تب ہی ممکن ہو سکتا تھا جب کوئی ''اپنا آدمی'' مخبری کرے، اور وہ اپنا آدمی چاچا انور شاہ کے سوا، اور کون ہو سکتا تھا، لیکن مجھے ان پر پورا بھروسا سا تھا کہ وہ کبھی بھی ایسی قبیح حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ تو پھر کون تھا؟ لامحالہ بڑے منشی دادن خان کا نام ہی ذہن میں آتا تھا۔ اس کی اس روز والی مشتعل تقریر نے میرے دل میں پہلے ہی کھٹک پیدا کر دی تھی جس طرح وہ اس معاملے کو بنانے کی بجائے بگاڑنے پر تلا ہوا تھا تو اس سے مجھے یہی لگا تھا کہ وہ اس طرح مخالف گروپ کو فائدہ پہنچانا چاہتا تھا۔

''تو کیا دادن خان لینڈ مافیا سے ملا ہوا تھا؟'' میرے ذہن میں ابھرا۔

بہرطور آج کی اس صورت حال نے مجھے خاصا تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں اپنی عقل اور ذہانت کے بل بوتے پر جس طرح اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، مجھے اس کی ''پیش'' اس طرح ''لینڈ مافیا بدمعاشی'' کے آگے چلتی ہوئی نہیں نظر آ رہی تھی۔ ظاہر ہے مجھ جیسا ایک عام اور کم مایہ شخص اتنے بڑے گینگ کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا؟ بات اپنی ذات کی حد تک ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن میرے بھائی بہن کے حوالے سے مجھے ان کا دھمکانا مجھے واقعی ایک انجانے خوف میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔ یہ ان کی بزدلانہ حرکت تھی۔

میں اسی پریشانی میں لاری اڈے پہنچا اور سوچتا رہا کہ آیا مجھے اس بات سے چاچا انور شاہ کو آگاہ کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟ ان کے سوا، اور بھلا میرا کون ہمدرد اور غم خوار تھا؟ میں نے کم از کم انہیں آگاہ کرنا تو ضروری ہی سمجھا تھا۔

لیکن اس روز میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی، وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں ٹھٹھہ گئے ہوئے تھے۔

اسی دن میں ذرا جلد ہی گھر لوٹ آیا۔ آج کام میں دل ہی نہیں لگا تھا۔ سارا دن ذہن اسی پریشانی اور تشویش میں مبتلا رہا تھا۔

ابھی شام کا جھٹپٹا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ میں اپنے گھر کے قریب پہنچا تو بری طرح کر رک گیا۔ ایک بڑی سی نئے ماڈل کی سفید کار میرے گھر کے سامنے کھڑی تھی اور دروازے پر میں نے جس شخص کو کھڑے دیکھا وہ میرے لیے ناقابلِ یقین ہی نہیں بلکہ حیرت اور چونکا دینے کا بھی باعث بنا تھا۔ وہ رانا بشیر تھا۔

(جاری ہے)

(مہناز فتح چنیوٹ کا جواب)

رفیق احمد ناز.........ڈی جی خان

یوں سما جاؤ اس دل میں دنیا کہے
کہیں شمس و قمر بھی یک جان ہوتے ہیں

اشتیاق احمد.........دینہ

یہ سارے رنگ مردہ تھے تمہارے ہنسنے سے
یہ سارے حرف مہمل تھے تمہارے نام سے پہلے

(انیس الرحمٰن کراچی کا جواب)

نازش ممتاز.........کراچی

مجبوری و فراق کا شکوہ نہیں بجا
خود پہ نہ ہو یقین تو محبت نہ کیجیے

(نسرین مشتاق کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری.........لاہور

یہ موسم کی ادائیں بھی ہیں انہی کے لیے
وہ ہیں انگشت بدنداں کہ مرے آنگن میں بہار آئی

(ہما اختر مظفر گڑھ کا جواب)

سید محمد حسین شاہ.........کراچی

لفظوں میں پڑ گیا ہے اثر انقلاب کا
اپنا جسے کہا وہی بیگانہ بن گیا

رفیق احمد ناز.........ڈیرہ غازی خان

لے کر چھین گئی مجھ سے پیام بہار زندگی
منسوب تھے جس نے زیست کے سب رنگ

ارشد حسن.........میانوالی

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

(نزاہت افشاں مہورہ کا جواب)

عبدالحکیم شمر.........کراچی

اس قدر بھیڑ تھی اس بار بھی رستے میں ترے
کوئی چہرہ کسی کھڑکی سے ہٹ آیا شاید

زاہدا کبر.........سیالکوٹ

ایک پرانا مرض جس میں دفن ہیں لاکھوں امیدیں
چھلنی چھلنی سینہ آدم دیکھنے والے دیکھتا جا

(نوشین جاوید مظفر گڑھ کا جواب)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان.........ڈاہرانوالہ

میں شعاعوں میں پگھل جاؤں مری فطرت نہیں
وہ ستارہ ہوں کہ جس کو ڈھونڈتی ہے روشنی

عشرت جہاں.........لاہور

سب سے پرامن واقعہ یہ ہے
آدمی آدمی کو بھول گیا

حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی.........میانوالی

ساتھ چھوڑا تھا مگر شہر نہ چھوڑا ہوتا
ہم اسے دیکھ تو لیتے کہیں آتے جاتے

(نصرت جبین کراچی کا جواب)

سیف اللہ.........ملک وال

نماز جنازہ پڑھی میری عزیزوں نے
مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

نزاہت افشاں.........مہورہ فتح جنگ

میں جس میں آگ بھر کر دن رات پیتا ہوں
کوئی چھو بھی نہیں سکتا وہ جام آتش میرا

(محمد ممتاز قادری شادی پور کا جواب)

نیلوفر شاہین.........اسلام آباد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ترے دل کے ہے دھڑکنے کی صدا یاد

عباس شاہ.........لاہور

میرے شاداب گلستاں کو جلانے والے
تیری ہستی کا بھی شیرازہ بکھر جائے گا

نوشین کنول..........جھنگ

میں چاہتا ہوں کہ تم ہی مجھے اجازت دو
تمہاری طرح سے کوئی گلے لگائے مجھے

ورواملک..........خانیوال

میری آنکھ میں ایک مدت سے
قافلے رت جگوں کے ٹھہرے ہیں

آفتاب حیدر..........سرگودھا

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا
(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

محمد ثاقب..........ملتان

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

ندرت علی..........لاہور

آس کیا اب تو امید نا امیدی بھی نہیں
کون دے مجھ کو تسلی کون بہلائے مجھے

سندس امین..........جہلم

اداس رکھو یا خوش کچھ گلہ نہیں کرتے
خزاں کے پھول کبھی یوں کھلا نہیں کرتے
(نسیم شاہ مظفر گڑھ کا جواب)

مریم بنتِ کاشف..........حیدرآباد

دوست بن بن کے ملے مجھ کو مٹانے والے
میں نے دیکھے ہیں کئی رنگ بدلنے والے
(محمد احمد رضا انصاری کوٹ ادو کا جواب)

زاہد شیخ..........لاہور

اب اے خدا عنایت بے جا سے فائدہ
مانوس ہو چکے ہیں غم جاوداں سے ہم

عباس علی ملک..........فیصل آباد

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
ایک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

احمد توحید..........سرگودھا

آگ کی ضد پہ نہ جا پھر سے بھڑک سکتی ہے
راکھ کی تہہ میں شرارہ نہیں دیکھا جاتا

نجمی رحمٰن..........برٹ لیٹ امریکا

پرورش بچوں کی امریکا میں ہو
جائیدادیں جن کی انگلستان میں
ہو دوا ہر مرض کی بیرونِ ملک
حکمراں ایسے ہیں پاکستان میں

نیئر حسن..........کراچی

پھول پہ دھول ببول پہ شبنم دیکھتا جا
اب ہے یہی انصاف کا عالم دیکھنے والے دیکھتا جا
(عبدالحکیم شر کراچی کا جواب)

احمد ایاز..........سرگودھا

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لیے بیٹھے ہیں

انیس انصاری..........کراچی

یہی ارشد ہمارے نوجوانوں کی کہانی ہے
جیے دولت کی خاطر اور مرے فلمی ستاروں پر

محمد سیف الاسلام..........گجرات

لفظ لفظ وفاؤں کی مسکراتے پھول
کسی غریب کی قسمت کا ہے ستارہ خط

ناہید فاطمی..........ملتان

یہ بزم محبت ہے اس بزم محبت میں
دیوانے بھی شیدائی فرزانے بھی شیدائی
(عبدالجبار رومی انصاری لاہور کا جواب)

انیس احمد..........شادی پور

نہ دشت چھانے نہ بن کھنگالے نہ کوہ پیا ہے
اسی ندامت پہ جی رہے ہیں کسی کی خاطر کیا ہی کیا ہے
(منعم سید سیالکوٹ کا جواب)

نسیم احمد نیازی..........ملک وال

واسطہ پھر پڑ گیا تھا ان کا سلطانی کے ساتھ
زندگی اسلوب جینے کے سکھا کر یوں گئی

نزہت رحمٰن..........لاہور

وہ جو آجاتے تھے آنکھوں میں ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کررہے ہیں نتیجتاً ان کے شعر تلف کردیے جاتے ہیں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .................................... ہے۔

نام: ....................................................................

پتا: ....................................................................

....................................................................

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔



مورخہ 28 فروری 2017 تک علمی آزمائش 134 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

## مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....................................................

پتا ....................................................

....................................................

محترم/ محترمہ ........ کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے)

95

مقابلہ بیت بازی

74200 ... 982 ...

# علمی آزمائش۔ 134

ادارہ

**ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ**

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 فروری 2017 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

## اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

2 لاکھ 15 ہزار 339 مربع کلومیٹر پر پھیلی اور ڈیڑھ کروڑ کی آبادی والی ریاست جسے پاکستان میں شامل ہونا تھا لیکن حکمران کی نااہلی کے سبب ہندوستان میں شامل کہلاتا ہے۔ اس ریاست کے پہلے حکمران کا نام قمرالدین خان تھا۔

## علمی آزمائش 132 کا جواب

بانو قدسیہ فیروز پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ لاہور سے ریاضی اور معاشیات میں بی اے پھر اردو میں ایم اے کیا۔ ریڈیو ٹی وی کے لیے بے شمار ڈرامے تحریر کیے۔ حکومت نے تمغۂ امتیاز سے نوازا۔

## انعام یافتگان

1۔ نزہت جمال، کراچی 2۔ محمد انعام الدین، حیدرآباد 3۔ نایاب حسن، چنیوٹ 4۔ احمد توحید، جھنگ 5۔ یاسر علی خان، لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے اسامہ مجل، سنبل جبین، سید عزیز الدین، پروین اختر، جلیل احمد جعفری، ناعمہ تحریم (ملیر) خاقان احمد، نبیل اختر، عنایت گجر، فرحت عباس نقوی، عنایت مسیح، سبطین سید، الیاس محمد خارج، غلام حسن، طفیل احمد، نازش حسین، نوید حسن، نعمان خان، زبیر سیالکوٹی، باسط فاروقی، نذر حسین، انعام گل، صباحت مرزا، محمد احمد، یاسین خان، منظر حسن، قیام الدین انصاری، دردوہ جتول، اکبر علی رئیسانی، ارشد علی، عنبرین اختر، اسرار احمد، مولیٰ بخش بٹ، تنویر حسین، ہارون محمد، فتح باب خان اچکزئی، انیس جتوئی، فہیم بٹ، سعید الدین مروت، صوفی تبسم، محمد فیضان،

خواجہ خیر محمد، نواز سلیم کھوکھر، مہوش علی خان، فرحین بشیر، فیروز رحمانی۔ کوٹ ادو سے محمد احمد رضا انصاری۔ شورکوٹ جھنگ سے نثار احمد، ریڈیو مکینک۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، بشارت خان۔ فرمان حسن۔ علی عباس، محمد ذیشان، خالد عثمانی، تحریم فاطمہ، ماہ جبین فاطمہ، نعیم اختر، عزیز الحسن، فہد عثمانی۔ راولپنڈی سے رضوان قریشی، ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، رضوان احمد ہاشمی، توصیف حسین، طارق ظفر، مسعود اظہر، معین انور، افتخار حسن خان، کاظم زیدی، حضور خان، عتیق الرحمن خان، برجیس مرزا، ذکی سید، تقی عباس تقی، قادر علی قادری، نوید حسن خان، کاظم جعفری، مہدی علی خان، صابر علی، محمد اسلام الدین انصاری۔ لڈن وہاڑی سے منشی محمد عزیز میئے۔ وزیر آباد سے سلمٰی فرحت۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، محمد فیض، عتیق احمد، ذیشان مرزا۔ ملک وال سے سیف اللہ، ملتان سے محمد معین چشتی، محمد یحییٰ معین، محمد افتخار، فرحین گل، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، رخسانہ یاسمین، خالد حسن توصیفی، نسیم احمد، نصیر احمد، فوزیہ اختر، بیگم الطاف گوہر، ذکیہ احسن کمال، نفیسہ جمال انصاری، گل باز خان، خالد حسن، ارشد آفاق، ممنون الحسن، پیام احسن، مظہر قادری۔ لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری، نیاز چوہان، کائنات مرزا، فہد علی خان، عباس رضا سید، اقبال اصغر، عبدالخالق، احمد علی بٹ، توصیف باری، آل پنجتن نقوی، اصغر علی اصغر، نواز کبیر، یاسمین فرحت، مصباح الرضا، نوید احسن، لیاقت جتوئی، صابر علی خان، نیاز حسن، سلمان احمد، تاثیر احسن۔ رحیم یار خان سے جاوید احمد، جمال اکبر، اسرار احمد، فہیم الدین، بخشش حسین، ثنا مرزا، ملک یاسین، حبیب علی، ذکی حسن، ابرار بھٹ ڈرائیور، ارباز حسن زکی۔ ساہیوال سے صوفی مقبول احمد نقشبندی، صفی مبارک علی نقشبندی، حکیم اللہ، کاظم علی، مختار قاضی، فہیم عباس، نعمت اللہ۔ کوہاٹ سے زاہد خان، فدا حسین طوری، نصیر عباسی، فتح محمد، ارشد کوہاٹی۔ ساہیوال سے عبدالستار۔ میانوالی سے حکیم سید محمد رضا، شاہ نقوی، سلطان احمد، نوازش حسن۔ شیخوپورہ سے ندرت قاسمی، ثریا فاطمہ، عقیل احمد، محیب بٹ، ناصر حسین، عرفان قاسمی۔ پشاور سے خاقان خان، قیام احمد، ممتاز عرفان، ظہیر الدین، نجم شاہ، اصغر شاہ، زاہد حسین طوری بنگش، فدا حسین زیدی، ارباب خان۔ جہلم سے کنیز کبریٰ، فہد علی خان، حکیم صدر الدین، ناصر کوکب خان۔ بہاولپور سے مسرت اسلم ملک، مہوش خان، فطرت عباس، نور علی، اقبال احمد، تقی حسن، جاوید تقی عثمان، اکرام ملک، نواز کھوکھر، امتیاز حسن، محمد فہیم، نوشین ملک، صفی اللہ خان۔ بہاولنگر سے صغریٰ بیگم، انتخاب الحسن، افضال محمد، ذکیہ امتیاز، ملک امتیاز، فصاحت اللہ، ظہیر شاہ، آفتاب احمد، عثمان مظفر، یاور علی سید۔ مظفر گڑھ سے ارباب رضا، نعمان ملک، چوہدری فیض اللہ، ساجد علی، نیاز حسین، فاروق نیازی، ارباز خانزادہ، فصیح الدین، جاوید حسن خان، کھاتان سے سلیم کامریڈ۔ جاوید مسیح، خاقان خان۔ جامشورو سے راشد مغل، حیدر علی بھٹو، مدحت لاشاری، ایاز سومرو۔ حیدرآباد سے نسرین یاسین، احمد جاوید، سلیم کھوکھر، فرید احمد، نواز حسن خان، اکبر فیاض لودھی، عباس علی، ماہ رخ، امجد بٹ، محمد محی الدین خان، احمد لون، فیصل شیخ۔ سکھر سے شیخ یاسر، نجم الدین ثاقب، بیاس گل، اقبال انصاری۔ جیکب آباد سے امین عباسی، ذوالفقار خان، فہد شیخ، کائنات یاسمین۔ میرپور خاص سے سدرہ ناصر علی، پروفیسر طارق حبیب، سلطان جوکھیو، نصیر ہایانی۔ میرپور ماتھیلو سے فہد سومرو، عباس حسن، سلیم شانی۔ میرپور آزاد کشمیر سے جمیل اختر، یوسف خان، اطہر عباس، نیناںبٹ۔ تیز یود سے احمد علی زیدی، عباس ماشی۔ گجرات سے انیس طاہر نا گی۔ شادی پور سے لطیف الرحمن۔ خانیوال سے ناہید عباسی۔ ڈی آئی خان سے محمد جاوید احسن، جاوید مسیح، مغنی ایاز، رفیق احمد ناز، خالد یوسف۔ ڈی جی خان سے یونس احمد، یوسف شاہ، کنول، ظاہر خان۔ جھنگ سے عطاء المصطفیٰ، ناصر قاضی، التماس عباس، ظاہر شاہ، ضیاء الحسن، علیم الدین۔ شجاع آباد سے غلام جیلانی، وزیر محمد، غلام الثقلین، خالد یاسر۔ چنیوٹ سے سہیل آفندی، خورشید رضوی۔ تلہ گنگ سے شاہ زیب، وصی الحق۔ سرگودھا سے ہارون محمد، رشید تبسم، شکیب آفاقی، فرخندہ یاسمین، آذر لودھی۔ حاصل پور سے ابریز احمد۔

بیرون ملک سے زاہد خان (شارجہ)، نیاز احمد (جرمنی)، انصار حسین (کویت)، جعفر بلوچ (زاہدان ایران)۔ محمد رضا (جدہ)، صدیق بھٹی (عمان)، ایاز سومرو (بیڈفورڈ)۔

# ماں جایا

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
یہ میری اپنی سچ بیانی ہے۔ میری زندگی الجھی الجھی ہے۔ اسے ایک تحریر میں سمیٹنا ممکن نہیں پھر بھی میں نے کوشش کی ہے اگر کہیں کوئی جھول رہ گیا ہو تو پلیز اسے درست کرلیں۔

مہرین
(کراچی)

یہ خبر مجھ پر بجلی بن کر گری کہ امجد بھائی نے ہمارا آبائی مکان بیچ دیا ہے اور خود ڈیفنس کے کسی فلیٹ میں منتقل ہو رہے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلیا۔ کیونکہ اس مکان میں میرا بھی حصہ تھا جو ابو نے بڑی محنت اور چاؤ سے بنوایا تھا۔ انہوں نے اپنی محدود تنخواہ میں سے بچت کر کے پائی پائی جوڑی اور اس سے بفرزون میں ایک سو بیس گز کا پلاٹ خریدا پھر ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن سے قرض لے کر مکان کی تعمیر شروع کردی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب ہم نئے مکان میں شفٹ ہوئے تھے۔ اس وقت امجد بھائی دسویں اور میں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ امی اور ابو کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ امی نے میلاد شریف کا اہتمام کیا اور تمام قریبی رشتے داروں کو کھانے پر بلایا۔ ان میں سے کچھ واقعی ہماری خوشی میں شریک تھے اور کچھ کے چہروں پر حسد کی پرچھائیاں واضح طور پر نظر آرہی تھیں۔ ان میں ہماری چچی پیش پیش تھیں۔ پہلے تو انہوں نے مکان کا تنقیدی جائزہ لیا پھر اپنی عادت کے مطابق تبصرہ کرتے ہوئے بولیں۔ ''معاف کرنا بھابی۔ بھائی صاحب ہر معاملے میں کنجوسی دکھاتے ہیں۔ اگر مکان بنانا ہی تھا تو کم از کم دو سو گز کا پلاٹ تو لیتے۔ دو بیڈ روم میں تمہارا گزارہ کیسے ہوگا۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ انہیں بھی علیحدہ کمرا چاہیے۔ پھر تم دونوں میاں بیوی کیا ڈرائنگ روم میں بستر لگاؤ گے؟''

امی بہت خاموش طبیعت اور صلح جو تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بہن گزارہ تو بارٹن کوارٹرز میں بھی ہو رہا تھا۔ جہاں صرف دو کمرے، برآمدہ اور ایک صحن ہی تھا۔ یہ مکان اس سے بدرجہا بہتر ہے۔ کم از کم اس میں ڈرائنگ روم، لاؤنج اور اٹیچڈ باتھ تو ہیں۔ ہماری اتنی ہی گنجائش تھی۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اوپر ایک کمرا بنا کر امجد کو دے دیں گے۔ اس طرح یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

ابو نے ایسا ہی کیا۔ چند ماہ بعد کچھ پیسے ہاتھ آئے تو انہوں نے چھت پر ایک عارضی کمرا بنا کر اس میں امجد کے سونے کا انتظام کردیا اور ہم اپنے نئے مکان میں بظاہر پُرسکون زندگی گزارنے لگے۔ اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہاؤس بلڈنگ کی قسط ادا کرنے کی وجہ سے ابو کا ہاتھ کتنا تنگ ہو گیا تھا۔ اس موقع پر امی نے ان کا پورا ساتھ دیا اور گھر کے خرچ میں ممکنہ حد تک کفایت شعاری کرنے لگیں۔ البتہ انہوں نے ہماری ضروریات پوری کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہم سب اچھا کھاتے، اچھا پہنتے اور ہماری فیسیں بروقت ادا ہوتی تھیں۔ ابو کی خواہش تھی کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ اس لیے انہوں نے ہمیں کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا اور ہماری ہر ضرورت بر وقت پوری کی۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ وہ ریٹائر ہونے سے پہلے اپنا ذاتی مکان بنانے میں کامیاب ہو گئے اور اب ان کی ساری توجہ ہماری تعلیم پر تھی۔

میں کچھ بڑی ہوئی تو احساس ہوا کہ امی اور ابو نے

اس تنگ دستی کا اثر ہم پر تو نہیں پڑنے دیا لیکن اپنی ضروریات کو بے حد محدود کرلیا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اپنی تمام خواہشات کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ دونوں ہی خوش لباس، خوش وضع اور کھلا خرچ کرنے والے تھے۔ ابو کو نئے کپڑے بنانے کا شوق تھا اور ان کی الماری میں کئی سوٹ، قمیصیں اور پتلونیں لٹک رہی تھیں۔ وہ ایک دن کے پہنے ہوئے کپڑے دوسرے دن استعمال نہیں کرتے تھے۔ یہی حال امی کا بھی تھا۔ وہ ہر سال گرمیوں، سردیوں اور عید بقرعید پر نئے کپڑے بناتیں۔ اسی طرح انہیں شاپنگ کرنے کا بھی شوق تھا جب بھی بازار جاتیں، کراکری، چادریں، تولیے یا گھر کی ضرورت کا کوئی نہ کوئی سامان ضرور خریدتیں لیکن اب ان دونوں نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اپنی ذات پر تو وہ بالکل خرچ نہیں کررہے تھے۔ کئی کئی ماہ گزر جاتے لیکن امی ابو اپنے لیے کوئی جوڑا نہیں بناتے۔ پرانے کپڑوں سے ہی کام چل رہا تھا۔ ان کی یہ قربانی دیکھ کر میرا دل رونے لگتا۔ خدا جانے امجد بھائی کو بھی اس کا احساس تھا یا نہیں۔

امجد بھائی نے انٹر اور میں نے میٹرک پاس کیا تو والدین کو ہمارے مستقبل کی فکر ستانے لگی۔ ابو چاہتے تھے کہ بھائی انجینئر بنیں لیکن ان کے اتنے اچھے نمبر نہیں آئے کہ وہ این ای ڈی یا داؤد میں داخلہ لے سکیں چنانچہ انہوں نے ایم بی اے کرنے کے بارے میں سوچا لیکن وہ آئی بی اے کا ٹیسٹ بھی پاس نہ کرسکے۔ مجبوراً انہیں پرائیویٹ یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑا جہاں کی سمسٹر فیس ابو کی تین ماہ کی تنخواہ کے برابر تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ابو نے اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے کیا لیکن ان کی کمر مزید جھک گئی۔ میں کالج میں آئی تو امی کو تعلیم سے زیادہ میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ ایک دن میں رات کے وقت پانی پینے لاؤنج میں آئی تو امی ابو کی باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے سنا امی کہہ رہی تھیں۔

”ماشاء اللہ مہرین کالج میں آگئی ہے۔ دو چار سال بعد اس کی شادی کرنا ہوگی۔ ہمیں ابھی سے تھوڑا بہت انتظام کرلینا چاہیے۔“

”میں نے تو سوچا ہے کہ اسے ڈاکٹر بناؤں۔ اس کے بعد ہی شادی ہوگی۔“

”رہنے دیں۔ ڈاکٹر بن کر کیا کرے گی۔ سسرال جا کر اسے روٹی ہانڈی ہی کرنی ہے۔ میں اپنی بیٹی کو دوہرے عذاب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی۔ دن بھر مریضوں میں سر کھپاؤ، شام کو کچن سنبھالو۔ آج کل ڈاکٹر بننا آسان نہیں ہے۔ لاکھوں خرچ ہوجاتے ہیں۔ آپ پر ویسے ہی امجد کی پڑھائی کا بوجھ ہے۔ یہ اضافی خرچ کیسے برداشت کریں گے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم ابھی سے اس کی شادی کے لیے کچھ جوڑنا شروع کردیں۔“

”شادی کے اخراجات کی فکر مت کرو۔ میں اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لے لوں گا۔ اس وقت تک امجد بھی برسر روزگار ہوجائے گا لیکن تم میری بیٹی کو پڑھنے سے مت روکو۔“

”میں کب روک رہی ہوں۔ بے شک وہ اپنی تعلیم جاری رکھے۔ شادی تو گریجویشن کے بعد ہی ہوگی۔“

”گویا تم نے سوچ لیا ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بناؤ گی۔“

”ہاں میں اس کا وقت اور آپ کا پیسا ضائع کرنا نہیں چاہتی۔“

میرا دل ٹوٹ کر رہ گیا اور میں اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ میری ہمیشہ سے یہی خواہش تھی کہ ڈاکٹر بنوں۔ شاید ہر ذہین اور پڑھاکو لڑکی یہی خواب دیکھتی ہے۔ میں بچپن سے ہی پڑھائی میں تیز تھی۔ میٹرک میں بھی اے ون گریڈ آیا تھا اور فرسٹ ایئر میں بھی خوب دل لگا کر محنت کررہی تھی تاکہ انٹر میں اتنے نمبر آجائیں کہ مجھے باآسانی سرکاری میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے۔ لیکن امی کی باتوں نے میرا کلیجہ چھلنی کردیا تھا۔ وہ امجد بھائی کو مجھ پر ترجیح دے رہی تھیں۔ یہی وہ امتیازی سلوک ہے جو ہمارے معاشرے میں صنف نازک کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ مجھے امی کے رویے میں خودغرضی کی جھلک نظر آئی کیونکہ ہمارے یہاں بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑکا لے کر آتا ہے اور لڑکی لے کر جاتی ہے۔ انہیں میرے ڈاکٹر بننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ میری کمائی سے شوہر اور سسرال والوں کو فیض پہنچتا پھر وہ میرے اور اپنے شوہر کی خون پسینے کی کمائی کیوں خرچ کرتیں جو پہلے ہی کافی زیر بار تھے۔

میں کافی دیر تک روتی رہی جب دل کچھ ہلکا ہوا تو میں نے امی کی باتوں پر غور کرنا شروع کیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ ڈاکٹر بننے کا سفر بہت طویل تھا۔ ایم بی بی ایس کرنے میں پانچ سال لگتے ہیں۔ پھر ایک سال کا ہاؤس جاب۔ اس کے بعد بھی صرف ایم بی بی ایس کو کوئی نہیں پوچھتا۔ زیادہ سے زیادہ کسی اسپتال میں آر ایم او کی جاب

مل سکتی ہے جس کی ڈیوٹی صرف وارڈ کا چکر لگانے تک محدود ہوتی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کسی مریض کو ایک گولی بھی نہیں دے سکتا۔ لہٰذا زیادہ تر لوگ اسپشلائزیشن کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں جس میں مزید پانچ چھ سال لگ جاتے ہیں۔ اس وقت تک میں تیس کی ہو جاؤں گی اور میری شادی کے امکانات پچاس فیصد کم ہو جائیں گے۔ ویسے بھی ہمارے معاشرے میں لڑکی کی شادی پہلی ترجیح ہے۔ اس کے کیریئر سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ امی بھی انہی خطوط پر سوچ رہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ اپنی زندگی میں ہی میرے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ لہٰذا میں نے بھی ڈاکٹر بننے کا خیال دل سے نکال دیا اور چادر تان کر سو گئی۔

میں نے انٹر سائنس کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میرا ارادہ کیمسٹری میں ماسٹرز کرنے کا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ پڑھائی سے میری دلچسپی واجبی سی رہ گئی تھی اور میں صرف وقت گزاری کے لیے یونیورسٹی جارہی تھی کیونکہ ابو کی بھی یہی خواہش تھی کہ اگر میں ڈاکٹر نہ بن سکی تو کم از کم ایم ایس سی ہی کرلوں۔ میں نے شام میں دو تین ٹیوشنز لگائی تھیں جن سے اتنی آمدنی ہو جاتی کہ میرے اخراجات پورے ہو جاتے بلکہ گھر کے لیے بھی کچھ چیزیں لے آتی تھی۔ ابو کی بھی ترقی ہو گئی تھی۔ جب ان کی تنخواہ میں اضافہ ہوا تو امی نے کمیٹی ڈالنا شروع کردی تاکہ میری شادی کے لیے کچھ پیسے جمع ہو جائیں۔ البتہ امجد بھائی کو کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ اپنی دنیا میں مست تھے۔ میں نے اشارتاً ایک دو مرتبہ انہیں ٹیوشن کرنے کی ترغیب دی لیکن انہوں نے صاف انکار کردیا اور بولے۔ ”اس سے میری پڑھائی پر اثر پڑے گا اور میں ایسا نہیں چاہتا۔ میری خواہش ہے کہ مقررہ وقت میں اپنا کورس مکمل کرلوں تاکہ مجھے کوئی اچھی جاب مل جائے۔ اس کے بعد ابو کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ ان کی طرح ساری عمر گھس گھس کر نہیں گزار سکتا۔ مجھے بڑا آدمی بننا ہے۔ تاکہ اپنا اور بچوں کا مستقبل محفوظ بنا سکوں۔“

یونیورسٹی کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ یہاں ہر طرح کے طالب علم تھے جنہیں پڑھنا تھا۔ وہ پڑھ رہے تھے اور جو تفریح کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ وہ تفریح کر رہے تھے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے یہ کوئی میرج بیورو یا لو اسپاٹ ہے جہاں لڑکے لڑکیاں اپنا جیون ساتھی چننے کے لیے آتے ہیں۔ میری طرف بھی کئی لڑکوں نے بڑھنے کی کوشش کی لیکن میں نے کسی کو لفٹ نہیں کروائی۔ امی نے پہلے روز ہی یہ بات سمجھا دی تھی کہ مجھے اپنی پسند سے شادی کرنے کا پورا حق ہے لیکن اس کے لیے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ ایسے ساتھی کا انتخاب کرنا چاہیے جو ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان ہو اور جس کے سامنے ایک روشن مستقبل ہو۔

میری طرف بڑھنے والوں میں نوید کے علاوہ کوئی بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ ان میں سے بیشتر غیر یقینی کیفیت سے دوچار تھے۔ انہیں خود معلوم نہیں تھا کہ پوسٹ گریجویشن کے بعد وہ کیا کریں گے۔ کوئی سول سروس کا امتحان دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو کسی کو امید تھی کہ وہ لیکچرار بن جائے گا اور کوئی ملک سے باہر جانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ان سب لڑکوں میں نوید کی پوزیشن مستحکم تھی۔ وہ کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے باپ کی امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم تھی اور وہ ڈیفنس میں رہتا تھا۔ چند ہی دنوں میں وہ میرا اچھا دوست بن گیا۔ ویسے تو ہمارا پانچ لڑکیوں کا گروپ تھا اور میں زیادہ وہ وقت انہی کے ساتھ گزارتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی میں اور نوید لائبریری یا کینٹین میں بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کر لیتے تھے۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کیا کرے گا تو وہ بولا۔ ”کرنا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے والد کا بزنس سنبھالوں گا۔ میرا کوئی بھائی تو ہے نہیں۔ اس لیے یہ ذمے داری مجھ پر ہی آئے گی۔“

”پھر تو تمہیں ایم بی اے کرنا چاہیے تھا۔ کیمسٹری کیوں پڑھ رہے ہو؟“

”میرے والد صرف میٹرک پاس ہیں۔ انہوں نے ایم بی اے نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ ایک کامیاب بزنس مین ہیں۔ میں انجینئر بننا چاہتا تھا لیکن انٹر سائنس میں کم نمبر آئے۔ اس لیے یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑ گیا۔ اگر کسی مرحلے پر ضرورت محسوس کی تو ایم بی اے بھی کرلوں گا۔“

چار سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ اس دوران بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ امجد بھائی کو ان کی مرضی کی ملازمت مل گئی۔ میں نے ایم ایس سی کرلیا ابو کی ریٹائرمنٹ قریب تھی۔ اس لیے امی ہم دونوں کی شادی کے بارے میں سوچنے لگیں۔ انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا کہ اگر میری کوئی پسند ہو تو بتا دوں۔ انہیں کیا جواب دیتی۔ حالانکہ نوید مجھے پسند تھا اور میں نے اس کی باتوں سے بھی یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن اس نے ابھی تک کھل

## جارجیا

بحیرۂ اسود کا کیشیائی ریاست۔ رقبہ: 26900 مربع میل یا 6900 مربع کلو میٹر اس کے مغرب میں بحیرۂ اسود، شمال اور شمال مشرق میں روس اور جنوب میں ترکی اور آرمینیا اور جنوب مشرق میں آذربائی جان واقع ہیں۔ آبادی (2000ء) 56 لاکھ۔ دارالحکومت تبلیسی یا طبلیسی، زبان جارجیائی اور دیگر لہجے۔ مذہب عیسائیت۔ کورو اور ریونی مشہور دریا ہیں۔ چائے، گندم، پھل، سبزیاں، اعلیٰ قسم کا ریشم اور تمباکو اہم زرعی پیداوار اور سونا اور مینگنیز اہم معدنی پیداوار ہیں۔ کوئلہ اور تیل بھی نکالا جاتا ہے۔ صنعتی پیداوار میں گاڑیاں اور بجلی کی مصنوعات اور پن بجلی قابل ذکر ہیں۔ شرح خواندگی تقریباً 99 فیصد ہے۔ اس کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں جارجیا ایک سلطنت تھی پھر ایران کے ساسانی بادشاہوں نے اس پر تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں حکومت کی۔ 18 ویں صدی عیسوی میں جارجیا نے روس کی حکمرانی قبول کر لی۔ 1801ء میں اس کا آخری بادشاہ معزول ہوا اور اسے روس میں شامل کر لیا گیا۔ 1921ء میں اسے سوویت یونین کا حصہ بنایا گیا۔ آئین کے تحت چونکہ ہر روسی ریاست کو کسی بھی وقت آزاد ہونے کا حق دیا گیا تھا۔ چنانچہ یہاں کے باشندوں نے 1991ء میں روس سے آزادی حاصل کرنے کا اعلان کر دیا۔ مارچ 1991ء میں جارجیا نے روس کے آئینی ریفرنڈم کا بائیکاٹ کر دیا۔

کر کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس لیے میں نے ای کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اگر میری کوئی پسند ہوئی تو بتا دوں گی۔

وہ یونیورسٹی میں آخری دن تھا۔ میں اپنی مارک شیٹ لینے گئی تھی۔ نوید بھی آیا ہوا تھا۔ میرے ساتھ گروپ کی دوسری لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ مجھے اشارہ سے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ ''کیا ہم کہیں بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ چلو کینٹین چلتے ہیں۔''

''نہیں، میں جو بات کرنے والا ہوں۔ اس کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر تمہارے پاس وقت ہو تو ہم کسی ریستوران میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔''

''سوری، تم جانتے ہو۔ میں کبھی کسی کے ساتھ ایسی جگہ پر نہیں گئی۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔''

''شاید تم میری گاڑی میں بیٹھنے سے ہچکچا رہی ہو۔ میں تمہیں لوکیشن بتا دیتا ہوں۔ تم رکشا کر کے وہاں پہنچ جاؤ۔ میں تمہارا صرف آدھ گھنٹا لوں گا۔ اس کے بعد تم اپنے گھر چلی جانا۔''

اس کے لہجے کی بے چینی سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی بہت ہی خاص بات کہنے والا ہے۔ میں کچھ کچھ سمجھ تو گئی تھی لیکن جب تک اس کی زبان سے نہ سن لیتی، مجھے یقین نہیں آتا۔ پہلے سوچا کہ انکار کر دوں پھر دل کے کسی گوشے سے آواز آئی کہ اس کی بات سن لینے میں کیا حرج ہے۔ میں ان لڑکیوں سے رخصت ہو کر آتی ہوں۔''

میں نے اپنی دوستوں سے الوداعی ملاقات کی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پارکنگ لاٹ تک آ گئی۔ وہ گاڑی کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے دروازہ کھولا اور میں تیزی سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد میں نے اپنی چادر کے پلو کو نقاب کی طرح چہرے پر لے لیا۔ اب اگر کوئی دیکھ لیتا تو بھی مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی کار ایک ریستوران کے سامنے روکی اور مجھے لے کر اندر چلا گیا۔ اس نے داہنی جانب ایک آخری کیبن منتخب کیا اور بولا۔ ''اب تم یہ نقاب ہٹا سکتی ہو یہاں تمہیں دیکھنے والا کوئی نہیں۔''

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ بعض اوقات پولیس چھاپہ مار کر نوجوان جوڑوں سے نکاح نامہ طلب کرتی ہے ورنہ دوسری صورت میں انہیں حوالات میں لے جا کر بند کر دیا جاتا ہے۔ جب میں نے

اپریل 1991ء میں ابل جارجیا نے روس کو ہر قسم کے ٹیکس وغیرہ دینے سے انکار کر دیا اور 1991ء میں کیمونسٹ مخالف رہنما گیمس کھوردیا کو صدر منتخب کرلیا گیا۔ اگست 1991ء میں روس کے ساتھ اس کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو گئے۔ اسی سال عوام نے صدر کے خلاف جمہوریت کی مکمل بحالی کے لیے نعرے بلند کیے چنانچہ گیمس کھوردیا جنوری 1992ء میں آرمینیا بھاگ گیا اور سابق سوویت یونین کے سابق وزیر خارجہ ایڈورڈ شیورڈ ناڈزے نے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ سیگوا (Sigua) وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ اسی سال جارجیا آزاد ریاستوں کی یورپ کی سیکیورٹی اینڈ کوآپریشن کا رکن بنا۔ اگست 1993ء میں اوٹر پٹیٹیسیا (Otar Patatasia) ملک کے وزیر اعظم بنے۔ 1994ء میں جارجیا اور روسی فیڈریشن کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کے تحت روس کو جارجیا کی سرزمین پر تین فوجی اڈے قائم کرنے اور جارجیا کی فوج کو تربیت دینے کی اجازت دے دی گئی۔ 1996ء میں جارجیا اور جنوبی اوسیٹیا (Ossefia) چھ سالہ جنگ بند کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ تیز ابخازیہ کو مسئلے کو بھی حل کرنے میں کچھ مدد ملی تاہم اپریل 1997ء میں جارجیا کی پارلیمنٹ نے اکثریتی ووٹوں سے روسی فوجی اڈوں کو ختم کرنے کی منظوری دی۔

مرسلہ: فاطمہ شاہ۔ نگر (گلگت)

اس خدشے کا اظہار نوید سے کیا تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔ یہاں کوئی پولیس والا نہیں آئے گا اور اگر کوئی آیا تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔ تم سکون سے بیٹھو۔''

اس نے چائے اور اسنیکس منگوائے اور بولا۔ ''یونیورسٹی کی پڑھائی ختم ہو گئی اور کل سے میں بھی دفتر جانا شروع کردوں گا۔ اس لیے اب تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی اور بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ بتاؤ کہ میں تمہاری نظر میں کیسا آدمی ہوں؟''

یہ ایسا عجیب وغریب سوال تھا کہ میں چونک پڑی تاہم میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''بظاہر تو ٹھیک ہی ہو۔ اندر کا حال میں نہیں جانتی۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''آج کل لوگ ظاہر ہی دیکھتے ہیں۔ اندر کون جھانکتا ہے۔ ویسے تم نے ان چار سالوں میں یہ اندازہ تو لگا لیا ہوگا کہ میں دل کا برا نہیں ہوں۔''

''تم کہہ رہے ہو تو مان لیتی ہوں۔ اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ یہ تمہید کیوں باندھی جا رہی ہے؟''

''وہی بتانے کے لیے تو تمہیں یہاں لے کر آیا ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں کافی عرصے سے یہ بات کہنا چاہ رہا تھا لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں تم اسے بے وقت کی راگنی نہ سمجھو لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ تم سے بات کرنے کا یہ بالکل مناسب وقت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔''

''بھئی جو کہنا ہے جلدی کہہ ڈالو۔ مجھے الجھن ہو رہی ہے۔'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے مہرین۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''ارے یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو ہم بہت چھوٹے ہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے کہا۔ ''چلو فی الحال منگنی کر لیتے ہیں شادی بعد میں ہوتی رہے گی۔''

''لیکن تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں بھی تمہیں پسند کرتی ہوں یا نہیں۔''

''اگر تم مجھے ناپسند کرتیں تو کبھی میرے ساتھ یہاں تک نہ آتیں۔ اب جلدی سے بتا دو کہ ممی ڈیڈی کو کب تمہارے گھر بھیجوں۔''

''دیکھو نوید ہمیں سنجیدگی سے اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے چائے کا گھونٹ لیتے

ہوئے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ تمہارے ڈیڈی اور ممی اس رشتے پر راضی ہوسکیں گے۔ ہماری حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میرے والد ایک معمولی درجے کے سرکاری ملازم ہیں۔ ہم ایک سو بیس گز کے مکان میں رہتے ہیں جس کی قسطیں ابھی تک ادا ہورہی ہیں۔ اب میری ماں کو یہ فکر ستا رہی ہے کہ میری شادی کے اخراجات کے لیے رقم کا بندوبست کیسے ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کردو تو بہتر ہے۔ بلاوجہ اپنے گھر میں ٹینشن بڑھانے سے کیا فائدہ۔''

''میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا۔ صرف یہ پوچھا ہے کہ ممی ڈیڈی کو تمہارے گھر کب بھیجوں۔ یہ سب باتیں انہیں بتاچکا ہوں اور وہ اس رشتے کے لیے تیار ہیں۔''

''اچھی طرح سوچ لو کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ تمہیں اپنے ہم پلہ ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔''

''ہاں مل تو سکتی ہے لیکن وہ تم جیسی نہیں ہوگی۔''

''اب تم اتنا اصرار کررہے ہو تو کیسے انکار کردوں۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''امی سے بات کرکے بتاؤں گی۔''

جب میں نے امی کو نوید کے بارے میں بتایا تو وہ بہت حیران ہوئیں۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا میرا ہاتھ مانگ سکتا ہے لیکن جب میں نے کہا کہ اسے چار سال سے جانتی ہوں اور اس نے دوران تعلیم کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے پتا چلتا کہ وہ مجھ سے تعلق قائم کرنے کا خواہش مند ہے۔ اب مناسب موقع دیکھ کر اس نے یہ بات چھیڑی ہے جس سے اس کی سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے۔ میری بات سن کر امی سوچ میں پڑ گئیں اور بولیں۔ ''تمہارے ابا سے مشورہ کرکے بتاؤں گی۔''

ابو کا بھی یہی خیال تھا کہ حیثیت کے فرق کی وجہ سے یہ رشتہ بے جوڑ رہے گا۔ البتہ امجد بھائی کا کہنا تھا کہ یہ رشتہ فوراً قبول کرلینا چاہیے۔ اسے ٹھکرانا کفران نعمت ہوگا۔ وہ اپنے لیے ایک اچھی زندگی کا خواب دیکھ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ میں بھی عیش و آرام سے رہوں۔ اس موضوع پر ہمارے گھر میں تین چار دن تک بحث ہوتی رہی۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگیا کہ ان لوگوں کو اگلے اتوار کو بلالیا جائے۔

میں نے نوید سے کہہ دیا تھا کہ بے شک وہ ابھی منگنی کرلے لیکن شادی دو سال بعد ہوگی کیونکہ ایک تو جہیز کی تیاری کے لیے وقت درکار تھا۔ ابو کی ریٹائرمنٹ دو سال بعد ہونا تھی۔ تبھی ان کے ہاتھ میں کچھ رقم آتی دوسرے یہ کہ امی پہلے امجد بھائی کی شادی کرنا چاہ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ بہو کے آنے کے بعد ہی وہ بیٹی کو رخصت کریں۔ ورنہ وہ تنہا ہوجائیں گی۔ اس سلسلے میں وہ بڑے زور و شور سے امجد بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔

مقررہ وقت پر نوید کے والدین ہمارے گھر آئے۔ امی نے نوید کو بھی بلایا تھا وہ بڑے معقول اور سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ ان میں غرور تھا اور نہ ہی وہ امارت کا مظاہرہ کررہے تھے۔ امی ابو نے اپنی بساط کے مطابق ان کی خاطر مدارات کیں اور چند رسمی جملوں کے بعد نوید کی والدہ نے صرف مدعا بیان کردیا۔ امی نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تو وہ بولیں۔

''بے شک آپ تسلی کرلیں۔ ویسے تو مہرین اور نوید ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن پھر بھی آپ اطمینان کرلیں۔ نوید میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ ہمیں اس کی خوشی ہر حال میں عزیز ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا انتخاب غلط نہیں ہوسکتا اور آج مہرین کو دیکھ کر میری تسلی ہوگئی۔ مجھے آپ کی بیٹی بہت پسند آئی۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد ان کی منگنی کردی جائے۔''

''آپ مطمئن رہیں۔ ہم جلد ہی آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیں گے۔''

امی نے محض لڑکی والوں کی روایت پر عمل کرتے ہوئے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ ورنہ اس معاملے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی چنانچہ ایک ہفتے بعد امی نے انہیں فون کرکے اپنی رضامندی سے آگاہ کردیا اور منگنی کا دن بھی طے کرلیا۔ یہ تقریب انتہائی سادگی سے منعقد ہوئی۔ دونوں طرف سے قریبی رشتے دار ہی اس میں شریک ہوئے۔ ابو تو کسی کو بلانے کے حق میں نہیں تھے لیکن امی اپنے سسرال والوں سے بہت ڈرتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے چچا اور پھوپو کے گھر والوں کو بلالیا۔

منگنی والے دن میں نے نوٹ کیا کہ چچی کی بیٹی شازیہ ہمارے امجد بھائی سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہورہی تھی اور وہ بھی اس پر ریشہ خطمی ہوئے جارہے تھے۔ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا اور میں سمجھ گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ایک ہفتے بعد ہی میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب امجد بھائی نے امی سے کہا کہ وہ شازیہ کا رشتہ مانگنے چچی کے گھر چلیں

جائیں۔ یہ سن کر امی سناٹے میں آگئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ چچی اس طرح ان کے گھر میں نقب لگائیں گی۔

وہ لڑکی شازیہ امی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وہ انتہائی چھچھوری، بدمزاج اور بدتمیز تھی۔ اسے پڑھائی سے دلچسپ تھی اور نہ گھر کے کام کاج سے کوئی واسطہ بس سارا دن کمرا بند کیے موبائل سے کان لگائے رکھتی یا فلمیں دیکھا کرتی۔ انٹر میں دو مرتبہ فیل ہونے کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور مختلف کورسز کرنے کے بہانے گھر سے باہر وقت گزارنے لگی۔ کبھی کمپیوٹر، کبھی انگلش لینگویج اور کبھی انٹیریئر ڈیکوریشن لیکن اس کا کوئی کورس مکمل نہیں ہوا۔ البتہ اس میں ایک خوبی تھی اور وہ یہ کہ قدرت نے اسے اچھی شکل اور خوب صورت جسم سے نوازا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال، گورا رنگ، جھیل جیسی گہری آنکھیں۔ ستواں ناک اور بھرا بھرا جسم دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا۔ امجد بھائی بھی شاید اس کے حسن اور اداؤں میں الجھ گئے تھے۔

ابو تو خیر بھائی کی محبت میں کچھ نہیں بولے لیکن امی کسی صورت بھی شازیہ کو بہو بنانے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ ضد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہی ہوگا جو امجد بھائی چاہیں گے۔ ایک بار جو بات ان کے دماغ میں سما جائے وہ اسے پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔ کیا انہیں شازیہ کی خوبیوں اور خامیوں کا علم نہیں لیکن جب وہ خود ہی جلتا ہوا کوئلہ ہتھیلی پر رکھنے کے لیے تیار ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔ کل انہیں اس فیصلے پر پچھتانا ہوگا۔

''یہ تو میں نہیں چاہتی۔ اگر وہ اس گھر میں آگئی تو میرے بیٹے کی زندگی جہنم بنا دے گی۔''

''آپ کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ وہی کریں جو بھائی کہہ رہے ہیں۔ آگے ان کی قسمت۔''

امی با دل نخواستہ چچی کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ پہلے انہوں نے فون کر کے چچی کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔ وہ تو جیسے اسی انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ فوراً آنے والے اتوار کا وقت دے دیا۔ رشتہ کی بات کرنے امی اور ابو کے ساتھ میں بھی گئی۔ چچا اور چچی نے فوراً ہی رشتہ قبول کر لیا۔ مجھے لگا کہ سب باتیں پہلے ہی طے ہو چکی ہیں اور ہم صرف رسمی کارروائی کے لیے آئے تھے۔ چچا نے شادی کے لیے چھ ماہ کا وقت مانگا۔ امی کو بھی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے عید کے مہینے میں شادی کی تاریخ رکھنے پر اتفاق ہو گیا۔ میں خود بھی یہی چاہ رہی تھی کہ شازیہ جلد از جلد ہمارے گھر آجائے تاکہ میرا بھی راستہ صاف ہو۔

رشتہ طے ہو جانے کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ یہ دونوں کہاں رہیں گے۔ نیچے صرف دو بیڈ روم تھے جب کہ امجد بھائی چھت پر بنے ہوئے عارضی کمرے میں سوتے تھے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ نئی نویلی دلہن اس کمرے میں رہے۔ اس کے علاوہ یہ مسئلہ بھی تھا کہ اس کا سامان کہاں رکھا جائے گا۔ اس کا ایک ہی حل سمجھ میں آیا کہ اوپر کی منزل تعمیر کی جائے لیکن اس کے لیے پیسا کہاں سے آتا۔ ابو پہلے ہی ہاؤس بلڈنگ سے قرض لے چکے تھے اور ویسے بھی اس عمر میں انہیں مزید قرض نہیں مل سکتا تھا۔

امجد بھائی نے تجویز پیش کی کہ وہ اپنے دفتر سے ہاؤس بلڈنگ لون لے سکتے ہیں لیکن اس کے لیے مکان ان کے نام کرنا ہوگا۔ ابو کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا تاہم انہوں نے مجھ سے پوچھنا ضروری سمجھا۔ میری نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی بلکہ میں تو چاہتی تھی کہ کسی طرح یہ مسئلہ حل ہو جائے چنانچہ میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ چند ہی دنوں میں تمام کارروائی مکمل ہو گئی۔ بھائی کو کمپنی سے قرض مل گیا اور اوپر کی منزل کی تعمیر شروع ہو گئی۔ امجد بھائی نے اسے بالکل نئے انداز میں بنایا تھا۔ پورے گھر کے فرش اور باتھ روم میں ٹائل لگوائے۔ جدید طرز کا کچن بنوایا۔ نئے ڈیزائن کے دروازے اور المونیم کی کھڑکیاں نصب کی گئیں۔ اس کے مقابلے میں نچلی منزل بہت پرانی لگنے لگی۔

انہی دنوں میری نظر سے پبلک سروس کمیشن کا اشتہار گزرا بس میں کالج لیکچررز کے لیے درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ میں نے بھی اپلائی کر دیا اور خوش قسمتی سے میرٹ پر میرا سلیکشن ہو گیا۔ جب میں نے یہ خبر نوید کو سنائی تو وہ بولا۔ ''تمہیں ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہاری ضروریات بہ آسانی پوری کر سکتا ہوں۔''

''وہ بعد کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال میں اپنے گھر والوں کو سپورٹ کرنا چاہتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ امجد بھائی نے مکان بنانے کے لیے کمپنی سے قرض لیا ہے۔ انہیں اس کی قسطیں بھی ادا کرنا ہوں گی۔ شادی سر پر رکھی ہے اور ابو عنقریب ریٹائر ہونے والے ہیں۔ ان حالات میں میرے لیے ملازمت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔''

''خیر جیسا تم مناسب سمجھو۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''میرے لائق کوئی کام ہو تو ضرور بتانا۔''

مجھے نوید سے اسی جواب کی توقع تھی۔ وہ ان لوگوں

میں سے نہیں جو عورتوں پر اپنی مرضی مسلط کرتے ہیں۔ میری پوسٹنگ ایک مقامی کالج میں ہوگئی اور میں نے ملازمت پر جانا شروع کردیا۔ میں نے امی سے کہا کہ انہوں نے کمیٹیاں ڈال کر میرے جہیز کے لیے جو پیسے جمع کیے ہیں، ان سے بھائی کے لیے بری بنا دیں۔ ولیمہ کا انتظام وہ خود کریں گے۔ ابھی ہمارے پاس دو سال ہیں۔ اس دوران میرے پاس اتنے پیسے ہو جائیں گے کہ آپ با آسانی میرا جہیز بنا سکیں۔

امی میری تجویز سے متفق نہیں تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ”وہ پیسے تمہاری امانت ہیں۔ میں انہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ امجد کی تنخواہ ابھی خاصی ہے۔ سارا انتظام اسے ہی کرنا چاہیے۔“

”آپ شاید بھول رہی ہیں کہ انہیں مکان کی قسط بھی ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ اس لیے ان پر اکیلے اتنا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔“

میری ضد کے آگے امی مجبور ہوگئیں اور شادی کی تیاری شروع کردی۔ میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق اس میں حصہ لیا اور ایک دن شازیہ بیگم دلہن بن کر ہمارے گھر آگئیں۔ اس کا سارا سامان اوپر پہنچا دیا گیا جسے اس نے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق سیٹ کیا۔ بھائی نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لی تھی۔ پہلا ہفتہ تو دعوتوں میں گزر گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں شمالی علاقوں کی سیر کے لیے چلے گئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد امجد بھائی نے اپنی ڈیوٹی جوائن کرلی اور شازیہ اپنی دنیا میں مگن ہوگئی۔ اس کا پورا وقت اوپر ہی گزرتا تھا۔ وہ صرف کھانے کے لیے نیچے آتی تھی۔ گھر کا سارا کام امی کو ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ شام کو میں ان کا ہاتھ بٹا دیتی۔

امی نے کچھ دن تو یہ برداشت کیا پھر ایک دن ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انہوں نے امجد بھائی سے کہا۔ ”آخر کب تک اس طرح چلے گا۔ شازیہ کو بھی گھر کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن اسے تو سونے اور گھومنے پھرنے سے ہی فرصت نہیں ہے۔ ابھی تو مہرین ہے۔ کل کو وہ بھی اپنے گھر چلی جائے گی پھر کیا ہوگا۔“

”کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔“ امجد بھائی بے پروائی سے بولے۔ ”فی الحال آپ ایک ماسی رکھ لیں۔ اس کی تنخواہ میں دے دوں گا۔“

”امجد! تم جانتے ہو کہ میں نے ہمیشہ سارا کام خود کیا ہے۔ میں گھر کو نوکروں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑنا چاہتی۔ آخر تم شازیہ سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ گھر کے کام میں دلچسپی لے۔“

”امی! اسے کام کرنے کی عادت نہیں ہے۔ اس نے اپنے گھر میں کبھی کچھ نہیں کیا۔ اس لیے اس سے کچھ کہنا بے کار ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ امی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولیں۔ ”ابھی تو میں زندہ ہوں۔ میرے مرنے کے بعد تو شاید اس گھر میں کتے لوٹیں گے۔“

”اللہ نہ کرے۔ مریں آپ کے دشمن۔“ امجد بھائی جلدی سے بولے۔ ”میں اسے سمجھا دوں گا۔ فی الحال آپ میرا ایک مسئلہ حل کردیں۔“

”وہ کیا؟“

”دراصل شازیہ کو آنے جانے کی بہت تکلیف ہے۔ مجھے بھی ہر مہینے گاڑی والے کو ایک بڑی رقم دینا پڑتی ہے۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ ایک سیکنڈ ہینڈ کار لے لوں۔ میں نے دفتر سے کار ایڈوانس لیا ہے لیکن اب بھی پچاس ہزار کم ہیں اگر آپ مجھے یہ رقم ادھار دے دیں تو وعدہ کرتا ہوں کہ مہرین کی شادی سے پہلے واپس کردوں گا۔“

”خدا کا خوف کرو۔ قرض پر قرض چڑھائے جا رہے ہو۔ اس کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟“

”آپ فکر نہ کریں۔ میری ترقی ہونے والی ہے۔ اللہ نے چاہا تو دو تین سال میں سارا قرض ادا ہوجائے گا۔“

”میری مانو تو فی الحال کار لینے کا ارادہ ملتوی کردو۔ جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو خرید لینا۔ ویسے بھی میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جو تھا وہ تمہاری شادی میں خرچ ہوگیا۔“

امجد بھائی کا چہرہ اتر گیا اور وہ مایوس ہوکر چلے گئے۔ مجھے جب معلوم ہوا تو میں بے چین ہوگئی مجھ سے یہ برداشت نہ ہوسکا کہ شازیہ جیسی عورت میرے بھائی کو کار نہ ہونے کا طعنہ دے چنانچہ میں نے اپنے اکاؤنٹ سے پیسے نکال کر بھائی کے ہاتھ پر رکھ دیے بعد میں امی نے بہت ڈانٹا لیکن مجھے بھائی کی خوشی عزیز تھی۔ اس لیے مجھ پر اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

دوسرے روز ہی بھائی اپنی پسند کی گاڑی لے کر آگئے اور پہلے روز ہی شازیہ اس میں سوار ہوکر اپنے میکے چلی گئی۔ بھائی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ جھوٹے منہ ہی مجھے یا امی کو کہیں چلنے کے لیے کہتے البتہ ابو کو ایک دو بار وہ ضرور ڈاکٹر

کے یہاں لے کر گئے۔ ورنہ عملاً وہ کار شازیہ کے تصرف میں ہی تھی۔ وہ تقریباً روزانہ ہی شام کو بھائی کے ساتھ کہیں گھومنے چلی جاتی اور ان کی واپسی رات گئے ہوتی۔

ایک سال بعد شازیہ ماں بن گئی۔ اس نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ماں بننے کے بعد اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرے گی لیکن اس کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بچے کی دیکھ بھال کے لیے اس نے چوبیس گھنٹے کی آیا رکھ لی۔ امجد بھائی کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ قرضوں کا بوجھ کیا کم تھا کہ اس میں ماسی اور آیا کی تنخواہ کے ساتھ پیٹرول کے خرچ کا بھی اضافہ ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ گھر کے خرچ کے لیے جو پیسے ابی کو دیا کرتے تھے اس میں کمی کر دی۔ ابو ریٹائر ہو چکے تھے اور ان کی پنشن اتنی نہیں تھی کہ اس سے گھر کا خرچ پورا ہو سکے۔ چنانچہ یہ کمی بھی مجھے ہی پوری کرنی پڑی۔ میں یہی سوچا کرتی تھی کہ میرے جانے کے بعد کیا ہوگا۔

دو سال کی مہلت پوری ہوئی تو نوید کے والدین نے شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے کہا۔ ابو بھی بیمار رہنے لگے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اپنی زندگی میں ہی میرے فرض سے سبکدوش ہو جائیں چنانچہ انہوں نے شادی کی تاریخ دینے میں دیر نہیں لگائی اور ابی میرا جہیز تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ اس موقع پر بھی امجد بھائی اور شازیہ نے بے حسی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کیا۔ ابو نے ہی اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے شادی کے اخراجات پورے کیے۔ امجد بھائی زبان بند کیے بیٹھے رہے بلکہ انہوں نے میرے وہ پچاس ہزار بھی واپس نہیں کیے جو انہوں نے مجھ سے کار خریدنے کے لیے قرض لیے تھے۔ اسی طرح شازیہ نے بھی ابی کی کوئی مدد نہیں کی۔ البتہ مہندی والے دن اس نے ایک لفافہ ضرور ابی کو تھما دیا جس میں دس ہزار روپے تھے۔

نوید نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ جہیز میں فرنیچر، ٹی وی، فریج اور واشنگ مشین وغیرہ نہ دی جائے کیونکہ یہ سب چیزیں ان کے یہاں موجود تھیں البتہ اگر مجھے اپنے والدین کو زیر بار کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو جہیز کے نام پر چند جوڑے کپڑے اور تھوڑی سی جیولری خرید سکتی ہوں۔ میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ ابو کی ساری جمع پونجی شادی میں خرچ نہ ہو اور ان کے پاس ہنگامی ضرورت کے لیے کچھ پیسے بچ جائیں۔

شادی بہت سادگی سے ہوئی۔ نوید کے گھر میں میرا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ میری ساس بہت مشفق خاتون تھیں۔ سسر بھی میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ شادی کے ایک ہفتے بعد انہوں نے مجھے ایک لاکھ روپے کا چیک دیا اور بولے کہ تم دونوں کہیں گھومنے چلے جاؤ لیکن نوید کی باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے ساتھ کچھ اہم کاروباری میٹنگز چل رہی تھیں۔ اس لیے وہ شہر سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ فرصت ملتے ہی وہ گھمانے لے جائیں گے۔ فی الحال میں یہ چیک اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں۔ مجھے گھومنے پھرنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔

میری چھٹیاں ختم ہوئیں تو کالج جانے کے ارادے سے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آ گئی۔ سب لوگ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ شاید وہ یہ توقع کر رہے تھے کہ بڑے گھر کی بہو بننے کے بعد میں ملازمت کو خیرباد کہہ دوں گی۔ ساس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہوگا۔''

''اگر آپ کو میرے ملازمت کرنے پر اعتراض ہے تو آج ہی استعفیٰ دے دوں گی۔''

''ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' وہ جلدی سے بولیں۔ ''نوید سے پوچھ لو۔''

نوید کو دفتر جانے کی جلدی تھی۔ وہ اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے بولے۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں ملازمت کرنے کی کوئی ضرورت ہے لیکن اگر تم اسے جاری رکھنا چاہتی ہو تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''تھینک یو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے کالج ڈراپ کر دیں۔ واپسی میں وین والے کو گھر دکھا دوں گی۔''

شادی کے بعد میں نے اس کے لیے آپ کا صیغہ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

راستے میں نوید نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم ملازمت کیوں کرنا چاہتی ہو۔ میں تمہاری ہر ضرورت پوری کر سکتا ہوں۔''

''یہی تو میں نہیں چاہتی۔ اپنی کمائی کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اس کے علاوہ گھر بیٹھ کر اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگانا نہیں چاہتی۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس ملازمت سے گھر کے نظام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے تم سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا۔

اپنا شوق پورا کرلو۔"

زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی۔ نوید نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کیا کماتی ہوں اور کہاں خرچ کرتی ہوں۔ وہ مجھے ہر ماہ ایک معقول جیب خرچ دیتے۔ میری تقریباً پوری تنخواہ بینک میں جمع ہورہی تھی۔ البتہ مجھے امی اور ابو کی طرف سے بہت فکر رہتی تھی۔ نوید مجھے ہر ہفتے ان سے ملوانے لے جاتے اس کے علاوہ امی سے بھی میری روزانہ فون پر بات ہوتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ امجد بھائی اور شازیہ کا سلوک ان کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ امی کو اب بھی گھر کا سارا کام کرنا پڑ رہا تھا۔ ماسی صرف اوپر کے کام کرنے کے لیے آتی تھی۔ ابو کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ بھائی کو تو اتنا خیال بھی نہیں تھا کہ وہ انہیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاتے۔ یہ فرض بھی مجھے ہی انجام دینا پڑا۔

ڈاکٹر نے ابو کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ وہ شدید قسم کے ڈپریشن میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے ان کے اعصاب متاثر ہورہے ہیں۔ انہیں علاج سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ یہی بات میں نے امجد بھائی کو بتائی تو وہ بولے۔ "انہیں وہم ہوگیا ہے۔ میں تو روزانہ صبح شام ان کی خیریت دریافت کرتا ہوں بلکہ رات کا کھانا ہم ساتھ ہی کھاتے ہیں۔"

وہ صریحاً جھوٹ بول رہے تھے۔ ان کی شامیں گھر سے باہر گزرتی تھیں۔ شاید ہفتے میں ایک دو بار ہی ایسا ہوتا ہو جب انہوں نے امی ابو کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ہوگا۔ میں ان سے بحث کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے صرف اتنا ہی کہا۔ "بھائی انہیں آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔"

میری بات سنتے ہی وہ چراغ پا ہوگئے اور غصے سے بولے۔ "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا اگر تمہیں ان کی اتنی ہی فکر ہے تو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ شازیہ کی زبان بول رہے ہیں۔ اسے اس گھر میں میرے بوڑھے ماں باپ کا وجود گوارا نہیں تھا۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ کسی طرح ان سے چھٹکارا مل جائے۔ افسوس تو مجھے امجد بھائی پر تھا جو یہ بھول گئے کہ ماں باپ نے کس طرح اپنا تن پیٹ کاٹ کر اور خواہشات کا گلا گھونٹ کر انہیں اس مقام تک پہنچایا تھا۔ اب وہ بیوی کی باتوں میں آکر ان سے جان چھڑانا چاہ رہے تھے۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں یہ بھی کرسکتی ہوں۔ میرے شوہر اور سسرال والے بڑے وسیع القلب ہیں۔ وہ انہیں بخوشی اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہوجائیں گے لیکن سوچ لیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ کیا آپ ان کے طعنے برداشت کرسکیں گے۔"

میری بات سن کر وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولے۔ "میرے منہ سے غصے میں نکل گیا۔ ورنہ میں تو تصور میں بھی ایسی بات نہیں سوچ سکتا۔ بہرحال کوشش کروں گا کہ آئندہ تمہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"اپنی بیوی کو بھی سمجھا دیں۔ آج جو کچھ بو رہی ہے کل وہی کاٹے گی۔ اسے اس وقت سے ڈرنا چاہیے، جب اس کی اولاد بھی اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے گی۔"

میرا خیال تھا کہ اس گفتگو کا کچھ اثر ہوگا اور ان کے رویے میں بہتری آجائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ابو زیادہ عرصہ یہ سلوک برداشت نہ کرسکے اور میری شادی کے ایک سال بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد امی بالکل تنہا رہ گئیں۔ ان دنوں میں امید سے تھی اور شازیہ بھی دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس نے امی سے نوکرانیوں کی طرح کام لینا شروع کردیا۔ مجھے پتا چلا تو میں نے بھائی سے خوب جھگڑا کیا اور صاف کہہ دیا کہ اگر تمہاری بیوی سے کام نہیں ہوتا تو فل ٹائم نوکرانی رکھ لو جو کھانا پکانے کے علاوہ گھر کے دوسرے کام بھی کرے۔ اس کی آدھی تنخواہ میں دوں گی۔ بھائی نے وعدہ کیا کہ آئندہ امی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن وہ زیادہ دیر اس وعدے پر قائم نہ رہ سکے۔ مجبوراً عدت ختم ہونے کے بعد میں امی کو اپنے گھر لے آئی۔

ندیم کی پیدائش کے بعد امی نے گھر واپس جانے کی ضد شروع کردی۔ ادھر شازیہ نے بھی ایک لڑکی کو جنم دیا تھا اور بھائی بھی یہی چاہ رہے تھے کہ امی اپنے گھر چل کر رہیں۔ میں نے یہ شرط رکھی کہ امی گھر کا کوئی کام نہیں کریں گی۔ یہ ذمے داری شازیہ کی ہے۔ چاہے وہ خود کام کرے یا نوکروں سے کروائے۔ بھائی میری بات مان گئے اور امی اپنے گھر واپس چلی گئیں۔ میں باقاعدگی سے ان کی خبرگیری کررہی تھی۔ ہفتے میں ایک بار ملنے جاتی تو ان کے لیے دو تین چیزیں بنا کر لے جاتی تاکہ وہ کھانے کے لیے کسی کی محتاج نہ رہیں۔ اس کے علاوہ ان کے لیے صابن، ٹوتھ پیسٹ، شیمپو، زیتون کا تیل، خشک میوے، موسم کے پھل، شہد اور کھانے پینے کی دیگر چیزیں بھی پہنچاتی رہتی۔ شازیہ یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی تھی لیکن میرے سامنے بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کے باوجود امی وہ سب چیزیں

اپنے بیٹے اور پوتے کو کھلا دیتی تھیں۔

دن گزرتے رہے۔ ایک ایک کر کے میرے ساس اور سسر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بھائی کے یہاں ایک اور لڑکا پیدا ہوا جب کہ اللہ میاں نے مجھے ایک لڑکی کی نعمت سے نوازا۔ میں ترقی پا کر گریڈ اٹھارہ میں آ گئی تھی اور میرے بینک اکاؤنٹ میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ دوسری جانب امجد بھائی کی معاشی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ ایک بڑے عہدے پر فائز تھے اور ان کی تنخواہ بھی معقول تھی لیکن شازیہ کے پھوہڑ پن اور فضول خرچیوں نے انہیں مقروض بنا دیا تھا۔ ان کا ایک قرضہ ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا لینا پڑ جاتا۔ پھر ایک دن میں نے سنا کہ امجد بھائی نے مکان بیچ دیا ہے۔ یہ خبر سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں اسی وقت بھائی سے بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن اپنے آپ کو روک لیا اور نوید کے گھر آنے کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے سوچا کہ شام کو نوید کے ساتھ ان سے ملنے جاؤں گی۔

☆......☆

''بھائی یہ میں کیا سن رہی ہوں آپ نے مکان بیچ دیا؟''

''ہاں۔'' انہوں نے ہنکارا بھرا۔

''حیرت ہے۔ ہم لوگوں سے مشورہ کیے بغیر آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟''

''میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔''

''یہ مکان ابو نے بنوایا تھا اور امی ابھی زندہ ہیں۔ آپ نے ان سے بھی نہیں پوچھا۔ میں بھی وراثت میں حصے دار ہوں۔ آپ کو مجھ سے تو مشورہ کرنا چاہیے تھا۔''

''یہ مکان اب میری ملکیت ہے اور میں اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہوں البتہ اخلاقی طور پر میں تمہارا حصہ دینے کا پابند ہوں اور وہ تمہیں مل جائے گا۔''

''مجھے اپنے حصے کی نہیں، امی کی فکر ہے۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ آپ ڈیفنس کے کسی فلیٹ میں شفٹ ہو رہے ہیں جو دوسری منزل پر واقع ہے جب کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ امی گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتیں۔ وہ وہاں کس طرح رہیں گی۔''

''وہ کون سا کہیں آتی جاتی ہیں۔ ایک دفعہ کسی طرح انہیں اوپر پہنچا دیا جائے گا پھر وہ آرام سے وہاں رہتی رہیں گی۔''

''گھر میں آپ انہیں قیدی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گی کہ آپ کو یہ مکان بیچنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ آپ نے یہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا کہ اس مکان سے ہماری کتنی یادیں وابستہ ہیں۔ ابو نے کس طرح پائی پائی جوڑ کر اور اپنی ضرورتوں کا گلا گھونٹ کر اسے بنایا تھا؟''

''مجھے سب یاد ہے لیکن مجبوری تھی۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہاں کا ماحول بہت خراب ہو گیا ہے۔ آئے دن وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ ان پر بھی اس کا برا اثر پڑ سکتا ہے۔ اسی لیے مجھے یہاں سے جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔''

''اگر یہی بات تھی تو آپ کوئی گراؤنڈ فلور کا مکان دیکھتے تاکہ امی کے چڑھنے اترنے کا مسئلہ نہ ہوتا۔''

''میں کسی پوش علاقے میں شفٹ ہونا چاہ رہا تھا اور اتنے پیسوں میں وہاں مکان نہیں، فلیٹ ہی مل سکتا ہے۔''

میں سمجھ گئی کہ یہ سبق بھی شازیہ نے ہی پڑھایا ہوگا۔ وہ احساس کمتری کی ماری عورت ہمیشہ سے ہی اسٹیٹس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ وہ بفرزون سے نکل کر ڈیفنس جا رہی تھی تاکہ اس کی شان میں اضافہ ہو سکے اور دوسرے اسے امی سے جان چھڑانے کا موقع مل گیا تھا۔ اب مجھ میں مزید کچھ سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ میں نے امی کو اسی وقت سامان پیک کرنے کے لیے کہا اور بوا کو فون کر کے ان کے لیے کمرا تیار کرنے کے لیے کہہ دیا۔ بھائی کہتے رہ گئے کہ ابھی وہ ایک مہینا اس گھر میں رہ سکتی ہیں وہ مجھے کھانے کے لیے بھی روکنا چاہ رہے تھے لیکن میں نے ان کی کوئی بات نہیں سنی اور امی کو لے کر گھر آ گئی۔

میں نے ان کے لیے اپنے برابر والا کمرا تیار کروایا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ بہت بے چین رہیں۔ انہیں ہر وقت بیٹے اور پوتے پوتیوں کی یاد ستاتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ انہوں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ وہ اس حقیقت کو قبول کر چکی تھیں کہ اب وہ دوسری منزل پر واقع فلیٹ میں رہنے کے قابل نہیں ہیں اور اس گھر کے سوا ان کا کوئی اور ٹھکانا نہیں۔ وہ پرانے زمانے کی عورت تھیں اور داماد کے گھر رہنا انہیں گوارا نہیں تھا لیکن بحالت مجبوری انہیں یہ کڑوی گولی

نکلنا پڑی۔ میں نے انہیں آرام وسکون پہنچانے کی پوری کوشش کی۔ بوا کو بھی تاکید تھی کہ وہ میری غیر موجودگی میں ان کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھے، ویسے تو وہ بالکل ٹھیک تھیں اور گھٹنوں کی تکلیف کے علاوہ انہیں کوئی عارضہ لاحق نہیں تھا اور وہ اپنے سارے کام خود ہی کرلیا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ہم سب انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تاکہ وہ جلد از جلد اس ماحول سے مانوس ہو جائیں۔

میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ بھائی نے اپنا دو منزلہ مکان بیچ کر فلیٹ میں رہنے کو ترجیح کیوں دی اگر وہ کوشش کرتے تو اتنے پیسوں میں انہیں گلستان جوہر وغیرہ میں ایک سو بیس گز کا سنگل اسٹوری مکان مل جاتا۔ ایک دن میں امی سے یہی بات کررہی تھی کہ انہوں نے مجھے اصل حقیقت بتادی۔ دراصل شازیہ کی شاہ خرچیوں اور بے تکے اخراجات کی وجہ سے بھائی بہت مقروض ہوچکے تھے اور ان کی آدھی تنخواہ قرض کی ادائیگی، بچوں کی فیسوں، نوکروں کی تنخواہوں اور یوٹیلٹی بلز کی نذر ہوجاتی تھی۔ بے اعتدالی کا یہ عالم تھا کہ شازیہ کے کمرے کا اے سی روزانہ بارہ چودہ گھنٹے چلتا۔ بقیہ تنخواہ سے مہینا پورا کرنا مشکل ہورہا تھا۔ اوپر سے شازیہ کی شاپنگ، دعوتیں اور دیگر فالتو اخراجات کسی طرح کم ہونے میں نہیں آرہے تھے اس پر گھر میں جھگڑے ہونا شروع ہوگئے۔ شازیہ پیسے مانگتی تو بھائی چلانا شروع کردیتے۔

بہت سوچ بچار کرنے کے بعد انہوں نے اس مشکل سے نکلنے کا یہ حل نکالا کہ مکان بیچ دیا جائے اور کم قیمت کا کوئی فلیٹ خرید کر اس میں شفٹ ہوجائیں۔ اس طرح جو پیسے بچیں گے انہیں بینک میں رکھ دیا جائے اور اس پر ملنے والے ماہانہ منافع سے گھر کے اخراجات پورے کیے جائیں۔ اسکیم بہت اچھی تھی لیکن اس میں امی کہیں نہیں تھیں۔ بھائی کو اپنا مسئلہ حل کرنے کی فکر تھی۔ شازیہ ڈیفنس میں رہنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ امی کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا۔ شاید وہ یہ طے کرچکے تھے کہ اب امی کو میرے ساتھ ہی رہنا ہے۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ بھائی نے مکان کی فروخت سے ملنے والی رقم کا بقیہ حصہ بینک کے فکسڈ ڈپازٹ میں رکھ دیا ہے اور اس پر ماہانہ منافع لے رہے ہیں تو میں اپنا حصہ وصول کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ مجھے اس بات پر غصہ آرہا تھا کہ انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر امانت میں خیانت کی اور امی کو داماد کے گھر رہنے پر مجبور کردیا۔ ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہوسکتی تھی لیکن ایک بار پھر مجھ پر بھائی کی محبت غالب آگئی۔ اگر میں ان سے اپنا حصہ وصول کرلیتی تو ان کا منصوبہ ادھورا رہ جاتا اور تنگی بھی دور نہ ہوتی۔ میری نظر میں پیسے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس سے کہیں زیادہ رقم میرے اکاؤنٹ میں موجود تھی جس میں ہر ماہ اضافہ ہورہا تھا۔ لہٰذا میں نے بھائی سے مطالبہ کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

امی اپنے پوتے پوتیوں کو بہت یاد کررہی تھیں۔ میں نے بھائی کو فون کرکے کہا کہ کسی دن وہ بچوں کو امی سے ملوانے لے آئیں۔ انہوں نے وعدہ کرلیا اور ایک اتوار وہ بچوں سمیت ہمارے گھر آگئے۔ امی کی تو گویا عید ہوگئی۔ انہوں نے بھائی کو مکمل طور پر نظرانداز کردیا اور بچوں میں مگن ہوگئیں۔ وہ تقریباً دو گھنٹے رہے۔ لگ رہا تھا کہ انہیں جانے کی بہت جلدی ہے۔ شاید بیوی نے سمجھا کر بھیجا تھا کہ زیادہ دیر مت بیٹھنا، وہ حاسد عورت کسی طرح بھی امی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی۔ جب وہ جانے لگے تو امی نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ”بیٹا کبھی کبھی انہیں لے کر آجایا کرو۔ انہیں دیکھ کر کلیجے میں ٹھنڈک پڑگئی۔“

”جی امی ضرور۔“ بھائی نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

وہ دو تین مرتبہ بچوں کو لے کر آئے۔ اس کے بعد انہیں اپنا وعدہ یاد نہ رہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ شازیہ نے انہیں منع کردیا ہوگا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچے دادی سے زیادہ قریب ہوجائیں۔ میں نے دو تین مرتبہ فون کرکے انہیں یاددہانی کرائی لیکن وہ ہر بار مصروفیت کا بہانہ کرکے ٹال جاتے۔ پھر میں نے بھی کہنا چھوڑ دیا البتہ امی بچوں کو ہر وقت یاد کرتی رہتی تھیں۔ اس طرح انہیں بیٹے کا دیدار بھی نصیب ہوجاتا تھا لیکن بھائی کو اس کا بالکل احساس نہیں تھا۔

رفتہ رفتہ یہ غم انہیں روگ کی طرح چمٹ گیا۔ انہوں نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ اپنے بچوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ وہ بس یہی کہتی رہتی تھیں کہ تم مجھے ایک دفعہ سہارا دے کر اوپر چڑھا دو پھر میں ساری عمر وہاں سے نیچے نہیں اتروں گی۔ میں انہیں کیسے بتاتی کہ اصل مسئلہ چڑھنے اترنے کا نہیں بلکہ بہو بیٹا انہیں اپنے ساتھ رکھنا ہی نہیں چاہتے۔ میں نے بھائی سے کہا کہ وہ کوئی دوسرا فلیٹ دیکھ لیں جہاں لفٹ کی سہولت ہو اگر کچھ پیسے کم پڑیں تو میں دے دوں گی لیکن انہوں نے میری بات سنی ان سنی کردی۔

امی کے لیے یہ غم جان لیوا ثابت ہوا اور ایک دن وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد احساس ہوا کہ ماں کا وجود ہماری زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے گو کہ میں ایک میچورڈ، پڑھی لکھی اور خود مختار عورت تھی۔ اس کے باوجود اکثر و بیشتر مجھے ان کے مشوروں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان کے جانے کے بعد یوں لگا جیسے سر سے سائبان ہٹ گیا ہو گو کہ میرے شوہر کا سایہ سلامت تھا لیکن ماں کی کمی کون پوری کر سکتا ہے۔ ویسے تو ان کا وقت پورا ہو چکا تھا لیکن میں ان کی موت کا ذمے دار بھائی اور بھاوج کو سمجھتی تھی۔ ان کی سنگ دلی اور بے حسی نے ہی امی کو اس مقام تک پہنچایا تھا۔

امی کے انتقال پر امجد بھائی آئے تو وہ کافی نڈھال اور مضمحل لگ رہے تھے اور ان سے ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ گھٹنوں میں درد رہنے لگا ہے۔ ڈاکٹر نے دوائیں دی ہیں۔ اس کے علاوہ فزیوتھراپی اور روزانہ واک کرنے کے لیے کہا ہے۔

''اس سے کچھ فرق پڑا؟'' میں نے پوچھا۔

''فرق تو اس وقت پڑتا جب میں ڈاکٹر کے مشوروں پر پوری طرح عمل کروں۔ میرے پاس فزیوتھراپی کے لیے وقت ہے اور نہ ہی باقاعدگی سے واک کر سکتا ہوں۔''

''اس طرح تو آپ اپنا مرض بڑھا رہے ہیں۔'' میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''تم کچھ بھی کہو لیکن فی الحال یہی پوزیشن ہے۔''

شازیہ سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ اسے اپنی ذات کے علاوہ کسی بات سے غرض نہیں تھی بلکہ میرے خیال میں تو بھائی کو اس حال تک پہنچانے والی بھی وہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بھائی کے پاس اپنے علاج کے لیے وقت کیوں نہیں ہے۔ فزیوتھراپسٹ شام میں بھی بیٹھتے ہیں اور امجد بھائی دفتر سے آنے کے بعد بھی فزیوتھراپی کے لیے جا سکتے تھے بشرطیکہ شازیہ ان کی جان چھوڑتی۔ اب بھی اس کا گھومنا پھرنا ختم نہیں ہوا تھا اور وہ کسی نہ کسی بہانے بھائی کو لے کر گھومنے نکل جاتی۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے وہ صبح جلدی نہیں اٹھ پاتے تھے اور اس طرح ان کے پاس واک کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔

میں جب بھی ان سے ملنے جاتی تو ان سے یہی کہتی کہ وہ اپنے معمولات میں تبدیلی لائیں اور علاج کے لیے وقت نکالیں۔ وہ مجھے بے چارگی سے یوں دیکھتے جیسے میرے مشورے پر عمل کرنا ان کے بس میں نہ ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ جب بھی یہ بات کہتی تو شازیہ کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ اسے میرا آنا ناگوار گزرنے لگا۔ چنانچہ میں وقفہ دے کر جانے لگی لیکن مجھے لگا کہ بھائی کا مرض بڑھتا جا رہا ہے۔

مجھے امجد بھائی کے گھر گئے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے کیونکہ باہر سے ایک وفد آیا ہوا تھا اور نوید اس کے ساتھ میٹنگوں میں مصروف تھے۔ ان کے پاس کہیں آنے جانے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا پھر میرے بیٹے کو بخار ہو گیا۔ چند روز اسی پریشانی میں گزر گئے۔ اس دوران میں نے بھائی کو دو تین مرتبہ فون کیا لیکن بات نہ ہو سکی۔ ان کا فون بند جا رہا تھا۔ شازیہ کو تو فون کرنا بے کار تھا۔ وہ مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی تھی۔ میں یہی سوچ رہی تھی کہ نوید کو فرصت ملے تو میں بھائی کی خیریت معلوم کرنے جاؤں لیکن اس سے پہلے ہی ان کے بڑے بیٹے کا فون آ گیا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''پاپا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ آپ جلدی سے آ جائیں۔''

یہ سنتے ہی میں پریشان ہو گئی۔ میں نے فون کر کے نوید سے کہا کہ وہ فوراً گاڑی بھیج دیں۔ میں ابھی اور اسی وقت بھائی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ میں نے بوا کو بچوں کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور بھائی سے ملنے چلی گئی۔ انہیں دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ بہت کمزور ہو چکے تھے اور وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بھائی کو اس حال میں دیکھ کر مجھے امی یاد آ گئیں۔ وہ بھی تو گھٹنوں کی تکلیف میں مبتلا تھیں اور بھائی جانتے تھے کہ وہ سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتیں۔ اس کے باوجود بھائی نے رہائش کے لیے فلیٹ کا انتخاب کیا اور آج وہ خود اس تکلیف میں مبتلا ہو چکے تھے اور ان کے لیے سیڑھیاں چڑھنا اترنا محال ہو گیا تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ دونوں گھٹنے جواب دے چکے ہیں اور وہ گھر میں بھی بڑی مشکل سے دیوار کا سہارا لے کر چلتے ہیں۔ دفتر سے انہوں نے چھٹی لے رکھی ہے اور فی الحال ان کے کام پر جانے کی کوئی امید نہیں۔

''پھر بھی بھائی، اس کا کوئی علاج تو ہو گا۔'' میں نے بے چین ہو کر کہا۔

''ڈاکٹر نے آپریشن کے لیے کہا ہے۔ دس لاکھ لگیں گے۔ وہ میں افورڈ نہیں کر سکتا۔''

ان کی بات سن کر میں سناٹے میں آ گئی۔ شازیہ بازار گئی ہوئی تھی۔ اس لیے مجھے کھل کر گفتگو کرنے کا موقع مل

گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے پاس دس لاکھ بھی نہیں ہیں۔ امی نے بتایا تھا کہ فلیٹ خریدنے کے بعد جو پیسے بچ گئے تھے وہ آپ نے بینک میں رکھ دیے تھے تاکہ اس کے منافع سے قرض اتار سکیں۔ آپ اس میں سے علاج کے لیے پیسے نکال لیں۔ جان ہے تو جہان ہے۔ قرض بھی اتر ہی جائے گا۔''

''میں تو شکر ادا کرتا ہوں کہ قرض اتر گیا۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ ''شازیہ اسی دن کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے بعد پھر الللے تللے شروع ہو گئے، تم تو جانتی ہو کہ پیسا ہوا کی طرح اڑتا ہے میں ہمیشہ یہی سوچتا کہ اب بینک سے مزید پیسے نہیں نکالوں گا لیکن وہ ہر بار کوئی نہ کوئی فرمائش کر کے مجھے مجبور کر دیتی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج میں بالکل قلاش ہو گیا ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں کچھ نہیں بچا۔ اب صرف تنخواہ پر ہی گزارہ ہے۔ اگر کام پر نہ گیا تو وہ بھی بند ہو جائے گی۔''

یہ باتیں سن کر میں سناٹے میں آ گئی۔ بچوں کو دیکھ کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ پھول جیسے چہرے مرجھا گئے تھے۔ وہ حزن و یاس کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ اگر شازیہ میرے سامنے ہوتی تو میں اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ اس کی بے اعتدالیوں نے بھائی کو اس حال تک پہنچایا تھا یا پھر یہ مکافات عمل تھا۔ بھائی نے امی کے ساتھ جو کچھ کیا وہ دنیا میں ہی ان کے سامنے آ گیا۔ بہرحال یہ وقت ان باتوں کے سوچنے کا نہیں تھا۔ شازیہ گئی بھاڑ میں۔ مجھے اپنے بھائی کے آپریشن کے بارے میں سوچنا تھا۔ ان کے بچوں کے چہرے کی رونق واپس لانا تھی۔

میں نے بھائی کو تسلی دی اور ان سے کہا کہ وہ اپنی سب رپورٹیں مجھے دے دیں۔ میں کچھ سوچتی ہوں۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شازیہ آ گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح فریش لگ رہی تھی اور مجھے اس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی نظر نہیں آئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے برا سا منہ بنایا اور بولی۔ ''میں ہمیشہ انہیں یہی سمجھاتی رہی کہ باہر چلے جاؤ، یہاں کچھ نہیں رکھا لیکن یہ تو اپنے گھر والوں کی محبت میں لتھڑے ڈوبے ہوئے تھے کہ انہوں نے ایک نہ سنی۔ اگر میری بات مان لیتے تو آج لاکھوں میں کھیل رہے ہوتے اور اس طرح معذور ہو کر گھر بیٹھنا نہیں پڑتا۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر اگلے مہینے تنخواہ نہ ملی تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔''

میں اس عورت کی کم عقلی پر ماتم کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ شوہر معذور ہو کر وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا لیکن اسے پیسوں کی فکر ستائے جا رہی تھی۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور گھر چلی آئی۔ شام کو نوید کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئے اور بولے۔ ''امجد بھائی کو فوراً آپریشن کروانا چاہیے۔ جتنے اخراجات ہوں گے وہ میں برداشت کروں گا۔''

''نہیں مجھے صرف آپ کی اجازت اور تعاون چاہیے۔ میرے اکاؤنٹ میں بہت پیسے ہیں۔ اس سے اچھی بات کیا ہو گی کہ وہ میرے بھائی کے کام آ جائیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔ میں ہر طرح سے مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

دوسرے دن میں اور نوید اصرار کر کے بھائی کو اپنے گھر لے آئے۔ شازیہ اور بچے بھی ساتھ تھے۔ نوید نے شہر کے ایک مشہور سرجن سے وقت لیا جو گھٹنوں کی سرجری کے ماہر تھے۔ ان کے مشورے پر بھائی کو اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ میں نے کالج سے چھٹی لے لی تھی اور ابو کو تاکید کر دی کہ شازیہ اور اس کے بچوں کا ہر ممکن خیال رکھا جائے۔ اس وقت میں بھول گئی تھی کہ بھائی اور بھاوج نے میرے والدین خصوصاً امی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف انہیں چھت سے محروم کیا بلکہ ایسے حالات پیدا کر دیے کہ وہ ان کے ساتھ نہ رہ سکیں لیکن یہ وقت بدلہ لینے کا نہیں بلکہ معاف کرنے کا تھا۔ میرا ماں جایا چلنے پھرنے سے معذور ہو چکا تھا اور مجھے اسے نارمل لائف کی طرف واپس لانا تھا۔

آپریشن کامیاب رہا اور بھائی ایک ہفتے بعد ڈسچارج ہو کر واپس آ گئے۔ ڈاکٹروں نے انہیں فی الحال سیڑھیاں چڑھنے سے منع کیا تھا۔ اس لیے میں انہیں اپنے گھر لے آئی۔ پھر میرے اور نوید کے کہنے پر انہوں نے گراؤنڈ فلور کا فلیٹ لے لیا۔ کاش وہ امی کی زندگی میں ہی یہ بات مان لیتے لیکن مجبوری انسان سے سب کچھ کروا دیتی ہے۔ بہرحال انہوں نے نارمل لائف گزارنا شروع کر دی۔ البتہ اس بیماری کے بعد ان میں ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ انہوں نے شازیہ کے کہنے پر چلنا چھوڑ دیا ہے اور ہر ماہ اپنی آدھی تنخواہ بینک میں چھوڑ دیتے ہیں تاکہ آئندہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں انہیں دوسروں کی طرف نہ دیکھنا پڑے۔

# میں کھلونا نہیں

مکرمی مدیر سرگزشت
السلام علیکم
ایک اور تحریر بھیج رہا ہوں، یہ سچ بیانی ہارون کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی زندگی میں ایک دوشیزہ آئی جس نے اس کی زندگی کو ایک نیا موڑ دے دیا امید ہے قارئین کو بھی یہ سچ بیانی پسند آئے گی۔
اعجاز احمد راحیل
(ساہیوال)

---

میں ایئرپورٹ سے باہر نکلا اور متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسٹینڈ پر کوئی ٹیکسی نظر نہ آئی تو میں ایک جگہ کھڑا ہوگیا اور بریف کیس زمین پر رکھ دیا۔ اتنا بوجھ ہاتھ میں اٹھانا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ میں نے کلائی پر موجود گھڑی پر وقت دیکھا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ دھیرے دھیرے وقت گزرنے لگا۔ مجھے وہاں کھڑے دس منٹ ہوگئے تھے کہ ایک کار میرے قریب آکر رکی۔ میں نے اچٹتی سی نگاہ کار پر ڈالی۔ یہ سیاہ رنگ کی کرولا تھی۔ میں نظروں کا زاویہ بدلنے والا

تھا کہ کار کا دروازہ کھلا ایک شخص باہر نکلا۔ اس نے متحیر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشی و حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔

اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ''تم ہارون ہو نا؟''

اتنی دیر میں، میں نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ پھر بھی پوچھ لیا۔

''اوہ! شاہد تم۔''

اگلے ہی لمحے ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں تھے۔

دونوں گلے ملنے کے بعد ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے لگے۔

''میں اپنے کزن کو سی آف کرنے آیا تھا۔ اب گھر واپس جا رہا ہوں۔'' شاہد نے بتایا۔ پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آؤ۔ گھر چلتے ہیں۔''

''ایسا کریں مجھے میرے گھر تک چھوڑ دو۔ کل تمہارے ہاں ضرور آؤں گا۔''

اس نے برا سا منہ بنایا، بولا۔ ''گھر میں کون سا حلوا پکا ہو گا جس کے ٹھنڈا ہونے کا خدشہ ہے۔ بہانے باز کہیں کے۔''

میں قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''تم ذرا بھی نہیں بدلے۔ چلو تمہارے گھر چلتے ہیں۔''

وہ خوش ہو گیا۔ ''یہ ہوئی نا دوستوں والی بات۔''

ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر جبکہ میں برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ گاڑی جانے پہچانے راستوں پر آگے بڑھنے لگی۔ یہ لاہور کی سڑکیں تھیں۔ میری دیکھی بھالی سڑکیں۔ ٹریفک کا رش، گاڑیوں کے ہارن۔ چاروں طرف روشنیاں ہی روشنیاں۔ گو کہ گرمیوں کا موسم تھا۔ تاہم دوڑتی گاڑی کے شیشے سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں اس سے گھر والوں کے بارے پوچھنے لگا۔ وہ بتاتا چلا گیا۔

گاڑی آر اے بازار پہنچ چکی تھی۔ دل میں ہوک سی اٹھی۔ کوئی بہت اپنا یاد آنے لگا۔

کسی اپنے کے گدگداتے جیلے ساعتوں میں رس گھولنے لگے۔ اس کا حسین عکس چشم خیال میں اپنی پوری آن بان سے آ موجود ہوا۔ میرے لیے لاہور بدل چکا تھا۔ آر اے بازار اجنبی لگنے لگا۔ کیونکہ اس میں، میں اس کے ساتھ کچھ عرصہ جیتا رہا۔ وہ میری محبت، میرا دلجوئی کا سامان۔ میرے دکھ سکھ کو سننے اور سمجھنے والی شائلہ جو کہیں کھو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے میں لاہور سے مسقط چلا گیا۔

پاکستان سے ہر تعلق توڑ کر مجھے مسقط میں مقیم ہونا پڑا۔ مسقط میں پاکستانی کھانوں کا ایک ریسٹورنٹ ہے۔ اس میں ایک دوست پرویز نے جاب دلوادی تھی۔ جاب کا بس نام ہی تھا۔ اکثر فارغ رہتا تھا۔ اس کے نزدیک ہی سا اسپتال تھا جہاں روز ہزاروں مریض آتے۔ ڈاکٹر ان کا علاج کرتے اور وہ صحت یاب ہو کر واپس جاتے مگر میں اس جگہ سے بھی پرانا درد ساتھ لے کر آیا۔ وہ ہوٹل اتنا مشہور ہے کہ صرف نام بتانے پر انجان بندہ وہاں پہنچ جاتا۔ مگر شائلہ کا انتظار کرتے میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس نے نہ آنا تھا۔ نہ ہی آئی۔ ہاں میں پانچ سال بعد لوٹ آیا۔ الحریہ جسے منی ڈھاکا بھی کہتے ہیں۔ جہاں بنگالیوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔ میں بلا مقصد وہاں چلا جاتا۔ شاید مجھے اس کی تلاش ہی لے جاتی تھی۔

کبھی میں شیرٹن ہوٹل کی بلند و بانگ بلڈنگ کی طرف جا نکلتا۔ مگر وہ نہ ملی۔

پھر شیرٹن سے مغرب کی طرف وادی کبیر چلا جاتا جہاں دنیا جہان کی کمپنیاں اپنے آفس بنائے بیٹھی ہیں۔ تاہم جس کی تلاش تھی نہ ملی۔ میں مسقط میں مارا مارا پھرتا رہا۔

کبھی اسٹار سینما، کبھی پوسٹ آفس تو کبھی پی آئی اے آفس۔ میں آوارگی کرتا رہا۔ جب تھک جاتا تو مسقط کی سب سے اونچی بلڈنگ، مطرح بلڈنگ کے گرد و نواح میں کسی ریسٹورنٹ میں جا گھستا۔ پھر اٹھتا اور مطرح کارنیش پہنچ جاتا۔ مطرح کارنیش سمندری جہازوں کی جیٹی ہے۔ جس کے ارد گرد فٹ پاتھ بنا ہوا ہے۔ رات کو لائٹنگ کا خوب انتظام کیا جاتا تھا۔ یہ دیکھنے والی جگہ ہے مگر میں صرف اسے دیکھنا چاہتا تھا۔

''کہاں کھو گئے جگر؟''

میں نہ جانے کب تک خیالوں کی وادی میں بھٹکتا رہتا کہ شاہد کی آواز سن کر چونکا۔ گاڑی اس کے بنگلے کے سامنے رکی ہوئی تھی۔ چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔ گیٹ کھلا تو اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شاہد نے آگے جا کر مجھے اتار دیا اور گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے واپس آ گیا۔ پھر ہم سیدھا شاہد کی امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان سے سلام دعا کی۔ وہیں شاہد کی بیوی عاصمہ اور اس کا بیٹا بھی آ گئے۔ ان سے بھی ملا۔ کھانا وغیرہ بھی وہیں کھایا۔ رات کے ایک بجے ہم سوئے۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد وہ مجھے میرے بنگلے میں ڈراپ کر گیا۔ جو کہ ڈیفنس فیز ٹو میں واقع ہے۔ جہاں ایک بار پھر

میں اور تنہائی تھی۔ یا پھر ہمارا پرانا ملازم شیر خان تھا۔

☆.....☆.....☆

میں اپنے بیڈ روم میں اکیلا لیٹا ہوا ماضی کی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ جس کا اک اک ورق کرب آمیز تنہائیوں اور اداسیوں سے عبارت ہے۔ اداسیاں بے سبب نہیں ہوتیں۔ ان کے بہت سارے اسباب ہوتے ہیں۔ نامکمل خواہشات کا بیج دل میں اگتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ امر بیل کی طرح دامن گیر ہو جاتا ہے۔ انسان کو اپنی لپیٹ میں لے کر کمزور کر دیتا ہے۔

ہاں اداسی جس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا مگر یہ بے رنگ بڑا پکا ہوتا ہے۔ ہزاروں رنگ مل کر بھی اداسی کا رنگ نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ اس کا رنگ کسی قسم کے تصنع و بناوٹ سے پاک ہوتا ہے۔

میں زندگی جینا چاہتا تھا۔ اس کے رنگوں کو دیکھنا چاہتا تھا مگر اداسی کا رنگ ہی حصے میں آیا۔

ایک طویل سانس سینے سے خارج ہوئی۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔

بہت پہلے کی بات ہے جب میں خوبرو جوان تھا۔ بی اے کے امتحان دے کر فارغ تھا۔ میرے ابو مختار خان لاہور کے معروف صنعت کار تھے۔ جن کا میں اکلوتا بیٹا تھا۔ امی اور ابو میرا بہت خیال رکھتے۔ میری ہر خواہش پل میں پوری کر دیتے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے اکلوتا ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ کالج لائف میں کئی لڑکیوں سے دوستیاں کیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کسی سے محبت نہ ہوئی۔ ہر تعلق محض دل بستگی اور وقت گزاری تک محدود رہا۔ کالج میں ہی میری دوستی شاہد سے ہوئی جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید گہری ہوتی گئی۔ ابو اسٹیٹس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بہر کیف شاہد کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ گو کہ شاہد کے ابو امین انکل کی فیصل آباد میں ایک ٹیکسٹائل مل تھی۔ پھر بھی ہمارے ہم پلہ نہ تھے۔

زندگی خوشگوار طریقے سے گزر رہی تھی۔ قسمت بھی مہربان تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تقدیر گھات میں ہے۔ دسمبر کے دنوں کی بات ہے۔ ابو اور امی اسلام آباد ایک تقریب میں گئے۔ اس شام دل بہت اداس تھا۔ میں نے شاہد کو اپنے پاس بلا لیا۔ ہم رات بارہ بجے تک گپیں لگاتے رہے۔ پھر سو گئے۔ ابھی سوئے ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا۔ موبائل کی گھنٹی بجی تو آنکھ کھل گئی۔ شاہد بھی جاگ گیا۔ میں نے وقت دیکھا۔ ایک بج چکا تھا۔ کوئی انجان نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف کوئی اجنبی تھا، اس نے جو خبر سنائی، اس نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ موبائل ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ پر گر پڑا۔ شاہد نے موبائل اٹھایا اور بات کرنے لگا۔ آہ میری دنیا اجڑ گئی تھی۔ گویا قیامت آ گئی تھی۔ ابو کی گاڑی کلر کہار کے قریب حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ امی ابو دونوں چل بسے تھے۔

میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ امی ابو یوں مجھ سے بچھڑ جائیں گے۔ میرے ابو جو گھنے پیڑ کی طرح مجھ پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ وہ سایہ چھن گیا۔ پھر مقدر میں صحرا ٹھہرا۔ میری آبلہ پائی کی مسافت طویل ہے۔ مجھے لگا میں مر جاؤں گا۔ مگر انسان بڑا ڈھیٹ ہے۔ یہ بڑے سے بڑا صدمہ آسانی سے جھیل جاتا ہے۔ ہر بات کو مقدر کا لکھا سمجھ کر آنسو بہا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ میں بھی نہیں مرا تھا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلنے لگا۔ دن مہینوں میں اور پھر سال میں ڈھل گیا۔ وقت کا مرہم زخم بھرتا رہا۔ میں نے ابو کا کاروبار سنبھال لیا۔

☆.....☆.....☆

ابو اور امی کو بچھڑے ایک سال گزر چکا تھا۔ اب میں کچھ سنبھل گیا تھا۔ زندگی کا سفر جیسے تیسے گزر رہا تھا۔ زندگی نام ہی متحرک شے کا ہے۔ اگر رک جائے تو موت۔ یہ حقیقت ہے جو مر جائیں وہ نہیں مرتے۔ ہم جو پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اصل میں وہ مرتے ہیں اور روز مرتے ہیں۔ ہر دن جی جی کر مرتے اور جیتے بھی ہیں۔

کبھی کبھی میں بے ساختہ سوچتا۔

”وچھوڑے کی آگ ایک بار جلا کر راکھ کیوں نہیں کرتی۔ یہ ہلکی آنچ پر ہمیں کیوں سلگاتی ہے؟“

مگر اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

میرا سارا وقت بزنس میں گزرنے لگا۔ میں نے خود کو کاروبار زیست میں غرق کر دیا۔ سارا دن مصروف رہتا۔ رات کو دوستوں کے ساتھ محفلیں سجتی تھیں۔ پھر تھک کر سو جاتا۔

وہ مارچ کے دن تھے۔ میرے ایک دوست وجاہت کی بہن کی شادی تھی۔ انھوں نے انوائٹ کیا۔ مجھے جانا پڑا۔ اس دن ولیمہ اور رخصتی ہونا تھی۔

شادی پر کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ ہر طرف دھنک رنگ بکھرے نظر آ رہے تھے۔

لڑکیاں حلق پھاڑ پھاڑ کر ہنس رہی تھیں۔ میری نگاہیں ایک لڑکی پر ٹک گئیں۔ وہ گلابی رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ کمر سے نیچے تک پھیلے سیاہ زلفیں جو ناگن کی طرح ڈسنے

والی تھیں۔ دل پذیر نقوش والی جس کا بدن موم سے بنا دکھ رہا تھا۔ اس کے بچوں جیسے چہرے پر جادو جگاتی شہد آگیں آنکھوں کا طلسم دل میں کھب گیا۔ اس میں ایک خاص قسم کی کشش تھی جس نے پہلی ہی نظر میں میرے دل کو چھو لیا تھا۔ اس کے معصوم حسن نے میری روح تک سرشار کردی۔

ہاں اس کا حسن سونامی کی اک لہر تھی۔ جو مجھے اپنے ساتھ بہا کرلے گئی۔ مجھے یوں لگا تھا کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر محبت کے گہرے ساگر میں لے گئی ہو۔

محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس کا ہونا نہ ہونا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا۔

پھر اس کی نگاہیں میری طرف اٹھیں۔ ایک عجب سی سرشاری کی لہر وجود میں دوڑ گئی۔ وہ میری جانب بڑھنے لگی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے پاس آ کر رک گئی۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ یہ کوئی فلمی سین نہ تھا۔ نہ ہی کسی رومانوی داستان کا کوئی دلگداز باب۔ یہ حقیقت تھی۔ خواب نہ تھا۔ ہال میں کافی عورتیں اور مرد موجود تھے۔ یہ آزاد خیال لوگ تھے۔ اپنی مرضی سے جینے والے لوگ۔ اس لیے کسی نے بھی توجہ نہ دی اور وہ میرے پاس کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے پوچھا۔

''آپ ہارون چوہدری ہیں نا؟'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے بصد محبت اس کا گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

''جی میں ہی ہارون چوہدری ہوں۔''

''میں شمائلہ رانا ہوں۔''

اس نے اپنا تعارف کرادیا۔ میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ ''آپ شمائلہ الطاف رانا ہیں نا؟''

الطاف رانا لاہور کا بزنس مین تھا۔ انتہائی امیر بندہ۔ جس کا کاروبار غیر ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ مسقط میں بھی ایک اسپیئر پارٹس کا اسٹور تھا۔ گاڑیوں کا ایک بڑا شوروم گلبرگ میں بھی تھا۔ اس کے ساتھ ایک دو بار میری ملاقات ہو چکی تھی۔ چھ ماہ قبل اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی کا نام بھی شمائلہ تھا۔ میں نے اس کے لباس اور بیش قیمت جیولری سے اندازہ لگایا جو کہ درست ثابت ہوا۔

اس نے بچوں جیسی حسین ناک بڑی نخوت سے سکیڑی۔ اپنے گول گول ہونٹوں کا دایاں گوشہ ذرا گرا کر میری جانب دیکھا، بولی۔ ''جی۔ آپ نے صحیح پہچانا۔''

میں نے اشتیاق سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس سے بھی زیادہ خوشی اس بات کی ہورہی ہے کہ آپ مجھ سے ہمکلام ہیں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''اگر آپ اپنے غور سے میری طرف نہ دیکھتے تو میں آپ کے پاس نہ آتی۔''

میں جھینپ گیا۔ وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر بیس سے پچیس سال کے درمیان تھی۔ تاہم وہ غیر معمولی حسن کی مالک تھی۔ اس کے سرخ بھرے بھرے گال، متبسم ہونٹ، چنچل سی آنکھیں، گردن کی حسین وادیوں میں خیمہ زن سیاہ تل۔ سب سے بڑھ کر اسے بات کرنے کا سلیقہ تھا۔ وہ شائستہ انداز میں گفتگو کرتی رہی۔ اسی اثنا میں ہال میں میوزک کا شور بلند ہوا۔ راحت نصرت فتح علی خاں کی پرسوز آواز میں غزل سنائی دینے لگی۔

نظر سے نظر ملانے سے پہلے
ذرا سوچ لو تم دل لگانے سے پہلے

ہماری نظریں مل گئی تھیں۔ دلوں پر اختیار کب ہوتا ہے۔ یہ خود ہی مل جاتے ہیں۔ ایسا ہی اس وقت ہوا۔ وہ لمحہ میرے دل کی دھرتی میں محبت کا بیج بوگیا۔ پھر اس کی اداؤں اور حسن نے اس بیج کو اک لحظہ میں پودا بنا دیا۔

یہ میری اور شمائلہ کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کا اور میرا ایک شغل مشترک تھا۔ وہ سگریٹ پیتی تھی۔ مجھے اس کے سگریٹ پینے کا انداز بہت اچھا لگا۔ وہ ہلکا سا کش لگاتی اور گفتگو کے دوران دھواں منہ سے خارج کرتی۔ اس رات ہم اکٹھے بیٹھ کر دل بہلاتے رہے۔ جب رخصت ہوئے تو پھر ملنے کا وعدہ بھی کرلیا۔

اس کے بعد ہماری ملاقاتوں کے لامتناہی سلسلے شروع ہوگئے۔ پی سی ہوٹل پر اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی ہم کسی پارک میں اکٹھے ہو جاتے۔ لاہور کا کوئی ایسا مقام نہ تھا۔ جہاں ہم نہ ملے ہوں۔ کتنی حسین صبحیں، سنہری دوپہریں اور خوشگوار شامیں اس کی قربت میں گزریں تھیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوجاتا۔ ہم رات گئے کسی کلب یا ریسٹورنٹ سے واپس آتے۔ وہ میرے بنگلے میں ہی سو جاتی۔

ہاں یہ میری زندگی کے خوشگوار لمحے تھے۔ خواب ناک لمحے......

ہماری ملاقات صرف ان دنوں نہیں ہوتی تھی جب اس کا شوہر پاکستان آجاتا۔ تاہم ہم موبائل پر کال کرکے ایک دوسرے سے حال چال پوچھ لیتے۔

دن گزرتے رہے۔ رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔ ہمارا تعلق ہر دن مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ مجھے یوں لگنے لگا۔ جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کبھی کبھی میں بے اختیار سوچتا۔

"ہمارے اس تعلق کا انجام کیا ہوگا۔ یہ اک حسین خواب ہے۔ اس کی تعبیر کیا ہوگی؟"

وسوسوں اور واہموں کے سنپولیے ذہن میں سرسرانے لگتے۔ میں سر جھٹک کر نکالنے کی کوشش کرتا۔ اپنی سوچوں پر دل گرفتہ ہو جاتا۔ پھر خود ہی ہر سوچ اور خیال کو حرف غلط سمجھ کر مٹانے لگتا۔

پھر وہ دن بھی آگئے۔ جب اس کی ایک پل کی دوری مجھ سے برداشت نہ ہوتی تھی۔

"جس طرح سورج صبح مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ دن بھر اپنا سفر طے کرتا ہے۔ تھک کر شام کی بانہوں میں خود کو چھپا لیتا ہے۔ پھر رات کی مہرباں آغوش میں سو جاتا ہے۔ اسی طرح عاشق بھی محبوب کی چاہ میں چاہتوں کا سفر طے کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ اسے بھی محبوب کی بانہوں کا سہارا درکار ہوتا ہے۔ وہ بھی محبوب کے سینے پر سر رکھ کر اپنی تھکاوٹ اتارنا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں خواہش ہوتی ہے کہ محبوب کی آغوش میں سر رکھ کر سو جائے۔

میرے دل میں بھی ایسی ہی خواہش سر ابھارنے لگی۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہ دوستی محبت میں بدل گئی ہے۔ ایک سال میں محبت کا پودا اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے۔ ایک تناور درخت بن کر جڑیں اتنی کر چکا ہے کہ اسے اب سماجی طوفانوں کی پرواہ بھی نہیں رہی۔"

میرے ذہن میں اکثر یہ سوال ابھرتا۔ "کیا شادی شدہ عورت بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہو سکتی ہے؟"

ایسے واقعات میں نے کہانیوں اور اخباروں میں پڑھے تھے۔ تاہم عملی زندگی میں ایسے ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ انسان ازل سے کھوج میں ہے۔ سوچتا ہے، کھوجتا ہے۔ جب تک مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کی تلاش جاری رہتی ہے۔ آخر وہ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ مجھے بھی اپنے سوال کا جواب ملنے والا تھا۔ اس دن میں پہلی بار رانا ہاؤس گیا۔ میں نے ایک بیش قیمت گولڈ کا کنگن اسے تحفہ دیا۔ خود ہی اس کی کلائی میں پہنا دیا تھا۔

وہ شادی شدہ تھی۔ مجھے اس سے محبت ہوئی اور شدت سے ہوگئی۔

آخر میں نے محبت کا اظہار کر دیا۔ اب اس کے جواب کا منتظر تھا۔

اس نے پاس پڑے میز سے گولڈ لیف سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا۔ ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے سلگایا دو تین ہلکے ہلکے کش لگائے پھر بولی۔ "ہارون۔ ہم صرف دوست ہی ٹھیک ہیں۔" ذرا توقف کے بعد بولی۔ "محبت کا کھیل بہت خطرناک ہے۔ میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ محبت کے بارے میں سوچو بھی مت۔"

"شائلہ۔ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"تو ضد ہو نا یار۔" اس کے ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ ابھری۔ "محبت میرے بس میں نہیں۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔"

"کیا میں تمہیں اچھا نہیں لگتا ہوں؟"

"اگر تم اچھے نہ لگتے ہوتے تو اس وقت ہم بھلا ساتھ ہوتے؟"

یہ اک فسوں خیز شب تھی۔ اس کی قربت نے اک نشہ سا طاری کر دیا۔ میرا دل گویا دھڑکنوں کی تال پر محو رقص تھا۔ میں خود پر قابو پانے لگا۔ عشق کا سفر مدتوں میں نہیں بلکہ اک جست میں طے ہوتا ہے۔ قلبی واردات اک لمحے کا کھیل ہی تو ہے۔ ہم تو کئی بار مل چکے تھے۔ ایک دوسرے کو کسی حد تک سمجھ گئے۔ جان چکے تھے۔ ہمارے سروں کے عین اوپر آرائشی لائٹ جل رہی تھی۔ اس لیے مجھے وہ دودھیا روشنی میں نہائی وہ بہت پیاری لگی۔

اس کے کانپتے ہونٹ، بالخصوص بالائی لب پر تل دھڑکنوں میں تلاطم برپا کرنے لگا۔ جذبات کی منہ زوری کی طغیانی..... جیسے پورا چاند، مست لہروں کا مدو جزر..... جذبات کا سیل رواں، جس میں بہہ کر میں نامعلوم سفر کی طرف جانے لگا۔ وہ سفر جس کی کوئی منزل تھی یا نہیں، میں نہیں جانتا تھا۔

اس کی مخروطی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ وہ ہلکے ہلکے کش لگاتی رہی۔ میں اس کا بچوں جیسا خوبصورت چہرہ دیکھتے ہوئے ہولے سے بولا۔ "اے حسن کی ملکہ! تم بہت ظالم ہو۔ میرے جذبوں کی صداقت پر بھروسا کیوں نہیں کرتی ہو۔ میری محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں دے رہی ہو؟"

یہ سن کر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ پھر ہنستی چلی گئی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دودھیا رخسار پر موجود ڈمپل کو نظروں سے چومتا رہا۔

وہ بمشکل اپنی ہنسی دبا کر بولی۔ "سب مرد ایک جیسے

کیوں ہوتے ہیں؟ کیا ان کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ عورت کی تعریف کرتے رہیں؟''
میں نے جھینپ کر نظریں جھکا لیں۔
''اب کچھ بولو نا۔''
میں کچھ دیر چپ رہا۔ آخر ہمت مجتمع کی، دل فگار لہجے میں بولا۔ ''شمائلہ۔ میں بے جا تعریف نہیں کرتا۔ تمہارا ملکوتی حسن مجھے مجبور کرتا ہے۔ میری آنکھیں جو دیکھتی ہیں۔ دل جو کہتا ہے۔ وہی زبان پر آجاتا ہے۔ اگر میں تمہاری تعریف کرتا ہوں تو اس میں برائی کیا ہے؟''
وہ مسکرائی، بولی۔ ''ایسی تعریفیں سن سن کر میرے کان تھک چکے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ مرد تعریفوں کے جال میں پھنسا کر جسم تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔''
میں بولا۔ ''محبت اور ہوس میں بہت فرق ہے۔ محبت بہت طاقتور جذبہ ہوتا ہے۔ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ہوس جسم حاصل ہوجائے تو ختم ہوجاتی ہے۔''
وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ لمحاتی توقف کے بعد میں نے تمناک لہجے میں کہا۔ ''میں صحرا ہوں۔ بہت پیاسا ہوں۔ تم ساون کی گھٹا ہو۔ آؤ مجھ پر سایہ فگن ہوجاؤ۔ مجھ پر تاحیات برستی رہو۔''
''ہارون۔'' اس نے دھیرے سے پکارا۔
''جی...!''
''میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہاری لائف پارٹنر بن سکوں۔ میری کئی لوگوں سے دوستیاں رہی ہیں۔ میں رکھیل کا مطلب بھی اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر تم میرا جسم حاصل کرنے کے لیے ایسا کہتے ہو تو آؤ کمرے میں چلتے ہیں۔ اپنا پیاسا من سیراب کرلو۔'' یہ کہہ کر وہ چل پڑی۔
میرے ہاتھ کی گرفت اس کی کلائی پر مضبوط ہوگئی۔ وہ رک گئی۔
میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے بیڈروم میں آگئے۔ یہ شمائلہ کا بیڈروم تھا۔ میں اور وہ پہلی بار اس جگہ اکٹھے ہوئے تھے۔
وہ مجھے بیڈ پر بٹھا کر بیڈروم سے ملحق کچن کی جانب بڑھ گئی۔ جب واپس آئی تو وہسکی کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔
پھر شراب کا دور چلنے لگا۔ وہ خود بھی پینے لگی اور مجھے بھی پلاتی رہی۔ آخر بوتل ختم ہونے کے قریب تھی۔ دل و دماغ پر ہلکا ہلکا سرور چھانے لگا۔
دونوں روبرو بیٹھے تھے۔ شعلہ جوالہ حسن تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہونے لگا۔ وہ اپنے لیے جام بنانے لگی۔ شراب سے بھی زیادہ شباب کا نشہ میرے دماغ پر چڑھنے لگا۔
اس نے جام تیار کیا۔ آتشی سیال حلق میں انڈیلا۔ پھر مسکرائی۔ ''تم بھی بہت پیتے ہو۔ مگر آج میں ساقی ہوں۔ اس لیے نہیں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک میں پیوں، ساتھ دینا ہوگا۔'' یہ کہہ کر ایک ہی سانس میں جام خالی کردیا۔
وہ نشیلی آنکھوں سے میرا چہرہ پڑھتی رہی۔ پھر سگریٹ سلگالی۔ ایک ہلکا کش لے کر جھولنے لگی۔ پھر سنبھل کر آہستگی سے بولی۔ ''میں آج رات کے لیے تمہاری ہوں۔ مگر مجھے پانے کے لیے میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' لمحاتی توقف کے بعد ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔
میں ٹیبل پر پڑی وہسکی کی بوتل پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے آج تک اتنی نہیں پی۔ جتنی وہ پلا چکی تھی۔
شمائلہ کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہنا ہوا تھا۔ گویا وہ پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ پھر رنگین رات ایک ہی کمرے اور بیڈ پر گزرتی۔ اس نے آتے ہی بوتل اٹھائی۔ دو جام تیار کیے۔ ایک میری طرف بڑھا دیا۔ جبکہ دوسرا اپنے یاقوتی لبوں سے لگالیا۔
میں نہیں جانتا تھا کہ آج میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ بالکل لاعلم تھا۔ عورت واقعی نہ سمجھ آنے والی مخلوق ہے۔ مرد اسے کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ میں خاموشی سے آتشی سیال حلق سے اتارتا رہا۔ ہم پیتے رہے۔ اس وقت مجھے صاف محسوس ہونے لگا کہ اب میرے حواس بے قابو ہو رہے ہیں۔ میں خود کو سنبھالنے لگا۔
''ہارون۔ آج تمہیں اپنا دکھ سنانا چاہتی ہوں۔ سنو گے نا؟'' اس کی مخمور آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔
''ہاں بولو۔''
پھر اس نے اپنی حیات کی کتاب سامنے رکھ لی۔ اس کا اک اک ورق پڑھ کر سنانے لگی۔
عورت واقعی ایک انوکھی کتاب کی مانند ہے۔ اگر پڑھنا چاہو تو اس کا اک اک حرف، لفظ، سطریں، ابواب اور انجام تک پہنچتے پہنچتے مرد تھک جاتا ہے، ہانپنے لگتا ہے۔ پھر بھی سمجھ نہیں سکتا۔ کبھی کبھی پوری کی پوری پل میں سمجھ آجاتی ہے۔ مگر

اس کا آغاز جتنا دلپذیر ہوتا ہے۔ انجام اتنا ہی دل فگار ہے۔ ہاں عورت بند گوبھی جیسی ہوتی ہے۔ اگر پرت در پرت کھولتے بھی جاؤ۔ آخر پر کچھ حاصل نہیں ہوتا اس نے اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔ جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ وہ اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ماں بچپن میں مرگئی۔ اس کے باپ سیٹھ شکور کا لبرٹی میں کاروں کا ایک چھوٹا سا شوروم تھا۔ زندگی اچھی گزر رہی تھی۔ جن دنوں وہ بی اے کے ایگزام سے فارغ ہوئی۔ اس کے والد کے شوروم میں حادثاتی طور پر آگ لگ گئی۔ جس میں لگ بھگ آٹھ گاڑیاں نذرآتش ہوگئیں۔ اس کے والد کے ساتھ الطاف رانا کا لین دین چل رہا تھا۔ وہ کچھ دن چپ رہا۔ آخر ایک دن قرض کی واپسی کا مطالبہ کردیا۔ یہ پچاس لاکھ کے لگ بھگ رقم تھی۔ اس کے والد نے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ جو کہ الطاف رانا خود بھی جانتا تھا۔ اسے آتشزدگی والے واقعے کا پتا تھا۔ مگر وہ بضد تھا کہ اسے رقم چاہیے۔

سیٹھ شکور ایک خوددار شخص تھا۔ مگر بے بس تھا۔ کچھ دن اس نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ اس دوران الطاف رانا کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا۔ اس کے والد نے کچھ زیورات بیچے۔ رشتہ داروں سے قرض لیا اور دوبارہ شوروم کی سیٹنگ شروع کردی۔ وہ وہاں جانے لگا۔ مگر الطاف رانا شوروم پر بار بار آکر اسے لوگوں کے سامنے ذلیل کرتا رہا۔ اس نے تنگ آکر شوروم جانا چھوڑ دیا۔ وہ فون پر تنگ کرنے اور دھمکیاں دینے لگا۔ آخر ایک دن وہ گھر آ گیا۔ وہ اپریل کی ایک شام تھی۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ جب شائلہ چائے لے کر گئی۔ وہ دروازے کے قریب کچھ دیر رکی۔ الطاف رانا اس کے باپ سے رقم کا تقاضا کررہا تھا۔ پھر اس نے ایک عجیب بات کہہ دی۔ ”اگر رقم نہیں دے سکتے تو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دو۔“

سیٹھ شکور بے بس تھا۔ خاموش رہا۔ وہ چائے دے کر واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ ساری رات جاگتی رہی۔ کروٹیں بدلتی رہی۔ آخر فجر تک ایک فیصلہ کرلیا۔

یہ فیصلہ تھا۔ الطاف رانا سے شادی کا۔ دو دن بعد اس نے اپنے باپ سے بات کی۔ وہ ششدر رہ گئے۔ پھر شائلہ نے بتایا کہ اس نے دروازے کے قریب کھڑے ہوکر سب باتیں سن لی تھیں۔ اس نے اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔ اس کا باپ جانتا تھا کہ الطاف رانا ایک عیاش شخص ہے۔ لوگوں کی مجبوریوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ شائلہ کا باپ اس جذباتی فیصلے کے خلاف تھا۔ مگر اس نے بڑی مشکلوں اور منتوں سے انہیں قائل کرلیا۔ پھر سیٹھ شکور نے ہاں کردی۔ کچھ ماہ بعد اس کی شادی الطاف رانا سے ہوگئی۔ شروع میں دو ماہ تک وہ ٹھیک رہا۔ پھر شائلہ کو بار بار طعنے دینے لگا۔ بقول اس کے کہ وہ رقم کے عوض ملی ہے۔ وہ شراب اور عورتوں کا رسیا تھا۔ اکثر پارٹیوں میں جاتا۔ اسے بھی ساتھ لے جانے لگا۔ پھر ایک دن اس نے شائلہ سے اپنے ساتھ بیٹھ کر شراب پینے کا کہا۔ وہ خوفزدہ ہوگئی۔ اس نے انکار کردیا۔ وہ غصے میں آگیا۔ شائلہ کو بری طرح زدوکوب کیا۔ آخر اس وقت جان چھوڑی جب اس نے شراب پی۔ وہ شراب پی کر مدہوش ہوگئی۔ اس رات وہ پہلی بار بے سدھ ہوکر سوئی۔ اسے یہ اچھا لگا۔ کچھ وقت تو سکون سے کٹا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے خود کو شراب میں ڈبو لیا۔ اسے ان دنوں شراب ہی بہترین ساتھی لگی۔ کیونکہ وہ اسے نا صرف حال سے بے خبر کردیتی بلکہ کچھ لمحوں کے لیے مستقبل کے اندیشوں سے بھی بے فکر کردیتی۔ اس کے ساتھ اس نے سگریٹ نوشی بھی شروع کردی۔ وقت بند مٹھی میں دبی ریت کی طرح سرکتا رہا۔ اس دوران اسے کافی باتوں کا علم بھی ہوگیا۔ اس کی زندگی ایک گرداب میں پھنس چکی تھی۔ یہ جان لیوا احساس اسے شدت سے ہونے لگا۔ ماضی کا فیصلہ جو کہ جذبات میں کیا تھا۔ اب سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں تھا۔

تقدیر اٹل حقیقت ہے۔ اس کا وار بہت کاری ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ ہوا۔ ایک رات سیٹھ شکور کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ وہ جانبر نہ ہوسکا۔ وہ بھرے جہاں میں اکیلی رہ گئی۔ اس کا شوہر کچھ عرصہ قبل دبئی چلا گیا تھا۔ اب وہ ایک طرح سے آزاد تھی۔ مگر پھر بھی خود کو ان دیکھی قید میں محسوس کرتی۔ ایسی قید جو زندگی کی تمام خوشیوں کی موت تھی۔ شائلہ نے اپنی روداد سنادی۔ ماحول پر سکوت طاری ہوگیا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی۔ پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ سگریٹ کا کش لگایا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ”میرا شوہر آج کل دبئی کی فضاؤں میں سانسیں لے رہا ہے۔ شنید میں آیا ہے کہ رنگ رلیاں منا رہا ہے مگر وہ جب بھی پاکستان آیا تو سیدھا میرے پاس آئے گا۔ حالانکہ اس کے آنے پر اب میں افسردہ ہوجاتی ہوں۔ دل پر پتھر رکھ کر وقت گزارتی ہوں۔ نجانے کب تک تصنع و بناوٹ کا یہ رسمی تعلق نبھانا پڑے گا۔ جبکہ تم سمجھتے ہو کہ میں اس کے ساتھ خوش ہوں۔ اس لیے اسے چھوڑ نہیں سکتی۔“

وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوئی، پھر بولی۔ ''ہاں جب شوہر بیوی کو محض پاؤں کی جوتی سمجھتا ہو۔ وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ جب دل چاہا اس کے پاس آگیا۔ صرف یہ جتانے کے لیے کہ تم میری ملکیت ہو۔ مگر وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ جوتی جب لگنا شروع ہو جائے تو پاؤں زخمی کر دیتی ہے۔ چال بدل جاتی ہے۔ آخر اس جوتی کو ہاتھ میں پکڑ کر برہنہ پا چلنا پڑتا ہے۔''

آخر میں اس کا لہجہ کٹیلا ہو گیا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔ اس لمحے مجھے اس کی آنکھیں بحر بیکراں جیسی لگیں اور میں ان آنکھوں میں ڈوب گیا۔

میں نے خودی کے عالم میں کہا۔ ''شمائلہ، میں تمہارا اور درد جان گیا ہوں۔ اب چاہتا ہوں کہ اسے بانٹ لوں۔ شاید کچھ کم ہو جائے۔''

وہ بھرپور انداز میں میری جانب دیکھتی رہی۔ پھر کہا۔ ''ہارون۔ میں آزاد فضاؤں میں اڑنے والے پرندے جیسی ہوں۔ اپنی مرضی سے اڑان بھرتی ہوں۔ اب قید ہو کر جی نہیں پاؤں گی۔ گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ کیا تم مجھے قید کرنا چاہتے ہو۔ مارنا چاہتے ہو؟'' وہ جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

میں چپ تھا۔ سوچنے لگا۔ ''بلاشبہ وہ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہے۔ بہت مشکل سوال کرتی ہے۔ اسے اپنی ذہانت کا یقین تھا۔'' میں دل ہی دل میں اس کی ذہانت کو سراہنے لگا۔ یہ سچ ہے کہ عورت مرد کی توجہ چاہتی ہے۔ ورنہ بغاوت پر اتر آتی ہے۔ پھر وہ شوہر کی محبت کو بھی تشکیک آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگتی ہے۔ اس میں قصور شوہر کا ہی ہوتا ہے۔ وہ واضح اقرار چاہتی ہے۔ صرف محبت کا اقرار اور بھرپور توجہ..... شوہر اور بیوی کا رشتہ گویا دل کی دھڑکنیں ہیں جو دو جسموں میں ایک ساتھ چلتی ہیں۔

میں خاموش تھا۔ شراب کا نشہ ذہن پر حاوی ہونے لگا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر مرتکز تھیں۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ٹھوڑی کے گڑھے پر آکر رک گئیں۔ اگلے ہی لمحے اس کی دودھیا گردن کی وادیوں میں خیمہ زن تل پر جم گئیں۔ یہ سیاہ رنگ کا تل اس کی ٹھوڑی کے عین نیچے گردن پر تھا۔

ذہن میں بے اختیار یہ سوچ ابھری۔

''اگر آسمان کا رنگ سفید ہوتا تو اس پر سیاہ چاند ہی جچتا۔''

ہماری نگاہیں چار ہوئیں۔ اس کے گلاب کی پنکھڑیوں سے لب کپکپانے لگے۔ میرا دل مچلنے لگا۔ پھر میں نے ہونٹوں کو ہدف سمجھ کر نشانہ لیا۔ اس نے جلدی سے اپنا چہرہ ایک طرف کر لیا۔ نشانہ خطا ہو گیا۔

''نہیں ابھی نہیں۔'' اس کے لبوں پر بھید بھری مسکراہٹ تھی۔

''بس دو چار پیگ اور ہو جائیں تو۔'' اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔''

پھر ہم جام پہ جام پیتے رہے۔ میرے ہاتھوں میں دم نہ رہا۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کمرے کے وسط میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

''آجاؤ ہارون۔'' اس کی آنکھوں میں دعوت تھی۔

میں کھڑا ہو گیا۔ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا اس کے پاس چلا گیا۔ ہم میرون کلر کے قالین پر کھڑے تھے۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ وہ مچل کر ایک طرف ہو گئی۔ پھر یہی کھیل شروع ہو گیا۔ وہ تھوڑا دور ہو جاتی۔ پھر اشارے سے اپنے پاس بلاتی۔ میں جب اسے پکڑنے لگتا تو وہ تڑپ کر ایک جانب ہو جاتی۔ میں اس کوشش میں تھک گیا۔ پھر ہانپنے لگا۔ آخر تھک کر گر پڑا۔ مجھے نہیں پتا پھر کیا ہوا۔ جب صبح دس بجے آنکھ کھلی تو قالین پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ شمائلہ بیڈ پر لیٹی نظر آئی۔ پھر میرے ذہن میں رات والی باتیں آنے لگیں۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ اپنا آپ بچانا جانتی تھی۔ بچا گئی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی روشن پیشانی پر محبت کی مہر ثبت کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ بیس منٹ بعد میں اپنے بنگلے پر تھا۔

میں کئی دن خود سے لڑتا رہا۔ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر دل بچہ بن گیا۔ ایسا بچہ جسے اپنا پسندیدہ کھلونا ہر قیمت پر چاہیے ہوتا ہے۔ آخر ایک دن میں نے اس سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ جاتی سردیوں کی اک خوشگوار شام تھی۔ میں نے شمائلہ کو کال کی اور ملنے کا کہا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد میرے بنگلے پر آگئی۔

ہم روبرو بیٹھے تھے۔ میں بغور اسے دیکھنے لگا۔ اس نے بلیو جینز کے ساتھ اسکن کلر کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ شرٹ کے اوپر میرون رنگ کی جرسی۔ جرسی پر عین دل کے مقام پر اسکن کلر کا پھول بنا ہوا تھا۔

میں اس کے حسین چہرے کو دیکھتا رہا۔ نجانے کیوں

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ بعدازاں یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔

"شمائلہ! آج میں صاف صاف کہنا اور سننا چاہتا ہوں۔ اب میں مزید انتظار نہیں کرسکتا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کا آغاز کیا۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ میں دوبارہ گویا ہوا۔ "تم صاف صاف بتا دو کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ تم کیا چاہتی ہو۔ اس تعلق کو کب تک اور کہاں تک لے جانا چاہتی ہو؟"

"ہارون صاف لفظوں میں بتاؤ۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ اب ہمیں ایک ہو جانا چاہیے۔ تم الطاف رانا سے جان چھڑاؤ۔ میری ہمسفر بن جاؤ۔"

"کیا محبت کا انجام نفرت اور شادی ہی ہوتا ہے؟"

"محبت کا بیج دل کی دھرتی میں بونے والوں کے مقدر میں نفرت کا صحرا نہیں ہوتا۔ انھیں آبلہ پائی کا عذاب بھی نہیں سہنا پڑتا۔"

"اچھا...!" اس کے چہرے پر مصنوعی حیرت کا عکس واضح محسوس ہوا۔ "جب وہی بیج پودے سے درخت بن جاتا ہے۔ اس کا سایہ ہمیشہ ہم پر سایہ فگن رہتا ہے۔ اس کی چھاؤں ہمیں زمانے کی دھوپ سے محفوظ رکھتی ہے۔"

میں نے اس کی تصنع آمیز حیرت کی ذرا پرواہ نہ کی۔

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ماحول میں جلترنگ بج اٹھا۔ ہاں اسی ہنسی نے ہمیشہ مجھے گھائل کیا۔ مگر اس وقت زہر کی طرح لگی۔ وہ ہنسی کو بمشکل روک کر بولی۔ "ہارون...... اب میری بات سنو۔"

میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

وہ نچلا ہونٹ ہلکے سے دانتوں میں دبا کر میری جانب دیکھتی رہی، پھر گویا ہوئی۔ "جس طرح ہماری دھرتی مصنوعی سہاروں کی مرہون منت ہو چکی ہے۔ ہمارے ہاں اگنے والے گلاب کے پھولوں کا رنگ سرخ ہی ہوتا تھا۔ اب ہر رنگ کا گلاب مل جاتا ہے۔ حتیٰ کہ سفید، زرد، اور کالا بھی۔ ہاں کالا گلاب۔ اسی طرح اب دل کی دھرتی بھی اپنی خاصیت بدل چکی ہے۔ اس میں اگنے والا محبت کا بیج کبھی سکھ کا شجر نہیں بن سکتا کیونکہ یہ تصنع و بناوٹ کی پیداوار ہے۔ اس سے جو پودا نکل کر شجر بنتا ہے۔ وہ خلش کا ببول ہی ہوتا ہے۔ جس کے مسموم کانٹے روح کو بھی چھلنی کر دیتے ہیں۔" آخر میں اس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

میں چپ ہوگیا۔

## موقع تو دیں

بیوی نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ "ڈارلنگ! یہ کیا بات ہے کہ جب آپ کے دوست آتے ہیں تو آپ بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں، ان کے گلے ملتے ہیں اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں مگر جب میری سہیلیاں آتی ہیں تو آپ ذرا بھی خوش نہیں ہوتے۔"

شوہر۔ "خوشی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کرسکتا ہوں مگر آپ مجھے اپنی سہیلیوں سے ملنے کا موقع تو دیں۔"

مہوش مشعل...... سرگودھا (پنجاب)

## تلقین

ایک جگہ بم دھماکا ہوا اور ایک سکھ کا بازو کٹ گیا، جس پر وہ زور سے چیخنے لگا تو دوسرا سکھ بولا۔

"صبر کر یار صبر! کیوں اتنا چلا رہا ہے، وہ دیکھ سامنے ایک آدمی کی گردن اڑ چکی ہے مگر وہ تو بالکل خاموش ہے۔"

شبانہ حیات...... رحیم یار خان

"کہاں کھو گئے ہو؟" اس کی دلفریب آواز مجھے خیالوں سے باہر لے آئی۔

"شمائلہ میں اتنا جانتا ہوں۔ میرے دل میں تمہارے لیے بے حد محبت ہے۔ اب زیادہ دن دور نہیں رہ سکتا۔ تم طلاق لو اور مجھ سے نکاح کرلو۔"

"مطلب تم محبت کا صلہ چاہتے ہو؟"

"جو بھی سمجھ لو۔"

"ہارون۔ ہم صرف دوست بن کر رہ سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں جس سے محبت ہو، شادی بھی اسی سے ہو۔ محبت کا انجام شادی ہرگز نہیں ہے۔"

"تو اس کا انجام کیا ہے۔ کسی کے جذبات سے کھیلنا۔ اس کی زندگی برباد کردینا؟" میں غصے سے پھٹ پڑا۔

"شاید اس رات والی بات کو تم نے انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ بس یہی وجہ ہے۔ جو تم بار بار شادی کا کہہ رہے ہو۔ کیونکہ اب تک تم میرا جسم حاصل نہیں کرسکے اور یہ تبھی ممکن ہے۔ جب تم اپنا لوگے۔ سوری میں اسے انا سمجھتی ہوں۔ محبت نہیں۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں چپ رہا۔ کچھ نہ

بولا۔ تاہم کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ''او کے۔ اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ کب طلاق لوگی؟''

''مردوں کی فطرت کبھی نہیں بدل سکتی، نہ بدلے گی۔ شاید وہ خود بدلنا نہیں چاہتے۔''

شمائلہ نے کاٹ دار لہجے میں کہا، پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے گھن آتی ہے ایسے مردوں سے، جو عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ محض دل بستگی کا سامان۔''

''نن.....نہیں شمائلہ ایسی بات نہیں ہے۔'' میں بوکھلا گیا۔

''ہارون میری طرف دیکھو۔''

میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''کوئی مرد جب کسی عورت کو دیکھتا ہے تو وہ اس کی نگاہوں کا مفہوم جان جاتی ہے۔ میں نے سب کی نظروں میں ہوس دیکھی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا ہوس محبت ہوتی ہے؟''

یہ اک عجیب سوال تھا۔ جس کا جواب مشکل تھا۔ بہت مشکل۔ میں چپ رہا۔

میری خاموشی ہی شاید اس کے سوال کا جواب تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ تمہارے پاس میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں بتاتی ہوں۔ ایک مرد کی محبت، اس کی تڑپ اسے حاصل کرتے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ جبکہ عورت حقیقی معنوں میں جان دینے کی حد تک وفا کرتی ہے۔ ہاں اس کی چاہت بحر بیکراں کی مانند ہے۔''

جونہی اس کی بات ختم ہوئی میں نے کہا۔ ''عورت بھی قابل اعتبار نہیں ہوسکتی۔'' میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ قابل اعتبار ہوتی ہے۔ ہاں قابل اعتبار۔ اس پر بھروسا کرنے والا ساری عمر پچھتاتا ہے۔''

وہ تڑپی۔ ''ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تم کیا جانو۔ عورت اپنے دل کے مندر میں جسے دیوتا بنا کر بٹھا دیتی ہے۔ ساری زندگی اس کی داسی بن کر گزار دیتی ہے۔''

میں نے استہزائیہ قہقہہ لگایا، بولا۔ ''تم کہتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ ہے نا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پھر اب اگر شادی کا کہہ رہا ہوں تو بھاگتی کیوں ہو؟ اپنی مجبوریاں کیوں سنا رہی ہو؟''

وہ سسک کر بولی۔ ''میں حالات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عورت ہوں۔ یہ جانتی ہوں، میرا شوہر مجھے کبھی طلاق نہیں دے گا۔'' لحاتی توقف کے بعد بولی۔ ''یہ حقیقت ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔''

میرا ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

''مکار عورت! تم نہ جانے کتنے مردوں کو یہ بات کہہ چکی ہو؟''

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اسے یقیناً اس بات کی توقع نہیں تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ میں اس پر ہاتھ اٹھاؤں گا۔ مگر جو ہونا تھا، ہو چکا تھا اور بہت غلط ہوا۔ ہاں بہت غلط۔

☆......☆......☆

ماضی انسان کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ شمائلہ میری زندگی میں اداسیوں کے رنگ بھر گئی۔ جس میں خلش بھی تھی۔ اس دن وہ کافی دیر روتی رہی۔ میں پتھر بنا بیٹھا رہا۔

پھر وہ چلی گئی۔ میں اس سے معافی بھی نہ مانگ سکا۔ مرد کبھی جھکنا نہیں جانتا۔ میں بھی نہ جھکا۔ وہ چہرہ جو مجھے بہت پیارا تھا۔ جس چہرے کو چاند سے تشبیہہ دیتا رہا۔ اس پر وہ میری انگلیوں کے نشان لے کر گئی تھی۔ ہاں جانے سے قبل اس نے صرف اتنا کہا۔ ''ہارون میری دعا ہے کہ تم خوش رہو۔ اب اس شہر میں کبھی نظر نہیں آؤں گی۔''

وہ چلی گئی۔ میں اپنے کیے پر نادم ہوا۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم جذبات میں آکر جو غلطی کرتے ہیں، اس کا پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ زیاں کا کرب ہی روگ بن جاتا ہے۔ میں ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگا۔ مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ برآمدے کے ستون پر مکے مارنے لگا، مارتا رہا۔ حتیٰ کہ ہاتھ لہولہان ہوگیا۔ یہ وہی ہاتھ تھا۔ جو اس پر اٹھا تھا۔ میں مکے مارتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ میری آواز سن کر شمیر خان آگیا۔ اس نے بمشکل مجھے قابو کیا۔ پھر ڈاکٹر کو بلا کر مرہم پٹی کروائی۔

اگلے دن دوپہر کے وقت میں جاگا۔ لباس بھی نہ بدلا۔ گاڑی نکالی اور رانا ہاؤس کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں ملازم کی زبانی پتا چلا۔ ''میڈم دس بجے کی فلائٹ سے بیرون ملک صاحب کے پاس چلی گئی ہیں۔''

میں ٹوٹے دل کے ساتھ واپس آگیا۔ اب میں اکیلا رہ گیا۔ مایوسیوں کے سینے سے جھانکتا ہوا میرا ماضی تھا۔ یا پھر وقت رخصت اس کے بولے دو جملے اور اس کا دور جاتا ہوا دھندلا عکس۔ وہ مجھ سے ناراض ہوکر کسی اور دیس کی باسی بن گئی۔

میں ایک بااختیار شخص تھا۔ دولت کا بھی مسئلہ نہ

تھا۔میں نے بمشکل چار دن گزارے۔پانچویں دن رات گیارہ بجے کی فلائٹ سے دبئی چلا گیا۔میں جانتا تھا کہ الطاف رانا دبئی میں مقیم ہے۔کچھ ماہ قبل شمائلہ نے بھی بتایا تھا کہ اس کا شوہر ایک ماہ کے لیے دبئی بلانا چاہتا ہے۔وہ ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے۔دبئی انسانوں کا جنگل ہے۔کسی کو ڈھونڈنا مشکل کام ہے۔میرے پاس فون نمبر بھی نہ تھا۔بہرکیف الطاف رانا ایک معروف کاروباری شخص تھا۔میں نے اس کی رہائش گاہ کا پتا چلا لیا۔اسے ڈھونڈنے میں میرے ایک دوست پرویز احمد کا ہاتھ تھا۔پرویز احمد پاکستان کے شہر حیدر آباد کا باسی تھا۔مسقط میں ایک ہوٹل میں منیجر تھا۔رانا الطاف کی رہائش گاہ سے پتا چلا کہ وہ دس دن کے لیے جدہ گیا ہوا ہے۔وہاں سے وہ مسقط چلا جائے گا۔وادی کبیر میں اس کا گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کا اسٹور ہے۔

میں پرویز کے ساتھ مسقط آگیا۔بہرکیف پورا سال گزر گیا۔اس سے ملاقات نہ ہوسکی۔اگر اس سے ملاقات ہو جاتی تو تھوڑی مزید کوشش شمائلہ تک پہنچا دیتی۔میں معافی مانگ لیتا۔اسے اپنی قلبی کیفیت سے آگاہ کرتا۔پھر پرویز نے ہوٹل میں جاب دلوا دی۔تاہم میں اسے ڈھونڈتا رہا۔پانچ سال گزر گئے۔پھر ایک دن اخبار میں ایک خبر پڑھ کر میں ششدر رہ گیا۔

اس خبر کے مطابق رانا الطاف اور اس کی بیوی کی لاشیں مطرح کارنیش جیٹی پر پائی گئی تھیں۔موت کی وجہ تھی ڈوبنا۔اخبار پر چھپی تصویر میں رانا الطاف کا چہرہ قابلِ شناخت تھا۔جبکہ شمائلہ کا چہرہ سمندری جانوروں نے نوچ لیا تھا۔تاہم میں نے اس کی کلائی میں موجود کنگن سے پہچان لیا۔ہاں یہ وہی کنگن تھے۔جو میں نے اسے گفٹ کیا تھا۔جس طرح سمندر کے سینے پر اٹکھیلیاں کرتی لہریں ساحل سے ٹکرا کر واپس پلٹ جاتی ہیں۔میرا سفر بھی رائیگاں گیا۔اس سفر کا مقصد بھی جیٹی پر منتج ہو گیا۔شمائلہ کی نعش اصل میں میری تمناؤں کی موت تھی۔اس شہر آشوب میں ٹھہرنا جان لیوا عذاب کی مانند لگنے لگا۔اگلے دن ان کی نعشیں پاکستان روانہ کی گئیں۔اس کے دو دن بعد میں واپس پاکستان آگیا۔

☆......☆......☆

پاکستان میں آئے مجھے سات دن ہو گئے۔اس دوران کافی دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔بہت سے جاننے والے چوہدری ولا آتے رہے۔پرانے رابطے بحال ہو گئے۔تاہم میرا دل افسردہ تھا۔کیونکہ زندگی کا سرمایہ چھن چکا تھا۔وہ سرمایہ ہی متاعِ زیست تھا۔شمائلہ کی یادیں اس کی باتیں ہر پل حملہ آور ہونے لگیں۔میں نے سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیا۔وہ فیصلہ تھا خود کو مصروف کرنا۔تاکہ اس کی یاد کم آئے۔میں دوستوں کے پاس آنے جانے لگا۔کاروبار پر بھی توجہ دینا شروع کر دی۔تاہم دل نہ لگا۔یہ حقیقت ہے شمائلہ کی ناوقت نے مجھے توڑ ڈالا۔کبھی کبھی میرے ذہن میں خیال آتا کہ وہ زندہ ہے۔یہیں کہیں ہے۔مگر اس کی اخبار میں چھپی نعش کی تصویر اور ہاتھ میں کنگن میری سوچوں کا رخ موڑ دیتے۔جب کبھی میں اکیلا ہوتا تو پھوٹ پھوٹ کر روتا۔اپنی قسمت کو کوستا۔ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ہم سے غلطیاں ہوں۔جب ان کا خمیازہ بھگتنا پڑے تو قسمت کو ہی قصوروار ٹھہراتے ہیں۔

☆......☆......☆

وہ ایک خوشگوار صبح تھی۔مسقط سے واپس آئے پندرھواں دن تھا۔میں کینٹ کے نزدیک ریلوے آفیسر کالونی ایک دوست کے پاس کاروباری سلسلے میں گیا۔دو گھنٹے وہاں رہا۔پھر واپسی کے لیے نکل پڑا۔صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔میں سوچوں میں گم گاڑی چلا رہا تھا۔ایک جگہ سگنل پر گاڑی روکنا پڑی۔میں نے بلا ارادہ اپنی بائیں طرف دیکھا۔میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔میری گاڑی کے برابر ایک اور گاڑی کھڑی تھی۔اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر شمائلہ براجمان تھی۔میں پلکیں جھپکنا بھول گیا۔بلاشبہ وہ شمائلہ ہی تھی۔اس میں شک کی گنجائش نہ رہی۔اسی اثنا میں سگنل کھل گیا۔گاڑیاں آگے بڑھنے لگیں۔میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ہماری گاڑیاں آگے پیچھے مختلف راستوں سے ہوتی ہوئیں سمن آباد پہنچ گئیں۔فاصلہ مناسب تھا۔اسے ذرا بھی شک نہ ہوا۔دس منٹ بعد اس نے گاڑی ایک گیٹ کے سامنے روکی۔پھر ہارن بجا دیا۔اندر سے کسی نے گیٹ کھولا۔وہ گاڑی اندر لے گئی۔میں نے ایک گھنٹا انتظار کیا۔اس کے بعد گاڑی سے اترا۔اگلے ہی لمحے گیٹ پر کھڑا ڈور بیل بجا رہا تھا۔

کچھ لمحے گزر گئے۔اس سے پہلے کہ میں دوبارہ بیل بجاتا۔گیٹ کھل گیا۔گیٹ کھولنے والا ایک بوڑھا شخص تھا۔وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”شمائلہ صاحبہ سے کہیں کہ ایک پرانا شناسا ملنے آیا ہے۔“

اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ہکلاتے ہوئے بولا

"کک......کون شائلہ؟"
پھر سنبھل گیا۔
"یہاں کوئی شائلہ نہیں رہتی۔ جاؤ صاب اپنا کام کرو۔"
اس سے قبل وہ گیٹ کا پٹ بند کرتا۔ میں اسے ایک طرف دھکا دے کر اندر گھستا چلا گیا۔ وہ پیچھے سے آوازیں دیتا رہ گیا۔
میں سیدھا چلتا گیا۔ پھر میری نظر شائلہ پر پڑی۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ یقیناً وہ بوڑھے چوکیدار کی آواز سن کر نکلی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔
وہ شائلہ ہی تھی۔ وہی ملکوتی حسن، وہی مسکراتی آنکھیں۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ میں اس کے روبرو کھڑا ایک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ اس کے کھلے براؤن بال، جو کہ پہلے سیاہ تھے۔ حسبِ عادت گلے میں دوپٹا مگر سوگوار سا چہرہ۔ میں کچھ دیر چپ رہا، پھر دل فگار لہجے کہا۔ "شائلہ! یہ تم ہی ہو نا۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟"
وہ چپ رہی۔ اتنے میں بوڑھا چوکیدار بھی آ گیا۔
"میڈم جی! یہ بندہ......" شاید وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ اس کی بات کاٹ کر گویا ہوئی۔
"بابا! آپ جائیں۔"
گو کہ اس نے مہذب انداز میں بات کی۔ لیکن لہجے کی تلخی چھپا نہ سکی۔ وہ چلا گیا۔
"ہاں ہارون صاحب! میں شائلہ رانا ہوں۔ اب جلدی سے بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"
مجھے یوں لگا کہ جیسے کہہ رہی ہو۔ اپنا مدعا بیان کرو اور جاؤ۔
دل میں درد کی ایک کٹیلی لہر اٹھی۔ میرا جرم بڑا تھا۔ اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ کیسے بھول سکتی؟
"میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے بہت غلط کیا۔ پانچ سال سے پچھتاوے کی آگ میں جل رہا ہوں۔" میری آنکھیں نم ہو گئیں۔
"میں سب بھول چکی ہوں۔ کس نے میرے ساتھ کیا کیا۔ سب کچھ بھول گئی ہوں۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"
وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔
اس کی پشت میری طرف تھی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ ٹانگوں میں کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ میں رونے لگا، سسک کر بولا۔ "میں ایسے نہیں جا سکتا۔ اب حوصلہ نہیں رہا۔ اکیلا جینا عذاب لگتا ہے۔"
پھر میں وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ سسک سسک کر رونے لگا، روتا رہا۔
میں نجانے کتنی دیر روتا رہا۔ اچانک اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ وہ شائلہ کا ہاتھ تھا۔ آخر پتھر پگھل گیا۔ وہ بھی فرش پر بیٹھ گئی۔ "مت رو ہارون! میں نے دل سے آپ کو معاف کیا۔"
اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ زور زور سے رونے لگا۔ پھر روتے روتے اسے گزرے ماہ و سال کے بارے بتانے لگا۔ آخر میں کہا۔ "میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا ہے۔ اخبار میں تمہاری نعش کی تصویر دیکھی تو امید کا دیا بجھ گیا۔"
اس نے مجھے سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔ ہم کمرے میں آ گئے۔ وہاں سب سے پہلے پوچھا کہ یہاں تک کیسے آئے ہو؟
میں نے سب بتا دیا۔ اس نے فون کر کے بوڑھے اللہ بخش کو بلا لیا۔ مجھ سے گاڑی کی چابی لے کر اسے دی۔ وہ گاڑی کوٹھی میں لے آیا۔
"اچھا اب بتاؤ۔ کیا پیو گے۔ ٹھنڈا یا گرم؟" پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا، بولی۔ "شراب یا سگریٹ کے علاوہ۔ کیونکہ یہ دونوں میں چھوڑ چکی ہوں۔"
مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ تاہم چپ رہا۔
پھر وہ خود ہی اٹھی کوک اور بسکٹ لے آئی۔ ہم دونوں کوک اور بسکٹ سے انصاف کرنے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ میں متجسس تھا کہ الطاف رانا کے ساتھ دوسری لاش کس کی تھی؟
"اچھا یہ بتاؤ۔ دوسری لاش کس کی تھی؟"
میں دل کی بات زبان پر لے آیا۔
وہ گم صم ہو گئی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ آخر گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا، بولی۔ "تم مجھے بہت پیارے ہو۔ شاید تم جھوٹ سمجھو کہ میرے دل میں آج بھی تمہارے لیے بہت کچھ ہے۔ بے حد محبت ہے۔"
وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔ ذرا توقف کے بعد گویا ہوئی۔ "میں شروع سے سب سناتی ہوں۔"
میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔
پھر اس نے اپنی کہانی سنانا شروع کر دی۔ "میں دلبرداشتہ ہو کر دبئی گئی۔ وہاں سے جدہ میں دو سال گزارے آخر مستقل آ گئی۔ جدہ میں رہتے ہوئے حج کا فریضہ ادا

کیا۔شراب سے توبہ کی۔ مسقط میں الطاف رانا کا وسیع کاروبار تھا۔وہ زیادہ تر وہاں رہنے لگا۔ میں بھی ساتھ ساتھ رہی۔ الطاف رانا کے معاشقوں کی مجھے سب خبر تھی۔ وہ اکثر لڑکیوں کو گھر لے آتا۔شراب اور عیاشی کی محفلیں سجتیں۔ ان لڑکیوں میں ایک انڈین لڑکی راج کماری تھی جو کہ اس کی منظور نظر تھی۔ اس نے الطاف رانا کو کہہ کر مجھے شراب پلانے کا کہا تو میں نے انکار کر دیا۔'' وہ کچھ دیر کے لیے رکی پھر بولی۔

''ہارون! وہ سردیوں کی رات تھی۔ وہ مجھے شراب پینے کا کہہ رہا تھا۔ میں انکار کرتی رہی۔ اس نے راج کماری کے سامنے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ تشدد بھی کیا۔'' مجھے اس وقت وہ دونوں دنیا کے سب سے ذلیل انسان لگے۔ اس دوران مجھے تم بہت یاد آئے۔ میں نے کلائی میں پہنا ہوا کنگن دیکھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسی اثنا میں راج کماری نے الطاف کو کہا کہ مجھے یہ کنگن چاہیے۔ اس نے میرے سامنے دو شرطیں رکھ دیں۔ شراب پیو یا پھر راج کماری کو کنگن اتار کر دے دو۔ کنگن تمہاری نشانی تھا۔ شراب سے توبہ کر چکی تھی۔ میں تذبذب کا شکار ہوگئی۔ آخر کنگن اتار کر اسے دے دیا۔'' لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ ''وہ کنگن مجھے اپنی زندگی سے پیارا تھا۔ ہاں ہارون میں نے تم سے دل و جان سے محبت کی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں پل پل تمہیں یاد کرتی رہی ہوں۔''

مجھے اس کی ہر بات کا یقین ہونے لگا۔ اس کے لہجے کی صداقت اس بات کی غماز تھی۔ وہ جو کہہ رہی ہے۔ سب سچ ہے۔ ''ہارون! تمہیں وہ رات یاد ہے نا؟ جب ہم رانا ہاؤس میں ایک ساتھ تھے۔''

اس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں یاد ہے۔'' میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔ میرا سر شرم سے جھک گیا۔ وہ اسی رات کا ذکر کر رہی تھی۔ جب میں گناہ کی دلدل میں اترنے لگا تھا۔ میری ہر کوشش ناکام گئی۔

''میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتی۔ بس ایک بات یاد دلانا چاہتی ہوں۔ جب تم اس صبح اٹھے۔ تم نے سمجھا کہ میں سو رہی ہوں۔''

میرا دل زور سے دھڑکا۔ وہ منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جب وہ سو رہی تھی۔

''یاد ہے نا۔ تم نے میری پیشانی پر محبت کی مہر ثبت کی تھی۔''

میں اس کے بچوں جیسے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''عورت اپنی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کو ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔ لیکن میں نے دوسرے کو یاد رکھا ہے۔ وہ دوسرے تم ہو۔''

''مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے یاد رکھا۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں بھی تمہیں بھول نہیں پایا۔''

وہ مسکرائی۔ ''ہاں اب جان گئی ہوں۔''

''اچھا پھر الطاف اور راج کماری کا کیا ہوا؟''

میں نے تجسس سے مجبور ہو کر استفسار کیا۔ ''وہ چلے گئے۔ میں سرتاپا آگ میں جھلسنے لگی۔ اس رات میں نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ اس کے لیے الطاف کو خوش بھی رکھا۔ اس دوران پاکستان میں کچھ کاروباری و قانونی مسائل درپیش آگئے۔ اس نے پاکستان والا سارا کاروبار میرے نام کر دیا۔'' اس نے گہری سانس لی، پھر بولی۔ ''میں بہانے بہانے سے اس سے رقم اینٹھنے لگی۔ چھ ماہ میں کافی رقم اکٹھی کر لی۔ پھر مجھے پاکستان آنا پڑا۔''

''اچھا پھر۔'' میں متجسس ہوا۔

''جس رات میری فلائٹ تھی۔ اسی رات راج کماری اور الطاف کا مطرح کارنیش جانے کا پروگرام بن گیا۔ فلائٹ رات بارہ بجے کی تھی۔ وہ دونوں نو بجے گھر سے نکل گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے چلی گئی۔ وہ دونوں جیٹی کی دیوار پر کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھے تھے۔ ان کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے اپنا کام کیا۔ پھر ائیرپورٹ آ گئی۔ وہاں سے بارہ بجے والی فلائٹ سے پاکستان۔ یہاں آ کر میں اپنے کچھ جاننے والوں سے ملی۔ ان دونوں کی لاشیں بھی موصول کیں۔ قانون کے سامنے خود کو زندہ ثابت کیا۔ رانا ہاؤس چھوڑ کر یہاں آ گئی۔ کیونکہ میں کسی سے رابطہ یا واسطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اب رانا کی بیوہ بن چکی ہوں۔ اس کی ساری جائداد کی مالک ہوں۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔''

''کیا؟'' حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔

''ہاں ان دونوں کو میں نے دھکا دیا تھا۔''

سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے سورج کی روشنی چھن چھن کر اندر آنے لگی۔ بہت اداس منظر تھا۔ سورج کی روشنی شائلہ کے چہرے پر پڑنے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ حقیقت ہے عورت کو صرف محبت سے تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ باغی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بغاوت اس کی سرشت میں شامل ہے۔

پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔

# بے رحم

جناب ایڈیٹر
السلام علیکم
میں ایک بڑے اخبار کا رپورٹر ہوں، رپورٹنگ کے سلسلے میں ادھر اُدھر جانا پڑتا ہے، بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے اسی سلسلے میں میری ملاقات خلیل صاحب سے ہوئی انہوں نے جو کچھ بتایا یہ ایک اچھے فیچر کے لیے مناسب تھا لیکن عرصے سے دلی تمنا رہی ہے کہ میں سرگزشت کے لیے لکھوں اس لیے یہ سچ بیانی آپ کو بھیج رہا ہوں- ویسے یہ بتا دوں کہ اس کے تمام کرداروں کے نام میں نے بدل دیئے ہیں اس لیے کہ خلیل صاحب اپنے اصلی نام سے پورے پاکستان میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

غیاض چانڈیو
(کراچی)



وہ ایک اولڈ ہوم تھا۔ جہاں مجھے جانا تھا۔ عام طور پر اولڈ ہوم کا جو تصور ہوتا ہے وہ کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ ایک خستہ عمارت۔ جس کے در و دیوار سے محرومیاں جھلکتی ہیں۔ لیکن میں جس اولڈ ہوم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ماڈرن بنگلے کی طرح تھا۔ دروازے کے باہر کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں تازہ پھول تھے۔ دیکھ کر شگفتگی کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے وہاں میرے میگزین کے ایڈیٹر نے فیچر تیار کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے مجھے بلا کر کہا تھا۔ ''فیاض صاحب۔ پلیز

آپ دارالسکون چلے جائیں۔ میں جانتا ہوں کہ جتنا اچھا فیچر آپ تیار کر سکتے ہیں۔ دوسرا نہیں کر سکتا۔''
''وہ تو ٹھیک ہے سر۔ لیکن اب میں ایسی جگہ جانے سے کترانے لگا ہوں۔ دل خراب ہو جاتا ہے۔ کیسی کیسی درد ناک کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔''
''لیکن یہ اولڈ ہوم ذرا مختلف ہے۔'' ایڈیٹر نے کہا۔ ''آپ جا کر تو دیکھیں۔ میں ایک بار گیا تھا۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں۔ تو چلا جاؤں گا۔''

اس طرح میں دارلسکون کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ویسے پہلا ہی تاثر بہت اچھا تھا۔ دروازے پر گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ میں نے وہ گھنٹی دبا دی۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ کھل گیا۔ ایک باوردی چوکیدار کھڑا تھا جس نے بہت ادب سے سلام کیا تھا۔

''مجھے امتیاز صاحب سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔ امتیاز وہاں کا انچارج تھا۔ ایڈیٹر نے مجھے اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔
''آئیں۔ اندر آجائیں۔''
اس نے مجھے ایک انتظار گاہ میں بٹھا دیا تھا۔ اس کا تاثر بھی بہت خوش گوار تھا۔ صاف ستھرا فرنیچر۔ جدید انداز کی میزیں۔ دیواروں پر پینٹنگز اور پھولوں کے گملے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی فور اسٹار ہوٹل کا ویٹنگ روم ہو۔ اتنی صفائی کا تصور کسی اولڈ ہوم میں تو نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک میز پر تازہ اخبارات اور میگزین بھی پڑے ہوئے تھے۔ ان ہی میں ہمارا میگزین بھی تھا۔
میں وہاں بیٹھ کر وقت گزارنے کے لیے ایک اخبار دیکھنے لگا۔ پانچ منٹ کے بعد امتیاز کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اسمارٹ سا آدمی تھا۔ خوش لباس بھی تھا۔ اس کو بھی دیکھ کر اچھا لگا تھا۔ میں نے جب اپنا تعارف کروایا تو لہک اٹھا۔ ''ارے جناب۔ میں تو آپ کو پڑھتا رہتا ہوں۔ بہت اچھا لکھتے ہیں آپ۔''
''امتیاز صاحب۔ میں تو آپ کے اس ادارے کو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ اور خوش بھی ہوں۔''
''بہت بہت شکریہ'' اس نے کہا۔ ''چلیں پہلے ادارے کو دیکھ لیں۔ پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔''
میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس عمارت میں بارہ کمرے تھے۔ اوپر نیچے۔ اور ہر کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ہر کمرا قالین سے مزین۔ ایک چھوٹا سا فریج۔ کچھ کمروں میں اے سی بھی تھے۔ ایک بار پھر ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی ہوٹل کی سیر کر رہا ہوں۔ وہاں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ اولڈ ہوم صرف خواتین کے لیے تھا۔ بوڑھی عورتیں۔ ہر طرف وہی نظر آرہی تھیں۔
ایک ریکریشن ہال بھی تھا۔ اس میں ایک لائبریری تھی۔ ایک طرف شطرنج کھیلنے کا انتظام تھا۔ ایک بڑا سا ٹی وی تھا۔ ایک کاؤنٹر بھی تھا۔ جس کو چائے وغیرہ کی خواہش ہوتی اس کو وہیں پر چائے مل جاتی۔ ایک ڈائننگ روم تھا۔ بہت کچھ تھا۔ اس اولڈ ہوم میں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ڈاکٹرز کا ایک پینل ہر وقت مہیا تھا۔ دوائیں بھی تھیں۔
میں یہ سب دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہو چکا تھا۔ ایسا میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں رہنے والیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ سب بہت خوش اور مطمئن دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر ہم امتیاز کے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ اتنی دیر میں ہمارے لیے چائے اور بسکٹ وغیرہ آگئے تھے۔
''کیوں جناب کیسا لگا ہمارا سیٹ اپ'' اس نے پوچھا۔
''سچ تو یہ ہے کہ میں بہت متاثر ہوا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اتنے شاندار اولڈ ہوم کے چارجز بھی تو زیادہ ہوتے ہوں گے۔''
''نہیں جناب۔ ایک پیسا بھی نہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اگر پیسے ہی لے لیے تو پھر بات کیا بنی۔''
''تو پھر اس کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں؟''
''یہ بتانے والی بات نہیں ہے۔'' اس نے کہا ''کیوں کہ مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں کسی کو نہ بتاؤں''
''پھر بھی کچھ اندازہ تو ہو۔ میرے خیال کے مطابق اس کے اخراجات لاکھوں میں ہوں گے۔''
''جی ہاں۔'' اس نے بتایا۔ ''اس میں ڈاکٹرز کی فیسیں۔ ہمارے یہاں جس قسم کے کھانے دیے جاتے ہیں وہ اچھے اچھے ہوٹلز میں نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ اسٹاف کی مہنگی تنخواہیں۔''
''تو پھر ڈونیشن ہوتا ہوگا؟'' میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔
''جی نہیں ڈونیشن بھی نہیں۔ یہ سب صرف ایک صاحب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وہی ان کے اخراجات

پورے کرتے ہیں۔''
''کمال ہے صرف ایک آدمی۔ ان کا نام تو بتادیں۔''
''یہی تو پرابلم ہے کہ انہوں نے اپنا نام ظاہر کرنے سے منع کیا ہے۔ لیکن آپ کے لیے ان سے بات کروں گا۔ دیکھتا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔''
''دیکھیں میرا فیچر بھی اسی وقت مکمل ہوگا جب میں ان سے بات کروں گا۔ اس دور میں ایسے لوگ ملتے کہاں ہیں۔ خدا نے بہت سوں کو بہت کچھ دے رکھا ہے۔ لیکن دل کی وسعت بہت کم کے پاس ہے۔''
''یہ تو ہے۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔ بلکہ ممکن ہو تو ان سے ملاقات بھی کروادوں گا۔''
''جی ہاں۔ یہ تو بہت ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔
''آپ کل فون کریں۔ اگر انہوں نے رضامندی ظاہر کردی تو کل ہی ملاقات ہوجائے گی۔''
''اب تو ان کا نام بتادیں۔''
''آپ واقعی ضدی آدمی ہیں فیاض صاحب۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''چلیں ان کا نام سن لیں۔ ان کا نام ہے خلیل عمران۔''

''خلیل عمران۔ آپ ان کی بات تو نہیں کررہے جن کی سون لائٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''جی ہاں وہی۔''
''وہ تو واقعی پیسے والے آدمی ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اتنے بڑے دل کے مالک بھی ہیں۔ چلیں اب تو ان سے ملنے کا شوق اور زیادہ ہوگیا ہے۔''
میں نے جب ایڈیٹر کو بتایا تو وہ بھی اچھل پڑا۔ ''یہ بات ہوئی نا۔ میں بھی بہت دنوں سے اسی سوچ میں تھا کہ آخر اتنے شاندار اولڈ ہوم کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہوں گے۔ فیاض صاحب۔ آپ پہلی فرصت میں خلیل صاحب سے جا کر ملیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بہت کم ہیں۔''
''جی ہاں۔ بہت کم ہیں۔ اگر کوئی اس قسم کی نیکیاں کرتا بھی ہے تو اس کا مقصد ہوتا ہے کہ اس کو شہرت مل جائے۔ چھپا کر کام کرنے والے لوگ انگلیوں پر ہوں گے۔''

میں تو بے تاب ہورہا تھا۔ دوسری شام کو خود امتیاز کا فون آگیا۔ ''فیاض صاحب۔ خلیل صاحب نے کل کا وقت دیا ہے۔ آپ گیارہ بجے تک میرے پاس آجائیں۔''

## تھکاوٹ اور علاج بالغذاء

☆ متوازن غذا کا استعمال ضروری ہے اس لیے کہ کسی ایک بھی غذائی جزو کی کمی جسم کی مستعدی پر منفی اثر ڈالتی ہے۔ مثال کے طور پر وٹامن بی کی کمی کا براہ راست تعلق ایڈرینالین کی کمزوری سے ہے۔ تمام بی کمپلیکس وٹامنز اعصاب کی حفاظت کرتے اور غدود کی کارکردگی بہتر بناتے ہیں۔

☆ سبز پتوں والی سبزیاں، دودھ، مغزیات، بادام، اخروٹ، مونگ پھلی، کیلا، خمیر، ولیس، اور مٹر وٹامن بی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ معدنیات بھی تھکاوٹ پر قابو پانے میں مدد دیتے ہیں۔ پوٹاشیم اس سلسلے میں خاص طور پر مفید ہے۔ یہ بھی سبزیوں میں وافر مقدار میں ہوتا ہے۔

☆ کیلشیم بے خوابی اور تناؤ دونوں کو کم کرتا ہے۔ گاجر، کھیرا اور چقندر تھکن پر قابو پانے میں مفید ہیں۔ پنیر اور دہی بھی ایسی غذائیں ہیں جو غذا کے انہضام کو بڑھاتی ہیں۔ ان میں شامل غذائی اجزاء سے عضلات کو تقویت ملتی ہے۔

☆ اناج، گندم، باجرہ، جو کا آٹا اور دلیہ طاقت بخش غذائیں ہیں۔ جو کے دلیہ کا ناشتا دن بھر توانائی فراہم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر آپ ناشتے میں پراٹھا کھانے کے عادی ہیں تو اس میں چھان ملالیں تاکہ آپ کا معدہ اور انتڑیاں صاف رہیں اور جسم میں خون بھی پیدا ہو۔

☆ جو لوگ دن کے بڑے (تین) کھانوں کے دوران اسنیکس لیتے رہتے ہیں وہ تھکاوٹ اور اعصابی کمزوری کا شکار کم ہوتے ہیں۔ یہ چاکلیٹ، چپس، نمکو، بسکٹوں کی بجائے تازہ یا خشک پھلوں اور سلاد پر مشتمل ہوں تو بہتر ہے۔

☆ تھکن کے شکار افراد اپنی خوراک میں پالک، میتھی اور سرسوں ضرور شامل کریں کیونکہ یہ فولاد سے بھرپور ہوتے ہیں۔

☆ وٹامن بی، سوڈیم اور زنک بھی تھکاوٹ کے علاج میں مفید ہیں۔ کھیرا، سلاد کے پتے اور سیب سوڈیم کے جب کہ پھلیاں، سالم اناج اور کدو کے بیج زنک اور وٹامن بی کے بہترین ذرائع ہیں۔

☆ روزانہ کھجور کھانے سے تھکاوٹ دور ہوتی ہے کیونکہ یہ غذائیت سے بھرپور ایک قدرتی کیپسول ہے جو بیک وقت ملٹی وٹامن بھی ہے اور ملٹی منرل بھی۔

☆ کولا مشروبات ترک کردیں اور پانی زیادہ پئیں۔

مرسلہ: ڈاکٹر عمیر ارشد باجوہ۔ فیصل آباد یونیورسٹی

''ارے صاحب۔ سر کے بل حاضر ہو رہا ہوں۔''

میں دوسرے دن وقت سے پہلے ہی امتیاز کے پاس پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد ہم مون لائٹ ہاؤس میں تھے۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی۔ اس کی کئی منزلیں تھیں اور ہر منزل پر دفاتر بنے ہوئے تھے۔ یہ دفاتر خلیل عمران ہی کے تھے۔ اس کی نہ جانے کتنی کمپنیاں تھیں۔ ایک بہت بڑا ڈیری فارم تھا۔ جس کے مکھن اور پنیر کی پروڈکٹس بہت معیاری تھیں۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ خلیل نے ہمیں اپنے کمرے میں بلالیا تھا۔

خلیل ایک متاثر کن شخصیت تھا۔ باوقار اور مہذب۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ پھر اس نے امتیاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''امتیاز صاحب۔ بالآخر آپ نے میرا نام لے ہی دیا۔''

''ارے نہیں خلیل صاحب۔ فیاض صاحب نے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ میں کچھ نہیں کر سکا۔''

''چلیں جو فیاض صاحب کی مرضی۔''

پھر اس نے چائے منگوائی۔ اس دوران ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے خلیل سے پہلا سوال کیا۔ ''خلیل صاحب۔ پہلے تو یہ بتائیں کہ آپ کے اولڈ ہوم میں صرف خواتین کیوں ہیں۔ آپ نے مردوں کی طرف کیوں توجہ نہیں دی؟''

''اس لیے کہ مجھ پر ایک خاتون ہی کا قرض تھا۔ جس کو میں ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

اس کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اسی دوران امتیاز کا فون آگیا۔ اسے کسی کام سے جانا تھا۔ وہ ہم سے اجازت لے کر چلا گیا۔

''خلیل صاحب۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔ ''کس خاتون کا قرض ہے۔ جس کو ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''فیاض صاحب۔ یہ ایک پرانی کہانی ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیا آپ کے پاس اتنا وقت ہے کہ آپ سب سن سکیں؟''

''کیوں نہیں جناب۔ میں حاضر ہی اسی لیے ہوا ہوں۔ میرے لیے تو یہ اچھا ہوگا کہ میں ایک بھرپور کہانی لے کر جاؤں۔'' میں نے کہا۔

اس طرح میں نے وہ کہانی سنی۔ یہ ایک عجیب کہانی ہے۔ انسانی قربانی اور انسانی خود غرضی کی کہانی۔ اس میں بے شمار نشیب و فراز ہیں۔ اس کہانی میں انسان کی عظمت پر فخر بھی ہونے لگتا ہے اور اس سے نفرت بھی ہونے لگتی ہے۔ لیکن یہ کہانی ایک نشست میں مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے لیے مجھے کئی چکر لگانے پڑے تھے۔

میں نے اس کہانی کو اس انداز سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے کسی ناول یا افسانے کو تحریر کیا جاتا ہے۔

☆......☆

بچہ رو رہا تھا۔

وہ شاید بہت دیر سے رو رہا تھا۔ اسی لیے اس کی آواز اب بیٹھنے لگی تھی۔

وہ ایک چھوٹا سا علاقہ تھا، جمال پور۔ اس کی آبادی زیادہ سے زیادہ بیس پچیس ہزار نفوس کی ہوگی۔ ایک بازار تھا۔ اس کے علاوہ ایک اسکول اور دو مسجدیں تھیں۔ گھر بھی چھوٹے چھوٹے تھے جن کی دیواریں زیادہ بلند نہیں تھیں۔ اسی لیے بچے کے مسلسل رونے کی آواز آس پڑوس تک جا رہی تھی۔ اس بچے کے گھر کے برابر میں زینت رہتی تھی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کے شوہر کا پچھلے سال انتقال ہوا تھا۔ اس کی شادی کو صرف تین ہی سال ہوئے تھے۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔

بچے کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ ''اری اختری دیکھ تو سہی۔ منا کیوں رو رہا ہے؟''

صحن کی چارپائی پر اختری لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن بالکل بے حس و حرکت۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ زینت نے قریب جا کر دیکھا۔ پہلی نظر میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اختری مر چکی ہے۔ اور چارپائی پر وہ نہیں بلکہ اس کی لاش ہے۔

زینت نے یہ سب دیکھ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ زینت نے اس بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا تھا۔ اسی وقت اس کے لیے دودھ کا بندوبست کر دیا گیا۔ علاقے کے حکیم صاحب کو بھی بلا لیا گیا۔ جنہوں نے اصغری کی موت کی تصدیق کر دی۔ اس کا انتقال ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے ہوا تھا۔ رات کے کسی وقت اس پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ بے چاری تڑپتی ہوئی مر گئی۔ جبکہ اس کا شوہر اپنے کام کے سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا۔

اسی دن اس کو بھی خبر کر دی گئی تھی۔ لیکن لاش کی تدفین کر دی گئی۔

اب ایک بہت بڑا سوال یہ تھا کہ اس بچے کا کیا کیا جائے۔ دونوں میاں بیوی کا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔ بچے کو کہیں پھینک بھی نہیں سکتے تھے۔ انسان کی اولاد تھا۔ لہٰذا زینت ہی نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔

حالانکہ زینت کے لیے یہ بہت بڑا فیصلہ تھا۔ اس کی گزر چھوٹے موٹے کام کر کے ہوا کرتی تھی۔ شوہر تھا نہیں۔ کوئی اور ذریعہ آمدن بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس اللہ کی بندی نے ہمت کی اور بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

''بچے کا باپ چار دنوں کے بعد آیا تھا۔ وہ بھی رو دھو کر واپس چلا گیا۔ بچے کے لیے اس نے کہا تھا کہ اس کو زینت ہی رکھ لے۔ وہ اس کا خرچ بھیج دیا کرے گا۔ وہ صرف دو تین مہینوں تک پیسے بھیجتا رہا۔ اس کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔ وہ بھول ہی گیا کہ اس کا کوئی بیٹا بھی تھا۔ زینت ہی اس کو پالتی رہی۔''

''خلیل صاحب۔ اس عورت نے تو بہت بڑی قربانی دی۔'' میں نے کہا۔

''جی جناب۔ ایسی مثالیں کم ہوا کرتی ہیں۔ بہر حال اسی سے اندازہ لگا لیں کہ وہ جب کام پر جاتی تو بچے کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ اس کو ایک طرف بٹھا کر خود اپنا کام کیا کرتی اور جب وہ بچہ رونے لگتا تو فوراً اس کو دودھ پلا دیتی۔ یا اس کی دوسری ضروریات کا خیال رکھتی۔ علاقے کے لوگ اس کو سراہا کرتے تھے۔ لیکن صرف زبانی۔ کسی نے اس کا ساتھ دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بے چاری اکیلی ہی اس بچے کا بوجھ اٹھاتی رہی۔ اس نے اس بچے کو ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔ کیوں کہ باپ تو شہر گیا تو پھر چلا ہی گیا۔ اس نے مڑ کر بھی نہیں پوچھا کہ اس کا بیٹا کس حال میں ہے۔ وہ مر گیا یا زندہ ہے۔''

''خلیل صاحب۔ کیا ایسے بے رحم لوگوں کے لیے حکومت کے پاس کوئی قانون نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بدقسمتی سے اسے ایک سماجی مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے حکومت اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لیا کرتی۔ ارباب اختیار کے پاس اور بھی بہت سے کام ہیں، انہیں بیرونِ ملک کے دورے کرنے ہوتے ہیں۔ سیاست کے توڑ جوڑ کرنے ہوتے ہیں۔ اپنی حکومت بچانی ہوتی ہے۔ وہ کہاں ان چکروں میں پڑیں گے۔''

''خلیل صاحب۔ اس بچے کا نام کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت تک اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ اس کی ماں اسے منا کہا کرتی تھی۔ اسی لیے زینت بھی اسے منا کہنے لگی تھی۔ بہر حال وقت گزرتا گیا۔ منا بڑا ہوتا گیا۔ وہ کام پر ماں کے ساتھ جانے لگا تھا۔ اس محلے میں ایک مدرسہ تھا۔ منے کو اس مدرسے میں داخل کرا دیا گیا۔ اب زینت کے لیے یہ آسانی ہو گئی تھی کہ وہ اپنے کام پر آسانی سے آ جا سکتی تھی۔ کیوں کہ منا تو مدرسے میں ہوتا تھا۔ مدرسے کے مولوی بتایا کرتے تھے کہ منا بہت ذہین ہے۔ بہت جلدی سبق یاد کر لیتا ہے۔ اس پر خاص دھیان دیا جائے۔ بے چاری زینت کے بس میں جو کچھ بھی تھا وہ کر رہی تھی۔ منا مدرسے سے فارغ ہو گیا تو اس کی باقاعدہ پڑھائی شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں بھی انہی مولوی صاحب نے مدد کی۔ انہوں نے اس کا داخلہ سرکاری اسکول میں کروا دیا۔ وہاں بھی منا کی پروگریس بہت اچھی رہی۔ میں یہ سب شارٹ کر کے بتا رہا ہوں۔ کیوں کہ اصل کہانی تو آگے آئے گی۔''

''جی خلیل صاحب۔ سمجھ رہا ہوں میں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کا انداز بیان ایسا ہے کہ پوری تصویر نگاہوں کے سامنے کھنچی جا رہی ہے۔''

''بیٹا! جلدی اٹھو اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہیں اسکول جانا ہے۔'' ماں نے بیٹے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''امی! میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ مجھے اسکول سے نفرت ہے، بچے بھی مجھے پسند نہیں کرتے، سب استاد مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور اسکول کا تمام اسٹاف بھی مجھے ناپسند کرتا ہے۔''

''مگر تمہیں اسکول جانا ہوگا۔ تم اب بچے نہیں ہو۔ پچاس سال کے آدمی ہو اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو۔'' ماں بولی۔

......

ٹریفک کے سپاہی نے سڑک پر ایک چھوٹی سی کار دیکھی جو چلتے ہوئے بار بار اچھل رہی تھی۔ سپاہی نے حیران ہو کر کار روکی۔ اسے ایک موٹا آدمی چلا رہا تھا۔ سپاہی نے اس سے پوچھا۔ ''آپ کی کار میں کیا خرابی ہے؟''

''کار میں کوئی خرابی نہیں ہے۔'' موٹے آدمی نے جواب دیا۔

''پھر یہ بار بار اچھل کیوں رہی ہے؟'' سپاہی نے استفسار کیا۔

''وہ ہوا! اصل میں مجھے ہچکی لگی ہوئی ہے۔'' موٹے آدمی نے جواب دیا۔

مرسلہ: ناہید سلمان۔ کوٹ ادو

"اسکول سے خبریں آیا کرتیں کہ منا کی پڑھائی بہت اچھی جا رہی ہے۔ زینت کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوا کرتا۔ کیوں کہ اب اس کے لیے منا ہی سب کچھ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے منا کو جنم نہیں دیا تھا۔ لیکن اب وہی اس کی ماں تھی۔ وہ اس کا سرمایہ تھا۔ وہ اس کی ترقی کی خبریں سن سن کر خوش ہوا کرتی۔"

"بہرحال۔ سرکاری اسکول صرف آٹھویں تک تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ منا نے آٹھویں کا امتحان بہت نمایاں نمبروں سے پاس کیا تھا۔ آگے کی تعلیم کے لیے اسے قریبی شہر کے اسکول بھیجنا تھا۔ گاؤں کی کچھ عورتوں نے مشورہ بھی دیا کہ زینت اپنے آپ پر رحم کر۔ تو نے جتنا کرنا تھا وہ کرلیا۔ اب اس کو کسی کام پر لگا دے۔ کون سا تیرے پیٹ کا ہے کہ تو اس کے لیے مری جا رہی ہے۔ تو زینت کا جواب ہوا کرتا کہ چاہے منا میرے پیٹ کا ہو یا نہ ہو۔ لیکن اب وہ میری ذمے داری ہے۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"کمال کی عورت تھی خلیل صاحب" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ پھر یہ ہوا کہ منا کا داخلہ ایک بڑے اسکول میں ہوگیا۔ اس کی رہائش کا بندوبست ان ہی مولوی صاحب نے کر دیا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی بے آسرا ہو تو قدرت خود اس کا آسرا بن کر اس کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ زینت نے اخراجات پورے کرنے کے لیے دگنی محنت شروع کر دی۔ اب وہ رات کو بھی کام کرنے لگی۔"

"اس علاقے میں کام ہی کیا ہوتا ہوگا خلیل صاحب۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ کام تو کوئی خاص نہیں تھا۔ کیوں کہ گاؤں کی عورتیں خود ہی محنت کی عادی ہوتی ہیں۔ وہ اس کی مدد کے لیے اس سے چھوٹے موٹے کام لے لیا کرتیں۔ منا نے شہر کے اسکول میں بھی شاندار کارکردگی دکھائی اور ہوتے ہوتے وہ کالج تک پہنچ گیا۔ یہ ساری محنت اس عورت کی تھی۔ اس نے کسی اور کی اولاد کی پرورش کے سلسلے میں کمال کر دیا تھا۔ کالج میں اس نے اور بھی محنت کی۔ اب وہ خود بھی ٹیوشن کرنے لگا تھا۔ ایک ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لی۔ زینت نے اس کے اخراجات اس طرح ادا کیے کہ اس نے اپنے زیورات فروخت کر دیے۔ جو اس کے اچھے دنوں کی یادگار تھے۔ جب اس کا شوہر زندہ تھا۔ اس طرح منا کی مہنگی پڑھائی کا سلسلہ جاری رہا۔ ذہین تو تھا۔ اس نے کالج میں بھی پوزیشن حاصل کرلی۔ اب ٹیوشن سے بھی انکم ہونے لگی تھی۔ اسی دوران ایک اچھی جاب کی بھی آفر آگئی۔ اس نے وہ جاب کرلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چند مہینوں کے بعد اس نے زینت کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔ ہاں۔ ایک بات یہ ہوئی تھی کہ اسے پتا چل گیا تھا کہ زینت اس کی اصل ماں نہیں ہے۔ بلکہ اس نے اپنے سینے سے لگا کر اس کی پرورش کی ہے۔ وہ اس کے اس جذبے سے بہت متاثر تھا۔ اب دونوں شہر کے ایک فلیٹ میں رہنے لگے تھے۔ حالات بدل گئے تھے۔ منا ترقی کرتا جا رہا تھا۔ سب کچھ آ گیا تھا اس کے پاس۔ گاڑی بھی ہوگئی تھی۔ اس کی سیلری بھی اچھی خاصی تھی۔ بینک بیلنس بھی ہو چکا تھا۔"

"خلیل صاحب، زینت تو بہت خوش ہوگی۔" میں نے پوچھا۔ "کیوں کہ اس کا لگایا ہوا پودا پھل دینے لگا تھا۔"

"ہاں بہت زیادہ۔ ہمیشہ کی محرومیوں نے ایک راستہ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ زندگی بہت پُرسکون ہوگئی تھی۔ اسی دوران منا کو ایک لڑکی مل گئی۔ وہ ایک کروڑپتی باپ کی بیٹی تھی۔ وہ منا سے اتنی متاثر ہوئی کہ اسے احساس ہوگیا کہ اگر اس نوجوان کو چانس مل گیا تو یہ کاروبار کی دنیا میں بہت کامیاب ہوگا۔ اس نے اپنے باپ سے تذکرہ کیا۔ اس کے باپ نے منا سے ملاقات کی اور اسے اپنی فرم کا منیجر بنا دیا۔ یوں سمجھ لیں کہ منا کی ترقی کو پر لگ گئے تھے۔ زندگی اسے راستہ دیتی جا رہی تھی۔"

"خلیل صاحب۔ ان مولوی صاحب کا کیا ہوا جنہوں نے منا کی مدد کی تھی؟" میں نے پوچھا۔ ان جزئیات کو جاننا اس لیے ضروری تھا کہ میں ایک بھرپور کہانی لکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے درمیان میں سوالات بھی کرتا جاتا۔

"مولوی صاحب کا کچھ دنوں بعد انتقال ہوگیا تھا۔ منا کی زندگی پر ان کا بھی احسان تھا۔ اب تو یہ ہوا کہ منا کچھ کا کچھ ہوگیا۔ وہ بچہ جس کو اس کی ماں روتا چھوڑ کر انتقال کر چکی تھی۔ جس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ جس نے انتہائی غربت میں آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک اور ٹرننگ پوائنٹ اس وقت آیا جب اسی لڑکی سے اس کی شادی ہوگئی۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس نے کتنی ترقی کرلی ہوگی۔ اب کیا نہیں تھا اس کے پاس۔ وہ لڑکی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ باپ کی موت ہارٹ فیل سے ہوئی۔ اور وہ سب کچھ منا کے پاس آ گیا۔ اب وہ بزنس

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی...... ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرربار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہربار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک و خون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جا رہا تھا پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

کے صفحات پر ملاحظہ کریں

ثانی کون تھا۔ اس نے ایک شاندار گھر بنوا لیا تھا۔ لیکن پھر یہاں سے زندگی نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ اس نے اپنی بیوی کو بھی اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے بتا دیا تھا کہ وہ جس کے ساتھ رہتا ہے وہ اس کی ماں نہیں ہے بلکہ اس نے منا کی پرورش کی ہے۔ اس لڑکی کو ایک راستہ مل گیا۔ اس نے منا سے کہا کہ وہ اس عورت کو الگ رکھے۔ اس کو خرچ دیتا رہے۔ ساتھ نہ رکھے۔ اس وقت تک منا بہت بدل چکا تھا۔ دولت نے اس کے دل کو سخت کر دیا تھا۔ اس نے اس عورت سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس کو ساتھ نہیں رکھ سکتا۔''

''خلیل صاحب۔ یہ تو خود غرضی کی انتہا تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ انتہا ہی تھی۔'' خلیل کے لہجے میں دکھ تھا۔

''اس عورت نے اس سے کہا کہ دیکھ بیٹا۔ یہ ٹھیک ہے کہ تو میرے پیٹ کا نہیں ہے۔ لیکن میں نے تجھے ایک سگی ماں سے زیادہ محبت دی ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تجھے دیکھتی رہوں۔ تجھے یاد ہوگا کہ جب تو لڑکا تھا اور گاؤں میں کھیل کر دیر سے گھر واپس آتا تھا تو میں تیرے انتظار میں دروازے پر کھڑی رہتی تھی۔ میری زندگی تجھ سے تھی۔ اور آج بھی ہے۔ تو اپنے بڑے مکان میں میرے لیے ایک کوٹھڑی بنوا دے۔ میں اس میں زندگی گزار لوں گی۔ میرے لیے یہی بہت ہوگا کہ تو نگاہوں کے سامنے ہے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔ لیکن منا تو پوری طرح بیوی کے ٹرانس میں تھا۔ اس نے اس عورت کو خود سے الگ کر دیا۔ وہ بے چاری یہ دکھ برداشت نہیں کر سکی۔ اور الگ ہونے کے دو مہینے بعد ہی مر گئی۔''

خلیل اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا صلہ ملا اسے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے منا کو جنم نہیں دیا تھا۔ لیکن وہ ماں ہی تھی۔

''کیا اس کے بعد بھی کچھ سننا چاہتے ہیں فیاض صاحب۔'' خلیل صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ میں یہ سننا چاہتا ہوں کہ اس کہانی میں آپ کہاں فٹ ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''فیاض صاحب۔ بدقسمتی سے میں ہی اس کہانی کا مرکزی کردار ہوں۔'' خلیل نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ منا میں ہی ہوں۔''

''کیا؟'' مجھے یہ سن کر بہت عجیب سا لگا تھا۔ ''خلیل صاحب آپ؟''

''ہاں۔ میں۔ میں نے اپنا نام شادی کے بعد خلیل رکھ لیا تھا۔ لیکن افسوس میں اپنی ماں کا بھی خلیل نہیں بن سکا۔ میں نے مار دیا اس کو۔ بظاہر اس کی موت اچانک ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ جس طرح میری وہ ماں مری تھی۔ جس نے مجھے جنم دیا تھا۔ اور اس کے پہلو میں ایک بچہ رو رہا تھا۔ لیکن اس بچے کو سہارا دینے والی ایک عورت آ گئی تھی۔ اب اس عورت کا انتقال ہوا تو اس کو سہارا دینے والا بچہ اس کو بھول چکا تھا۔ اس کی موت ہارٹ فیل سے نہیں ہوئی تھی فیاض صاحب۔ وہ تو ایک بہانہ تھا۔ اس کو تو میری بے وفائی اور بے رحمی نے مار دیا تھا۔ میں بہت بے رحم انسان ہوں فیاض صاحب۔ بہت بے رحم۔ اور اب تلافی کرتا پھر رہا ہوں۔ اولڈ ہوم اسی لیے قائم کیا ہے کہ اس میں ایسی عورتوں کو پناہ دی جائے جو بے سہارا ہو چکی ہوں۔ جن کا کوئی نہ ہو۔ کم از کم کسی ایک عورت کو بھی اگر میں اس کے بیٹے کا پیار دے سکا تو یہ سمجھوں گا کہ میں نے اس عورت کا حق ادا کر دیا ہے۔''

''خلیل صاحب۔ کیا آپ اس عورت کا حق ادا کر سکیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کبھی نہیں۔ یہ بات جانتا ہوں میں۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے مجھے اب تک معاف بھی کر دیا ہوگا۔ میری ماں میری .... طرح بے رحم نہیں تھی فیاض صاحب۔ وہ بے رحم نہیں تھی۔ نہیں تھی۔ ورنہ وہ ایک روتے ہوئے بچے کو کیوں اٹھا کر لے جاتی۔ اس سے بچے کا رونا دیکھا نہیں گیا تھا۔ میں اس وقت بھی رو رہا ہوں فیاض صاحب۔ اور اس کی روح کو میرا رونا برداشت نہیں ہو رہا ہوگا۔ اس نے مجھے معاف کر دیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے۔''

خلیل کے آنسو بہنے لگے تھے۔ کمرے کی فضا بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ مجھ سے اب وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ میں باہر آ گیا۔

کسی نے کہا تھا کہ اس دنیا میں جتنے لوگ ہیں۔ اتنی کہانیاں ہیں۔ کچھ کہانیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ اور کچھ صرف محسوس کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ کہانی بھی دل کی آنکھوں سے پڑھنے کے لیے ہے۔

وہ اولڈ ہوم اب تک قائم ہے لیکن میرا پھر اس طرف جانا نہیں ہوا۔

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

# میری اجالا

محترم مدیر
السلام علیکم
کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ میں فہد اور اس کے گھر والوں کی روداد قلم بند کروں لیکن درمیان کے کچھ واقعات کا پتا نہ تھا، جب تمام واقعات یکجا ہو گئے تو انہیں کہانی کے انداز میں لکھ لیا ہے۔
حسیب اشرف
(سیالکوٹ)

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر فہد پر پڑی جو ابھی تک نیند کی وادی میں گم تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو سورج کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔ سورج کی کرنوں سے فہد کو اپنے چہرے پر تپش محسوس ہوئی تو اس نے اپنا چہرہ کمبل کے پیچھے چھپالیا۔

''فہد اٹھو کب تک سوتے رہو گے۔'' ماہم نے کمبل سرکاتے ہوئے کہا۔

''کیا یار ماہم تم بھی کسی چڑیل کی طرح ناک میں دم

کرنے کے لیے آجاتی ہو۔" اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"اگر میں چڑیل ہوں تو چڑیل کا شوہر کیا ہوا؟" اس نے شوخ نظروں سے فہد کو دیکھا۔

"جن!" اس نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

"عینک والا جن....." اس نے چشمہ فہد کی طرف پھینکا اور زور سے قہقہہ لگایا۔

"اچھا یار جاؤ اور مجھے آرام سے سونے دو۔" اس نے عینک سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور پھر سے کمبل اوڑھ لیا۔

"فہد پلیز اٹھ جاؤ تمھیں پتا ہے آج دس مارچ ہے؟"

"ہاں یار پتا ہے آج دس مارچ ہے، اتوار ہے اور چھٹی کا دن ہے۔" اس نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"آج اجالا کی سالگرہ بھی ہے یہ بھی یاد ہے کہ نہیں۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اوہ شٹ میں تو بھول ہی گیا تھا۔" یہ سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"ابھی یاد آگیا نا اس لیے جلدی سے اٹھو ہمیں بہت ساری تیاریاں کرنی ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم ناشتا تیار کرو میں پانچ منٹ میں آیا پھر مل کر اجالا کی سالگرہ کی پارٹی کی تیاری کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں جارہی ہوں جلدی سے نیچے آجاؤ۔" اس نے حکم دینے کے سے انداز میں کہا۔

"یس باس۔" فہد نے بھی فرمانبردار خادم کی طرح سر جھکا دیا۔

☆......☆

آج گھر کو خوب سجایا گیا تھا ایک شاندار کیک بھی ٹیبل پر رکھا ہوا تھا لیکن کیک کاٹنے والی کا کوئی پتا نہیں تھا۔

"فہد آج پورے پانچ سال ہوگئے، ہم ہر سال اس دن اپنے گھر کو سجاتے ہیں، کیک بھی لاتے ہیں اور پھر خود ہی اس کیک کو کاٹتے اور خود ہی کھاتے ہیں، اگر کوئی ہماری یہ حالت دیکھے تو ہمیں پاگل سمجھے گا۔"

"اور کون ہے ہمارا جسے انوائیٹ کریں۔"

"کتنی عجیب بات ہے نا ایک میں ہوں جس کا اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں اور ایک تم ہو جو اتنا بڑا خاندان ہوتے ہوئے بھی بالکل تنہا زندگی گزار رہے ہو۔" اس نے سوالیہ نگاہوں سے فہد کو دیکھا۔

"تنہا کہاں ہوں تم ہو نا میرے ساتھ۔" اس نے بات کو گول کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن وہ بھی تو نہیں ہے جس کے لیے یہ پارٹی ہے۔"

"تو کیا کروں یار..... تم تو جانتی ہو میں اس کی سالگرہ میں شرکت نہیں کرسکتا اسی لیے خود ہی اس کی سالگرہ منا کر اپنا دل ہلکا کرلیتا ہوں۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"جب سے ہماری شادی ہوئی ہے تب سے تم ایک بار بھی اپنے گھر والوں سے ملے ہو اور نہ ہی وہ تم سے ملنے آئے ہیں۔ انسان کی زندگی میں خاندان کی بہت اہمیت ہوتی ہے اور تم خوش قسمت ہو کہ تمہارا خاندان ہے اس لیے جاؤ اور جا کر ملو اپنے خاندان والوں سے، اجالا سے جس کے بغیر تم گھٹ گھٹ کے زندگی گزار رہے ہو۔"

"بس یار ہے کوئی مجبوری جس کی وجہ سے....."

"فہد میں زندگی کے اس سفر میں تمہاری ہم سفر ہوں کیا تم اپنی یہ مجبوری مجھے بھی نہیں بتاؤ گے۔" اس نے فہد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گی جان کر؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ماہم کی طرف دیکھا۔

"تمہاری واپسی کا کوئی چارہ کروں گی۔"

"میں جن راستوں سے ہو کر یہاں آیا ہوں اب واپسی ممکن نہیں ہے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

"پانچ سال گزر گئے ہیں، فہد کیا تمھیں اپنے گھر والوں کی یاد نہیں آتی۔" اس نے ایک بار پھر سے اس کے دکھ کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔

"پانچ سال تو ہماری شادی کو ہوئے ہیں میں تو پچھلے آٹھ سال سے اپنے گھر والوں سے دور ہوں۔" اس نے ماہم کی بات درست کرتے ہوئے کہا۔ "اور رہی بات یاد کرنے کی تو یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ میں ان سب کو اور خاص طور پر اجالا کو کتنا یاد کرتا ہوں۔"

"اجالا تمہاری اکلوتی بہن ہے نا۔"

"ہاں..... کتنی ہی دعاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے بابا کو دو بیٹوں کے بعد ایک بیٹی سے نوازہ تھا۔ بابا کا ماننا تھا کہ یہ بیٹی ان کی زندگی میں نئی خوشیاں لے کر آئے گی اور غم کے اندھیروں کو دور کردے گی اس لیے انھوں نے اپنی بیٹی کا نام اجالا رکھا تھا۔ میں دس سال کا تھا اور ساحر سات سال کا۔ جب اجالا پیدا ہوئی تھی ہم دونوں بھائی اپنی پری سی بہن کو پا

کر بہت خوش تھے اور بابا کی توقعات بالکل درست ثابت ہوئیں کہ اجالا کے آتے ہی ان کی زندگی میں بہار آ گئی۔ کاروبار میں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ اجالا تو پہلے ہی سب کو پیاری تھی اب سب کی آنکھ کا تارہ بن گئی تھی۔''

''دیکھنے میں کیسی تھی وہ.....''

''بالکل پریوں جیسی...... بلکہ پریوں جیسی کیا پری ہی تو تھی وہ، معصوم سا چہرہ، نیلی آنکھیں، جس کی نظر اس پر پڑتی تو وہ بس اسے ہی دیکھتا رہ جاتا، اسکول سے واپسی کے بعد سارا دن اس کے ساتھ کھیلنے میں ہی نکل جاتا تھا۔ میں نے اپنے سارے کھلونے اجالا کو دے دیے تھے اور اسی بات پر ساحر مجھ سے جھگڑا کرتا تھا کہ اجالا کے آنے کے بعد اس کی قدر و قیمت کم ہو گئی ہے۔''

''کتنی بڑی تھی جب تم اسے چھوڑ کر آئے تھے۔''

''پورے دس سال کی تھی میری شہزادی جب آخری بار اسے دیکھا تھا۔ اب تو وہ مجھ سے بھی لمبی ہو گئی ہو گی۔ جب اسے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ میرے پاس ہی آتی تھی اور پیار سے میرے گلے میں اپنی بانہیں پھیلا دیتی اور اپنی کوئل سی آواز میں کہتی تھی کہ بھائی مجھے فلاں چیز چاہیے اور میں بھی اسی وقت اس کی وہ خواہش پوری کرنے نکل جاتا تھا۔''

''جب سب اتنے ہی خوش تھے اپنی زندگی میں تو پھر تم لوگ جدا کیسے ہو گئے۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے تمھیں سب کچھ چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔'' وہ آج ایک ایک راز جان لینا چاہتی تھی۔

''بابا کی ایک بڑی بہن تھی جن کے شوہر فوج میں تھے۔ اجالا کی پیدائش کے ایک سال بعد جب ان کی شہادت کی خبر ملی تو بابا پھوپو کو ہمارے گھر لے آئے اور پھر انھوں نے ہمارے ساتھ ہی رہنا شروع کر دیا تھا۔''

''کیا تمہاری پھوپو کی وجہ سے تم یہاں؟'' ماہم نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں پھوپو کی بڑی بیٹی سارہ کی وجہ سے۔''

''سارہ کی وجہ سے۔'' اس نے حیرت بھری نگاہوں سے فہد کی طرف دیکھا۔

''ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کھڑکی سے باہر دور افق پر نظریں جما دیں جیسے وہیں کہیں اس کا ماضی دفن ہے وہ دھیرے دھیرے اپنا ماضی کھولنے لگا۔

☆......☆

آج گھر میں سارہ کو دیکھنے کے لیے لڑکے والے آ رہے تھے۔ اسی لیے میں تیار ہو رہا تھا کیونکہ بابا کی ہدایت کے مطابق مجھے ہی مہمانوں کا استقبال کرنا تھا۔ میں نے گرے کلر کا تھری پیس زیب تن کیا۔

''فہد بھائی مہمان آ گئے ہیں اور نیچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ سارہ تھی۔

''سارہ رکو۔'' وہ مڑ کر جانے لگی تو میں نے پیچھے سے آواز دی۔

''کیا تم اس رشتے سے خوش تو ہو میرا مطلب ہے کہ تم تو ثاقب کو جانتی ہو اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہو۔'' وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس کی مرضی جان لینا چاہتا تھا۔

''جہاں تک یونیورسٹی کی بات ہے تو میں یونیورسٹی میں صرف پڑھائی کرنے جاتی تھی دوستیاں بنانے نہیں اور رہی بات خوشی کی تو اگر اس رشتے سے آپ سب لوگ خوش ہیں تو...... میں بھی خوش ہوں۔''

''کیا مطلب کہ ہماری خوشی میں تم بھی خوش ہو، کیا تمہاری اپنی کوئی مرضی نہیں۔''

''شریف گھرانے کی لڑکیاں اپنے گھر والوں کی خوشی میں ہی خوش ہوتی ہیں۔'' اس کے اس جواب کے بعد میں بالکل لاجواب ہو گیا تھا۔

''بھائی آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے نیچے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' اجالا نے رعب دار آواز میں کہا۔

''تیار ہی تو کھڑا ہوں، یہ تو تمہاری سارہ آپی نے باتوں میں لگا دیا ورنہ میں تو نیچے جانے ہی والا تھا۔'' میں نے سارا الزام سارہ پر ڈال دیا۔

سب کی رضامندی سے رشتہ پکا ہو گیا اور نکاح کی تاریخ بھی رکھ دی گئی۔

رخصتی کی تاریخ نکاح کے ایک ہفتے بعد کی تھی وقت بہت کم تھا لیکن محمود ہاؤس میں تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جس دن رخصتی ہونی تھی۔ سب لوگ بے صبری سے برات کے آنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن برات تو نہیں آئی البتہ ایک بری خبر آ گئی۔

''محمود صاحب سننے میں آیا ہے کہ دولہے کی کار کو حادثہ ہو گیا ہے اور اس میں سوار سب لوگ جاں بحق ہو گئے

ہیں۔'' ایک پڑوسی نے ابو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ہجوم میں ایک شور سا برپا ہوگیا۔ کوئی کہنے لگا کہ ہائے بیچاری قسمت کی ماری ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی جو بیوہ ہوگئی۔ ایک عورت نے تو حد ہی کردی ''دیکھو کتنی منحوس ہے یہ لڑکی جس کے ساتھ رشتہ جڑتے ہی بیچارے کا موت سے ناطہ جڑ گیا۔'' یہ سب سننا سائرہ کے لیے آسان نہیں تھا لیکن اس نے بڑی ہمت سے یہ سب کچھ برداشت کیا۔

☆......☆

''ہائے......میری بچی کی قسمت بھی کتنی پھوٹی ہے کہ ابھی تو اس کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ بھی نہیں چڑھا تھا اور وہ بیوہ ہوگئی۔''

''ایسا نہ کہو فضیلہ خدا کے فیصلوں پر اعتراض کرنے کی ہماری اوقات نہیں ہے۔'' ابو کو اس کا یوں بین کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''میں خدا کے فیصلے پر اعتراض نہیں کر رہی بھائی، میں تو اپنی بچی کی قسمت پر رو رہی ہوں۔''

''ایسا نہ کہو خدا پر یقین رکھو اس نے ہماری بچی کے لیے کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا۔'' ابو نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''جس لڑکی کے لیے سارا محلہ باتیں بنا رہا ہو اور اسے منحوس کہہ رہا ہو اس کے لیے اچھا کیا ہوگا، اب کون کرے گا میری بیٹی سے شادی۔'' فضیلہ کے دل کی بات زبان پر آہی گئی۔

''دیکھو اس وقت میں یہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اب تم نے مجبور کر ہی دیا ہے تو دھیان سے سنو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ سائرہ کی عدت پوری ہوتے ہی فہد اور سائرہ کا نکاح کر دیا جائے۔''

محمود صاحب کی بات سن کر فضیلہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

''لیکن بھائی آپ نے اس بارے میں فہد سے بات کی ہے۔'' وہ اپنے تمام تر خدشات دور کر لینا چاہتی تھی۔

''فہد سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے میری بات کبھی نہیں ٹالے گا۔'' ابو نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

''لیکن پھر بھی ایک بار......''

''اپنے دماغ سے سارے خدشے دور کردو۔ عدت ختم ہونے کے بعد جمعے کے روز ان دونوں کا نکاح کر دیا جائے گا۔'' ابو نے کہا۔

پھوپو بھی جانتی تھی کہ اب اگر ابو نے کہہ دیا ہے تو یہ ہو کر ہی رہے گا کیونکہ کسی کی بھی ابو کے فیصلے کے خلاف جانے کی ہمت نہیں تھی۔

☆......☆

دوسرے کمرے میں کھڑا میں سب کچھ سن رہا تھا لیکن اس وقت دخل دینا میں نے ضروری نہیں سمجھا لیکن رات کو ان کے کمرے میں پہنچ ہی گیا۔

''بابا میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے آپ نے ایک بار بھی مجھ سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔'' مجھے ابو کا فیصلہ سن کر دکھ ہوا تھا۔

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے تم میرے بیٹے ہو کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں تمہاری زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرسکوں۔''

''آپ کو حق ہے بابا لیکن میں سائرہ سے شادی کیسے کرسکتا ہوں۔''

''کیوں کیا کمی ہے سائرہ میں۔'' محمود صاحب کی نظروں میں حیرت تھی۔

''بات کمی کی نہیں ہے، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم بچپن سے بہن بھائیوں کی طرح رہے ہیں اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ میں اس سے شادی کرلوں۔''

''شریف گھرانے کے بچوں کی یہی نشانی ہوتی ہے اور سائرہ تمہاری پھوپو کی بیٹی ہے اور ہمارا مذہب پھوپی زاد سے شادی کی اجازت دیتا ہے۔''

''بابا ہمارا مذہب بچوں کی شادی کرنے سے پہلے ان کی مرضی جانن لینے کی اجازت بھی دیتا ہے۔''

''فہد تمہیں ہم نے لندن پڑھنے کے لیے بھیجا تھا اس لیے نہیں کہ تم اپنی تہذیب اور ثقافت کو بھول جاؤ۔ یہ کون سا طریقہ ہے اپنے بابا سے بات کرنے کا۔'' امی نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

''امی، بابا میں اپنے رویے کے لیے آپ دونوں سے معافی چاہتا ہوں لیکن پلیز مجھے اس شادی کے لیے مجبور نہ کریں ابھی تو میری پڑھائی بھی پوری نہیں ہوئی۔'' میں نے درخواست کرنے کے انداز میں کہا۔

''تم چاہو یا نہ چاہو میں فضیلہ کو زبان دے چکا ہوں اس لیے اب اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی عزت یا احترام ہے تو تم میرا فیصلہ مان لو ورنہ تمہاری مرضی......'' ابو نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''بابا......'' ابو اپنے کمرے میں جانے لگے تو میں نے پیچھے سے آواز دی لیکن وہ مجھے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''امی آپ تو مجھے سمجھیے......''

''فہد بیٹا سمجھنے کی کوشش تم کرو یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔ اس وقت لوگ سائرہ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ اسے منحوس کہہ رہے ہیں اس لیے بھی تمہاری شادی اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے تاکہ لوگوں کی زبانیں بند ہو سکیں۔'' امی نے نصیحت کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن اس کی شادی کسی اور کے ساتھ بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''بیٹا سب لوگ اسے منحوس سمجھ رہے ہیں ایسے میں کوئی بھی اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں...... فہد بیٹا تم میرے اچھے بیٹے ہو اس لیے چپ چاپ اپنے بڑوں کے فیصلے کو مان لو ہمیشہ خوش رہو گے۔'' امی تسلی دے کر چلی گئیں اور میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆......☆

جب کچھ سمجھ نہ آیا تو میں باہر نکل پڑا۔ بے مقصد سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔

☆......☆

میں باہر سے تھکا ہوا آیا اور آتے ہی ہال میں پڑے ہوئے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا اور صوفے کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

''فہد بھائی۔'' جیسے ہی یہ آواز کانوں میں پڑی میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے مائرہ تھی (سائرہ کی چھوٹی بہن)۔

''آؤ مائرہ بیٹھو۔'' میں نے اپنے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''فہد بھائی میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ سائرہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔''

''سب ٹھیک تو ہے سائرہ نے مجھ سے کیا بات کرنی ہے۔'' سائرہ کے بلاوے نے مجھے سوچ میں ڈال دیا تھا۔

''یہ تو اس نے نہیں بتایا لیکن وہ اسٹڈی روم میں آپ کا انتظار کر رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ میں اسٹڈی روم میں جا رہا ہوں۔'' مائرہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور میں اسٹڈی روم کی طرف ہو لیا۔

اسٹڈی روم کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے دستک دی۔

''آجائیں۔'' دروازے پر دستک ہوئی تو سائرہ نے اندر سے جواب دیا۔

''السلام علیکم۔'' میں نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے بجھے سے انداز میں جواب دیا۔'' جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔'' میں نے مشکل سے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اب تو چار مہینے گزر گئے اس بات کو اور آپ اب افسوس کررہے ہیں۔'' اس نے نم آنکھوں سے میری طرف دیکھا تو شرم سے میرا سر جھک گیا۔

''میں تو پہلے ہی آنا چاہتا تھا لیکن پھر تم عدت میں تھی اس لیے میں......''

''خیر جو ہونا تھا ہوگیا......کیا آپ جانتے ہیں کہ گھر والے اس جمعے کو ہمارا نکاح کروانا چاہتے ہیں۔''

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ اس فیصلے سے خوش نہیں ہیں ماموں نے زور زبردستی سے آپ کو منایا ہوگا۔'' اس نے میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں جو کوئی میرے ساتھ زور زبردستی کرے گا اور رہی بات میری خوشی کی تو جس فیصلے سے گھر والے خوش ہیں اس میں میری بھی خوشی ہے۔''

''لیکن میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا کمی ہے مجھ میں۔'' میں اس کا جواب سن کر دنگ رہ گیا تھا۔

''آپ میں کوئی کمی نہیں ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ میں منحوس ہوں اگر میری وجہ سے آپ کو کچھ ہوگیا تو۔'' بالآخر اس نے اپنا خدشہ ظاہر کرہی دیا۔

''میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اللہ کی اشرف بنائی ہوئی چیز منحوس تو کہیں ہوسکتی۔''

''لیکن اگر آپ کو کچھ ہوگیا تو!'' اس نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔

''مجھے جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا اس لیے اپنے دماغ سے سارے وہم نکال دو اور ہاں لوگ جو کہتے ہیں انہیں کہنے دو۔ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور تمہیں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔'' میں نے سرد انداز میں کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆......☆

جمعہ کے مبارک روز نکاح کی تیاری کی گئی تھی۔ فضیلہ کی خوشی تو دیدنی تھی۔ باقی سب بھی خوش تھے لیکن یہ خوشی صرف چند لمحوں کی ثابت ہوئی۔ میں اور ساحر جس جھومر کے نیچے کھڑے ہو کر باتیں کررہے تھے کہ اچانک جھومر کی رسی کھل گئی اور وہ نیچے آن گرا۔ وہ تو عین اسی وقت ساحر کی نظر جھومر پر پڑ گئی اور اس نے مجھے دھکا مارا اور خود بھی دور جا گرا لیکن میرا سر ٹیبل سے ٹکرا گیا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ابو اور ساحر نے مجھے اٹھایا اور اسپتال لے گئے۔ یہاں مسز محمود اور سائرہ کا رو رو کر برا حال تھا۔

''مجھے بعد میں یہ باتیں معلوم ہوئیں لیکن ساری بات تم سمجھ سکو اس لیے تمہیں پہلے بتارہا ہوں۔'' فہد نے رک کر ماہم کی طرف دیکھا پھر کہا۔'' نکاح کا پروگرام کینسل کردیا گیا تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاچکے تھے لیکن امی ابھی تک پریشان بیٹھی تھیں۔''

''بھابی اسپتال سے کوئی خبر آئی۔'' پھوپی نے امی سے پوچھا جو اپنے خیالوں میں گم تھی۔

''ہاں ساحر کا فون آیا تھا فہد اب پہلے سے بہتر ہے صبح تک گھر واپس آجائے گا۔''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں ابھی یہ بات جاکر سائرہ کو بتاتی ہوں وہ تو اس وقت سے کافی پریشان ہے۔''

''فضیلہ......بیٹھو مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' پھوپی مڑ کر جانے لگیں تو امی نے انہیں روکا۔

''جی بھابی کہیے۔'' انہوں نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو فضیلہ مجھے غلط مت سمجھنا لیکن میں چاہتی ہوں کہ فہد اور سائرہ کے نکاح والی بات کو یہیں ختم کردیا جائے۔''

''بھابی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔'' پھوپی نے حیرت بھری نگاہوں سے امی کو دیکھا۔

''تم تو جانتی ہو کہ سائرہ کے بارے میں لوگ شروع سے ہی باتیں بنارہے ہیں لیکن ہم لوگوں نے پھر بھی ان

سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سارہ کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا لیکن جو کچھ بھی ہوا وہ تمہارے سامنے ہے۔''

''تو بھائی آپ کیا کہنا چاہتی ہیں کہ یہ سب میری بیٹی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' پھوپی نے سوالیہ نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔

''میں کسی کو الزام نہیں دے رہی، میں تو بس تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر رہی ہوں کہ یہ شادی اب نہیں ہوگی اور میں فہد کو کل واپس لندن بھیج رہی ہوں۔''

''تو صاف صاف کہیے نا کہ آپ نے بھی لوگوں کی طرح سارہ کو منحوس سمجھ لیا ہے۔'' پھوپی نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''اگر تم نے یہی سمجھنا ہے تو یہی سہی لیکن یہ شادی اب نہیں ہوگی میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا۔'' امی نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ اس بات سے بے خبر کہ پیچھے سیڑھیوں پر کھڑی سارہ سب کچھ سن رہی تھی۔

☆......☆

سورج طلوع ہو چکا تھا اور سب لوگ کھانے کی میز پر جمع ہو گئے تھے۔

''بشریٰ تم نے فہد کے کمرے میں ناشتا بھجوا دیا۔'' امی نے اپنی ملازمہ کو مخاطب کیا۔

''جی بیگم صاحبہ فہد صاحب ابھی سو رہے ہیں جب اٹھ جائیں گے تو ناشتا دے آؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔''

''ارے بھئی آج یہ سارہ بیٹی کہاں رہ گئی، روز تو وہ سب سے پہلے اٹھ جاتی ہے اور کھانا بھی خود پیش کرتی ہے۔'' ابو کو سارہ کی غیر موجودگی ناگوار گزر رہی تھی۔

''بھائی جو کچھ کل ہوا اس کی وجہ سے وہ کافی پریشان تھی اسی لیے رات کو دیر سے سوئی ہوگی۔ آپ لوگ کھانا شروع کیجیے۔''

''امی میں کب سے دروازے پر دستک دے رہی ہوں لیکن سارہ باجی نہ تو دروازہ کھول رہی ہیں اور نہ ہی کچھ بول رہی ہیں۔'' جیسے ہی ناشتا شروع کرنے لگے ماہرہ بھاگتی ہوئی آئی اس کے چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔

''یا اللہ خیر...... میری بچی کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔'' پھوپو نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

سب بے اختیار سارہ کے کمرے کی جانب بھاگے۔ میں بھی شور سن کر اپنے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔

''سارہ، بیٹا دروازہ کھولو۔'' پھوپی نے آواز دیتے ہوئے کہا۔

''بشریٰ جاؤ اور میرے کمرے سے چابیاں لے کر آؤ۔'' امی نے ملازمہ کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''چابیاں ڈھونڈنے کا وقت نہیں ہے امی، یہ دروازہ ہی توڑنا پڑے گا۔'' ساحر اور ابو نے مل کر دروازے کو چھ سات دھکے دیے تو ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ سارہ سامنے بستر پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ پھوپی کی تو یہ دیکھ کر جان ہی حلق میں آ گئی تھی۔ ماہرہ نے بھاگ کر اسے سیدھا کیا اور اس کے اوپر چادر ڈال دی۔

''مجھے لگتا ہے کہ سارہ باجی نے چھ سے بار گولیاں کھا لی ہیں۔'' ملازمہ نے اپنا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو تم بشریٰ۔'' امی نے اسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں کل رات کو وہ کچن میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں، میں نے پوچھا تو کہا کہ ماچس ڈھونڈ رہی ہوں جبکہ ماچس سامنے پڑی ہوئی تھی۔''

''یہ وقت ان فضول باتوں کا نہیں ہے ساحر بیٹا جلدی سے گاڑی نکالو ہمیں سارہ کو اسی وقت اسپتال لے کر جانا ہوگا۔''

''بابا میں نے ڈاکٹر جبار کو فون کر دیا ہے وہ آنے ہی والے ہوں گے۔''

اس کا جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ کال بیل بجی۔ ملازمہ نے دروازہ کھولا تو سامنے ڈاکٹر صاحب تھے۔ انہیں سیدھے سارہ کے کمرے میں پہنچایا گیا۔

''معافی چاہتا ہوں لیکن سارہ بیٹی کی روح تو کب کی پرواز کر چکی ہے۔'' ڈاکٹر جبار نے بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی گھر میں ایک کہرام مچ گیا تھا۔ پھوپی کی حالت غیر ہو گئی تھی، سب لوگ حیران تھے کہ سارہ جیسی معصوم لڑکی اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی ہے۔ خبر سنتے ہی آس پڑوس کے لوگ بھی تعزیت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

''بہت دکھ ہوا فضیلہ بہن یہ سن کر آخر تمہاری بھابی نے تمہاری بیٹی سے اپنی جان چھڑا ہی لی۔'' ایک عورت نے پھوپی سے تعزیت کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب۔'' فضیلہ بی بی نے اپنی آنکھوں سے

آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
''تم تو بہت ہی بھولی ہو بہن ارے تمہاری بھابی تو شروع سے ہی سائرہ کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی تھی وہ تو محض بھائی کی وجہ سے خاموش تھی۔ وہ تو کئی بار مجھ سے اس بات کا اظہار کرچکی ہیں اور تو اور میں نے انہیں ایک بابا سے تعویذ لیتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔''
''کیا بکواس کررہی ہو تم!'' پھوپی نے اسے ڈانٹا۔
''تمہارا دکھ بہت بڑا ہے بہن، ابھی تم کو میری باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی چند روز گزر جانے دو پھر تفصیل سے سمجھاؤں گی۔ ابھی میں چلتی ہوں خدا تمہیں یہ دکھ برداشت کرنے کا حوصلہ دے بہن۔'' پھوپی تو پہلے ہی امی کے خلاف تھیں ہمسائی کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

☆......☆

''یقین نہیں آتا کہ اس زمانے میں بھی ایسے دقیانوس لوگ پائے جاتے ہیں۔'' ماہم کو زمانے کی بے حسی پر یقین نہیں آرہا تھا۔
''لوگوں کی باتوں نے اسے ذہنی طور پر اتنا پریشان کر دیا تھا کہ اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان لے لی۔'' فہد نے کراہتی آواز میں کہا۔
''کیا تمہاری کزن نے صرف اس لیے اپنی جان دے دی کیونکہ لوگ اسے منحوس کہتے تھے۔'' اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا۔
''پتا نہیں اس نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا لیکن اس کے لکھے ہوئے ایک خط نے میری پوری زندگی بدل کر رکھ دی۔''
''کون سا خط اور کیا لکھا تھا اس میں؟''
''سائرہ نے مرنے سے پہلے ایک خط لکھا تھا جس میں لکھا ہوا تھا کہ اس نے میری وجہ سے خودکشی کی ہے۔ مگر وہ خط خودکشی کے پندرہ دن بعد ملا تھا۔''
''کیا تمہاری وجہ سے؟'' ماہم نے سوالیہ نگاہوں سے فہد کی طرف دیکھا۔
''ہاں میری وجہ سے۔'' فہد نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔ ''اس دن......''

☆......☆

میں اپنے کمرے میں نیند کی وادیوں میں گم تھا کہ اچانک زور زور سے دروازہ پیٹنے کے شور سے اٹھ گیا۔
''فہد......دروازہ کھولو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔'' ابو زور زور سے دروازہ پیٹ رہے تھے۔
میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو ابو نے تھپڑ مارنا شروع کردیا اور کمرے سے گھسیٹ کر باہر لے آئے۔
''بابا آپ مجھے اس طرح مار کیوں رہے ہیں...... میں نے کیا کیا ہے؟''
''بے غیرت تجھے یہ سب کرتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔'' ابو مارتے جارہے تھے اور بڑبڑاتے جارہے تھے۔
''بابا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آخر بھائی نے کیا کیا ہے؟'' ساحر نے ابو سے میرا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔
''کیا کیا ہے اس نے......اس کمینے نے ایک معصوم لڑکی کو جان سے مار ڈالا۔'' ابو نے ایک دفعہ پھر سے مجھے دبوچنے کی کوشش کی۔
''یہ سب جھوٹ ہے۔'' میں نے اپنا جرم ماننے سے انکار کردیا۔
''مرنے والا کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور یہ رہا تمہارے گناہ کا ثبوت۔'' ابو نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور میری جانب پھینکا۔
میں نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔
''پیاری امی جان مجھے معاف کردیں۔ میں آپ کو اور ماہرہ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جارہی ہوں، میں تھک گئی ہوں لوگوں کی باتیں سن سن کر اور اب تو مجھے خود بھی لگنے لگا ہے کہ میں منحوس ہوں۔ لوگ تو پہلے بھی باتیں کرتے تھے لیکن میں نے ان کی کبھی پروا نہیں کی لیکن آج صبح جب فہد اسپتال سے واپس آیا تو وہ سیدھا میرے کمرے میں آیا اور مجھے کھری کھری سنانے لگا جیسے اس پر جو مرض میں نے گرایا ہو۔ اس نے مجھے یہ احساس کردایا کہ میں واقعی منحوس ہوں۔ وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا اور ماموں اپنے فیصلے کو بدلنے والے نہیں اس لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری یہ منحوسیت آپ میں سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے اس لیے میں آپ سب کو چھوڑ کر جارہی ہوں۔ سائرہ۔''
''بابا میرا یقین کریں یہ سب جھوٹ ہے میں اس دن سائرہ سے ملا بھی نہیں تو یہ سب کیسے کہہ سکتا ہوں۔''
''دیکھ لیں اپنے بیٹے کی حرکت بھائی صاحب پہلے تو میری بیٹی کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا اور اب میری مری ہوئی بچی پر بہتان باندھ رہا ہے۔''
''پھوپو میرا یقین کریں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں

نے سائرہ سے یہ سب نہیں کہا پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" میں نے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن میری سمجھ میں آ گیا ہے، تم پہلے ہی اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لیے تم نے اس سے جان چھڑانے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔" پھوپو نے جلتی پر تیل پھینکا۔

"دفع ہو جا میری نظروں سے ورنہ میں تیری جان لے لوں گا۔" ابو ایک بار پھر جوش میں آ گئے۔

"خدا کا خوف کریں جوان بیٹے کو گھر سے نکال رہے ہیں۔" امی نے دخل اندازی کرنے کی کوشش کی۔

"میرا بیٹا مر گیا ہے۔ یہ آج سے ہمارے لیے اور ہم اس کے لیے مر چکے ہیں، میرے لیے تو پہلے ہی تیرے دل میں کوئی عزت نہیں تھی لیکن اگر تیری ماں اور بہن بھائیوں کے لیے کوئی پیار ہے تو دفعہ ہو جا اس شہر سے اس ملک سے اور پھر کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔" ابو نے آگ بگولا ہوتے ہوئے کہا۔

یہ سب سن کر تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی ساحر اور امی نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن میں رکا نہیں اور پہلی فلائٹ سے یہاں آ گیا۔

☆......☆

"تم نے اپنے بابا کی باتوں کو اتنا سیریس لے لیا کہ آٹھ سال گزر گئے ایک بار بھی واپس جانے کی ہمت نہیں کی۔" ماہم کو میری اس حرکت پر بہت حیرت تھی۔

"تم میرے بابا کو نہیں جانتی، جب وہ ایک بار کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر کچھ بھی ہو جائے وہ کبھی اپنا فیصلہ واپس نہیں لیتے۔"

"لیکن ہو سکتا ہے یہ سب کچھ انہوں نے غصے میں کہہ دیا ہو۔" ماہم نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"لندن آنے کے ایک مہینے بعد ایک دفعہ بڑی ہمت کر کے گھر پر فون کیا تھا لیکن اتفاق سے بابا نے فون اٹھا لیا اور انہوں نے میری آواز پہچان لی۔ مجھ سے کہا کہ اگر میں نے دوبارہ انہیں فون کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی جان دے دیں گے، اس لیے میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور پھر میری ملاقات تم سے ہوئی اور میں نے تم سے شادی کر لی اور یہیں لندن میں آباد ہو گیا۔"

"چلو مانا کہ بابا نے تو تمہیں منع کر دیا تھا لیکن کیا تم نے کبھی امی، ساحر اور اجالا کی بھی خبر لینے کی کوشش نہیں کی۔"

"ایک دوست کی مدد سے گھر والوں کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی پھر وہ دبئی شفٹ ہو گیا تو خبر آنا بھی بند ہو گئی۔"

"ذرا سوچو فہد وہ اجالا جو تم سے کبھی دور نہیں رہ سکتی تھی وہ کتنا روتی ہو گی تمہیں یاد کر کے۔ تمہیں نہیں لگتا کہ ہمیں ایک بار پاکستان جانا چاہیے ان سے ملنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" ماہم نے کہا۔

"وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے ماہم، اب دیکھو نا میں بھی تو ان کے بغیر پچھلے آٹھ سال سے رہ رہا ہوں اسی طرح ان کو بھی میرے بغیر رہنے کی عادت ہو گئی ہو گی پھر یوں اچانک ان کے سامنے جا کر میں ان کے پرانے زخم تازہ نہیں کرنا چاہتا، اس لیے اب چپ چاپ یہ کیک کھاؤ اور جا کر سو جاؤ۔"

"لیکن فہد......"

"پلیز ماہم مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی میں کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا ہوں تم جا کر سو جاؤ۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ماہم اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں کافی کا کپ ہاتھ میں تھامے سوچوں میں گم ہو گیا۔ میں ان باتوں کو ذہن میں تازہ کرنا چاہتا تھا جو میرے دوست کی معرفت مجھ تک پہنچی۔ یہ باتیں بعد میں آنا چاہیے تھیں لیکن کہانی کا تسلسل برقرار رہے اس لیے پہلے بیان کر رہا ہوں۔

☆......☆

اس دن پھوپی اپنے کمرے میں لیٹی تھیں کہ پروین آ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "دیکھا فضیلہ بہن فہد کے جانے کے بعد تمہاری بھابی کیسے ادھ موئی ہو گئی ہے۔"

"اب اسے میری تکلیف کا کچھ تو اندازہ ہوا ہو گا۔" پھوپی نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"ابھی اسے خاک اندازہ ہوا ہو گا ابھی تو صرف ہماری پہلی کاوش کامیاب ہوئی ہے ابھی تو ہمیں دو اور وار کرنے ہیں۔"

"کیا مطلب......؟" میں نے نسیم کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ فہد کے بعد اب ساحر کی باری ہے۔"

"نہیں ہم ساحر کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں

گے۔'' پھوپی نے ساحر کا نام سنتے ہی ٹکا سا جواب دیا۔
''ارے تم تو بہت ہی رحم دل ہو جس عورت نے تمہاری بیٹی کو مار ڈالا اس کے بچے کے لیے بھی تمہارے دل میں کتنا رحم ہے۔'' نسیم نے پھر سے پھوپی کے جذبات کو ابھارا۔
''بات رحم کی نہیں ہے دراصل ساحر اور مائرہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، ایک بیٹی کی خوشیاں تو میں نہیں دیکھ سکی اب دوسری کی میں برباد نہیں کرنا چاہتی۔''
''یہ بات بھی ٹھیک ہے فضیلہ بہن لیکن اب اجالا کے لیے اپنے دل میں رحم نہ پال لینا یہ بات جان لو کہ اجالا میں اس عورت کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ اگر اسے ذرا بھی تکلیف پہنچی تو وہ تڑپ کر رہ جائے گی۔''
''ٹھیک کہہ رہی ہو تم واقعی اجالا میں تو سب کی جان اٹکی ہوئی ہے۔''
''میں کل بابا کے پاس گئی تھی انھوں نے کہا ہے کہ تم مجھے اس لڑکی کے بال دے دو پھر دیکھو میرا کمال....''
''بال تو تمہیں مل جائیں گے لیکن یاد رہے کہ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔''
''ارے فضیلہ بہن یقین رکھو، اس عمل سے بس اس کے سر میں ہلکا سا درد اٹھے گا لیکن وہ ہلکا سا درد بھی اس مغرور عورت کی جان نکال دے گا۔''
''تو پھر ٹھیک ہے ابھی تم جاؤ کل جاتے وقت مجھ سے اجالا کے بال لے جانا۔'' پھوپی نے اسے چلتا کیا اور خود سوچوں میں گم ہوگئی۔

☆.....☆

''السلام علیکم اینڈ گڈ مارننگ اٹھ جاؤ میری پیاری چڑیل اپنی سالگرہ کے موقع پر بھی کوئی اتنی دیر تک سوتا ہے۔'' اس وقت میرا موڈ بالکل فریش تھا۔
''تمہیں یاد تھا کہ آج میری سالگرہ ہے۔'' ماہم نے بجھے سے انداز میں کہا۔
''تمہاری سالگرہ میں کیسے بھول سکتا ہوں صرف ایک دن کا ہی تو فرق ہے تمہاری اور اجالا کی سالگرہ میں۔''
''تمہیں میری سالگرہ اس لیے یاد ہے کیونکہ اجالا کی سالگرہ بھی مارچ میں ہی ہے۔'' کل والی بات کا غصہ ابھی تک قائم تھا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے وہ تو بس.....''
''بس کرو فہد آخر کب تک تم اپنے آپ سے اور مجھ سے جھوٹ بولتے رہو گے۔ تمہارا کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جس میں اجالا نہ ہو، ہمارے گھر کو دیکھ لو اس گھر میں اتنی تصویریں ہماری نہیں ہیں جتنی اجالا کی ہیں، ایک ہی تصویر کی تم نے دسیوں کاپی کرا کر فریم بنوایا ہے۔ تمہارے دل میں اتنی جگہ میری نہیں ہے جتنی اجالا کی ہے، بس کرو اب ختم کرو اس قصے کو یا تو مکمل طور پر بھول جاؤ سب کچھ یا پھر واپس چلے جاؤ ان کے پاس۔'' ماہم نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔
''ماہم تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ان دونوں میں سے کوئی بھی کام نہیں کر سکتا۔''
''فہد مجھے تمہاری ان حرکتوں سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ جلن ہوتی ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ تم بار بار اپنے بہن بھائیوں کا میرے سامنے اس لیے ذکر کرتے ہو تاکہ تم مجھے یہ احساس کرا سکو کہ میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔'' ماہم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔
''ماہم یہ تم کیا کہہ رہی ہو میں تمہیں تکلیف پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' میرے لہجے میں محبت عیاں تھی۔
''اگر تم واقعی مجھے تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے اور مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو پلیز مجھے پاکستان لے چلو۔'' ماہم نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
''ماہم یار تم نے یہ کیا ضد پکڑ لی ہے۔'' میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔
''فہد میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہیں گھر جانے کے لیے مجبور نہیں کروں گی ہم صرف سات دن کے لیے پاکستان جائیں گے اور کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔''
''کیا کرو گی تم پاکستان جا کر۔'' میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔
''وہاں جا کر ہم اجالا اور ساحر سے ملیں گے۔'' اس نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔
''اور اگر انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا تو۔''
''تب کی تب دیکھی جائے گی فی الحال تم جانے کی تیاری کرو۔''
''ٹھیک ہے اگر تمہاری یہی ضد ہے تو چلتے ہیں۔'' میں نے بالآخر ہار مان ہی لی۔
''تھینک یو سوچ۔'' اس نے تشکر بھری نگاہوں سے

میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
اور پھر میں نے ماہم کی ضد پر ٹکٹ منگوا لیے۔
☆.....☆
''کتنا اچھا لگ رہا ہے نا اپنے ملک میں واپس آ کر۔'' اس نے سامان صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔
''اچھا تو لگ رہا ہے لیکن ڈر بھی لگ رہا ہے۔''
''ڈرو مت فہد..... اللہ سے اچھی اُمید رکھو۔'' ماہم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''اللہ تعالیٰ کا ہی تو سہارا ہے۔'' میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔
''اور تمہارے لیے ایک اور بھی اچھی خبر ہے۔''
''وہ کیا!'' اس نے تجسس بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔
''میرے ایک دوست سے مجھے ساحر کا نمبر مل گیا ہے۔''
''تو پھر انتظار کس کا ہے، ابھی نمبر ڈائل کرو اور بات کرو۔'' اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔
''میں بعد میں بات کر لوں گا ابھی میں فریش ہونے جا رہا ہوں اور تم بھی فریش ہو جاؤ پھر کھانا کھانے باہر چلتے ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔'' فہد نے اپنا موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ جس کی وجہ سے میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔
☆.....☆
''ماہم میں تیار ہوں اور کتنی دیر انتظار.....'' میں کپڑے تبدیل کر کے باہر آیا تو ماہم کسی سے ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ میں چونک گیا۔ وہ کوئی اور نہیں ساحر تھا۔
''ساحر تم!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''میری چھوڑو بھائی تم بتاؤ اتنے سال میری یاد نہیں آئی۔'' اس نے زور سے لپٹتے ہوئے کہا۔
''مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ اتنے بڑے ہو گئے ہو تم۔''
''جدائی نے صرف 35 سال کی عمر میں ہی کتنا بوڑھا کر دیا ہے آپ کو۔'' اس نے میرے کھچڑی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کیسے گزار لیے اتنے سال تم نے ہمارے بغیر۔''
''بس یار یوں سمجھ لو کہ ہر دن سو بار جیتا تھا سو بار مرتا تھا۔'' میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''کریں تمہارے دشمن..... جتنی جدائی لکھی تھی وہ ہم نے بھگت لی اب میں تمہیں خود سے دور نہیں جانے دوں گا۔'' وہ بدستور مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔
''جانا تو میں بھی نہیں چاہتا لیکن جانا ہوگا۔ تمہیں یاد نہیں بابا نے کیا کہا تھا کہ اگر میں نے انہیں اپنی شکل بھی دکھائی تو وہ اپنی جان لے لیں گے اسی لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اتنے سال تم لوگوں سے دور رہا۔ یہ تو ماہم کی ضد تھی جو مجھے یہاں تک کھینچ لائی ورنہ میں ساری زندگی واپس نہ آتا۔''
''تب کی بات اور تھی بھائی اب تو سب گھر پہ آپ کا انتظار کرتے اور یاد کرتے رہتے ہیں۔''
''کیا ..... بابا..... بھی۔'' میں ابو کے دل کا حال جاننے کے لیے بے چین تھا۔
''جی ہاں بابا، امی، میں اور سائرہ آپ سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔''
''اور اجالا..... کیا وہ مجھے یاد نہیں کرتی۔''
''اجالا اگر ہوتی تو ضرور یاد کرتی۔'' اس نے ذرا ٹھہر کر جواب دیا۔
''کیا مطلب ہے تمہارا کہ ہوتی تو یاد کرتی؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے ساحر کی طرف دیکھا۔
''بھائی..... اجالا..... اس دنیا میں نہیں رہی۔''
یہ سن کر تو میرے قدموں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ زمین پر جا گرتا اگر ساحر اور ماہم مجھے سہارا نہ دیتے لیکن اس صدمے نے میرے ہوش چھین لیے تھے۔ دل کا یہ دوسرا جھٹکا تھا۔
☆.....☆
''فہد بیٹا آنکھیں کھولو..... کب سے ترس رہی ہوں تمہاری آواز سننے کے لیے۔'' میں بے ہوش پڑا ہوا تھا اور امی سرہانے بیٹھی ہوئی بڑبڑا رہی تھیں۔
''امی..... کیا یہ کوئی خواب ہے یا واقعی آپ میرے سامنے ہیں۔'' آنکھ کھلتے ہی میں نے امی کو اپنے سامنے دیکھ کر کہا۔
''کوئی خواب نہیں ہے بیٹا!'' امی نے میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔
''میں کہاں ہوں اور مجھے یہاں کون لایا۔''
''اسپتال میں ہو، ساحر تمہیں یہاں لے کر آیا ہے۔''
''اجالا.....؟'' اس کے لہجے میں دکھ اور آنکھوں میں

نمی تھی۔
"ہاں بیٹا قسمت کو یہی منظور تھا۔ اجالا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔" امی کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔
"جب میں گیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھی پھر اچانک کیا ہو گیا۔"
"کیا بتاؤں بیٹا تمہارے جانے کے بعد وہ بہت چپ چپ سی ہوگئی تھی۔ شروع شروع میں تو ہم نے اسے یہی بتایا کہ تمہارے امتحان ہونے والے تھے اس لیے تم واپس لندن چلے گئے ہو لیکن ایک دن اس نے تمہارے بابا اور میری باتیں سن لیں۔ اس کے بعد وہ ہر وقت روتی رہتی اور تم سے ملنے کی ضد کرتی تھی۔" امی نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اچانک ایک دن اس کے سر میں شدید قسم کا درد اٹھا اس درد کی وجہ سے وہ ہر وقت تکلیف میں رہتی تھی اور پھر وہ تکلیف اس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔"
"کس قسم کا درد تھا وہ۔" ماہم نے بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔
"پتا نہیں بیٹا ہم لوگ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ کئی اسپتالوں کے چکر بھی لگائے لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا اور میری بیٹی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔"
"اپنے آپ کو سنبھالیے امی، خدا کے فیصلوں کے سامنے ہم سب ہی بے بس ہیں۔ وہی خالق و مالک ہے اور جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔" ماہم نے امی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"اور...... بابا۔" میں نے آنسو پونچھ کر کہا۔
"بہن کی محبت میں آکر اولاد کی جدائی کا غم تو پہلے ہی دل پر تھا اوپر سے اجالا کی موت نے ایسی ضرب لگائی کہ تمہارے بابا بستر سے ہی جا لگے۔ دیکھے بعد دیگرے دو بار اٹیک ہو چکا ہے۔"
"بابا اب کہاں ہیں۔" میں نے اپنے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"گھر پر، چلو اب گھر چلتے ہیں۔ ساحر بل وغیرہ جمع کرانے گیا ہے۔"
گھر پہنچتے ہی بابا سے ملنے کے لیے ان کے کمرے کی جانب بھاگا۔
"بابا......" میں نے دروازہ کھولا تو ابو آنکھیں موندیں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔
میری آواز کانوں میں پڑتے ہی وہ اچھل کر بستر سے نیچے اتر آئے لیکن کمزوری کی وجہ سے ایک قدم چلنے کے بعد وہیں گر گئے۔
"بابا......" میں نے بھاگ کر ابو کو سنبھالا اور گلے سے لگا لیا۔
"مجھے معاف کردو بیٹا میں نے تمہیں غلط سمجھا۔" ابو کو اپنے کیے پر پشیمانی تھی۔
"معافی تو مجھے مانگنی چاہیے بابا...... ماں باپ تو بچوں کو ڈانٹتے ہی ہیں لیکن بچے گھر چھوڑ کر تو نہیں جاتے اور میں تو ایسا گیا کہ آٹھ سال تک پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ میرے بابا کو اس وقت میری ضرورت ہے۔" میری آنکھوں میں آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔
"بس اب تو تم آگئے، اب میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔" ماہم اور امی بھی کمرے میں آگئیں۔
"بابا اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم کہیں نہ جائیں تو آپ کو جلد سے جلد صحت یاب ہونا ہوگا یہ آپ کے مریض بننے کی عمر تو نہیں ہے۔" ماہم نے ابو کے سر کے نیچے تکیہ رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ پیاری سی بیٹی ......" ابو نے مسز محمود کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
"جی بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے ...... یہ ماہم ہے آپ کی بڑی بہو۔" امی نے ماہم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ماشاء اللہ...... خدا کرے کہ تم ہمیشہ یونہی مسکراتی رہو۔" ابو نے ماہم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"محمود صاحب یہی ہے جو فہد کو یہاں لے کر آئی ہے ورنہ شاید فہد تو ساری زندگی آپ کے غصے کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کرتا۔" امی نے بھی پیار سے ماہم کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔
"شکریہ بیٹا تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے ورنہ مجھے تو یہ ڈر تھا کہ کہیں اپنے بیٹے کی شکل دیکھے بغیر ہی نہ مرجاؤں۔"
"بابا خدا کے لیے ایسی مایوسی کی باتیں نہ کریں ابھی تو میں آپ سب سے ملی ہوں اور آپ بچھڑنے کی باتیں کر رہے ہیں۔" ماہم نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔
"سوری بیٹا۔" ابو نے بھی فوراً معذرت کی۔

"اچھا امی فہد نے مجھے مائرہ اور پھوپو کے بارے میں بتایا تھا لیکن وہ دونوں کہاں ہیں؟" ماہم نے سوالیہ نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا۔

"بیٹا، مائرہ کی امی کی طبیعت کافی خراب ہے اس لیے وہ زیادہ وقت اپنی امی کے کمرے میں ہوتی ہے شاید ابھی بھی وہیں ہے۔"

"کیا ہوا ہے پھوپو کو۔"

"بیٹا، فہد کی پھوپی کو کینسر ہے اور وہ بھی آخری اسٹیج پر، کچھ ماہ پہلے جب انہیں اس بیماری کا پتا چلا تو وہ بہت بے چین ہوگئی۔ وہ اپنی بیٹی کی خوشی دیکھنا چاہتی تھیں اسی لیے انہی کی خواہش پر ہم نے مائرہ اور ساحر کی شادی کروادی۔" امی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"بابا اگر آپ کی اجازت ہو تو میں پھوپی سے مل لوں۔" میں نے ابو سے اجازت لی۔

"ٹھیک ہے بیٹا جاؤ۔" میں اور ماہم کمرے سے باہر آگئے۔ سیدھے پھوپی کے کمرے میں پہنچا مگر اندر جانے سے پہلے دروازے پر دستک دی۔

☆......☆

"آجائیں دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے تو مائرہ نے پھوپی کو آواز دی۔

"امی دیکھیں فہد بھائی آئے ہیں۔"

"فہد بیٹا تم آگئے کب سے انتظار کر رہی تھی میں تمہارا۔" پھوپی نے آنکھیں کھولیں تو مجھے سامنے دیکھ کر کہا۔

"پھوپی یہ سب کیا ہوگیا۔" پھوپی کی یہ حالت دیکھ کر یقین نہ آیا۔

"یہ سب میرے کیے کی سزا ہے جو مجھے مل رہی ہے۔" پھوپی کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔

"لیکن میں نے تو کبھی بھی آپ کو بددعا نہیں دی۔"

"تم نے بددعا نہیں دی لیکن یہ اس معصوم کی آہ ہے جس کی جان میری وجہ سے چلی گئی۔"

"کیا مطلب......" پھوپی کی باتیں میرے سر سے گزر گئی تھیں۔

"اجالا کی موت کی میں ذمے دار ہوں۔" پھوپی کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" مائرہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں بیٹا۔" پھوپی اپنے گناہوں کا اقرار کررہی تھیں اور ہم تینوں کھڑے سن رہے تھے۔

☆......☆

پھوپی ٹھہر ٹھہر کر بتا رہی تھیں۔ اس دن میں لیٹی ہوئی تھی کہ نسیم کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ "فضیلہ بہن آپ نے مجھے بلایا تھا۔"

"آؤ نسیم میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" پھوپی نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اب بتاؤ مجھے اس دن تم کیا کہہ رہی تھی۔"

"میں تو وہی کہہ رہی تھی جو میں نے دیکھا اور سنا تھا۔" وہ اب بھی اپنی بات پر قائم تھی۔

"پہیلیاں مت بجھاؤ صاف صاف بتاؤ کیا دیکھا تھا تم نے۔" فضیلہ جاننے کے لیے بے چین تھی۔

"فضیلہ بہن یہ جو تمہاری بھابی ہے نا یہ کوئی عام عورت نہیں بلکہ بہت ہی چالاک ہے۔ اس نے ہی تمہاری بیٹی کو منحوس مشہور کیا تھا اور تو اور تمہارے ہونے والے داماد

### سرپرائز

لڑکی نے اپنے منگیتر کو بتایا۔ "تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی جب ہماری شادی ہوگی تو تمہارے گھر میں ایسی عورت آجائے گی جو کھانے پکانے میں بے حد ماہر ہے۔"

"اچھا!" منگیتر نے خوشگوار حیرت سے کہا۔ "مجھے معلوم ہی نہیں تھا تم کھانا پکانے میں ماہر ہو۔"

"میں اپنی بات نہیں کررہی۔" لڑکی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "شادی کے بعد میری اماں ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آجائیں گی۔"

خان ریاض، بنوں

### معمولی فرق

وہ اس کا جڑواں بھائی ہے جو ہو بہو اس کے مشابہ ہے۔ ایک ہی روز پیدا ہونے والے ان بہن بھائی میں معمولی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بھائی کی عمر پچاس سال ہے...... جبکہ وہ ابھی پچیس سال ہی کی ہے۔

ثمائلہ سہیل، شجاع آباد

## جریرؓ بن عبداللہ

انتقال 54ھ/673ء۔ صحابی تھے۔ یمن کے شاہی خاندان کے رکن اور قبیلہ بجلیہ کے سردار۔ ابوعمر کنیت تھی۔ نسب نامہ اس طرح ہے جریر بن عبداللہ بن جابر بن مالک بن نصر بن ثعلبہ بن جشم بن عوف بن خزیمہ بن حرب بن علی بن مالک بن سعد بن تدیر بن قسر بن عبقر ابن انمار بن اراش بن عمرو بن غوث بجلی۔ بعض روایات کے مطابق آنحضورؐ کے وصال سے 40 روز پیشتر ایمان لائے لیکن صحیح تر بات یہ ہے کہ آپ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضورؐ کے ہمرکاب تھے۔ ظاہر ہے آپ آنحضورؐ کے وصال سے چار پانچ ماہ پیشتر ایمان لائے ہوں گے بقول واقدی آپ رمضان میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ جب آپ آنحضورؐ کی خدمت میں قبول اسلام کے لیے حاضر ہوئے تو آنحضورؐ نے دریافت فرمایا کہ کیسے آنا ہوا۔ عرض کیا اسلام قبول کرنے آیا ہوں۔ آنحضورؐ نے آپ کے لیے اپنی چادر بچھادی اور فرمایا مسلمانو جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز آدمی آئے تو اس کی عزت کیا کرو۔ حجۃ الوداع کے موقع پر مجمع کو خاموش کرانے کی خدمت آپ ہی کے سپرد تھی۔ فتح مکہ کے بعد اگرچہ عرب کے تمام قبیلے تقریباً اسلام کے حلقہ اثر میں آچکے تھے لیکن صدیوں کے اعتقاد کی وجہ سے توہم پرستی باقی تھی چنانچہ وہ صنم کدوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اس وہم کو دور کرنے کے لیے آنحضورؐ نے کئی صنم کدے گرادیے۔ یمن کے صنم کدہ ذی الخلیفہ کو جو کعبہ یمانی کے نام سے مشہور تھا ڈھانے کی خدمت جریرؓ کی سپرد ہوئی۔ چنانچہ آپ نے ایک سو پچاس

پر بھی اسی نے کالا جادو کروایا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے ایک بابا سے تعویذ لیتے دیکھا تھا۔"

"بھابی ایسا کیوں کریں گی۔" مجھے اب تک یقین نہیں آیا تھا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن اگر تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں تو میں تمہیں اس بابا کے پاس لے جاؤں گی جس سے تمہاری بھابی نے تعویذ لیے تھے شاید وہ تمہارے سوال کا جواب دے سکے۔"

"ٹھیک ہے کل صبح دس بجے آجانا پھر ہم اس بابا کے پاس جائیں گے۔" مجھے اب بھی اس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بہن میں پورے دس بجے آجاؤں گی لیکن تم اپنے ساتھ اپنی بھابی کی کوئی تصویر لے لینا اور کچھ پیسے بھی رکھ لینا۔"

"کیوں تصویر کی کیا ضرورت ہے؟"

"ارے فضیلہ بہن وہ بابا بہت ہی مشہور ہیں ان کے پاس بہت سے لوگ آتے ہیں انہیں پہچاننے کے لیے تصویر کی ضرورت ہوگی۔"

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ اور کل صبح دس بجے آجانا۔" میں نے اسے ہدایت دی۔

"ٹھیک ہے میں جاتی ہوں۔"

اگلے دن میں سب کی نظریں بچا کر گھر سے نکلی۔ گلی کے موڑ پر تسنیم کھڑی تھی۔ اس نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آدھا گھنٹے میں ہم پہنچ جائیں گے۔"

جب ہم بابا کے محلے میں پہنچے تو میں نے کہا۔ "یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو تسنیم، اتنا گندہ راستہ، ہر طرف جھاڑیاں، جانوروں کی ہڈیاں۔ یہ کس واہیات جگہ رہتا ہے بابا۔" میں نے اپنی ناک کے آگے دوپٹا رکھا ہوا تھا۔

"فضیلہ بہن یہ کالے جادو والے بابے اسی طرح گندی جگہوں پر رہتے ہیں میں نے سنا ہے کہ ایسی جگہوں پر رہنے سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔"

"میں اپنی بھابی کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ ایسی گندی جگہ پر کبھی بھی نہیں آسکتیں۔"

"اب دروازے تک آچکی ہو تو اندر آکر ایک بار بابا سے مل لو پھر اس کے بعد ہی فیصلہ کرنا کہ میں سچ بول رہی ہوں یا جھوٹ" کہتے ہوئے وہ ایک مکان میں داخل ہوگئی۔

"سلام بابا، یہ میری بہن فضیلہ ہے وہ جو عورت آپ

سواروں کے دستے کے ساتھ یمن پہنچ کر ذی الخلیفہ کے صنم کدہ کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ابھی آپؓ یمن ہی میں تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا لیکن آپ کو اس بارے میں خبر نہ ہو سکی۔ ایک روز یمن کے دو آدمیوں کو حدیث نبوی سنا رہے تھے کہ انہوں نے کہا تم اپنے جس ساتھی کا حال سنا رہے ہو وہ تین روز ہوئے ختم ہو گیا۔ یہ وحشت ناک خبر سن کر آپ مدینہ کو روانہ ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں غالباً آپ نے خاموشی کی زندگی بسر کی۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں جریرؓ ہمدان کے گورنر تھے۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کی بیعت کر لی اور اپنے رقبہ حکومت میں حضرت علیؓ کی بیعت لے کر خلیفہ کے پاس کوفہ چلے آئے۔ جنگ جمل کے بعد جب حضرت علیؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو اپنی بیعت کے لیے خط لکھا تو اس خط کو حضرت امیر معاویہؓ کے پاس لے جانے والے بھی جریرؓ ہی تھے۔ جب اہل شام نے حضرت علیؓ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تو واپس آ کر مطلع کیا اور حضرت امیر معاویہؓ کے جنگی انتظامات سے بھی مطلع کیا۔ پھر آپ نے قرقیسیا میں جا کر سکونت اختیار کر لی اور خاموشی کی زندگی بسر کرنے لگے اور یہیں پر وفات پائی۔ آپ کی اولاد میں پانچ لڑکے عمر، منذر، عبیداللہ، ایوب اور ابراہیم تھے۔ آپؓ سے ایک سو کے قریب احادیث مروی ہیں جن میں سے آٹھ متفق علیہ ہیں۔ آپ سے روایت کرنے والوں میں آپ کے لڑکوں میں منذر، عبیداللہ، ایوب ابراہیم اور ان کے علاوہ ابوذرعہ بن عمر، انس، ابووائل، زید بن وہب، زیاد بن علاقہ، شعبی، قیس بن ابی حازم، ہمام بن حارث وغیرہ ہیں۔

مرسلہ: محمد اظہر الحسن۔ کوئٹہ

سے تعویذ لے کر گئی تھی یہ اس کی نند ہے۔"

"ہمارا کام تو لوگوں کی خدمت کرنا ہے اور میرے پاس تو دن میں بہت سے لوگ آتے ہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ تو کس عورت کی بات کر رہی ہے۔" بابا نے کہا۔

"بابا میں اس عورت کی بات کر رہی ہوں۔" اس نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ عورت...... ہاں یہ میرے پاس آئی تھی اپنی بیٹی کے لیے تعویذ لینے۔" بابا نے کہا۔

"بابا اس عورت نے آپ سے جھوٹ بولا تھا اس نے آپ سے جو تعویذ لیے تھے اس نے میری بہن کی بیٹی کی جان لے لی ہے۔" نسیم نے میرے درد کو تازہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو بی بی؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں بابا اسی لیے تو میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ اس نے آپ سے وہ تعویذ کس لیے حاصل کیے تھے آپ جتنے پیسے کہیں گے میں آپ کو دوں گی لیکن خدا کے لیے مجھے سچ بتا دیجئے۔"

"اس عورت نے مجھے کہا تھا کہ اس کی ایک سات سال کی بیٹی ہے جس پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے اس لیے میں نے اسے تعویذ دیئے تھے کہ وہ کسی طرح یہ اس عورت کو کھلا دے جس نے اس کی بیٹی پر جادو کیا ہے۔ اس سے اس کی بیٹی پر سے جادو کا اثر ختم ہو جائے گا اور اس عورت پر الٹا اثر شروع ہو جائے گا۔" بابا نے تفصیل سے آگاہ کیا۔

"بابا جو تعویذ آپ نے اس عورت کو دیئے تھے اس سے کیا اثرات ہو سکتے تھے۔"

"جو بھی وہ تعویذ پیئے گا وہ بے چین ہو جائے گا اور اس کی زندگی سے خوشی کے اجالے دور اور غم کے سائے چھا جائیں گے اور لوگ اس سے نفرت کریں گے، اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا گوارہ کریں گے۔"

"کیا لوگ اسے منحوس بھی سمجھیں گے۔" نسیم نے اپنی طرف سے اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں لوگ اسے منحوس سمجھیں گے اور اس سے دور ہی رہیں گے۔" بابا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر رک کر بولی۔

"یہی سب تو ہماری سائرہ کے ساتھ ہوتا رہتا تھا۔"

نسیم اور بابا کی باتیں سن کر فضیلہ کا ذہن مزید الجھ گیا تھا۔

"مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میری بیٹی سے

اس کی کیا دشمنی تھی۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو وہی بتا سکتی ہے کہ کس بات کا بدلہ لیا ہے اس نے تم سے لیکن جو بھی تمہاری بھابی نے کیا ہے وہ بہت غلط ہے اور میرے خیال سے تمہیں اس کا بدلہ ضرور لینا چاہیے۔'' نسیم نے اسے ورغلانے کی کوشش کی۔

''چلو میرے ساتھ میں ابھی جا کر بھائی کو بتاتی ہوں کہ اس کی بیوی یہ سب کیا کرتی پھر رہی ہے۔''

''فضیلہ بہن، تم اچھی طرح جانتی ہو کہ محمود بھائی ان سب باتوں پر یقین نہیں کرتے اور تو اور اس بات کا تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں اس عورت نے میری بیٹی کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئی اور تم چاہتی ہو کہ میں اسے چھوڑ دوں میں اس ناگن کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گی۔'' میں نے غصیلے انداز میں کہا۔

''ارے فضیلہ بہن اپنے ہاتھوں سے اسے مار دو گی تو خود بھی جیل چلی جاؤ گی۔ جب ہمارے پاس کالے جادو جیسا ہتھیار ہے تو تمہیں اپنے ہاتھ خون سے رنگنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے نسیم کی طرف دیکھا۔

''تم چلو میرے ساتھ میرے گھر، میں تمہیں سب کچھ سمجھاتی ہوں۔'' کہہ کر وہ بابا کے کمرے سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ رکشا والا منتظر تھا۔ ہم اس میں بیٹھ کر نسیم کے ہاں آ گئے۔

''ہاں نسیم اب بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔'' میں نے اس کے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے فضیلہ بہن پہلے آرام سے بیٹھ تو جاؤ پھر سب کچھ سمجھاتی ہوں۔''

''دیکھو تمہاری بھابی سے بدلہ لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے بھی وہی تکلیف دو جو اس نے تمہیں دی ہے۔'' نسیم نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ بھی کہنا ہے صاف لفظوں میں کہو۔''

''مطلب یہ کہ اگر تم اسے مار دیتی ہو تو یہ تو اس کے لیے ایک بہت ہی چھوٹی سی سزا ہو گی، تمہارا بدلہ صرف اسی صورت پورا ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ وہی سب کرو جو اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔''

''مجھے اب بھی تمہاری بات سمجھ نہیں آئی۔'' میں اس کی پہیلیوں سے تھک چکی تھی۔

''ارے تم تو واقعی بہت بھولی ہو، میرا مطلب ہے کہ اگر اس نے تمہیں اولاد کا دکھ دیا ہے تو تم بھی اسے اولاد کا دکھ دو۔'' اب اس نے مکمل کر وضاحت کی تھی۔

''تم کہنا چاہتی ہو کہ میں اپنی سائرہ کا بدلہ لینے کے لیے اجالا کی جان لے لوں...... تم نے یہ سوچا بھی کیسے وہ معصوم بچی ہے میں کیسے اس کی جان لے سکتی ہوں۔'' میں غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تو کیا تمہاری سائرہ معصوم نہیں تھی۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔'' نسیم نے مجھے جذبات میں لانے کی کوشش کی۔

''لیکن میں پھر بھی کسی کی جان نہیں لے سکتی۔'' میں نے ایک بار پھر اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

''اگر تم اس کی جان نہیں لینا چاہتی تو تمہاری بھابی سے بدلہ لینے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے غور سے نسیم کو دیکھا۔ ''اس نے تو تم سے ایک بیٹی دور کی ہے تم اس کے تینوں بچوں کو اس سے دور کر دو میرا مطلب یہ ہے کہ ان سب کے دل میں ایک دوسرے کے لیے نفرت پیدا کر دو یعنی اس کے بچے زندہ بھی رہیں گے اور اسے اولاد کی خوشیاں بھی نصیب نہیں ہوں گی اور اس کی شروعات ہم فہد سے کریں گے۔''

''ہاں یہ طریقہ ٹھیک ہے اس سے کسی کی جان بھی نہیں جائے گی اور میرا بدلہ بھی پورا ہو جائے گا۔''

☆......☆

اگلے دن نسیم پھر آ گئی۔ ''ارے فضیلہ بہن یہ لو میں بابا سے تعویذ لے آئی ہوں۔'' اس نے چپکے سے تعویذ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''بابا کہہ رہے تھے کہ یہ تعویذ پانی میں گھول کر پلا دینا پھر دیکھنا اسے پینے والا کیسے تمہارے اشارے پر ناچتا ہے۔''

''بہت اچھے نسیم تمہارا بہت شکریہ۔'' میں نے تعویذ لے لیا۔

''یہ تعویذ تم اپنی بیٹی مائرہ کے ذریعے اپنی بھابی کو دے دینا۔''

''پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر کیا، تمہاری بھابی سے سب نفرت کرنے لگیں۔ ہاں ایک کام اور کرنا مائرہ اور سائرہ کی لکھائی بالکل ایک جیسی ہے۔ میں جو کچھ کہوں اسے مائرہ سے لکھوا کر مجھے دے

دینا۔‘‘

’’اس سے کیا ہوگا؟‘‘

’’وہ کسی طرح محمود بھائی تک پہنچانا ہے۔ یہ کہہ کر کہ یہ مجھے سائرہ کے کمرے سے ملا ہے۔‘‘

’’اس سے کیا ہوگا۔‘‘ میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔

’’اس کے بعد جو ہوگا اس کا تو تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتی تم تو بس دیکھتی جاؤ۔‘‘

اس کے اگلے دن بھائی نے تمہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے اگلے روز پھر نسیم آگئی۔

اس کے کچھ دن بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے دہلا گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یوں آناً فاناً اجالا موت کی گود میں چلی جائے گی۔ ایک دن غصے میں بھری بیٹھی تھی کہ نسیم آگئی۔ اسے دیکھتے ہی چیخی۔ ’’ارے نسیم...... تجھے خدا کا خوف نہیں رہا یہ تو نے کیا کر دیا ایک معصوم بچی کی جان لیتے ہوئے تیرے ہاتھ نہیں کانپے۔‘‘

’’میں نے کیا کیا ہے فضیلہ بہن۔‘‘ اس کے لہجے میں معصومیت بھری ہوئی تھی۔

’’اتنی بھولی نہ بن ابھی ابھی مجھے اسپتال سے فون آیا ہے کہ اجالا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔‘‘

’’ہاں تو اس میں میرا کیا قصور ہے جو بھی کیا ہے تم نے خود ہی کیا ہے۔‘‘ اس نے مجھ پر الزام لگاتے ہوئے کہا۔

’’میں نے تو تمہیں اجالا کے بال دیتے وقت سختی سے منع کیا تھا کہ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے لیکن تم نے...... میں تمہیں اس گھٹیا کام کی سزا دلوا کر رہوں گی۔‘‘

’’کیسی سزا اور کس کام کی سزا......‘‘ اس نے ایک دھکا مارا اور میں دور جا گری۔ ’’میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ کالے جادو کی کوئی سزا نہیں ہوتی کیونکہ اس کا کوئی ثبوت ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے مجھے سزا دلوانے کی تمہاری خواہش تو پوری نہیں ہوسکتی۔‘‘

’’میں محمود بھائی کو سب کچھ بتا دوں گی پھر دیکھنا وہ تمہارا کیا حال کرتے ہیں۔‘‘

’’بے وقوف عورت کیا بتاؤ گی اپنے بھائی کو کہ میں نے تمہاری بیٹی پر کالا جادو کروایا تھا لیکن کالے جادو کے لیے مجھے اس کے بال کس نے دیئے تھے اس کی اپنی پھپھو نے اور جب وہ میری یہ بات سنے گا تو بالکل پاگل ہو جائے گا پھر میرا تو جو ہوگا وہ ہوگا لیکن تمہارا کیا حال ہوگا ذرا وہ سوچو......‘‘ اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

’’لیکن تم نے ایسا کیوں کیا آخر اس معصوم بچی نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟‘‘

’’تو کیا میری بچی معصوم نہیں تھی جس کی دوائی کے لیے میں نے تمہاری بھابی سے پیسے مانگے تھے اور اس نے یہ کہہ کر مجھے گھر سے نکال دیا تھا کہ یہ تو روز روز کا ڈراما ہے۔ میری چھوٹی سی بچی نے دوائی نہ ملنے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر جان دے دی تھی۔‘‘ اس نے روتے روتے اپنا حال بیان کیا۔ ’’میں نے تو اسی دن سوچ لیا تھا کہ میں اس سے بدلہ لے کر رہوں گی اسی لیے میں نے تمہاری بیٹی کو منحوس مشہور کیا اور الزام تمہاری بھابی پر لگا دیا اور پھر تم نے غصے میں آکر بدلہ لینے میں میری مدد کی۔‘‘ اس نے وضاحت سے کہا۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆......☆

جانتی ہو ماہم میں نے پوری کہانی سن کر پھوپی سے کیا کہا۔

’’پھوپو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ اتنا گرا ہوا کام کر سکتی ہیں۔‘‘

’’مجھے میرے کیے کی سزا مل رہی ہے بیٹا میں تو زندہ ہی اس لیے تھی کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔‘‘

’’آپ کو شرم نہیں آئی کہ اتنا گرا ہوا کام کرنے کے بعد معافی مانگ رہی ہیں، میں آپ کو اس دنیا میں تو کیا حشر کے دن بھی معاف نہیں کروں گا۔‘‘ میں نے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

’’بدلے کی آگ نے آپ کو اتنا اندھا کر دیا کہ آپ نے ایک چھوٹی سی بچی کو بھی نہیں بخشا۔‘‘ ماہم کو بھی پھوپی سے نفرت ہو رہی تھی۔

’’امی اگر آپ نے اسے اپنی بھتیجی نہیں سمجھا تھا تو یہ تو سمجھ سکتی تھیں کہ وہ آپ کی بیٹی کی نند ہے، اب میں کیا منہ دکھاؤں گی گھر والوں کو۔ آپ نے تو مجھے کسی سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔‘‘ یہ فضیلہ کے گناہوں کی سزا تھی کہ آج اس کی اپنی بیٹی اسے کوس رہی تھی۔

☆......☆

’’ارے یہ ساحر اور مائرہ کہاں رہ گئے ابھی تک آئے نہیں۔‘‘ امی نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بابا میں ان دونوں کو بلا کر لاتی ہوں۔" ماہم ان دونوں کو بلانے چلی گئی۔

"میں مائرہ کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ بہت ہی اچھی بچی ہے اپنی ماں کی اس حرکت کی وجہ سے وہ ہمارا سامنا کرنے سے کترا رہی ہے۔" ابو نے اپنی رائے دی۔

"یقین نہیں آتا کہ فضیلہ اتنا بڑا گناہ کر سکتی ہے۔" امی کو اب تک یقین نہیں ہو رہا تھا۔

"غصہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے پھر اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔"

"اتنا اندھا کر دیتا ہے کہ اسے اپنے رشتوں کا بھی کوئی خیال نہیں رہتا۔" امی کے لہجے میں غصے اور غم کے ملے جلے اثرات تھے۔

"اگر اس نے رشتوں کا خیال نہیں کیا تو تم ہی کر لو اس وقت موت کے قریب ہے اسے معاف کر دو ویسے بھی اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

"وہ جو سزا بھگت رہی ہے وہ اسی کے لائق ہے میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"اچھا ابھی اپنا موڈ ٹھیک کرو بچے آ رہے ہیں۔" ابو نے کہا۔

"السلام علیکم۔" مائرہ اور ساحر نے سب کو سلام کیا۔

"کیا بات ہے، آج تو بابا بھی ناشتے کی میز پر......" ساحر کو حیرت ہوئی تھی۔

"میری بہو نے کھانا بنایا ہے تو میں بھی کھانے چلا آیا۔"

"مطلب کہ آج کھانا بھابی نے بنایا ہے۔" ساحر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا اس سے پہلے کہ سب کھانا شروع کریں مجھے آپ سب سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" ماہم نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"ہاں بیٹا بولو کیا بات ہے۔" ابو نے ماہم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"بابا میں جانتی ہوں کہ پھوپو نے جو کچھ بھی کیا وہ غلط کیا لیکن......"

"ماہم میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ تم اس بارے میں کوئی بات نہیں کرو گی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"فہد پلیز مجھے بات کرنے دو پھر جو تم کہو گے میں وہی کروں گی۔" ماہم نے درخواست کرنے والے لہجے میں کہا۔

"ایک بار سب سن لو کہ ماہم کیا کہنا چاہتی ہے اس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تم لوگوں کو کیا کرنا ہے۔" ابو نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ بے شک میں نے اجالا کو دیکھا نہیں لیکن میں بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی آپ سب لوگ کرتے ہیں۔ لندن میں ہر سال ہم اس کی سالگرہ مناتے تھے یقیناً کسی اپنے کو کھونے کا غم بہت بڑا ہوتا ہے میں دس سال کی تھی جب میں نے اپنے ماں باپ کو کھو دیا تھا لیکن میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئی اور دیکھ لیں آج اللہ تعالیٰ نے آپ سب کو میری زندگی میں شامل کر دیا۔" سب بڑی غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"دیکھیں پھوپو نے بہت بڑی غلطی کی ہے بلکہ گناہ کیا ہے لیکن اب وہ اس گناہ کی سزا بھگت رہی ہیں اور اب ان کے پاس بہت کم سانسیں بچی ہیں اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ سب بھی پھوپو کو معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو بہت جلد آپ کی اجالا واپس لوٹا دے گا میرے بچے کی صورت میں۔" اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ماشاء اللہ...... کتنے دنوں بعد ہمارے گھر میں بھی کوئی خوشی آئی ہے میں اسی خوشی میں فضیلہ کو معاف کرتا ہوں۔" ابو نے پہل کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھی معاف کرتا ہوں۔" ساحر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اگر تم بچوں کی یہی خوشی ہے تو میں بھی فضیلہ کو معاف کرتی ہوں۔" امی نے بھی خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اب سب کی نظریں فہد پر جمی ہوئی تھیں۔

"فہد بھائی آپ بھی پلیز امی کو معاف کر دیں۔" مائرہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں بھی پھوپو کو معاف کرتا ہوں۔" میں نے بھی بالآخر پھوپو کو معاف کر دیا۔ یوں بھی پھوپو کو استعمال کیا گیا تھا۔ اصل مجرم تو تسنیم تھی یا وہ کالا جادو کرنے والا تھا یا ہم جیسے کم عقل ہیں جو کالا جادو ...... کرتے ہیں۔ جس کو کرانا ... بھی کفر ہے۔

زندگی کے تماشے بھی عجیب ہوا کرتے ہیں۔
امی نے مجھ سے کہا۔ ''ارسلان۔ اب میں یہ چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی ہوجائے۔''
''امی کچھ دن تو آزاد رہنے دیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''بس بہت ہو گئی آزادی۔ اب خدا کے فضل سے تمہاری نوکری بھی ہے۔ تنخواہ بھی بہت معقول ہے۔ اب اور کتنا انتظار کروں۔''

# قسمت کا کھیل

محترم مدیر
السلام علیکم
میں نے اپنی سرگزشت لکھی ہے۔ پتا نہیں کہانی بن پائی ہے یا نہیں، میں نے اپنے طور پر تو سرگزشت کی سچ بیانیوں کا انداز اختیار کیا ہے لیکن میں کہہ نہیں سکتا کہ اس میں قارئین کی دلچسپی کا مواد ہے بھی یا نہیں۔ اس لیے التجا ہے کہ اسے کسی اچھے قلم کار سے تصحیح کرا لیں۔ تمام قارئین سے استدعا ہے کہ وہ میرے لیے دعا کریں کہ میرے والد صاحب گھر لوٹ آئیں۔
ارسلان
(فیصل آباد)

"او ہو۔ امی پہلے کوئی ڈھنگ کی لڑکی تو دیکھ لیں۔"
"دیکھ لی ہے میں نے۔"
"اس چڑیل کی طرح نک چڑھی مت دیکھ لیجیے گا۔" میں نے شرارت بھری نگاہوں سے نادیہ کو دیکھا۔
وہ بپھر گئی۔ "اچھا تو میں نک چڑھی ہوں۔ تم خود گھونچو ہونا۔"

میں اسے چھیڑتا رہتا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان صرف تین برس کا فرق تھا۔ ہماری لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ ایک نمبر کی لڑاکا تھی۔ جب مجھ سے لڑنے پر آتی تو مجھے پریشان کر کے دکھ دیتی۔ ورنہ تو میرا اتنا خیال رکھتی تھی کہ میں اسے دعا ہی دیا کرتا تھا کہ خدا اس کے نصیب میں ایسا لڑکا ہو جو اس کو اچھی طرح سمجھ سکے۔ اس کا خیال رکھ سکے۔

میں فی الحال شادی کے موڈ میں نہیں تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ پہلے نادیہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ میں تھوڑا سا سیٹ ہو جاؤں۔ اس کے بعد شادی کا سوچوں گا۔

ویسے بھی میری زندگی میں ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ یعنی کوئی ایسا نہیں تھا۔ جس کے لیے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا رہتا۔ یہ سمجھ لیں کہ دل کے قریب کوئی نہیں تھا۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ زندگی بالکل روکھی سوکھی گزاری ہو۔ نہیں۔ لڑکیاں میرے قریب آتی رہی تھیں۔ محلے کی یا خاندان کی۔ یا کالج کی لیکن ان میں سے کوئی بھی مجھے اس پوائنٹ آف ویو سے پاس نہیں آئی تھی کہ اس کو جیون ساتھی بنا لیتا ہے۔

اسی لیے شادی میں کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن ابھی سیٹ نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ امی خدا جانے کس کو پسند کر لیتیں۔ میں نے تو اپنی شادی کا معاملہ ان ہی پر چھوڑ دیا تھا۔ جو وہ سوچ سکتیں تھیں وہ میں نہیں سوچ سکتا تھا۔

میں اگر یہ کہوں کہ میں اپنے والدین کا فرمانبردار بیٹا تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہو گا۔ میں نے کوئی بات کبھی ان کے خلاف نہیں کی۔ زندگی ان ہی راستوں پر گزاری جو راستے انہوں نے بنا دیئے۔ تعلیم ان کے کہنے پر ہی حاصل کی جو ان کی خوشی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں انجینئر بن جاؤں اور میں انجینئر بن گیا۔

ابو اور امی نے مجھے پیار بھی تو اتنا دیا تھا۔ ویسے تو دنیا کے ہر والدین اپنی اولاد سے پیار کرتے ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ہو گا۔ جس نے اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کی خواہش نہ کی ہو۔ اس کے لیے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں نہ مانگی ہوں۔

ویسے بھی ہم صرف دو ہی تو تھے، میں اور نادیہ۔ ویسے میں اتنا تو ضرور جانتا ہوں کہ اولاد چاہے جتنی بھی ہو، والدین کی توجہ ہر ایک پر ایک جیسی ہوا کرتی ہے۔ اور ہم تو ویسے بھی دو ہی تھے۔

ایک بات یہ تھی کہ امی اور ابو نادیہ کو بہت مانتے تھے۔ شاید مجھ سے بھی زیادہ۔ اسی لیے وہ مجھ سے اکڑی رہتی تھی۔ جہاں میں نے کچھ کہا وہ فوراً شکایت لے کر پہنچ گئی اور میں اپنی صفائیاں دیتا رہتا۔

یہی تو پیار ہوتا ہے۔ رشتے اسی کو کہتے ہیں۔ لڑنا جھگڑنا۔ روٹھ جانا۔ ایک دوسرے کو منانا۔ ایک دوسرے کے لیے تحفے لانا۔ اور کیا ہے۔ وہ دونوں کی لاڈلی تھی اور آج بھی ہے۔ میں بھی کبھی شرارت میں کہا کرتا۔ مجھے تو بے کار میں پیدا کیا گیا ہے۔ بس نادیہ ہی کو پیدا کر لیتے۔

میرے ابو دبئی میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ سال میں دو بار پاکستان آیا کرتے اور ان کی آمد ہمارے لیے عید بن کر آتی۔ دنیا بھر کی تفریح۔ فرمائشیں۔ روز باہر کے کھانے۔ شاپنگ اور نہ جانے کیا کیا۔

نادیہ تو ان کے لیے پاگل ہی رہتی تھی۔ خود میرا بھی یہی حال ہوتا تھا۔ میں بھی کالج یا دفتر وغیرہ سے چھٹی لے لیا کرتا۔ پھر تفریح ہوا کرتی۔

ابو جب پچھلی بار آئے تو انہوں نے ہماری سہولت کے لیے ایک گاڑی خرید لی تھی۔ میں نے جب ڈرائیونگ سیکھ لی تو نادیہ کو بھی سکھا دیا۔ جب میں گھر پر نہیں ہوتا تو نادیہ ہی امی کو کہیں لایا لے جایا کرتی تھی۔ وہ بہت اچھی ڈرائیونگ کرنے لگی تھی۔ مجھے اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر خوشی ہوا کرتی۔ اس کی ڈرائنگ بھی بہت اچھی تھی۔ بلکہ اس نے ایک آرٹ کالج سے باقاعدہ اسکیچنگ بھی سیکھی تھی۔ اس نے ہم سب کے پورٹریٹ بنائے تھے اور اتنے باکمال کہ جیسے کسی پروفیشنل نے بنائے ہوں۔ ہم نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی ہی کی تھی۔ کیوں کہ ہمارے پورے گھر کا مزاج دوستانہ سا تھا۔ گھر میں کبھی لڑائی جھگڑے کا ماحول نہیں ہوا۔

میں اپنی کہانی میں گھر کے پورے ماحول سے اس لیے واقف کرا رہا ہوں تاکہ پڑھنے والوں کو احساس ہو سکے کہ ہم نے کس انداز سے زندگی گزاری ہے اور اچانک جب زلزلہ سا آ جائے تو پھر کیا ہوتا ہے۔ جب سب کچھ اچانک بدل کر رہ جائے تو انسان کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے۔

تو اس کہانی کا آغاز ایک عام سی بات سے ہوا۔ یعنی

امی نے کہا کہ وہ میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ایک عام سی بات تھی۔ ہر گھر میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ والدین کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ بیٹا جب نوکری کرنے لگے اور اس کی کوئی سمت متعین ہو جائے تو اس کی شادی کر دی جائے۔

لیکن اصل کہانی کا آغاز اس وقت ہوا۔ جب میں نے شادی کی ہامی بھری۔

امی نے جب ایک بار اور یہ بات کی تو میں نے کہا۔ ''چلیں ٹھیک ہے۔ میں شادی کرنے کو تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا۔''

''میں پہلے اس لڑکی کو دیکھوں گا۔ اس سے باتیں کروں گا۔ یہ دیکھوں گا کہ وہ میرے مزاج کے مطابق ہے بھی یا نہیں۔''

''تم اس لڑکی کو دیکھ بھی چکے ہو۔ اور اس سے باتیں بھی کر چکے ہو۔'' امی نے بتایا۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے کہا نا کہ تم اس لڑکی کو بہت اچھی طرح جانتے ہو۔''

اب میں نے اپنا ذہن خاندان کی لڑکیوں کی طرف دوڑانا شروع کر دیا۔ کون ہو سکتی تھی؟ بڑی خالہ کی لڑکی انیسہ۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی فریحہ۔ پھوپی کی بھی دو لڑکیاں تھیں۔ ان ہی میں سے کوئی ایک ہو سکتی تھی۔

جب میں نے یکے بعد دیگرے ان لڑکیوں کے نام بتائے تو امی انکار کرتی چلی گئیں۔ ''نہیں ان میں سے کوئی نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''تو پھر آپ ہی بتا دیں۔''

''اس لڑکی کا نام ہے نادیہ۔'' امی نے کہا۔

''نادیہ۔'' میں نے حیران ہو کر امی کی طرف دیکھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کون نادیہ؟''

''میرا خیال ہے کہ تم صرف ایک ہی نادیہ کو جانتے ہو۔ میں اسی کی بات کر رہی ہوں۔'' امی نے کہا۔

''کیا کہہ رہی ہیں؟''

''ہاں بیٹا۔'' امی نے ایک گہری سانس لی۔ ''نادیہ تمہاری بہن نہیں ہے۔''

یہ ایسا انکشاف تھا جس نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ اتنی بڑی بات آج تک مجھے معلوم ہی نہیں ہو

سکی۔ امی یوں ہی تو نہیں کہہ رہی ہوں گی، کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔

نادیہ میری بہن نہیں ہے لیکن کیسے؟ وہ تو میرے ساتھ تھی۔ اگر یہ سچ تھا تو کسی نے اب تک بتایا کیوں نہیں؟ کوئی تو بتا دیتا۔ خاندان میں اتنے لوگ تھے۔ کسی کو تو معلوم ہوگا۔ خالائیں۔ پھوپیاں۔ کوئی تو اشارہ دے دیتا۔ کوئی تو کبھی سچ بول جاتا۔ لیکن سب خاموش تھے۔ آخر کیوں؟

اور دوسری بات یہ تھی کہ میں نے زندگی بھر نادیہ کو اپنی بہن ہی سمجھا۔ سمجھنا کیا وہ تو بہن ہی تھی۔ اس کے ساتھ ویسا ہی ہوتا رہا جیسے بہنوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ مار پیٹ۔ پیار۔ چھیڑ چھاڑ۔ روٹھنا ناراض ہونا۔ منانا۔ اب ایک دم سے میں یہ حقیقت کیسے برداشت کر سکتا تھا اور میں جانتا تھا کہ امی بھی یوں ہی نہیں کہہ رہی ہیں۔ اتنی بڑی بات کوئی یوں ہی کیسے کہہ سکتا ہے۔

امی کی طرف دیکھا۔ وہ پُرسکون تھیں۔ انہوں نے میری زندگی میں اتنی بڑی ہلچل مچا دی تھی اور خود پُرسکون ہو گئی تھیں۔ کمال ہے۔

''امی۔ خدا کے لیے بتائیں مجھے۔ یہ سب کیا ہے۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔''

''جب یہ صرف ایک سال کی تھی تو اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ تمہارے ابو کے دوست کی بیٹی تھی۔ تمہارے ابو ہی ایک دن اس کو اٹھا کر گھر لے آئے تھے۔ بچی بہت پیاری تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تمہارے ابو کا کوئی ایسا دوست بھی ہے۔ جو بہت بیمار رہتا ہے اور اس کی بیوی بھی ایک لاعلاج مرض میں مبتلا ہے۔ بہرحال میں نے اس بچی کو سچے دل سے قبول کر لیا اور اس کی پرورش کرنے لگی۔ تم اس وقت دو یا ڈھائی برس کے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے اس بچی سے محبت ہونے لگی۔ بالکل اپنی بچی کی طرح۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میں نے شاید تم سے زیادہ اس کو پیار دیا ہے۔''

''ہاں۔ یہ تو سچ ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''تو بیٹا یہ ہے نادیہ کی اصل کہانی۔'' امی نے کہا۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم دونوں اتنی آسانی سے اس حقیقت کو نہیں مان سکو گے۔ ایک دوسرے کو اس نئے روپ میں قبول کرنا تمہارے لیے آسان نہیں ہوگا۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دونوں کو ایک دوسرے سے اچھا جیون ساتھی بھی نہیں مل سکتا۔ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہو۔ ہر اچھے برے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔''

''لیکن امی وہ ساتھ تو کسی اور رشتے سے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ایک بھائی اپنی بہن کا ساتھ دے رہا تھا یا ایک بہن اپنے بھائی کا ساتھ دے رہی تھی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد جب دونوں اس نئے رشتے کو قبول کر لو گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' امی نے کہا۔ وہ اس رشتے کے لیے بہت سیریس تھیں۔

''امی۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں ابھی اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ میں سوچ کر جواب دوں گا۔ ہاں یہ بتائیں۔ آپ نے اس موضوع پر نادیہ سے بھی بات کی؟''

''ابھی نہیں۔ میں نے سوچا کہ پہلے تمہارا جواب لے لوں۔ اس کے بعد ہی بات کروں گی۔''

اس کے بعد سے میری ذہنی کیفیت بدل کر رہ گئی۔ سب کچھ وہی تھا۔ نادیہ بھی وہی تھی۔ میں بھی وہی تھا۔ ہم میں کوئی ظاہری تبدیلی نہیں آئی تھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے خدوخال بدل گئے ہوں۔ یا میرے سینگ نکل آئے ہوں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود سب کچھ اچانک بدل گیا تھا۔ اب میں اس کو دیکھتا تو عجیب سا احساس ہوتا۔ دراصل ذہنی تبدیلی ہی سب کچھ ہوا کرتی ہے۔ ورنہ انسان تو وہی ہوا کرتا ہے۔

اب جب وہ میرے سامنے آتی تو میں اس سے جھینپنے لگتا۔ اس سے کترایا کرتا۔ امی نے ابھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ انہیں میرے جواب کا انتظار تھا۔ ایک دن نادیہ نے پیچھے سے آ کر میرا کالر پکڑ لیا۔ ''اے۔ گھونچو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' میں گڑبڑا کر بولا۔

''پھر مجھ سے کیوں چھپے چھپے پھرتے ہو۔ بھول جاؤ یار۔ تم نے اس دن جو مجھ سے ادھار لیے تھے۔ وہ میں نہیں مانگوں گی۔''

میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔ ہم میں بے تکلفی بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ امی نے ابھی اس سے بات نہیں کی تھی ورنہ وہ خود مجھ سے شرمائی پھرتی۔

''بتاؤ نا۔ مجھ سے کیوں کترا رہے ہو؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''تم ایسا کرو۔ امی سے پوچھ لو۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب۔ تم کترا رہے ہو اور پوچھوں امی سے؟''

”ہاں۔ وہی صحیح بتا سکیں گی۔“

اس نے شاید اسی دن امی سے پوچھ لیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اس کی تفصیل بتانی آسان نہیں ہے۔ اس پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ قیامت تو میرے لیے بھی تھی۔ لیکن اس کا معاملہ بہت پیچیدہ سا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے والدین کون تھے۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ اس نے جس کو اپنی ماں سمجھا تھا وہ اس کی ماں نہیں تھی اور جو اس کا باپ تھا وہ اس کا باپ نہیں تھا اور جو اس کا بھائی تھا۔ وہ کچھ اور ہونے جا رہا تھا۔ اس کا دل و دماغ اس تبدیلی کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

وہ تو پاگل ہونے والی ہو گئی۔ میرا بھی حال کچھ ایسا ہی تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ ہم نے بچپن ایک ساتھ گزارا تھا۔ ایک ساتھ بڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کو بھائی بہن سمجھتے رہے تھے اور اب یہ اچانک پتا نہیں کیا ہو گیا تھا اور امی نے کوئی مذاق بھی نہیں کیا تھا۔ اس قسم کا مذاق کون ماں کر سکتی ہے۔

میں نے امی سے ایک دن پوچھا۔ ”امی! ایک بات بتائیں۔ کیا آپ نے نادیہ سے بات کر لی ہے۔“

”ہاں۔ اس کو تو بتانا ہی تھا۔ آج نہیں تو کل۔ اسی کا معاملہ ہے۔ اس کو نہیں پتا چلے گا تو اور کس کو پتا چلے گا۔“

”اس کا کیا حال تھا۔ کیا ری ایکشن تھا؟“

”جو کچھ بھی تھا۔ وہ تو ہونا ہی تھا۔“ امی نے بتایا۔ ”وہ سکتے میں رہ گئی تھی۔ پھر اتنا روئی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ کیوں کہ اس کے خیال میں وہ اس گھر کے لیے اب اچانک غیر ہو گئی تھی۔ پھر میں نے اسے دلاسہ دیا۔ اسے سمجھایا کہ پاگل مت بنو۔ تم کوئی غیر نہیں ہو۔ بلکہ ہماری جان ہو۔ اسی لیے تو تمہیں اس گھر کی بہو بنا رہے ہیں۔ تاکہ تم ہمیشہ ہماری نگاہوں کے سامنے رہو۔ تم ہمارے لیے سب کچھ ہو۔ پہلے کی طرح۔ بلکہ اب تو اور بہت کچھ ہو جاؤ گی۔ تب جا کر وہ بڑی مشکلوں سے چپ ہوئی تھی۔“

”مجھے تو اس کے سامنے جاتے ہوئے بھی جھجک ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو بیٹا۔ کبھی نہ کبھی اس حقیقت کو تو ماننا ہی ہو گا۔ فرض کرو اگر تم سے اس کی شادی نہیں ہوتی۔ پھر بھی تو یہ سچائی سامنے رہے گی۔“

ایک دن نادیہ خود میرے کمرے میں آ گئی۔ کتنا فرق ہو گیا تھا۔ وہ کتنے دنوں کے بعد آئی تھی۔ پہلے تو بے دھڑک گھس آیا کرتی۔ اگر میں سو رہا ہوں تو تکیے مار مار کر اٹھا دیا کرتی۔ اور میں اس کو برا بھلا کہتا ہوا بستر سے اٹھ جاتا اور وہ گلا پھاڑ کر چلاتی۔ ”اٹھو گھونچو، اب جو وہ آئی تو بالکل غیروں کی طرح۔

وہ ایک طرف آ کر کھڑی ہو گئی۔ بالکل خاموش۔ میں خود اس کے پاس چلا گیا۔ ”نادیہ۔ اب تو تمہیں پتا چل گیا نا کہ میں کیوں تم سے کترانے لگا تھا۔“

”ہاں۔ سمجھ گئی ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”نادیہ۔ اب ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم اس تلخ لیکن حیرت انگیز حقیقت کو تسلیم کریں اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ انکار کر دیں۔ لیکن پرابلم یہ ہے کہ انکار کی صورت میں بھی بات نہیں بنے گی۔ اب سب کچھ تم پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟ کیا تم نے اس مسئلے پر غور کیا؟“

”غور ہی تو کرتی رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہمیں سچائی کو قبول کر لینا چاہیے۔“

”اب ہی عقلمندی ہے نادیہ۔“

”لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میں تمہارا روایتی بیوی کی طرح احترام نہیں کروں گی۔“ اس نے کہا۔ ”تم سے لڑتی جھگڑتی رہوں گی اور جس طرح تمہیں گھونچو کہتی چلی آئی ہوں۔ اسی طرح کہتی رہوں گی۔“

”چلو منظور ہے لیکن میں بھی تمہیں چڑیل کہتا رہوں گا۔“

وہ مسکرا دی۔ اس کی یہ مسکراہٹ مجھے پہلی بار بہت مختلف لگی تھی۔ پہلے کی مسکراہٹ اور اس میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ اس مسکراہٹ میں وہ محبت شامل تھی جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ یہ مسکراہٹ ہمارے نئے رشتے کی ابتدا تھی۔

امی کو بھی جب محسوس ہوا کہ ہم نے سمجھوتا کر لیا ہے۔ تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

اب میں نادیہ کو لے کر آؤٹنگ کے لیے جانے لگا۔

طے یہ پایا تھا کہ ابو کے آنے کے بعد ہماری شادی کی تاریخ رکھی جائے گی۔

انسان بھی کیا ہوتا ہے۔ کس طرح اس کے جذبات اور احساسات بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کس طرح ہر قسم کے حالات سے سمجھوتا کرلیتا ہے۔ ہم نے بھی سمجھوتا کرلیا۔

اب ہم دونوں ایک دوسرے کے منگیتر اور لورز تھے۔ سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔ اس کو دیکھنے کا پوائنٹ آف ویو ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ اب ہمارے درمیان جو باتیں ہوتیں۔ ان کی نوعیت ہی کچھ اور ہوتی۔

ہم پہلے جس ہوٹل میں جایا کرتے تھے۔ اب بھی وہیں جاتے تھے۔ جس ساحلی مقام پر موج مستی کرتے۔ اب بھی وہیں جاتے۔ جس مال سے جا کر شاپنگ کرتے۔ اب بھی وہیں جاتے تھے۔ لیکن کتنی تبدیلی آگئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو سچے دل اور دماغ سے قبول کرلیا تھا۔

امی بھی یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتیں۔ پھر ایک دن ابو کا فون آگیا۔ وہ واپس آرہے تھے۔ ہم سب بہت ہی خوش تھے۔

امی نے کہا۔ ''بس تمہارے ابو کے آتے ہی ہم شادی کی تاریخ طے کرلیں گے۔ اور اس شادی میں کوئی جھنجھٹ بھی نہیں ہے۔ لڑکا بھی گھر کا ہے اور لڑکی بھی۔ نہ تو کوئی آرہا ہے اور نہ ہی کوئی جارہا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' میں شرارت سے بولا۔ ''لڑکی آپ کی ہے۔ جہیز تو دینا ہی ہوگا۔''

''اچھا۔ کیا لوگے جہیز میں؟''

''چلیں۔ آپ کی مجبوریاں دیکھ کر زیادہ تقاضہ تو نہیں کروں گا۔ بس ایک گاڑی دے دیجیے گا۔''

ہمارے درمیان اسی قسم کی باتیں ہوا کرتیں۔ زمانہ چاہے کچھ بھی کہے۔ بس ہمارا گھر خوش تھا۔

پھر ایک دن ابو بھی آگئے۔ اس دن نادیہ کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ ابو سے شرما بھی رہی تھی اور ان کے گلے بھی لگ رہی تھی۔ پہلے کی طرح۔ اور ابو بھی اس کو پیار کیے جا رہے تھے۔

امی نے اس دن ان سے کوئی بات نہیں کی۔

انہوں نے دوسری رات بات کی ہوگی۔ اسی لیے تیسری صبح قیامت کی صبح ہوگئی تھی امی نے بتایا کہ ابو نے اس رشتے سے انکار کردیا ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر یہ شادی نہیں کرنا چاہتے۔

یہ ایک شاکنگ نیوز تھی میں تو سکتے میں رہ گیا تھا۔ آخر کیوں۔ ابو نے اس رشتے سے انکار کیوں کیا؟ شاید ان کے ذہن میں ہوگا کہ ہم دونوں اب تک بہن بھائی کی زندگی گزارتے آئے ہیں۔ اب پتا نہیں اس تبدیلی کو قبول کریں یا نہ کریں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ہم نے ایک دوسرے کو اس نئے روپ میں قبول بھی کرلیا ہے اور بہت خوش بھی ہیں۔

میں نے امی سے کہا۔ ''آپ ابو کو سمجھائیں تو سہی کہ ہم ایک دوسرے کو اس روپ میں پسند کرنے لگے ہیں۔''

امی نے ابو سے بات کی۔ لیکن ابو اس بات پر اڑے رہے کہ وہ ہماری شادی کے سخت خلاف ہیں۔ اور کسی بھی حال میں یہ شادی نہیں ہوسکتی۔

یہ ایک نیا موڑ تھا۔ جب ہم ایک دوسرے کو دل و جان سے اپنا سمجھنے لگے تھے تو اس وقت ابو نے ایک فساد کھڑا کردیا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔

ایک دن امی نے مجھ سے کہا۔ ''بیٹا۔ اب صرف ایک راستہ رہ گیا ہے۔ تم خود ابو سے بات کرو۔ انہیں یقین دلاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ اور تم نادیہ کے ساتھ خوش رہو گے۔ ابھی تک تو صرف میں ان سے باتیں کرتی رہی ہوں۔ اب تم بات کرو۔''

''میں کیا بات کروں۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

''سوال اچھا لگنے یا نہیں لگنے کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ زندگی کا سوال ہے۔ نادیہ کے لیے بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ اس نے زندگی میں اگر کسی لڑکے کو دیکھا، تو وہ صرف تم ہو۔ چاہے وہ بھائی کے روپ میں ہو۔ اس کے بعد اب نیا رشتہ جو سامنے آیا ہے۔ وہ بھی تم ہی ہو۔ اسی لیے وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ تم ابو سے بات کرو۔ شاید ان کی سمجھ میں آجائے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ کہتی ہیں تو میں ان سے بات کرلیتا ہوں۔''

اس دن ابو اپنے کمرے میں اکیلے تھے۔ میں ان کے کمرے میں جا کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ انہیں میرے آنے کی خبر ہی نہیں ہوسکی تھی۔

جب کچھ دیر ہوگئی تو میں نے انہیں مخاطب کیا۔

''ابو۔''

وہ چونک پڑے۔ ''ارے تم کب آئے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ دیر ہوئی۔ لیکن آپ کسی خیال میں تھے۔ اسی لیے میں نے ڈسٹرب نہیں کیا۔''

''ہاں بیٹا۔'' وہ مسکرائے۔ بہت پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔ ''کہو خیریت تو ہے نا۔''

''ابو۔ آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''ہاں کہو۔''

''ابو وہ نادیہ اور میرا مسئلہ ہے۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے اس روپ میں بھی اچھی طرح گھل مل گئے ہیں۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ تم کیا کہنے آئے ہو۔ لیکن یہ شادی نہیں ہو سکتی۔'' ابو نے کہا۔

''آخر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

ابو کچھ سوچنے لگے تھے۔ میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ جب وہ بہت دیر تک خاموش رہے تو میں نے کہا۔ ''ابو بتائیں نا کیوں؟''

ابو نے میری طرف دیکھا۔ ''دیکھو بیٹا۔ بات یہ ہے کہ نادیہ تمہاری بہن ہے۔''

''جی ہاں۔ میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ لیکن اب سچائی سامنے آگئی ہے۔''

''نہیں بیٹا۔ سچائی سامنے نہیں آئی ہے۔'' ابو نے کہا۔ ''وہ سچائی جس کا علم تمہاری ماں کو بھی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بیٹا۔ نادیہ تمہاری بہن ہے۔'' ابو دھیرے سے بولے۔ ''یہ اور بات ہے کہ اس کو تمہاری ماں نے جنم نہیں دیا۔ لیکن وہ میری اولاد ہے۔ سگی اولاد۔ میں نے اس کی مرحومہ ماں سے شادی کی تھی۔ اس کا علم تمہاری ماں کو نہیں ہے۔ یہ ایک طویل داستان ہے کہ میں نے چھپ کر شادی کیوں کی تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ نادیہ کی بدقسمتی تھی کہ جب وہ بہت چھوٹی تھی تو اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ میں نے تمہاری ماں کو بتایا کہ یہ میرے ایک دوست کی بچی ہے۔ جبکہ وہ میری ہی بیٹی ہے۔''

میں تو پاگل ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کیسا کھیل تھا۔ پہلے بہن۔ پھر کوئی اور اب وہ پھر سے بہن بن گئی تھی۔ جس طرح رشتے بدل گئے تھے کیا اتنی ہی آسانی سے جذبات بھی بدل سکتے تھے۔ یہ ہمارے ساتھ کیسا ظلم تھا۔ کیا کر دیا تھا ابو نے۔

''ابو۔ آپ نے تو مجھے پاگل بنا دیا ہے۔'' میرا لہجہ تلخ

ایک آرٹسٹ نے ایک جنگلی لڑکی کو گڑ اور چنے دے کر ماڈل بننے پر راضی کر لیا اور اسے ایک درخت کی اونچی شاخ پر بٹھا کر تصویریں بنانے لگا۔

آدھ گھنٹے کے بعد لڑکی بے چینی سے پہلو بدلنے لگی تو آرٹسٹ بولا۔ ''سنا ہے جنگلی لڑکیاں بڑے صبر و ضبط اور برداشت والی ہوتی ہیں مگر تم تو آدھ گھنٹے میں ہی گھبرا گئی ہو۔''

لڑکی نے شاخ سے چھلانگ لگا دی اور کہا۔

''تم اس شہد کے چھتے پر مجھے آدھا منٹ بیٹھ کر دکھا دو تو مانوں۔''

مرسلہ: ذیشان احمد۔ سیالکوٹ

ہو گیا تھا۔ ''کتنی بڑی غلطی کی ہے آپ نے۔''

''بیٹے مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہاری ماں تمہارے لیے نادیہ ہی کا انتخاب کریں گی۔'' ابو نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے ان سے یہ راز چھپا کر رکھا تھا۔ اب بات کھل ہی گئی ہے تو تم کو بتا رہا ہوں۔ لیکن یہ اپنی ماں کو مت بتانا ورنہ میرے ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے گا۔''

''ابو۔ اب میں آپ سے کچھ کہہ تو نہیں سکتا۔ لیکن یہ اچھا نہیں ہوا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ راز تو کھل ہی جاتا ہے۔ خود سوچیں کیسا تماشا ہوا ہے بے چاری نادیہ کے ساتھ۔ پہلے وہ خود کو آپ کی اور امی کی اولاد سمجھتی رہی۔ ایک عرصہ اسی طور گزار دیا۔ پھر اسے پتا چلتا ہے کہ میں اس کا بھائی نہیں ہوں۔ آپ اس کے باپ نہیں ہیں۔ اور امی اس کی ماں نہیں ہیں۔ اس کے دل پر کیا گزری ہے اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ پھر امی نے ایک دوسرے رشتے کی پیشکش کی۔ اس نے کسی طرح اس رشتے کے لیے خود کو سمجھا لیا۔ اب یہ پتا چل رہا ہے کہ آپ اس کے باپ ہیں اور میں اس کا بھائی ہوں۔ یک بار پھر سب بدل کر رہ گیا۔ اب خدا جانے اس کا کیا ہوگا۔''

اب ایک بار پھر میں اس سے کترانے لگا۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن اس بار نوعیت شدید تھی۔ اس بار تو کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی تھی۔

"ایک بار نادیہ میرے کمرے میں آئی۔ وہ پہلے کی طرح پوچھنا چاہتی تھی کہ میں اس سے کترانے کیوں لگا ہوں۔ لیکن میں نے اس سے بے رخی اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ وہ مجھے بھول جائے۔ کیوں کہ میں اس کو حاصل نہیں کرسکتا۔"

"آخر کیوں؟ وہ بھڑ گئی تھی۔" کیا تماشا بنا رکھا ہے۔ کون ہوں میں۔ کیا میں انسان نہیں ہوں؟ کیا میری اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ جب چاہا بلا لیا۔ جب چاہا کوئی تماشا کھڑا ہوگیا۔"

"نادیہ۔ میں کیا کروں۔ کیسے تمہیں سمجھاؤں؟ تم یہ سمجھ لو کہ میرا اور تمہارا اس انداز سے ملاپ ناممکن ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا؟"

"آخر کیوں۔ اب کون سی نئی کہانی سامنے آگئی ہے؟"

میں نے سوچا کہ اسے بتا ہی دیا جائے۔ بہت ہوگئی۔ وہ بے چاری کب تک بے گناہی میں ماری جاتی رہے۔ یہ بھید تو اب کھلنا ہی تھا۔ اسی لیے میں نے اس سے کہا۔ "نادیہ۔ بات یہ ہے کہ تم میری بہن ہو۔"

"واہ۔ اچھا تماشا ہے۔" وہ غصے سے بولی۔ "کبھی بہن کبھی غیر۔ پھر بہن۔ کیا ہے یہ سب؟"

"نادیہ ذرا ٹھنڈے دل سے سن لو۔ جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ بتا رہا ہوں۔"

"چلو بتاؤ۔"

میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو مجھے ابو نے بتایا تھا۔

وہ اس طرح سکتے میں آگئی جیسے بے ہوش ہوگئی ہو۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ "نادیہ ہوش میں آؤ۔ سنبھالو خود کو۔"

اس کے بعد اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ میرے سینے سے لگ کر جو روئی ہے تو بس روتی ہی چلی گئی۔

پھر خاموش ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "بھائی۔" پتا نہیں میں تمہیں بھائی کہوں یا نہ کہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل پھر یہ خبر سننے کو ملے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ ابو نے غلط بیانی کی تھی۔ پھر کیا ہوگا۔ کیا گارنٹی ہے اس بات کی؟"

"نادیہ۔ میں خود پاگل ہو رہا ہوں۔ تقدیر کے اس کھیل کو کیا سمجھوں؟"

اس دوران امی بھی کمرے میں آگئیں۔ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ کوئی بات ہوگئی ہے۔ میں نے اب ان سے بھی چھپانا بے سود سمجھ کر سب کچھ بتا دیا۔ ان کا بھی وہی حال ہوا جو نادیہ کا ہوا تھا۔ پھر انہوں نے جو رونا شروع کیا ہے تو روتی ہی رہیں۔ میرا یہ حال تھا کہ میں کبھی نادیہ کو چپ کرداتا اور کبھی امی کو۔

امی کو اس بات کا دکھ تھا کہ ابو نے ان سے بے وفائی کی تھی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھیں۔ "میں اس شخص کو معاف نہیں کروں گی۔ اگر وہ شروع ہی میں یہ سب بتا دیتے تو ایسی کہانی تو نہیں ہوتی۔ میں نادیہ کو قبول کرلیتی۔ میں ایسے ہی دل کی ہوں۔ لیکن اس راز کو انہوں نے برسوں چھپائے رکھا۔ مجھے تو اس بات کا دکھ ہے جو زندگی بھر رہے گا۔"

اس کے بعد سے گھر کی فضا کچھ عجیب سی ہوگئی۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ امی اپنے کمرے میں اکیلی لیٹی رہتیں۔ ابو کا یہ حال تھا کہ وہ دن بھر نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے رہتے۔

پھر ایک دن ابو نہ جانے کہاں چلے گئے۔

وہ ہمیں چھوڑ کر ملک سے باہر بھی نہیں گئے تھے۔ کیوں کہ ان کا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات گھر میں ہی تھے۔ بس انہوں نے اپنے کچھ کپڑے لیے اور ایک رات بہت خاموشی سے کہیں چلے گئے۔ سب کچھ اسی طرح رہ گیا تھا۔

ہم نے ان کی تلاش میں کیا کیا نہیں کیا ہوگا۔ ان کے تمام جاننے والوں کے پاس جاتے رہے۔ تنگ آکر ہم نے اخبارات میں اشتہارات بھی دیے لیکن ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔

میں یہ کہانی اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر ابو کی نگاہ سے یہ کہانی گزرے تو خدا کے لیے واپس آجائیں۔ دس سال ہو گئے ہیں۔ آپ کو گئے ہوئے۔ امی نے تو کب کا آپ کو معاف بھی کر دیا ہے۔ نادیہ کی بھی شادی ایک بہت اچھے لڑکے سے ہوگئی ہے۔ وہ بہت خوش ہے اور میں نے بھی پھوپی کی بیٹی سے شادی کرلی ہے۔ ہم سب اطمینان کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سوائے امی کے جو آپ کے لیے روتی رہتی ہیں۔

اس کہانی میں ایک خاص بات جو میں سمجھانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ خدا کے لیے اگر آپ سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ بتا دیں سب کو۔ زیادہ سے زیادہ کچھ دنوں کی ناراضگی ہوگی۔ کم از کم یہ عذاب تو نہیں ہوگا جو ہم سبھوں پر مسلط ہے۔

# ناظر بھائی

محترمه عذرا رسول
السلام علیکم
ہمارے اطراف کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جنہیں بھلایا نہیں جاسکتا ...... ایسا ہی ایک کردار ہے ناظر بھائی کا۔ اس دور میں ایسے معصوم فطرت لوگوں کا جینا دو بھر ہے۔ اس کے اپنے بھی اسے سچی خوشی دے نہیں پاتے، میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ ماہنامہ پاکیزہ کے انداز سے ہٹ کر لکھوں لیکن کیا کروں کہ عرصہ سے خواتین کے پرچوں میں لکھتی رہی ہوں اس لیے پاکیزہ کے انداز تحریر کی جھلک آ ہی جاتی ہے پھر بھی یہ سچ بیانی قارئین کو پسند آئے گی۔
عظمیٰ سراج
(اسلام آباد)



ناظر بھائی کو پہلی بار میں نے آپا کی شادی میں دیکھا تھا۔ وہ آپا کے بالکل برابر میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن سہمے ہوئے سے۔

''یہ دولہا اتنا سہما ہوا کیوں ہے؟'' میں نے بیگم آپا کی سرگوشی سنی۔

''بھئی کچھ لوگ شادی کے بعد سہم جاتے ہیں اور کچھ عقل مند شادی پر ہی......'' مظہر بھائی نے بیگم آپا پر چوٹ کی۔

"اچھا! آپ یہ رننگ کمنٹری بند کریں اور دیکھیے منا کہاں ہے؟ کافی دیر سے نظر نہیں آرہا۔ نہ جانے آپ کا بھائی اسے لے کر کس ورلڈ ٹور پر نکلا ہوا ہے۔" بیگم آپا نے ہمیشہ کی طرح اپنے دیور کو رگڑ ڈالا۔

"عرشی چلو دولہا دلہن کے ساتھ ویڈیو بنواتے ہیں۔" منجھلی آپا نے ہم سے فرمائش کی۔

"ہاں چلیں۔ ہم تو کب سے تیار بیٹھے ہیں۔ اتنی دیر ہو گئی کبھی کوئی آجاتا ہے اور کبھی کوئی اور اس فوٹو گرافر کو تو دیکھو، جب بھی میں ناظر بھائی اور آپا کے ساتھ فوٹو بنانے کا کہتی ہوں تو کہتا ہے۔" بے بی آپ کی تصویر ابھی تو بنائی تھی۔"

"ہاں تو کیا ہے ایک تصویر اور بنادیں۔ آخر میری آپا کی شادی ہے کوئی مذاق تو نہیں۔" میں نے ویڈیو بنواتے ہوئے دور کھڑے فوٹو گرافر کو دیکھا جو اب باراتیوں کی تصویریں بنانے میں مصروف تھا۔

"ماشاء اللہ، بھئی جوہی پر تو کافی روپ چڑھا ہے۔" میں نے دوسرے صوفے پر دھری چھوٹی خالہ کی آواز سنی۔

"واقعی آپا کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ بالکل پری کی طرح۔" میں نے بھی رشک سے آپا کو دیکھا۔

"لیکن یہ ناظر بھائی اتنے پریشان سے کیوں ہیں؟ ویسے شکل صورت تو اچھی بھلی ہے۔ شاید طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" میرے ذہن نے ایک نکتہ پیش کیا۔

"رخصتی کے وقت امی آپا کے ساتھ بلک بلک کر رو دی۔ آپا بھی سب سے فرداً فرداً ملیں اور قرآن کے سائے میں پیا گھر کو ہولیں۔"

"مبارک ہو بھابی!" بڑی پھوپی نے آپا کے رخصت ہونے کے بعد امی کو مخاطب کیا۔

"شکر ہے میرے رب کا۔ جوہی کی طرف سے بڑی فکر مند تھی لیکن آج میری فکر ختم ہوئی۔" امی نے بڑی پھوپی کو پان پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہتی ہیں بھابی! ایک تو آج کل کی یہ لڑکیاں۔ ذرا سا پڑھ لکھ جائیں تو پھر شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہوتیں۔ اب میری زرتا کو دیکھو۔ جب اس سے شادی کا کہو تو فوراً کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ دیتی ہے۔" بڑی پھوپی کو اپنی بیٹی یاد آگئی۔

"راحت، میری مانو تو فوراً کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر زرتا کے ہاتھ پیلے کردو۔ اگر جوہی کی طرح اس کی عمر نکل گئی تو بعد میں بڑی مشکل ہو جائے گی۔" امی نے اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں بڑی پھوپی کو کارآمد بات بتائی۔

"ہوں..... بھابی! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب ایسا ہی کرنا ہوگا۔" بڑی پھوپی نے گہری سوچوں کے درمیان کہا۔

جہاں آراء جوہی میری بڑی آپا ہیں۔ انہیں اللہ نے پرکشش خدوخال کے ساتھ سلیقہ مندی، ہمدرد طبیعت اور اچھی عادات سے بھی نوازا ہے لیکن نہ جانے کیا تھا؟ ان تمام خوبیوں کے باوجود ان کا مناسب جگہ رشتہ نہ ہو پا تا تھا یوں ہی وقت گزر رہا تھا۔

اب امی کی تشویش بڑھنے لگی۔ آپا کی شادی کی عمر بیت رہی تھی لیکن نہ جانے ان کا بر کہاں کس کونے میں چھپا بیٹھا تھا جو نظر ہی نہیں آتا تھا اور پھر ایک دن انجم بھابی نے امی کی یہ مشکل آسان کردی۔

نشریاتی ادارے میں ملازم لڑکا سلجھے ہوئے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ انتہائی شریف، پڑھا لکھا اور مناسب شکل وصورت کا حامل تھا۔

امی کو اپنے وقت میں جب جوہی آپا کے لیے بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے دوسری شادی کے خواہش مند اور رنڈوے مرد حضرات کے رشتے آنے لگے تھے یہ رشتہ خاصا مناسب اور پرکشش لگا۔

اور پھر انجم بھابی پر امی کو خاصا اعتماد بھی تھا اور وہ انہیں خاندان بھر کی سب سے سمجھ دار اور جہاندیدہ خواتین میں شمار کرتی تھیں۔

بہر حال گھر میں مشورے اور لڑکے کی چھان بین کے بعد اسے جوہی آپا کے لیے فائنل کر دیا گیا۔

میری تو خوشی دیدنی تھی۔

"جوہی آپا کی شادی کتنا مزہ آئے گا۔" میں اکثر خوش ہو کر سوچتی۔

"میں برات کے لیے لہنگا بنواؤں گی۔" میں خوشی خوشی منجھلی آپا کے ساتھ شادی کے کپڑوں کی خریداری کے لیے امی کے سامنے فرمائشی پروگرام پیش کرتی۔

"اچھا بھئی جو مرضی ہو بنوا لینا۔" امی بھی خوشی سے کہتیں۔

"ہاں تو کیوں نہیں بنوائیں گے۔ ہمارے گھر کی پہلی شادی ہے اور وہ بھی اتنے انتظار کے بعد۔ میں تو مہندی کے مقابلے کے لیے اپنی ساری سہیلیوں کو بھی بلواؤں گی۔" منجھلی آپا بھی امی سے لاڈ دکھاتیں۔

جوں ہی شادی کی تاریخ پکی ہوئی، گھر میں ایک

ہنگامہ، شور شرابا اور رونق برپا ہو گئی۔ میں اور منجھلی آپا۔ کپڑوں کی تیاری کے ساتھ ساتھ مہندی کے لیے گانوں کی تیاری میں بھی جت گئے۔ شام ہوتے ہی ڈھولکی ہوتی اور ہم۔

''ارے لڑکیوں! اب سو جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ صبح مہمانوں نے بھی آنا ہے۔ پھر تم دیر سے بیدار ہو گی۔'' چھوٹی نانی نے ایک کمرے میں جمع لڑکیوں کو دیکھ کر ڈانٹ پلائی جو اس وقت بھی ہنسی مذاق میں مصروف تھیں۔

''منجھلی آپا! آپ نے میرا جوڑا کہاں رکھا ہے کل صبح جوہی آپا اور ناظر بھائی کو پہلی بار گھر آنا ہے۔ مجھے ان کے آنے سے پہلے تیار ہو جانا ہے۔'' میں نے منجھلی آپا کے کان میں سرگوشی کی۔

''چل ہٹ۔ تجھے ہر وقت اپنے کپڑوں کی ہی پڑی رہتی ہے۔ میں نے الماری میں رکھ دیے ہیں۔'' آپا کو میری مداخلت سخت ناگوار گزری جو اپنی سہیلیوں کے نرغے میں ملکہ بنی بیٹھی تھیں۔

☆......☆

اگلے دن میں سویرے ہی جاگ گئی اور جلدی جلدی تیار ہونا شروع کر دیا۔ بڑی آپا میرے پہننے اوڑھنے کے شوق پر اکثر ہنس کر کہتی تھیں۔ ''عرشی تو بڑا خرچا کروائے گی اپنی سسرال کا۔''

اور میں بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی۔ ''تو اور کیا ایک ہی تو شوق ہے میرا۔''

جوہی آپا اور چھوٹی خالہ کو ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر میں نے زور سے نعرہ لگایا۔ ''جوہی آپا آگئیں، جوہی آپا آگئیں۔''

امی نے آگے بڑھ کر جوہی آپا کو پیار کیا لیکن عجیب بات تھی۔ سب ہی نے محسوس کیا کہ جوہی آپا کے چہرے پر نئی دلہنوں والی خوشی کہیں نہ تھی۔ امی موقع دیکھ کر چھوٹی خالہ کو دوسرے کمرے میں لے گئیں اور سرگوشی میں پوچھا۔ ''جوہی کی سسرال میں سب ٹھیک تو ہیں۔''

''اے کہاں، لڑکا ہی ٹھیک نہیں۔'' چھوٹی خالہ نے گویا دھماکا کیا۔

''کیا مطلب؟'' امی کا ماتھا ٹھنکا۔

''لڑکا صحیح نہیں۔'' اب چھوٹی خالہ نے سرگوشی کی۔

''اے ہے..... کیا کہے جا رہی ہو چھوٹی۔ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتیں۔'' امی کو ان کا یوں سسپنس پیدا کرنا پسند نہ آیا۔

''لڑکا ذہنی طور پر ٹھیک نہیں۔ بیمار ہے۔ اسے دورے پڑتے ہیں۔'' چھوٹی خالہ نے آہستہ آہستہ سسپنس توڑنا شروع کیا۔ بھیا نے سنا تو صاف کہہ دیا۔ ''کوئی ضرورت نہیں جوہی کو دوبارہ وہاں بھیجنے کی۔ کسی ذہنی مریض کے ساتھ زندگی بتانے سے بہتر ہے، جوہی کہیں نہ جائے۔''

جوہی آپا افسردہ بھی تھیں اور خفا بھی۔ وہ سمجھ رہی تھیں گھر والے اس سازش میں شریک تھے اور انہیں پہلے سے سب معلوم تھا۔

''یہ سب کیا دھرا انجم اور اس کے میاں کا ہے۔ کم بخت نے ہمیں پہلے کیوں نہ بتایا کہ لڑکے کو یہ بیماری ہے۔ وہ تو تعریفیں کرتی نہیں تھکتی تھی۔ کچھ سوچنے سمجھنے اور زیادہ چھان بین کا بھی وقت نہ دیا کہ ایسے رشتے زیادہ دیر انتظار نہیں کرتے اور بھی لوگ ہیں جو ادھر نظر رکھے اور آس لگائے بیٹھے ہیں۔'' پھوپی اماں جو پہلے دن سے اس رشتے کے حوالے سے چھوٹی بڑی پیش رفت سے آگاہ تھیں جل کر بولیں۔

''میری تو زندگی برباد کر دی ناں آپ کے فیصلے نے۔ یہی نظر آئے تھے آپ کو پوری دنیا میں میرے لیے۔'' جوہی آپا نے روتے ہوئے شکوہ کیا۔

''آپا میرے خیال میں تو جو ہوا سو ہوا۔ اب جوہی کو کہیں بھیجنے کی ضرورت نہیں اور اللہ کرم کرے گا۔'' چھوٹی خالہ نے امی کو پھر آس دینے کی کوشش کی۔

''نہیں جوہی کی قسمت میں جو تھا وہ اسے ملا۔ اب اسے اسی گھر میں رہنا ہوگا۔'' امی نے مختلف تبصرے اور مشورے سننے کے بعد بالآخر کہا۔

''لڑکے کی یہ شرافت بھی تو دیکھو کہ اس نے خود پہلے ہی دن اپنی بیماری کے بارے میں بتا دیا۔ وہ چاہتا تو اسے چھپا سکتا تھا اگر یہ بات دو ماہ بعد، چھ ماہ بعد یا پھر سال بھر بعد ہمیں پتا چلتی تو! بس جوہی اپنے گھر میں ہی رہے گی یہی اس کی قسمت ہے اور یہی میرا فیصلہ۔'' امی نے اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

باقی سب کے ساتھ ساتھ جوہی آپا بھی دم بخود رہ گئیں جیسے کسی کو امی سے اس بات کی توقع ہی نہ تھی۔

امی کی بات گھر میں چونکہ حتمی سمجھی جاتی تھی اس لیے بھیا سمیت کسی میں بھی بحث کی گنجائش نہ رہی۔ جوہی آپا بھی خاموشی سے آنسو بہاتی ہوئی سہ پہر کو ناظر بھائی کے سنگ

اپنے گھر چلی گئیں۔

☆......☆

شام کو ولیمے پر زبردست سماں تھا۔ جوہی آپا کی سسرال کی طرف سے میوزک شو تھا اور وہ بھی سرپرائز نگ اور اس شو کے روحِ رواں تھے ہمارے ناظر بھائی۔

میں بہرحال بہت خوش تھی۔ آج پہلی بار اپنے من پسند گلوکاروں کو روبرو سننے اور دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

میں اگلی صف میں جوہی آپا اور ناظر بھائی کے ساتھ ہی چپک کر بیٹھ گئی۔ ناظر بھائی بھی وقفے وقفے سے میری طرف دوستانہ مسکراہٹ اچھالتے اور جوہی آپا کے کان میں سرگوشی میں کچھ کہہ جاتے۔

''عرشی کھانا بھی ٹھیک سے کھایا ہے یا گانوں پر ہی گزارہ کرنا ہے؟'' بالآخر جوہی آپا بولیں۔

''جی آپا، کچھ زیادہ ہی ٹھیک سے کھالیا ہے۔ بہت زبردست تھا ڈنر۔'' مجھے جوہی آپا کا صبح کا موڈ یاد آ گیا۔

''اچھا وری گڈ، چلو میری سسرال میں عزت رہ گئی۔

لو یہ تمہارے لیے اسپیشل میٹھا پان۔'' ناظر بھائی نے مسکراتے ہوئے مجھے پان پیش کیا۔

ہوں اتنے فرینڈلی تو ہیں ناظر بھائی۔ کہیں انہوں نے جوہی آپا سے کوئی مذاق تو نہیں کیا۔ مجھے جوہی آپا کا پُرشکوہ چہرہ یاد آ گیا۔

''آج تو اچھا لگ رہا ہے۔ کل کی طرح سہا ہوا نہیں۔'' میں منجھلی آپا کو دیکھنے کے لیے اٹھی تو پھوپی اماں کی دھیمی آواز سنائی دی۔

''بھابی آپ نے انجم سے بات کی؟'' پھوپی اماں پھر بولیں۔

''میں پانی پینے کے بہانے سے رک گئی۔''

''ہاں، موقع دیکھ کر کی تھی۔ کھسیانے لگی اور بولی۔

''ہمیں تو ناظر کے بارے میں ایسی کوئی بات معلوم نہ تھی۔'' امی بولیں۔

''ہوں، اس کا مطلب ہے اسے پہلے سے سب معلوم تھا۔ کیسی خبیث ہے اسے ہماری جوہی ہی ملی تھی۔'' پھوپی اماں دل گرفتگی سے بولیں۔

''کیا کریں اسی لیے تو بڑے بوڑھے کہتے ہیں لڑکی کا نصیبہ اچھا ہو۔'' امی بھی افسردگی سے بولیں۔

''ویسے بھابی، ایک بات ہے، ہماری جوہی کل سے بھی زیادہ حسین لگ رہی ہے اور سسرال بھی اس کی خاصی مہذب ہے۔'' پھوپی اماں نے امی کی افسردگی ختم کرنے کے لیے مثبت پہلو ڈھونڈا۔

''ہوں، بس میری بچی خوش رہے اور بسی رہے۔'' امی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

ناظر بھائی اور میری دوستی پکی ہو گئی تھی۔ ناظر بھائی چائے کے شوقین تھے تو میں آئس کریم کی۔ وہ جب بھی گھر آتے میرے لیے کوئی نہ کوئی سوغات ضرور ان کے ہمراہ ہوتی۔

''بھئی آخر کو ہماری چھوٹی سالی ہو۔ تمہارا تو پورا حق ہے ہم پر۔ لو یہ ٹھنڈی میٹھی رس ملائی خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ۔'' ناظر بھائی نے رس ملائی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''ناظر بھائی پرنس روڈ سے آرہے ہیں؟'' میں نے شاپر پر سرسری نظر دوڑائی۔

''ہاں! تمہاری آپا کو صدر لے گیا تھا۔'' ناظر بھائی نے ہمیشہ کی طرح مختصر بات کی۔

''ہوں، ضرور آپا نے جامع کلاتھ سے کپڑے لینے ہوں گے۔'' میں نے پیالے میں رس ملائی ڈالتے ہوئے سوچا۔

''ناظر بھائی چائے ابھی لے آؤں یا......'' میں نے جوہی آپا اور ناظر بھائی کو رس ملائی دیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ چائے پینے کے لیے تو میں ہر وقت تیار ہوں۔'' ناظر بھائی نے جوہی آپا کی طرف خوشگوار انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے گہری نظروں سے جوہی آپا کو دیکھا جو ''جیسے جانتے نہیں'' کی صورت بنی اپنی شاپنگ منجھلی آپا کو دکھا رہی تھیں۔

☆......☆

''عرشی یہ چوڑیاں اور ناظر کا سوٹ بھی رکھنا نہ بھولنا۔'' امی نے مجھے پکارتے ہوئے یاد دلایا۔

''امی جی! میں نے پہلے ہی رکھ لیے ہیں۔'' میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کالج یونیفارم میں اپنے سراپے پر اچٹتی سی نظر دوڑائی۔

''عرشی، تیری تیاریاں ابھی ختم نہیں ہوئیں؟'' منجھلی آپا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مجھے جھڑکا۔

''منجھلی آپا، میں چلی'' میں نے جلدی سے کالج بیگ اور دوسرا سامان اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اور بن دای کہہ رہی ہیں۔ مغرب سے پہلے پہلے گھر آجانا۔'' منجھلی آپا پھر بولیں۔

''ٹھیک ہے جی، میں ناظر بھائی کے ساتھ آجاؤں گی۔'' میں نے مزید ہدایات نامے جاری ہونے سے پہلے کمرے سے نکلنے میں ہی عافیت جانی۔

اصل میں جوہی آپا کل اپنی چوڑیاں اور ناظر بھائی کا سوٹ گھر پر ہی بھول گئی تھیں۔ امی نے جوہی آپا اور ناظر بھائی کے لیے کچھ سوغات بھیجنی تھیں لیکن سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس طرح یہ سامان ان تک پہنچایا جائے۔ بھیا شہر سے باہر تھے اور امی کو جوڑوں کے درد نے پریشان کیا ہوا تھا۔ ایسے موقع پر میں نے جلدی سے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

''امی کالج سے واپسی پر میں بڑی آپا کے گھر یہ سامان لے جاتی ہوں۔ کل ویسے بھی میرا ایک ہی پریڈ ہے اور پھر بڑی آپا کا گھر کالج سے بہت نزدیک بھی ہے۔''

''اے ہاں، میرا تو دھیان اس طرف گیا ہی نہیں۔ یہ صحیح رہے گا۔ کل تم کالج سے سیدھی جوہی کے یہاں چلی جانا۔ گلی یاد ہے ناں ان کی؟'' امی نے پوچھا۔

''جی امی بھیا کے ساتھ گئی تھی۔ ہمارے کالج کے پیچھے والی گلی ہی تو ہے۔'' میں جلدی سے بولی کہ کہیں مبادا امی کا پروگرام ہی نہ بدل جائے۔

''چل ٹھیک ہے۔ تو پھر تم کالج سے واپسی میں چلی جانا۔'' امی نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

''آہا، جوہی آپا کے گھر کتنا مزہ آئے گا۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے سوچا۔

''آہا عرشی تم کیسے آگئیں آج؟'' ناظر بھائی نے دروازہ کھولتے ہوئے مجھے حیرانی سے دیکھا۔

''ناظر بھائی، وہ امی نے یہ چیزیں بھیجنی تھیں۔ بھیا گھر پر نہیں تھے اور امی کے جوڑوں میں درد تھا۔ سو امی نے فریضہ مجھے سونپ دیا۔'' میں نے ساری رام کہانی سنائی۔

''چلو بہت اچھا کیا ویلکم...... ویلکم، تم اس بہانے ہمارے گھر تو آئیں۔ میں تو ہمیشہ کہتا ہوں تمہاری آپا سے کہ عرشی کا کالج تو یہاں سے بہت نزدیک ہے۔ پھر بھی اسے اپنی آپا کی یاد نہیں آتی۔'' ناظر بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ناظر بھائی جوہی آپا نظر نہیں آرہی کہاں ہیں؟'' میں نے گھر میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔

''تمہاری آپا آج اسکول سے لیٹ ہو گئیں۔ ویسے اس وقت تک گھر پہنچ جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے آنے ہی والی ہوں۔''

''اور آپ آپ نہیں گئے اپنے آفس!'' میں نے ناظر بھائی سے پوچھا۔

''بھئی تمہاری آپا نے کہا آج آپ چھٹی کر لیں ان کے اسکول میں کوئی فنکشن ہے ناں۔ سو ہم نے چھٹی کر لی۔'' ناظر بھائی نے معصومیت سے کہا۔

''ہائے کتنے اچھے اور Obedient ہیں۔ ناظر بھائی۔'' میں نے رشک سے جوہی آپا کے بارے میں سوچا۔ ''یونہی خفا دخفا رہتی ہیں۔ ناظر بھائی سے۔''

''اچھا بھئی تم بیٹھو۔ تمہاری آپا آنے ہی والی ہوں گی۔ میں ذرا مشین سے کپڑے نکال لوں۔'' ناظر بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

یہ ناظر بھائی۔ کہاں غائب ہو گئے۔ میں نے کچھ دیر انتظار کے بعد باہر صحن میں جھانکتے ہوئے سوچا۔

''ارے یہ کیا ناظر بھائی آپ کپڑے دھو رہے تھے۔ مجھے کہہ دیا ہوتا۔''

''ارے نہیں بھئی۔ میں اپنا کام خود کرنا پسند کرتا ہوں۔'' ناظر بھائی نے نیا نکتہ پیش کیا۔

''اور جوہی آپا؟'' میں نے سوال کیا۔

''تمہاری آپا کے کرنے کو گھر کے اور دوسرے بہت سے کام ہیں اور پھر اسکول میں شریر بچوں کو پڑھانا آسان تو نہیں۔'' میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ ''ہائے کتنے کیئرنگ ہیں ناظر بھائی۔'' مجھے پھر جوہی آپا پر رشک آیا۔

''لو...... تمہاری آپا بھی آگئیں۔'' ناظر بھائی نے کال بیل سنتے ہوئے کہا۔

''السلام علیکم۔'' میں نے جوہی آپا کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

''عرشی تو تو کس کے ساتھ آئی ہے؟ اکیلی آئی ہے کیا؟'' جوہی آپا نے مجھے کالج یونیفارم میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی آپا۔''

''امی نے سامان بھیجا ہے۔ عرشی کے ہاتھ وہی لائی ہے بے چاری۔'' ناظر بھائی نے حسب عادت مسکراتے ہوئے جوہی آپا کو دیکھا۔

''آپ آفس نہیں گئے آج؟'' جوہی آپا کو جیسے کچھ یاد آیا۔

"تم نے ہی تو کہا تھا۔ آفس سے چھٹی کرلیں۔ بھول گئیں کیا؟" ناظر بھائی نے پھر مسکراتے ہوئے جوہی آپا کو دیکھا۔

"اوہ ہاں۔" جوہی آپا نے سرگوشی میں کہا۔ پھر اچانک فوراً ہی کچھ یاد آنے پر بولیں۔ "دوائی کھائی آپ نے۔ کل رات آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔"

"جی ہاں لے چکا ہوں۔" ناظر بھائی فوراً بولے اور ہاں اب جلدی سے مجھے اور عرشی کو کچھ کھانے کو دو بہت بھوک لگی ہے۔"

"سالن بنا ہوا ہے۔ آپ تندور سے نان لے آئیں۔" جوہی آپا سامان دیکھتے ہوئے بولیں۔

"اچھا لے آتا ہوں۔ پیسے تو دو۔" ناظر بھائی نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

"سامنے الماری میں رکھے ہیں۔ اور سنیں یہ آپ نے فضول خرچی کس سلسلے میں کی ہے۔" جوہی آپا کو اچانک کچھ یاد آیا۔

"کیسی فضول خرچی؟" ناظر بھائی نے الٹا سوال کیا۔

"یہ اتنے زیادہ آڈیو کیسٹس کا کیا کریں گے آپ؟ جو آپ کل اٹھالائے ہیں۔" جوہی آپا بولیں۔

"بھئی بہت اچھے کیسٹ ہیں۔ لتا اور جگجیت کے۔"

"تو یہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ ایک ساتھ پندرہ بیس کیسٹس لانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اچھا بھئی میں نان لینے جارہا ہوں۔" ناظر بھائی نے کوئی جواب نہ پاکر فرار میں ہی عافیت جانی۔

"سارے بجٹ کا ستیاناس کردیتے ہیں۔ ہر مہینے ایسے ہی کبھی کیسٹ، کبھی پرفیوم، کبھی گھڑیاں اور کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔" جوہی آپا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"جوہی آپا کیا ہوا ہے ناظر بھائی کو۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں؟" اب مجھے اچانک کچھ یاد آیا۔

"ہاں وہ رات کچھ بے چینی محسوس کررہے تھے۔ پوری رات سوئے نہیں۔ بار بار واش روم کے چکر لگاتے رہے۔ کچھ ڈسٹرب تھے۔" جوہی آپا بولیں۔

"ارے...... یہ ان کی بیماری ہے۔ دوائی وقت پر نہ لیں یا اور کوئی ذہنی پریشانی ہو تو ایسے ہی ڈسٹرب ہوجاتے ہیں۔" جوہی آپا کے چہرے پر پہلی بار میں نے کرب کے آثار دیکھے۔ "میرا خیال ہے کل ان کے ساتھ آفس میں کوئی بات ہوئی تھی۔ اسی لیے ایسی کیفیت تھی۔" جوہی آپا گویا خود سے ہم کلام تھیں۔

میری سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا۔ جوہی آپا کی خفگی۔ ان کے شکوے۔ ایک دم ہی مجھے جوہی آپا سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

☆......☆

"آپا! تم تو جوہی کی شادی کے بعد گھر کی ہی ہو کر رہ گئی ہو۔ کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ تم آتی ہی نہیں، آج میں خود ہی چلی آئی۔" چھوٹی خالہ کئی دنوں بعد ہمارے گھر آئی تھیں۔

"ارے چھوٹی کیا بتاؤں جوہی کی طرف سے جی بہت پریشان رہتا ہے۔" امی بولیں۔

"ارے کیا ہوا آپا خیریت تو ہے؟" چھوٹی خالہ امی کے اور قریب ہولیں۔

"کہاں۔ ناظر کی طبیعت ان دنوں صحیح نہیں۔ بے چاری اکیلی لیے اسے ڈاکٹروں کے چکر لگاتی رہتی ہے۔ ان کی ساس اور نند تو بڑے بیٹے کے پاس کوئٹہ چلی گئی ہیں۔"

"ہائے ہائے!" چھوٹی خالہ نے تاسف سے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "کل میں اور ایاز گئے تھے ناظر کو دیکھنے بے چارہ تکلیف میں تھا۔ ہم نے بہت زور لگایا کہ جوہی اور ناظر کو ساتھ ہی گھر لے آئیں لیکن جوہی نہ مانی۔" امی نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہائے، میری بچی!" چھوٹی خالہ بھی امی کے ساتھ رو دیں۔ "ویسے تو...... آپا ناظر بیٹا بالکل نارمل لگتا ہے۔ جب اس کی طبیعت اچھی ہو۔ پچھلے ماہ جوہی کے ساتھ آیا تھا گھر پر۔ بچے تو بہت خوش ہوئے اس سے مل کر کہ ہمارا بہنوئی کتنا پیارا اور ملنسار ہے۔" چھوٹی خالہ نے امی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" امی بولیں۔ "چھوٹی کبھی کبھی لگتا ہے جوہی کے معاملے میں ہم سے بڑی بھول ہوگئی۔" امی پھر افسردگی سے بولیں۔

"ارے آپا تم دل چھوٹا نہ کرو۔ اللہ ناظر کو صحت دے گا اور پھر ہماری جوہی کے نصیب میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی۔"

"عرشی، اری او عرشی!" امی نے مجھے کچن سے پکارا۔

"آئی امی۔" میں کتابیں ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑی

ہوئی۔

"مردار کتابوں کا کیڑا ہی بنی رہتی ہے۔"

"چل مجھے جویی کا نمبر ملا کر دے۔ میں اس کی طبیعت کا تو پوچھوں۔" امی نے کباب بناتے ہوئے کہا۔

پھر اچانک ہی کال بیل کی آواز سن کر بولیں۔ "دیکھ دروازے پر کون ہے؟"

"السلام علیکم۔" مجھے دروازہ کھولنے پر ناظر بھائی کی صورت نظر آئی۔

"ارے ناظر بھائی آپ...... آئیے آئیے۔ آپ بڑی آپا کو ساتھ نہیں لائے؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی وہ تمہاری آپا کی میڈیسن لینے ہی کے لیے اِدھر آیا تھا۔ سوچا امی کو بھی سلام کرتا چلوں۔" ناظر بھائی بولے۔

"امی ناظر بھائی آئے ہیں۔" میں نے ناظر بھائی کو کمرے میں بٹھاتے ہوئے ہانک لگائی۔

"ارے میرا بچہ آیا ہے۔ کیسا ہے میرا بیٹا۔" امی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ناظر بھائی کی بلائیں لیں۔

"ارے جویی نہیں آئی؟" اب امی نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

"امی ناظر بھائی بڑی آپا کی میڈیسن لینے آئے تھے اِدھر۔" میں ناظر بھائی کے جواب دینے سے پہلے بول اٹھی۔

"اچھا اچھا۔" امی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کتنا شوق ہے ناظر بھائی کو اپنی سسرال آنے کا اتنی شوق سے تو لڑکیاں بھی اپنے میکے نہیں جاتیں۔" میں نے گہری نظروں سے ناظر بھائی کو دیکھتے ہوئے سوچا جو اس وقت بھی انتہائی خوش اور Excited نظر آرہے تھے۔

"جا جا کر بھائی کے لیے اچھی سی چائے بنا۔" امی نے مجھے گنگ کھڑے دیکھ کر کہا۔

"اور ہاں شامی کباب بنے ہوئے ہیں۔ منجھلی سے کہہ کر فریج سے سموسے نکال کر بنالے۔ چائے کے ساتھ مزہ دیتے ہیں اور ہاں سن تمہارا بھیا جو کیک لایا تھا وہ تو پہلے لے آ۔" امی نے مجھے پیچھے سے پکارا۔

"اچھا تو پھر ڈاکٹر نے کون سی تاریخ دی ہے؟" میں چائے اور دیگر لوازمات لے کر پہنچی تو امی کی آواز سنائی دی۔

"جی دو ماہ بعد کی چوبیس تاریخ۔" ناظر بھائی نے شرماتے ہوئے کہا۔

"چلو اللہ سب خیر کرے۔ تمہارے آنے سے پہلے میں جویی سے فون پر بات کرنے کا ہی سوچ رہی تھی۔"

"ناظر بھائی یہ شامی کباب اور لیجیے ناں۔ میڈ بائی امی، میں نے ناظر بھائی کو رغبت دلائی۔" مجھے معلوم تھا امی کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے ناظر بھائی کی کمزوری ہیں۔

"اچھا...... اچھا بھئی لاؤ پھر تو میں ضرور لوں گا۔" ناظر بھائی نے فوراً ہی میری پیش کش قبول کرلی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں ان کبابوں پر تمہارا ہی نام لکھا تھا۔ سو تم اپنے نصیب ہی کا کھا رہے ہو۔" امی نے ہمیشہ کی طرح اپنے داماد کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ دی۔

☆......☆

24 اکتوبر کو جویی آپا کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی جب جویی آپا اور ناظر بھائی کے گول گوتھنے سے بیٹے احمد نے اس دنیا میں آنکھ کھولی۔

"ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ یہ تو بنا بنایا ناظر ہے۔" امی نے احمد کو گود میں بھرتے ہوئے مسرت سے کہا۔

"امی اس کے بال کتنے پیارے اور چمکیلے ہیں۔" مجھے خالہ بن کر احمد پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

"بیٹا تمہاری امی اور گھر سے بھی کوئی آیا؟" امی نے ناظر بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی...... وہ امی تو بڑے بھائی کے پاس کوئٹہ میں ہیں۔ ان کا صبح فون آیا تھا۔ بہت مبارک باد دے رہی تھیں۔" ناظر بھائی نے محبت سے احمد کو چھوا۔

امی اپنے تجربات، گھریلو ٹوٹکوں اور روایتی طریقوں سے جویی آپا اور احمد کی نازبرداریوں میں مصروف رہیں۔

ان تمام تر مصروفیات کے باوجود امی ناظر بھائی کی وی آئی پی ٹریٹمنٹ نہیں بھولتی تھیں۔

کبھی ناظر بھائی کی پسند کے کھانے تیار ہو رہے ہیں اور کبھی ناظر بھائی کو چائے پیش کی جارہی ہے۔

ناظر بھائی بھی بہت خوش تھے۔ اتنے شوق سے میکے میں رہ رہے تھے جیسے ان ہی کا تو چلہ ہو۔

کچھ دنوں بعد جویی آپا کو گھر کی یاد ستاتی تو ناظر بھائی بولے۔ "بھئی تم پوری طرح ٹھیک تو ہو جاؤ پھر گھر چلیں گے اور دیکھو تو احمد بھی کتنا خوش ہے سب کے درمیان۔ ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ سوتے میں بھی مسکراتا ہے۔" ناظر بھائی نے خود بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کا بہت دل لگ گیا ہے یہاں، سچ کیوں نہیں کہتے آپ کا خود گھر چلنے کو دل نہیں کر رہا۔" جوہی آپا نے ناظر بھائی کی چوری پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو کیا ہے۔ یہ میرے بیٹے کا بھی تو گھر ہے۔" امی فوراً ناظر بھائی کی سپورٹ کے لیے آگے بڑھیں۔

"جوہی آپا ابھی سے کیوں؟ اتنا مزہ آ رہا ہے احمد کے ساتھ کھیلنے میں۔" میں بھی اتنے دنوں میں احمد کی عادی ہو چکی تھی۔

"تو...... میرے ساتھ ہی چل۔ ویسے بھی کالج سے تجھے چھٹیاں ہیں۔ کیوں امی لے جاؤں کچھ دنوں کے لیے عرشی کو۔ میرا گھر پر ہاتھ بھی بٹا دے گی اور احمد کو بھی دیکھ لے گی۔"

"ہاں ہاں لے جانا۔ ابھی تو بادام کا یہ حلوا کھا، خالص گھی سے بنا ہے۔ ذائقہ بھی اچھا ہے اور تیری کمزوری بھی جاتی رہے گی۔ لے کھا میرا بچہ۔" امی نے جوہی آپا کو اپنے ہاتھوں سے حلوا کھلاتے ہوئے کہا۔

☆......☆

"عرشی احمد سو گیا؟" جوہی آپا نے میرے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

"جی آپا!" میں نے آہستہ سے احمد کو اپنی گود سے اتارتے ہوئے جھولے میں ڈالا۔

"اس کو گود کی عادت پڑ گئی تو مشکل ہو جائے گی۔" آپا نے احمد کا سرہانہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو اسکول، گھر اور تمہارے بھائی کی بیماری میں ہی پھنسی رہتی ہوں۔ اسے کہاں گود میں اٹھائے اٹھائے پھروں گی۔"

"آپا آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ میں ہوں ناں احمد کے لاڈ اٹھانے کو۔" میں نے پیار سے احمد کا نرم گال چھوا۔ "ارے دیکھیے...... دیکھیے کیسے مسکرا رہا ہے۔" میں نے جوہی آپا کی توجہ احمد کی جانب دلوائی جو سوتے میں مسکرا رہا تھا۔

"اچھا! چل چائے پی لے۔" جوہی آپا کے چہرے پر احمد کے لیے بھرپور ممتا ابھر آئی۔

"ارے ہاں آپا ناظر بھائی کو آج دیر نہیں ہو گئی؟" میں نے اچانک چونکتے ہوئے وال کلاک کی جانب نظر دوڑائی۔

"ہوں۔ تنخواہ ملی ہو گی ناں آج۔ کر رہے ہوں گے کہیں فضول خرچیاں۔" جوہی آپا نے اطمینان سے جواب دیا۔ گویا ان کو ناظر بھائی کے پروگرام کا پہلے سے علم ہو۔ "اچھا یہ بتا تیرا کالج کب سے کھل رہا ہے؟" جوہی آپا کو اچانک کچھ یاد آیا۔

"ہوں...... اگلے ماہ کی سات تاریخ کو۔" میں نے چائے کا لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"صبح منجھلی کا فون آیا تھا کہ عرشی کو گھر بھیج دیں۔ گھر کے سارے کام مجھے دیکھنے پڑتے ہیں۔"

"اچھا اور کیا کہہ رہی تھیں منجھلی آپا؟" میں نے جلدی سے چائے ختم کرتے ہوئے پوچھا۔

"ناراض ہو رہی تھی کہ مجھے گھر کے تمام کام کرنے پڑتے ہیں اور تم مزے سے چھٹیاں گزار رہی ہو۔"

"ہوں...... منجھلی آپا کو تو نہ جانے کیا ہے کتنا مزہ آتا ہے جوہی آپا کے گھر۔" میں نے پیار سے احمد کی جانب دیکھا جو اپنی چھوٹی خالہ کے سر دست مسئلے سے بے نیاز مزے سے سو رہا تھا۔

☆......☆

"عرشی بھئی کہاں ہو؟ ادھر آؤ۔" ناظر بھائی نے گھر میں داخل ہوتے ہی ہانک لگائی۔

"جی، جی ناظر بھائی۔" میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔

"ارے یہ کیا!" میں نے ناظر بھائی کو سامان سے لدے پھندے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ احمد کے کھلونے اور اس کی پرام اور یہ تمہاری آئس کریم۔"

"تھینک یو ناظر بھائی۔" میں نے تمام چیزیں سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آپ کی فضول خرچیاں پھر شروع ہو گئیں۔" جوہی آپا نے ایک نظر سامان کو دیکھتے ہوئے ناظر بھائی کو مخاطب کیا۔

"بھئی یہ سب تو احمد کے لیے ہے۔" ناظر بھائی نے جوہی آپا کی ناراضگی پر بھی حسبِ عادت مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو کس نے کہا تھا کہ آپ احمد کے لیے یہ سب خریدیں؟ اس کے لیے یہ سب پہلے ہی موجود ہے۔ امی نے پرام بھی دی ہے۔ کھلونوں کا پہلے ہی ڈھیر ہے۔ پھر کیا ضرورت تھی یہ سب لینے کی۔" جوہی آپا کی ناراضگی امی کے

بلڈ پریشر کی طرح شوٹ کرنے لگی۔
"اچھا یار اب ناراض نہ ہو۔ یہ دیکھو تمہارے لیے کتنی زبردست شال لی ہے۔ ناظر بھائی نے ایک شاپر سے شال نکالتے ہوئے جوہی آپا کو دکھائی۔"
"کتنے پیسے خرچ کرڈالے اس شال پر۔" جوہی آپا نے آئی ایس آئی کے افسروں کی طرح گہری نظروں سے ناظر بھائی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"بہت سستی صرف بارہ سو روپے کی۔" ناظر بھائی نے گویا اپنی خریداری پر جوہی آپا سے داد چاہی۔
"اوہو خدایا یہ پانچ سو روپے کی عام مل رہی ہے۔" جوہی آپا نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔
"ہر روز ایک نیا مسئلہ۔ ہر روز نئی بے وقوفی اوہ خدا میرے لیے آپ اور آپ کی بیماری کو سنبھالنا کچھ کم نہیں۔ پھر یہ فضول خرچیاں؟ خدارا! باز آجائیں ان حرکتوں سے۔" جوہی آپا باقاعدہ روہانسی ہونے لگیں۔" اور ہاں آئندہ اگر آپ نے کوئی خریداری کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" جوہی آپا جلتی بھنتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆......☆

"عرشی! احمد کا دھیان رکھنا سویا ہوا ہے۔ میں ابھی ان کے دفتر سے ہو کر آئی۔" جوہی آپا نے مجھے ہدایات دیتے ہوئے کہا۔
"بڑی آپا! گھر سے بھائی کو ساتھ لے لیں۔ آپ اکیلی کہاں جائیں گی اس وقت۔" مجھے جوہی آپا پر ایک دم ترس آیا۔
"یہ کوئی پہلی بار تو نہیں، پتا نہیں کہاں نکل جاتے ہیں پھر ان کے دفتر کے ساتھی بھی میری طرح انہیں جانے کہاں کہاں ڈھونڈتے ہیں۔ ذہنی طور پر ڈسٹرب ہوں تو یونہی کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔" جوہی آپا کی آواز بیٹھنے لگی۔
"بڑی آپا آپ بھی تو حد کرتی ہیں، اتنے پیار سے ناظر بھائی نے آپ کے اور احمد کے لیے خریداری کی اور آپ نے انہیں یوں ڈانٹ دیا۔" مجھے ناظر بھائی کا کل شام دھواں ہوتا ہوا چہرہ یاد آیا۔
"ان کی حرکتیں بھی تو ایسی ہیں۔ پورے پانچ ہزار روپے اڑا دیئے ایک ہی دن میں۔ اچھا......تو ذرا گھر اور احمد کا دھیان رکھنا۔" جوہی آپا نے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔
"بڑی آپا۔ میں بھائی کو فون کردوں؟" جوہی آپا کو یوں اکیلے جاتے دیکھ کر میں نے گھبرا کر کہا۔
"نہیں بالکل کوئی ضرورت نہیں۔ اب تو یہ معمول زندگی کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ کوئی کب تک اور روز یوں میرے لیے دوڑا آئے گا۔" جوہی آپا نے دوسری طرف منہ پھیر کر اپنے آنسوؤں کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔
کوئی تین گھنٹے بعد جوہی آپا کی واپسی ہوئی۔
"بڑی آپا، ناظر بھائی کہاں ہیں کچھ پتا چلا۔" میں نے آپا کو یوں اکیلے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر سوال کیا۔
"ہاں وہ دفتر سے تو دو بجے شفقت صاحب کے ساتھ گھر کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ ان کے دوسرے کولیگ نے کہا کہ ہم ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آپ کو گھر پر اطلاع کردیں گے۔" جوہی آپا نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جوہی آپا لپک کر فون کی جانب دوڑیں۔
"جی......جی......جی اچھا......اچھا۔ شکر خدا کا آپ کی بہت مہربانی بہت شکریہ۔ جی میں گھر پر ہی ہوں خدا حافظ۔"
بڑی آپا نے فون رکھ کر اطمینان کی گہری سانس لی۔
"بڑی آپا! ناظر بھائی کے لیے فون تھا؟" میری بے تابی بھی دیدنی تھی۔
"ہاں وہ مل گئے ہیں۔ دوسرے روٹ کی بس میں سوار ہو گئے تھے۔ شفقت صاحب بھی اسی بس میں تھے۔ سمجھ دار آدمی ہیں ان کی بیماری سے واقف بھی اس لیے دھیان بٹانے کو اپنے گھر لے گئے۔ اب آ رہے ہیں۔"
"اوہو شکر ہے۔"
یہ کچھ گھنٹے میرے اور جوہی آپا کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہ تھے۔

☆......☆

"عرشی۔" مجھے دوسرے کمرے سے جوہی آپا نے پکارا۔
"جی آئی آپا۔"
"لو، یہ احمد کو کپڑے تبدیل کرادو۔ میں ذرا ان کو دیکھ لوں کچھ کھایا پیا بھی نہیں انہوں نے کل سے۔"
"بڑی آپا......"
"ہوں؟" بڑی آپا نے الماری سے احمد کے کپڑے نکالتے ہوئے کہا۔

''ناظر بھائی۔ اتنے چپ چپ سے کیوں ہیں۔ وہ کچھ بولتے ہی نہیں۔ بس بار بار واش روم جاتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی کو پہچانتے ہی نہیں۔ احمد کو بھی نہیں۔'' میرے سامنے ناظر بھائی کا عجیب سا چہرہ سامنے آگیا۔

''عرشی تمہارے ناظر بھائی ذہنی طور پر ڈسٹرب ہیں۔ ان کی بیماری ہی ایسی ہے۔ انہیں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ بس بے چینی اور شدید تکلیف محسوس کرتے ہیں۔'' بڑی آپا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ابھی کچھ دن ایسے ہی رہیں گے۔ میں ذرا انہیں میڈیسن دے دوں۔

☆......☆

واقعی جوہی آپا نے صحیح کہا تھا۔ کچھ دنوں بعد ناظر بھائی وہی پہلے والے ناظر بھائی نظر آنے لگے۔

لیکن اس دوران بڑی آپا نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ کبھی ناظر بھائی کو لیے ڈاکٹر کے پاس دوڑ رہی ہوتیں کبھی ان کی دوائیاں لا رہی ہوتیں اور کبھی ان کی ایسی دلجوئی کر رہی ہوتیں جیسے وہ کوئی چھوٹا سا معصوم سا بچہ ہوں۔ ویسے ان دنوں ناظر بھائی کسی معصوم بچے کی مانند ہی تو نظر آتے تھے۔ ایسا بچہ جسے نہ بولنا آتا ہو نہ کسی کی بات سمجھ آتی ہو۔ جو مکمل طور پر دوسروں کے رحم وکرم پر ہو۔

''لیجیے ناظر بھائی آپ کے لیے گرما گرم پکوڑے اور یہ آپ کا پسندیدہ مشروب مشرق چائے۔''

''بھئی واہ..... مزہ آگیا۔ سالی ہو تو تمہاری جیسی ہم نے تم سے یونہی تو دوستی نہیں کی۔'' ناظر بھائی نے حسب عادت اپنی پسندیدہ شے چائے کو دیکھتے ہوئے نعرہ لگایا۔ ''ویسے یہ پکوڑے کس خوشی میں۔'' ناظر بھائی آج تو پورے موڈ میں تھے۔ ''تمہاری آپا کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں ناں۔''

''ارے واہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے حیرانگی سے ناظر بھائی کے دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

''بھئی، تمہاری آپا آخر کو ہماری بھی تو کچھ لگتی ہیں۔'' ناظم بھائی نے شرارت سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

میں ناظر بھائی کی بات سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''اچھا آپ یہ لہسن ادرک چھوڑیں اسے میں چھیل دیتی ہوں۔ آپ چائے پئیں۔'' پھر بولی۔

''آپ یہ کام کرتے کیوں ہیں؟'' میں نے لہسن اور ادرک کے انبار کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی! تمہاری آپا کی تھوڑی سی Help ہو جاتی ہے۔ حرج ہی کیا ہے۔'' ناظر بھائی نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔

میں نے اس لمحے چونک کر ناظر بھائی کے چہرے کی جانب دیکھا جہاں مجھے بچوں جیسی معصومیت اور سکون نظر آیا۔

☆......☆

''ارے بھئی میرے بیٹے کے آنے سے تو گھر میں رونق ہو جاتی ہے۔'' امی نے حسب عادت ناظر بھائی کو وی آئی پی پروٹوکول دیتے ہوئے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اور یہ میرا چھوٹا سا بابا لاڈلا پالا بچہ۔''

احمد نے اپنے بابا کی گود سے امی کی طرف چھلانگ لگانا چاہی۔

''ارے جوہی۔ اس کے دانت نکلنا شروع ہوئے۔'' امی نے احمد کو گود میں بھرتے ہوئے پوچھا۔

''جی امی نکل رہا ہے ناں ادھر کے دو دانت نکل آئے ہیں۔'' جوہی آپا نے فخر سے بتایا۔

''اللہ خیر ادھر کے دانت نکال رہا ہے۔ بیٹا فوری طور پر اپنا اور ناظر کا صدقہ نکالنا بچے کا ادھر کا دانت نکالنا اچھا نہیں۔'' امی نے فکرمندی سے احمد کے ننھے منے سے دانت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی تم لوگوں کا صدقہ نکالوں گی۔''

''ارے امی..... کن وہموں میں پڑ گئی ہیں۔ لایئے احمد کو مجھے دیجئے۔ میں بھی تو دیکھوں ننھے میاں کے دانت۔'' میں نے بڑی آپا کی جانب دیکھا جہاں فکرمندی کے گہرے بادل نظر آئے۔

''اے تو چپکی بیٹھی رہ۔ یہ بڑے بوڑھوں کی باتیں ہیں۔ بڑی آئی ہے۔'' امی نے حسب عادت مجھے جھڑکی پلائی۔

''ارے امی دیکھیے تو کتنا پیارا لگ رہا ہے۔ دانت نکال کر اور کیسے مسکرا رہا ہے۔ میرا گڈا۔'' میں نے پھر موضوع کو بدلنا چاہا۔

''ارے میرا بچہ۔ بھئی یہ تو بہت ہنس مکھ ہے بالکل اپنے بابا کی طرح۔ منجھلی ذرا دوڑ کر سات مرچیں تو لے آ۔ میں اپنے بچے کی نظر تو اتار دوں۔'' امی نے منجھلی آپا کو خوشی خوشی حکم صادر فرمایا۔

احمد کی نظر اتارنے کے بعد امی کو پھر کوئی خیال

سوچا۔ ''بھئی آج تو ہمارے ناظر میاں بھی بہت جچ رہے ہیں۔ پہلے میں اپنے بڑے بچے کی نظر تو اتار دوں۔'' ای نے ناظر بھائی کی طرف دیکھا جو آج تھری پیس سوٹ میں ملبوس حسب عادت مسکرا رہے تھے۔

☆......☆

مجھے اور منجھلی آپا کو ایک نئی مصروفیت مل گئی تھی۔ ہم دونوں پچھلے کئی دنوں سے احمد کی پہلی سالگرہ کو خوب دھوم دھام سے منانے کے لیے مختلف تیاریوں میں جتے ہوئے تھے۔

ای بھی نہال نہال سی ہمارے ساتھ تیاریوں میں شریک تھیں۔

کبھی وہ اپنی قدیم سلائی مشین پر احمد کے لیے ننھے منے رنگ برنگے کپڑے اور چھوٹی سی سنہری شیروانی سیتی نظر آتیں۔ کبھی اس کے ننھے سوئٹرز اور موزوں کے لیے اون کے گولے کھول رہی ہوتیں۔ غرض احمد بڑی آپا کے گھر سے زیادہ ہمارے گھر کے لیے کھلونا بنا ہوا تھا۔

منجھلی آپا ایسا کرتے ہیں درمیان والے کمرے میں سالگرہ کی ساری تیاری کر لیتے ہیں۔ وہ کمرا بڑا بھی ہے اور ڈیک وغیرہ بھی وہیں ہے۔

''ہوں کہتی تو ٹھیک ہو لیکن ای کہہ رہی تھیں مہمان زیادہ ہوں گے اس لیے شامیانہ لگوانا پڑے گا۔''

''ارے واہ۔ پھر تو اور مزہ آئے گا۔ میں روشی اور سیما کو بھی ضرور بلاؤں گی۔'' مجھے ایک دم اپنے کالج کی دوستیں یاد آگئیں۔

''اور ہاں بھیا سے کہہ کر روشنیوں کا انتظام بھی ضرور کروانا۔ احمد بہت خوش ہوتا ہے رنگ برنگی روشنیوں سے۔ یاد ہے ہمارے ساتھ بازار گیا تھا تو لائٹیں دیکھ کر کیسی آوازیں نکال رہا تھا۔''

میرے سامنے احمد کا معصوم چہرہ ابھر آیا جو ہمیشہ گھر میں جلتے ہوئے بلب کو اپنی ننھی سی گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتا تھا۔

سالگرہ والے دن احمد سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ چھوٹی سی شیروانی میں ننھا منا دولہا لگ رہا تھا۔ سالگرہ کا کیک احمد نے جوہی آپا، ناظر بھائی اور ہم سب کے سنگ کاٹا۔ وہ رنگ برنگے غباروں، روشنیوں اور بہت سے بچوں کے درمیان بہت ہی محظوظ ہو رہا تھا۔

''اف عرشی، میں تو تھک گئی ہوں۔'' جوہی آپا آخری

## تھکاوٹ اور علاج بالغذاء

☆ متوازن غذا کا استعمال ضروری ہے اس لیے کہ کسی ایک بھی غذائی جزو کی کمی جسم کی مستعدی پر منفی اثر ڈالتی ہے۔ مثال کے طور پر وٹامن بی کی کمی کا براہ راست تعلق ایڈرینالین کی کمزوری سے ہے۔ تمام بی کمپلیکس وٹامنز اعصاب کی حفاظت کرتے اور غدودوں کی کارکردگی بہتر بناتے ہیں۔

☆ سبز پتوں والی سبزیاں، دودھ، مغزیات، بادام، اخروٹ، مونگ پھلی، کیلا، خمیر، دالیں، اور مغز وٹامن بی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ معدنیات بھی تھکاوٹ پر قابو پانے میں مدد دیتے ہیں۔ پوٹاشیم اس سلسلے میں خاص طور پر مفید ہے۔ یہ ہری سبزیوں میں وافر مقدار میں ہوتا ہے۔

☆ کیلشیم بے خوابی اور تناؤ دونوں کو کم کرتا ہے۔ گاجر، کھیرا اور چقندر تھکن پر قابو پانے میں مفید ہیں۔ پنیر اور دہی بھی ایسی غذائیں ہیں جو غذا کے انہضام کو بڑھاتی ہیں۔ ان میں شامل غذائی اجزاء سے عضلات کو تقویت ملتی ہے۔

☆ اناج، گندم، باجرہ، جو کا آٹا اور دلیہ طاقت بخش غذائیں ہیں۔ جو کے دلیہ کا ناشتا دن بھر توانائی فراہم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر آپ ناشتے میں پراٹھا کھانے کے عادی ہیں تو اس میں چھان ملا لیں تاکہ آپ کا معدہ اور انتڑیاں صاف رہیں اور جسم میں خون بھی پیدا ہو۔

☆ جو لوگ دن کے بڑے (تین) کھانوں کے دوران اسنیکس لیتے رہتے ہیں وہ تھکاوٹ اور اعصابی کمزوری کا شکار کم ہوتے ہیں۔ یہ چاکلیٹ، چپس، نمکو، بسکٹوں کی بجائے تازہ یا خشک پھلوں اور سلاد پر مشتمل ہوں تو بہتر ہے۔

☆ تھکن کے شکار افراد اپنی خوراک میں پالک، میتھی اور سرسوں ضرور شامل کریں کیونکہ یہ فولاد سے بھرپور ہوتے ہیں۔

☆ وٹامن بی، سوڈیم اور زنک بھی تھکاوٹ کے علاج میں مفید ہیں۔ کھیرا، سلاد کے پتے اور سیب سوڈیم کے جب کہ مچھلیاں، سالم اناج اور کدو کے بیج زنک اور وٹامن بی کے بہترین ذرائع ہیں۔

☆ روزانہ کھجور کھانے سے تھکاوٹ دور ہوتی ہے کیونکہ یہ غذائیت سے بھرپور ایک قدرتی کیپسول ہے جو بیک وقت ملٹی وٹامن بھی ہے اور ملٹی منرل بھی۔

☆ کولا مشروبات ترک کریں اور پانی زیادہ پئیں۔

مرسلہ: ڈاکٹر عمیرا رشد باجوہ۔ فیصل آباد یونیورسٹی

مہمان کو رخصت کر کے کمرے میں آئیں تو دھم سے بستر پر گر گئیں۔

''اللہ آپا اتنا مزہ تو آپ کی شادی میں بھی نہیں آیا جتنا احمد کی سالگرہ پر آیا ہے۔'' میں ایک دم روانی میں نہ جانے کیا کہہ گئی کہ آپا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا لیکن شکر ہے اسی لمحے امی احمد کو گود میں لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''لو بھئی سنبھالو دولہے میاں کو۔'' امی نے ہنستے مسکراتے احمد کو آپا کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی تک جاگ رہے ہیں صاحبزادے۔'' ناظر بھائی بھی امی کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔

''لائیے آپا اسے میں سلا دیتی ہوں۔'' میں نے جلدی سے اپنی خدمات پیش کیں۔

''بڑی باجی احمد کے گفٹس کہاں رکھنے ہیں؟'' باہر سے منجھلی آپا نے ہانک لگائی۔

''ارے پہلے تم ادھر تو آؤ۔'' جوہی آپا کے جواب دینے سے پہلے ناظر بھائی بول اٹھے۔

''ارے بیٹا تم نے کچھ کھایا پیا بھی۔ یا مہمانوں کی خاطر مدارت ہی کرتے رہے۔'' امی کو اچانک ہی بہت اہم بات یاد آئی۔

''جی میں نے کیک کھا لیا تھا۔'' ناظر بھائی نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''اے ہے۔ میں کھانے کا پوچھ رہی ہوں؟ عرشی چل اٹھ بھائی کے لیے کھانا گرم کر۔''

''جی امی۔'' میں نے احمد کو آپا کے سرہانے لٹاتے ہوئے کہا جو سوتے میں بھی مسکرا رہا تھا۔ بالکل ناظر بھائی کی طرح۔

☆......☆

''یہ سوٹ کہاں سے آیا ہے۔'' بڑی آپا نے ناظر بھائی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''پرسوں باڑا مارکیٹ سے لیا ہے۔ پورے تین ہزار کا۔ اچھا ہے ناں؟'' ناظر بھائی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' بڑی آپا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''آپ کو کیا ضرورت تھی اتنا مہنگا سوٹ خریدنے کی۔ پتا نہیں کب سمجھ آئے گی۔ ہر مہینے میرے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ وہ لون کے پیسے کم ہیں جو ہر ماہ آپ کی تنخواہ سے کٹ جاتے ہیں جو یہ فضول خرچیاں بھی کرتے رہتے ہیں۔ بتائیے کہاں سے مہینا پورا ہوگا۔ میں اپنی ہڈیاں گھر میں بھی توڑوں اور اسکول میں بھی۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ ایک دن بھی سکون سے نہیں رہنے دیتے۔''

جوہی آپا نے ایک دم سے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔

''اے بس کر دے جوہی۔'' امی نے ناظر بھائی کے عجیب سے ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں امی..... کیوں بس کر دوں ان کو کب عقل آئے گی کیوں یہ اتنے بے حس بنے رہتے ہیں۔'' جوہی آپا کو بھی نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔

''بس بہت ہو گیا۔ میں بہت عرصے سے برداشت کر رہی ہوں اگر آپ نہیں سدھرے تو میں احمد کو لے کر کہیں چلی جاؤں گی۔'' آپا کے ذہن میں نہ جانے کیسی کیسی باتیں آنے لگیں۔

''اے ہے..... بیٹا آؤ تم کھانا کھاؤ۔'' امی نے مجھے ٹرے میں کھانے کے لوازمات لاتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے موضوع بدلنا چاہا۔

اسی لمحے میں نے محسوس کیا ناظر بھائی کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

اگلے دن میں نے ناظر بھائی کو صبح صبح آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے دیکھا۔ جوہی آپا، ناظر بھائی سے ابھی بھی سخت خفا تھیں۔ ناشتا تیار کرتے ہوئے انہوں نے ناظر بھائی سے پھر شکوہ کیا۔

''وہ اپنا تین ہزار والا سوٹ پہن کر نہیں جا رہے۔''

اس لمحے پہلی بار میں نے محسوس کیا جیسے ناظر بھائی کے لبوں پر ہمیشہ سجی رہنے والی معصوم سی مسکان خاموش ہے۔

وہ سر جھکائے چھوٹے چھوٹے قدموں سے باہر کی جانب نکلے جیسے کہہ رہے ہوں مجھے روک لو پھر شاید میں لوٹ کر نہ آؤں۔

ایک لمحے کو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دوسرے ہی لمحے میں جوہی آپا کی طرف لپکی۔

''بڑی آپا! ناظر بھائی کو لنچ کے لیے شامی کباب دے دیں جو رات بنائے تھے۔ انہیں پسند بھی بہت ہیں۔''

''رہنے دو۔ انہیں باہر کے کھانے زیادہ اچھے لگتے ہیں پیسے جو برباد کرنے ہوتے ہیں۔'' آپا اب بھی خفا تھیں۔

شام کو میں کالج سے آئی تو جوہی آپا، احمد کو لے کر اپنے گھر واپس جا چکی تھیں۔

''کیسا سونا سونا سا گھر ہو جاتا ہے احمد کے جانے کے بعد۔'' امی نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔

"امی! ناظر بھائی یہاں آئیں گے یا اپنے گھر جائیں گے۔" مجھے کچھ یاد آیا۔

"اے ہے وظاہر ہے اپنے گھر جائے گا اور یہاں بھی آجائے تو کیا ہے۔ اس کا اپنا گھر ہے۔ ویسے جوہی دو چار دن رہ لیتی تو اچھا ہی تھا۔ آج کل تو اسے اسکول سے ویسے بھی چھٹیاں ہیں۔" امی کو پھر احمد کی یاد آئی۔

اور میرے سامنے ناظر بھائی کا اداس چہرہ در آیا۔ ایسے رنجور اور دکھی تو میں نے انہیں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اگلے دن مجھ سے کالج نہ جایا گیا۔ طبیعت میں عجیب سی کسلمندی تھی۔

"عرشی! تجھے جانا نہیں کالج آج تو تیرا وہ موا کیا بولے ہیں؟"

"پریکٹیکل امی۔"

"ہاں ہاں وہی۔"

"امی طبیعت اچھی نہیں۔" میں نے پھر چادر منہ پر تانتے ہوئے کہا۔

"اے ہے کیا ہوا ہے تم دونوں کو۔ اُدھر وہ منجھلی بھی چادر اوڑھے پڑی ہے۔"

امی کی بات سن کر میں نے چادر کی اوٹ سے امی کی طرف دیکھنا چاہا تو مجھے یوں لگا جیسے ناظر بھائی امی کے برابر کھڑے ہیں لیکن ان کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ کی جگہ اداسی تھی۔

میں نے گھبرا کر ایک دم چادر ایک طرف الٹ دی۔

"امی! بڑی آپا کا کوئی فون نہیں آیا؟"

"اے ہاں اچھا یاد دلایا۔ ذرا نمبر تو ملا جوہی کے گھر کا۔ صبح سے دھیان اسی کی طرف اٹکا ہوا ہے جانے کیوں۔" میں نے بڑی آپا کا نمبر ملانا چاہا تو معلوم ہوا ہمارا فون ڈیڈ ہے۔

شام تک میں نے کئی بار یہ کوشش کی لیکن فون ہنوز خراب ہی تھا۔

شام گہری ہونے لگی تو امی نے مجھے پھٹکارتے ہوئے کہا۔ "کم بخت صبح سے چادر اوڑھے ایسے پڑی ہے جیسے اس کا کوئی مر گیا ہو۔ چل اٹھ رات کے لیے کھچڑی بنا لے۔ بھائی آتا ہوگا۔"

میں کھچڑی بنانے کے لیے کچن میں داخل ہوئی تو دروازے کو بری طرح سے دھڑ دھڑانے کی آواز سنی۔

"عرشی او عرشی دیکھ تو سہی یہ دروازے پر کون ہے؟" امی نے دوسرے کمرے سے مجھے پکارا۔

"توبہ کیسے بری طرح سے دروازے کو توڑا جا رہا ہے ایک تو بھائی بھی ناں۔ کتنے دن سے کہہ رہی ہوں کہ بیل ٹھیک کروا لیں۔ لیکن وہ بھی بس!" میں نے دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے سوچا۔

"بڑی آپا آپ؟" میں نے دروازے پر کھڑی جوہی آپا اور ان کی گود میں سوئے احمد کو دیکھتے ہوئے حیرانگی سے کہا۔

"آپا خیریت تو ہے؟" میں نے بڑی آپا کے چہرے پر گھبراہٹ اور قدموں میں عجیب سی لڑکھڑاہٹ محسوس کی۔

"امی.....امی۔" جوہی آپا امی کو آوازیں دیتی اندر کی جانب دوڑیں۔

"جوہی؟" امی بھی اس وقت بڑی آپا کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"امی..... بھائی آ گیا؟"

"نہیں صفدر تو ابھی گھر نہیں پہنچا۔ کیوں خیریت تو ہے؟"

"امی ناظر کل سے گھر نہیں آئے۔" جوہی آپا نے روتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" امی کی پریشانی بھی دیدنی تھی۔

"بڑی آپا آپ نے ان کے دفتر اور دوسری جگہوں پر معلوم کیا؟"

"سب جگہ فون کر چکی ہوں۔ وہ کل شام دفتر سے گھر آنے کے لیے نکلے تھے۔" بڑی آپا مسلسل روئے جا رہی تھیں۔

"اوہو۔" میں نے عجیب سے خوف کو اپنے اردگرد محسوس کیا۔

اسی لمحے صفدر بھائی اندر داخل ہوئے۔

امی اور جوہی آپا نے ساری صورتِ حال ان کے سامنے رکھ دی۔

"تم ہمت کرو میں خود جا کر معلوم کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی دوست کی طرف ہوں۔" صفدر بھائی نے جوہی آپا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ان کا ایسا کوئی بے تکلف دوست ہی نہیں۔" جوہی آپا نے بری طرح روتے ہوئے کہا۔

دو گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد صفدر بھائی گھر میں داخل ہوئے تو بڑی آپا دوڑ کر ان کی طرف لپکیں۔

"سب جگہ معلوم کرلیا۔ دفتر، دوستوں کے ہاں، اسپتال، تھانے...... کہیں بھی نہیں ہیں بہرحال ان کے دفتر والے کہہ رہے تھے کہ وہ خود بھی اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جیسے ہی کچھ علم ہوا وہ ہمیں آگاہ کردیں گے۔" صفدر بھائی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"امی میں گھر جاتی ہوں۔ شاید وہ گھر آگئے ہوں۔" جوہی آپا نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔

"اے بیٹا جوہی اس وقت!" امی نے حیران ہوتے ہوئے وال کلاک کی طرف دیکھا جو رات کے گیارہ بجا رہی تھی۔

"وہ گھر آئے تو تالا لگا دیکھ کر پھر کہیں نہ نکل جائیں۔" جوہی آپا دھیرے سے بولیں۔

"پر بیٹا تم کسی کو پڑوس میں کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ اگر وہ آئیں تو یہاں فون کرلیں۔" امی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"نہیں امی، میں چلتی ہوں۔" جوہی آپا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا چل بیٹا صفدر بہن کے ساتھ جا رات کوئی تو ہو تیرے پاس۔ میں تیرے ساتھ چلتی لیکن میری ٹانگیں بالکل بے جان پڑی ہیں۔" امی نے اپنے جوڑوں کے درد کا شکوہ کیا۔

"نہیں امی بھائی کو صبح دفتر بھی جانا ہوگا اور ویسے بھی رات یہ وہاں کیا کرے گا۔ میں عرشی کو ساتھ لے جاتی ہوں۔" جوہی آپا بولیں۔

"اچھا چل تیری مرضی ہے۔ میں تو پھر کہتی ہوں رات یہیں ٹھہر جا۔" امی نے پھر بڑی آپا کو روکنا چاہا۔

"اچھا بیٹا کوئی اطلاع ملے تو فوراً بتانا مجھے تو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔" امی نے آپا کو اٹھتے دیکھ کر کہا۔

☆.....☆

جوہی آپا کی طرح میں بھی سارے راستے یہی دعا کرتی رہی کہ ہم گھر پہنچیں تو ناظر بھائی آچکے ہوں لیکن شاید اس دفعہ ناظر بھائی لوٹ آنے کا راستہ ہی بھول گئے تھے۔ گھر کے دروازے پر ہنوز تالا ہمارا منہ چڑا رہا تھا جوہی آپا نے گھر پہنچتے ہی پڑوس میں بھی دو چار گھروں میں پوچھا لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ ملنے پر پھر چپکے چپکے رونا شروع کردیا۔ اس لمحے میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں جوہی آپا کو کیونکر تسلی دوں۔ مجھے تو عجیب عجیب سے وسوسے پہلے ہی دل میں گھر کیے بیٹھے تھے۔

"جوہی آپا! احمر کا فیڈر بنادوں۔" میں نے جوہی آپا کا دھیان بٹانے کو یونہی کہا۔

"ہاں بنادے۔ میں تو اپنی پریشانی میں یہ بھول ہی گئی۔" جوہی آپا نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔

"آپا پلیز روئیں تو نہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" مجھ سے بالآخر رہا نہ گیا۔

"اچھا اب پلیز کچھ کھا بھی لیں۔ گھر میں بھی آپ نے چائے تک نہیں پی۔" مجھے ایک دم یاد آیا کہ آپا نے نہ جانے کب سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔

"میرا کچھ جی نہیں چاہتا۔" بڑی آپا اداسی سے بولیں۔

"میں چائے اور سینڈوچ بنانے لگی ہوں آپ نے ضرور کچھ کھانا ہے۔" میں نے فیصلہ دیتے ہوئے کچن کی طرف رخ کیا۔

چائے بناتے ہوئے میری آنکھوں میں وہ پرانی جوہی آپا در آئی جو شادی کے ابتدائی دنوں میں بہت ناراض ناراض نظر آتی تھیں سب سے اور آج وہی کتنی بدل گئی تھیں اور اسی لمحے میں نے چپکے سے اللہ سے شکوہ کیا۔

"کس مٹی سے بنایا ہے ہم عورتوں کو بھی۔ نہ جانے کب سے رنگین اور خوشنما خواب بننا شروع کردیتی ہیں۔ اور پھر اچانک ہی اتنا بدل جاتی ہیں کہ سب کچھ بھلا کر اس دنیا میں گم ہوجاتی ہیں جو ان کے خوابوں سے ذرا میل نہیں کھاتے۔"

میں چائے لے کر کمرے میں آئی تو جوہی آپا کو عبادت میں مصروف پایا۔ عبادت کے دوران بھی مجھے ان کی ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔

میرا دل پھر بری طرح رونے لگا۔

"اللہ جی، جلد کوئی خبر سنادے ناظر بھائی کی طرف سے۔" میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ کسی نے بری طرح دروازہ دھڑ دھڑایا اور ساتھ ہی کال بیل پر بھی ہاتھ رکھ دیا میری رات کے جانے کس پہر آنکھ لگی تھی۔ ہڑبڑا کر دروازے کی جانب لپکی لیکن جوہی آپا مجھ سے پہلے ہی دروازے پر موجود تھیں۔ دروازے پر مجھے اجنبی سے چہرے نظر آئے۔

"السلام علیکم بھابی جی۔"

"وعلیکم السلام۔ ان کا کچھ معلوم ہوا؟" میں نے جوہی آپا کی بے تابی دیکھی۔

''جی...... جی بھائی......'' مجھے لڑکھڑاتی آواز سنائی دی۔
''لک کہاں ہیں؟''
''وہ اسپتال میں ہیں۔'' عجیب سے انداز میں کہا گیا۔
''اسپتال؟'' جوہی آپا اور میں ایک ساتھ بول اٹھے۔
''جی!'' کچھ دیر کے وقفے کے بعد پوچھا گیا۔
''آپ چل رہی ہیں ہمارے ساتھ۔''
''جی...... آتی ہوں۔'' جوہی آپا تیزی سے اندر کی طرف لپکیں۔
''عرشی احمد کا دھیان رکھنا۔'' جوہی آپا نے اپنے پرس اور چادر کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

☆......☆

آپا کے جانے کے دس منٹ بعد ہی امی بھیا کے ساتھ آ گئیں۔
''امی ناظر بھائی کے دفتر سے کچھ لوگ آئے تھے۔ بڑی آپا اسپتال گئی ہیں ان کے ساتھ۔'' میں نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔
''اللہ میرے بچے کو اپنی حفاظت میں رکھنا۔'' امی نے پریشانی سے ماتھے کو مسلتے ہوئے کہا۔
''امی میں دیکھتا ہوں۔'' بڑے بھیا نے فوراً ہی دروازے کی راہ لی۔

☆......☆

عجیب اداس اور بے کیف سا دن شروع ہوا تھا۔ میں ہر تھوڑی دیر بعد کسی آہٹ پر دروازے کی طرف لپکتی کبھی بے وجہ کھڑکی کی طرف کھڑی ہو جاتی۔
امی احمد کے پاس ہی بیٹھی تھیں جو آنے والے بے رحم وقت سے بے نیاز معصومیت سے سو رہا تھا۔
میرے دل کو عجیب سے وسوسے گھیرے ہوئے تھے۔ میری چھٹی حس عجیب سے اشارے دے رہی تھی اور میری نظروں میں بار بار ناظر بھائی کا اداس چہرہ در آتا تھا۔
اچانک ہوا کے زور سے دروازہ چرچرا کر کھلا اور ساتھ ہی بڑی آپا بھیا کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔
وہ بے اختیار امی کے گلے لگ کر رو پڑیں۔
''امی ہم اکیلے رہ گئے۔''
امی بھی آپا کو گلے لگا کر سسک پڑیں۔''ہائے میرا بچہ۔''
''امی...... احمد کے بابا ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے اور ہم اکیلے رہ گئے۔'' جوہی آپا بری طرح رو رہی تھیں۔

میں نے لپک کر احمد کو گود میں اٹھا لیا جو گھر میں اچانک ہونے والے شور اور رونے سے خود بھی رونے لگا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد ناظر بھائی کے دفتر والے بھی آ گئے ناظر بھائی کو لے کر۔
ناظر بھائی کو ہمیشہ کے لیے لے جانے کے لیے اور اس وقت بڑی آپا کے گھر کے در و دیوار بھی چپ اور اداس محسوس ہوئے۔
اور ناظر بھائی وہ یوں محسوس ہوتے تھے جیسے کسی لمبے سفر پر چل دیے ہوں اکیلے چپ چاپ۔
''عرشی...... چلو اس دفعہ تمہاری باجی کو بائی روڈ ہنزہ لے کر چلتے ہیں۔ سفر لمبا ضرور ہے لیکن تمہاری باجی انجوائے کریں گی اور مجھے تو لمبے سفر کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔'' مجھے کوئی پرانی بات بے اختیار یاد آ گئی۔
''احمد کے بابا ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں۔'' مجھے بڑی آپا کی سسکیاں سنائی دیں۔
''تمہاری باجی بڑی جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔ جب احمد بیمار ہو جاتا ہے۔ بھئی انہیں ناں۔ وہ اکیلی تو نہیں۔ میں ہوں ناں احمد کا بابا۔'' مجھے ناظر بھائی کی بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔
دفتر والوں نے بتایا کہ ناظر بھائی کی ڈیڈ باڈی شہر کے باہر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے نیچے قریب ہی بہتی چھوٹی سی ندی کے قریب سے ملی۔ شاید اداسی اور پریشانی میں راستہ بھٹک کر وہ ادھر آ نکلے تھے اور پھر کسی پتھر کی ٹھوکر سے گر پڑے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔
ناظر بھائی ہمیشہ کے لیے جا چکے تھے۔ میرا دل دکھتا چلا جا رہا تھا۔ بڑی آپا کا بلکنا دیکھا نہ جاتا تھا۔
انہیں رنج پچھتاوا اور نہ جانے کون کون سی بے رخیاں یاد آ رہی تھیں۔ وہ ناظر بھائی کو واپس آنے کے واسطے دے رہی تھیں۔
لیکن جانے والے بھلا کب لوٹ کر آتے ہیں مجھے غزل کا وہ مصرعہ یاد آنے لگا ''تم بن یہ نگری سنسان''
ارے ہمیں تو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ سادے سے خاموش ناظر بھائی کی وجہ سے بھی زندگی میں رونق اور گہما گہمی ہو سکتی تھی۔
اور میں سوچ رہی تھی کہ ہمیں لوگوں کی قدر ان کے جانے کے بعد ہی کیوں آتی ہے؟

# خوابِ سراب

جناب معراج رسول
سلام تہنیت
کسی دوسرے کی آپ بیتی لکھنا آسان نہیں پھر بھی میں نے اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے۔ رفاقت دین کی سرگزشت میں سبق ہی سبق ہے اس لیے سرگزشت میں بھیج رہا ہوں۔

ارشد علی ارشد
(سعودی عرب)

وہ میرا ہم جولی اور لنگوٹیا تھا۔ مگر وقت نے اسے مجھ سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔ آنکھوں میں اداسی کے ڈیرے اور لہجے میں تھکاوٹ کا عنصر۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کے سفر نے اسے بہت تھکا دیا ہے۔ مجھے اس کے چہرے کی جھریوں کی دبیز تہہ میں ایک درد بھری کہانی چھپی نظر آئی۔ میں نے اسے گلے لگایا تو احساس جاگا جیسے وہ رو رہا ہے۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ مجھے لگا وہ برسوں سے کسی ایسے کندھے کا متلاشی تھا جس پر سر رکھ کر رو دے اور آنسوؤں میں دل کے سارے غم بہا دے۔ میں نے کافی دیر اسے سینے سے لگائے رکھا اور شفیق باپ کی طرح شفقت سے اس کی پیٹھ تھپتھپاتا رہا۔ اس کے غم میں میرا دل بھی رنجیدہ ہو چکا تھا۔ کافی دیر بعد جب مجھ سے الگ ہوا تو مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر پُرجوش لہجے میں بولا۔

''کیسے ہو میرے یار؟''

''اللہ کا بہت شکر ہے۔ رفاقت ذین تم سناؤ کیسے ہو اور آج اس طرف کیسے۔'' میرے سوال پر وہ بولا۔

''اڑنے والے کے جب پر کٹتے ہیں تو سیدھا زمین پر ہی گرتا ہے۔ بہت اڑ لیا پر کٹ چکے ہیں میرے یار اب آسمان پر نہیں زمین پر ہی رہوں گا۔''

''بہت گہری باتیں کرنے لگے ہو۔'' میں نے چلتے ہوئے کہا۔ ''اس طرف رکشا کھڑا ہوا ہے۔'' میں نے کہتے ہوئے اس کا ایک سفری بیگ اٹھا لیا۔

''ہاں چلو۔'' اس نے قدم سے قدم ملاتے ہوئے میرے شانوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

گاؤں میں کافی تبدیلی آگئی ہے۔ یہ چھوٹا سا تانگہ اڈا کتنا بڑا بس اسٹینڈ بن چکا ہے۔'' وہ دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ میں اس کی بات سن کر فقط مسکرا کر رہ گیا۔ گھر پہنچنے میں ہمیں بیس منٹ لگے۔ اس نے رک کر میرے چار مرلے کے مکان کو بغور دیکھا۔ اس بار میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

''کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ وہی مکان ہے جسے بیس سال پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ تانبے کے برتن کو قلعی اور مکان کو رنگ روغن کرواؤ تو نئے ہو جاتے ہیں چار پانچ سال بعد کروا دیتا ہوں رنگ۔ بس نیا ہو جاتا ہے۔'' اس نے طویل سانس خارج کی اور بیٹھک میں چلا گیا۔ چائے پانی سے فارغ ہو کر بولا:

''ہم مقدر سے آگے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے باپ دادا میرے لیے کیا چھوڑ کر گئے تھے اسی گاؤں میں کچی اینٹوں کا کچا مکان تھا۔ میں نے اس پر قناعت نہیں کیا دوڑ لگا دی۔ پچیس سال پہلے سعودی عرب چلا گیا۔ پانچ سال بعد یہ گاؤں چھوڑ کر سمندری شہر میں مکان لے لیا پھر ہکا نیں لیں گھر مزید بڑا کیا جو میرا مقدر تھا مجھے ملا اور بچوں کا مقدر انہیں مل رہا ہے مگر ہم اندر کی خواہشوں کی پلیدگی نہیں دھو سکتے۔ اتنی لمبی دوڑ کے بعد اب اپنا اور میرا جسمانی موازنہ کرو تم مجھ سے برس دو برس بڑے ہو گے آج دس برس چھوٹے لگتے ہو۔''

''تمہارے صرف بال ہی سفید ہوئے ہیں۔ فکر لگا لو تو اب بھی جوان ہو۔'' میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا مگر وہ سابقہ لہجے میں بولا:

''انسان خواہشوں کو پر لگا کر اڑنے کے لیے پوری طاقت صرف کرتا ہے جب زمین چھوڑ دیتا ہے تو پلٹ کر وہیں آ جاتا ہے جہاں سے آغاز سفر کیا تھا مگر وقت مسکرا دیتا ہے۔ تم بھی میرے دوست اڑنے کی کوشش مت کرنا ورنہ اللہ کی قسم اس چار مرلے کے مکان کو ترسو گے۔''

''تم قسمت کے دھنی ہو یار۔ شہر میں اتنا بڑا مکان ہے۔ مارکیٹ ہے۔'' بینک بیلنس ہے آسودہ حال ہو اور کیا چاہیے؟''

''اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو گی کہ میں اپنے جگری یار سے، جس کے ساتھ میں نے شب بیداری کی ''لوڈو اور تاش کی محفلیں سجائیں۔'' جس کے ہمراہ دو بھینسوں کی جوڑی کی طرح ساتھ رہا اس سے بیس برس بعد مل رہا ہوں۔ ان بیس برسوں کا ہی حساب جوڑ لو میں نے سرابوں کے تعاقب میں گزار دیے اور تم نے دن اچھے تھے یا برے اپنوں کے بیچ رہ کر بسر کیے۔ زندگی کے دکھ سکھ اکٹھے دیکھے اور سہے۔ گاؤں میں وہ تالاب اب بھی ہے جس کے کنارے ہم بیٹھا کرتے تھے۔''

''وہی جس کے سینے پر ہم مقابلے میں پتھر پھینکا کرتے تھے کہ کس کا پتھر کتنے گدے کھائے گا؟''

''ہاں ہاں وہی۔'' اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر میری بات کی تصدیق کی تو میں نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں اب بھی ہے وہ تالاب۔''

''کیا اب بھی اس میں مرغابیوں کے غول اترتے ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے تاسف سے جواب دیا وہ چونک کر بولا۔

''کیوں؟''

''اب شکاری بہت ہو گئے ہیں۔'' میری بات سن کر وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے سوالیہ نگاہ سے اسے دیکھا۔

''چلو باقی باتیں وہاں کریں گے۔'' اس نے مجھے میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا تم باہر چلو میں کھانا تیار کرنے کا کہہ کر آتا ہوں۔'' میں گھر میں شام کے لیے اچھا سا کھانا تیار کرنے کا کہہ کر باہر آیا تو گاؤں کی گلیوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بچہ پہلی بار کھلونے کی دکان پر من پسند کھلونے دیکھتا ہے۔ یہی حالت تالاب پر پہنچ کر بھی تھی۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر تالاب کے سینے پر زور سے

چھپتے ہوئے کہا۔

"پتا ہے جب میری ماں کا جنازہ اٹھا اس وقت میں جدہ شہر میں مشوار (سواری) اٹھا رہا تھا۔ اس وقت سعودیہ کا قانون ایسا تھا کہ لیبر آفس میں چھٹی کے لیے درخواست جاتی تھی اور اس پر چھٹی پاس ہوتی تھی اس مد میں دو تین دن نکل جاتے تھے۔ مجھے معلوم تھا میں ماں کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکتا اس لیے جانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ابا نے کہا بیٹا تمھاری ماں کو غیروں نے کاندھا دیا اتنا کر! مجھے اپنے ہاتھوں سے دفنا جانا۔" اس نے نمناک لہجے میں کہا اور ایک طرف کنارے میں بیٹھ گیا۔ میں نے دور تک لہلہاتے ہوئے کھیتوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا:

"چھٹی والا قانون اب بھی ہے؟"

"ہے مگر اب آن لائن ہوتا ہے اس لیے بندہ آنا چاہے تو ایمرجنسی میں ایک ہی دن میں آ سکتا ہے۔" اس نے بتایا پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "جب دو سال بعد ابا دنیا کے اسٹیج پر اپنا کردار نبھا کر رخصت ہوئے تو مجھے چھٹی گزار کر آئے ہوئے دو ماہ ہوئے تھے، اتنے قلیل عرصے میں، میں پاکستان جانے آنے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ابا کی خواہش کو میں نے دولت کے ڈھیر میں دفن کر دیا۔"

"میں دونوں جنازوں میں شریک تھا۔"

میری بات سن کر وہ اندر سے جیسے ہل گیا۔ اداس لہجے میں بولا۔ "پھر قسمت کا دھنی میں ہوں یا تم میرے یار، کہ تم دوستوں کے فرض کفایہ بھی ادا کرتے رہے ہو۔"

"میں کیسے شریک نہ ہوتا یار جب تم سعودی عرب گئے تھے تو تمہارے ابا مرحوم میری دکان پر آ کر گھنٹوں بیٹھے رہتے اور کہتے۔ پتر جسیل تمھاری شکل میں مجھے اپنا پتر رفاقت دین نظر آتا ہے۔ کم بخت چھوڑ کر سمندروں پار چلا گیا۔"

"ہاں مجھے ابا نے بہت روکا تھا کہ پتر مت جا تو ہماری اکلوتی اولاد ہے تیری جدائی برداشت نہیں ہوگی روکھی سوکھی جو بھی ملی کھا لیں گے۔" مگر میں نہیں مانا مجھے زندگی کی ہر سہولت درکار تھی جب گاؤں میں ٹھیکیدار بشیر پہلا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی لے کر آیا اور جمعرات کی رات پورے گاؤں نے اس پر وحید مراد کی فلم دیکھی تو میں نے تہیہ کر لیا کہ اب باہر جاؤں گا خوب کما کر لاؤں گا۔ گھر بڑا اور پکا کروں گا، حجرہ بناؤں گا، ٹی وی لوں گا اور پورا گاؤں میرے حجرے میں وحید مراد کی فلم دیکھنے آئے گا۔ اسی لگن میں، میں سمندری شہر گیا وہاں سے پتا چلا سعودی عرب جانے کے لیے سولہ ہزار روپے لگتے ہیں۔ میں نے گھر آ کر ابا امی کو بتایا پہلے تو وہ نہ مانے مگر میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال

ایک صاحب نابینا تھے۔ انہیں شادی کے چاول کھانے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے ایک لڑکا اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ جب کسی محفل میں جاتے وہ لڑکا ان کے ساتھ ہوتا۔ وہ کھانا شروع ہوتے وقت انہیں کہنی مارتا اور وہ کھانا شروع کر دیتے۔ اتفاق سے ان کی شادی ہو گئی۔ نکاح کے بعد کھانے کا مرحلہ آیا تو بیٹھتے وقت لڑکے کی کہنی اچانک ان کے لگ گئی۔ صاحب نے فوراً کھانا شروع کر دیا۔ وہ تیزی سے کھانا کھانے لگے۔ لڑکے نے کھنکار کھنکار کر تیزی سے کہنی مارنی شروع کر دی تو وہ بولے۔

"ابے کیا لوٹ مچی ہے؟"

مرسلہ: ناہید سلمان۔ کوٹ ادو

دیے۔ میں نے کچھ پیسے ادھر ادھر سے ادھار کر کے ایجنٹ کو پاسپورٹ بنا کر دے دیا ویزا آیا تو گھر کی پالتو بھینس فروخت کی اور سعودی عرب پہنچ گیا۔ میں نے سوچا تھا باہر جانے والے لوگوں کو بابو ٹائپ نوکری ملتی ہوگی۔ کام کم اور اجرت زیادہ۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مزدور صرف مزدور ہی ہے، چاہے کہیں بھی چلا جائے۔ وہاں بھی وہی کام تھا وہی مستری وہی بلاک اور وہی سیمنٹ۔ صبح سے شام تک کام اور پھر امور خانہ داری جو پردیس میں بطور بونس ملی تھی مگر میں خوش تھا۔ ایک کے آٹھ بن رہے تھے۔ ابا کو خط لکھ دیا کہ میں بہت خوش ہوں۔ کام نہ ہونے کے برابر ہے اور پیسا پاکستان کے مقابلے میں آٹھ گنا زیادہ۔ ان کا جوابی خط آیا تو میں ایک پل کے لیے ہل کر رہ گیا۔ میرے قدم لڑکھڑانے لگے تھے مگر خود کو مستقبل کے سہانے خوابوں کی زنجیر میں مضبوطی سے جکڑ دیا۔ ابا نے خط میں لکھا تھا۔ پیسا سو گنا بھی زیادہ ملے تو ہمارے پتر کی جدائی کا زخم دھو نہیں سکتا۔ ایک گائے ابھی باقی ہے۔ اس کا دودھ بیچ کر گھر کا چولہا جلتا رہے گا۔ تو اپنے پیسے بچا کر رکھ اور جلدی واپس آنے کی کوشش کر۔"

"میں پہلی چھٹی گزارنے دو سال بعد گھر آیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ تجھے لینے ہم سب دوست ایئر پورٹ گئے تھے۔"

"جب تم باہر آئے تو ہم لوگ پاگل ہی ہو گئے تھے۔ کلف لگا کاٹن کا سفید سوٹ، ہاتھ میں گولڈن گھڑی، انگلی میں سونے کی رنگ، آنکھوں پر کالا چشمہ اور بدن سے پھوٹتی ہوئی بھینی خوشبو۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے میرے دل میں خیال آیا تھا کہ گھر بیچ کر باہر چلا جاؤں۔"

"پھر جانے کی کوشش کیوں نہیں کی نہ ہی مجھ سے

کہا۔ ''تم نے پوچھا تھا۔

''گھر میں بات کی تھی۔'' میں نے کہا تھا۔

''پھر؟''

''پھر یہی کہ تم نے ابا کی بات نہیں مانی مگر میں نے مان لی تھی۔''

''سمجھداری کا کام کیا میرے یار۔''

''اچھا تم آگے بتاؤ۔''

ہم نے پرانے مکان گرا کر نئے پختہ مکان بنائے۔ ٹی وی خریدا اور کچھ نیا فرنیچر۔ میرے دو سالوں کی کمائی سے گھر کا نقشہ بدل گیا۔ میں بہت خوش تھا اپنے دوستوں میں سر تن کر چلتا تھا۔ والدین نے کہا ''پتر اب آ گئے ہو تو شادی کر کے جانا واپس۔'' مگر میں نہیں مانا۔ میرے خوابوں کی صندوقچی میں اب بھی بہت کچھ باقی تھا۔ میں دو ماہ بعد پھر لوٹ گیا۔ اس بار میں نے تین سال کا جبر سہا اور گھر تب گیا جب میرے پاس اتنے پیسے ہو گئے کہ میں گھر کے ملحق زمین خرید کر اس پر اپنا حجرہ بنا سکوں۔ میں نے ایسا ہی کیا حجرہ بنا کر اس میں ٹی وی رکھا تو میرے اندر بے کراں سکون اتر گیا۔ اتنا کچھ ہو چکا مگر میرے والدین کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی اور غم کبھی رفع نہ ہوئی۔ وہ مجھے اور میں انہیں سمجھاتا رہا۔ جب میں شادی کرنے کے لیے آیا تو ابا نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''رفاقت دین اب تو خیر سے شادی شدہ ہے۔ کل کو ان شاء اللہ بچوں والا ہو جائے گا۔ نہ جا پتر بس کر بہت ہو چکا۔ محلے میں اچھی دکان کھول لے ہمیں بھی خوشی سے جینے دے اور خود بھی بیوی بچوں کے ساتھ سکون سے رہ۔''

''بس ابا آخری چکر لگانے دے شادی میں بہت اخراجات اٹھ گئے ہیں۔ ہاتھ کھل جائے تو پھر نہ جانے کے لیے آ جاؤں گا۔''

میں نے وعدہ کر لیا مگر اسے پورا نہ کر سکا۔ میری بیوی پڑھی لکھی تھی اسے گاؤں پسند نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہم سمندری شہر میں گھر خرید لیں۔ اس کا میکہ بھی سمندری میں تھا۔ مجھے بھی گاؤں میں اب لطف نہیں آتا تھا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح والدین کو راضی کیا اور سمندری شہر میں شفٹ ہو گئے۔ شہر کے ایک اچھے علاقے میں گھر لینے کے لیے خطیر رقم درکار تھی اس لیے میں نے گاؤں والا گھر اور حجرہ والدین کو بتائے بغیر فروخت کر دیا تھا۔ میں اب ایک نئی دوڑ میں شامل ہو چکا تھا۔ اسی دوڑ میں جیتنے کے لیے میں نہ ماں کے جنازے کو کاندھا دے سکا نہ باپ کو اپنے ہاتھوں قبر میں اتار سکا۔ پہلے اپنی خواہشیں تھیں

شادی کے بعد کچھ خواہشیں بیوی کی پلو سے باندھ لیں۔ ابھی وہ ادھوری تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے تین بچوں کا باپ بنا دیا چوتھے نمبر پر بچی پیدا ہوئی تو بیوی نے کہا۔

''رفاقت دین خیر سے چار بچوں کے باپ بن گئے ہو۔ ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں ہیں تم پر۔ وہ بھی باکمال تھی خواہشوں کو ذمہ داری کے لباس میں سی کر مجھے پہنا دیا کہ بہت جچو گے اس لباس میں۔ محنت تو پہلے بھی میں بہت کرتا تھا مگر بچی کی پیدائش کے بعد میں خود غرض بھی بن گیا۔ دوسروں کے حصے کا اوور ٹائم بھی لگانے لگا۔ ڈیوٹی کے بعد خصوصی گاڑی میں پسنجر اٹھانے لگا۔ اس طرح صبح چار بجے سے شام چھ بجے تک سائیٹ پر مزدوری کا کام کرتا اور بعد میں رات دس گیارہ بجے تک مشوار ڈھونے لگا۔ میں انسان سے پیسا کمانے کی مشین بن گیا۔ بچوں کے جوان ہونے تک ایک مارکیٹ کھڑی کر چکا تھا۔ آج بھی بچوں کی پڑھائی ختم ہو تو سب کچھ چھوڑ کر گھر چلا جاؤں گا۔ اب میرے آرام کے دن ہیں مگر......''

وہ چند لمحے رکا۔ وہ بولتا رہے اس لیے میں چپ رہا۔ طویل سانس خارج کرنے کے بعد وہ پھر سے بولا۔

''میں نے جب سعودی عرب چھوڑنے کی بات کی تو بچے مانے نہ بیوی۔'' بیوی نے تو فوراً کہہ دیا۔

''رفاقت دین تیرا دماغ چل گیا ہے۔ بچوں کی شادیاں سر پہ ہیں اور تم اپنی کشتی خود بیچ منجدھار چھوڑ کر کنارہ تلاش کرنے لگے ہو۔ یہ بے وقوفی مت کرنا۔''

میں نے ہمیشہ کی طرح ان کی لاج رکھی اور پھر سے کولہو کے بیل کی طرح جت گیا۔ بچے پڑھ لکھ کر نوکریوں پر لگ گئے۔ ان کی شادیاں ہوئیں تو وہ اپنی دنیا میں مگن ہو گئے۔ اس دوران بیوی نے بھی ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا۔ ایک بچی ہے جو آ جاتی ہے حال احوال پوچھنے۔ بیٹے اپنے اپنے گھروں میں مگن ہو گئے۔ میں نے اپنا گھر اور حجرہ والدین کو بتائے بغیر فروخت کر دیا تھا۔ میرے بچے اب مارکیٹ کے کرائے کی مجھے ہوا بھی لگنے نہیں دیتے۔ سعودی عرب جب بھی چھٹی گزار کر جاتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں۔

چاچا اب گھر جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔ میں سوچتا ہوں میرا وہاں کون سا گھر ہے جس میں بیٹھ کر میں اللہ اللہ کروں۔

رفاقت دین چپ ہوا تو میں نے دیکھا آنسوؤں کے قطرے اس کے چہرے کی جھریوں میں راستہ بناتے ہوئے سفید داڑھی میں گم ہو رہے تھے۔

# مکافاتِ عمل

جناب ایڈیٹر سرگزشت
سلامِ مسنون
انسان بھی ایسا بے حس مخلوق ہے جو سب کچھ سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پاتا، ہم مسلمانوں کی رہبری کے لیے کتابِ خدا موجود ہے جس میں ہر بات کھول کھول کر بیان کردی گئی ہے لیکن ہم اس میں درج احکامات پر بھی توجہ نہیں دیتے۔ سرفراز نے بھی توجہ نہ دی اور خود کو ارضی خدا سمجھ لیا، یہ اسی سرفراز کی روداد ہے جو صدر میں بھیک مانگتا ہے۔ اس کے حالات کو میں نے کہانی کے انداز میں پیش کیا ہے۔

سید محمود حسن
(جعفر طیار، کراچی)



میں صدر کے علاقے سے گزر رہا تھا کہ فٹ پاتھ پر ایک معذور فقیر بیٹھا ہوا نظر آیا، داڑھی بڑھی ہوئی، ہاتھ اور پیر اکڑے ہوئے، دے دے اللہ کے نام پر بابا۔ وہ ایسے بول رہا تھا کہ جیسے اسے بولنے میں بھی مشکل پیش آرہی ہو۔

وہ فقیر مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ میں نے جیب سے دس کا نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ پر ڈال دیا، وہ بھی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کہ پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔ لگتا ہے وہ مجھ سے زیادہ پیسے نکلوانا چاہتا ہے، ایسے

فقیروں کا یہی طریقہ کار ہوتا ہے، میں بڑبڑاتا ہوا آگے چلتا چلا گیا۔

پھر یکایک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور یاد آ گیا کہ اس کی شکل ہمارے آفس کے ایک پرانے ملازم سرفراز سے ملتی ہے لیکن یہ بھیک کیوں مانگ رہا ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

تین سال پہلے میری پروموشن بطور آفس سپرنٹنڈنٹ ہوئی اور میں پوسٹنگ پر اسلام آباد چلا گیا۔ جب میں یہاں تھا میری سب سے زیادہ دوستی سینئر کلرک عمران سے تھی، جو کہ میرا ہم عمر تھا۔ اس کا اور میرا مزاج بھی ملتا تھا۔ اسلام آباد پہنچنے کے بعد شروع میں تو عمران سے میرا رابطہ رہا، پھر میں اپنے کاموں کے سلسلے میں ایسا مصروف ہوا کہ پرانے دوستوں کو بھولتا چلا گیا، ایک شادی کے سلسلے میں کراچی آنا ہوا، تو سوچا کہ پرانی یادیں تازہ کرلوں۔ عمران سے بھی ملاقات کرلوں۔ شاید وہ اس فقیر کے بارے میں کچھ بتا سکے۔

میں آفس پہنچا تو عمران میرا منتظر تھا۔ ”آؤ آؤ حسن بھائی، بڑے دن کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کیا کھاؤ گے؟“

”کھانا کھائیں گے، اور گپ شپ بھی چلے گی پھر گرما گرم چائے۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔

وہ میرا ایسا ہی دوست تھا جسے بلاشبہ ہم پیالہ اور ہم نوالہ قرار دیا جاسکتا تھا۔

ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ میں نے ہاتھ روک کر کہا۔ ”یار آج عجیب واقعہ ہوا، تمہیں تو یاد ہوگا کہ اپنے آفس میں ایک نائب قاصد سرفراز خان ہوا کرتا تھا، بالکل اس سے ملتا جلتا آدمی میں نے صدر میں کیفے اے ون کے سامنے فٹ پاتھ پر دیکھا ہے، بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ سرفراز ہی ہے۔“

”ہاں وہ سرفراز ہی ہے۔“ عمران نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اور یہ اپنی اس حالت کا خود ذمہ دار ہے۔“

سرفراز کہنے کو تو ہمارے آفس میں نائب قاصد تھا، یعنی ایک چھوٹا سا ملازم، جیسا کہ ہر آفس میں چھوٹے ملازم ہوتے ہیں جو کہ ڈاک لانے، لے جانے، چائے پانی اور دوسرے کام کرتے ہیں لیکن اس کا اسٹائل سب سے جداگانہ تھا، وہ چلتا تھا تو اس کی گردن اکڑی ہوئی ہوتی تھی، کاٹن کے سفید کپڑے، ہاتھ میں راڈو گھڑی، گلے میں سونے کی چین، جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی۔

مجھے وہ وقت بھی یاد آیا جب ایک بوڑھا پینٹر ہمارے آفس میں کام کرنے کے لیے آیا تو اس نے اس غریب کی بہت بے عزتی کی۔ ”اوے بوڑھے، تو کیا رنگ کرے گا، تیرے پیر تو ویسے ہی قبر میں لٹکے ہوئے ہیں۔“

ہم سب اس کے اس رویے پر حیران ہو گئے تھے کہ یہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔

”صاحب کر ہی لوں گا آہستہ آہستہ، اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ جو پالنا ٹھہرا۔“ اس پینٹر نے مسکین لہجے میں جواب دیا تھا۔

”اوے تم لوگ ہو ہی جھوٹے اور گندے۔ چل جلدی جلدی اپنا کام کر نہیں تو بڑے صاحب کو تیری شکایت کردوں گا۔“

وہ ہر ایک کی اسی طرح بے عزتی کرتا تھا۔ کچھ لوگوں نے منع کرنے کی بھی کوشش کی لیکن سرفراز اس ہتک آمیز رویے سے کہاں باز آنے والا تھا، وہ تو جیسے غریبوں کی بے عزتی کر کے سکون محسوس کرتا تھا۔

جب وہ آفس میں داخل ہوتا تھا تو لوگ کہتے تھے۔ ”آ گیا کمینہ۔“ لیکن یہ سب باتیں لوگ چپکے چپکے ہی کہا کرتے تھے۔ کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے منہ پر کچھ کہہ سکے، کیونکہ وہ بدتہذیب اور شور شرابہ کرنے والا شخص تھا، اور اس پر طرہ یہ کہ کچھ راشی افسران کا منظور نظر بھی تھا۔ پھر کچھ لوگ اس کے قرضدار تھے، جو کہ سود در سود اس کے قرضے میں جکڑے ہوئے تھے اس لیے اسے کچھ بھی نہ کہہ سکتے تھے۔

سرفراز کا خاص کام، غریبوں کو تنگ کرنا تھا، یعنی بس ایک مرتبہ کسی کا کام اس آفس میں رک جائے تو سرفراز اس سے اس کے عوض بھاری رشوت لیتا تھا، آنے والے سائلوں کی فائل دبا لیتا تھا، اور انہیں جھوٹے رعب میں لے لیتا تھا کہ او بھائی، تمہارا کام تو ہو ہی نہیں سکتا، صاحب بہت سخت ہیں، نیا صاحب آیا ہے، بڑا ایماندار ہے، یہ تو ہم اپنی Technique سے کام کراتے ہیں۔ افسران کو ان کی من پسند چیزیں اور تحفے تحائف بھی دینے پڑتے ہیں۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے، جب ایک بوڑھا اور معذور آفس کے اندر داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، جسے وہ زمین پر ٹیک ٹیک کر آہستہ آہستہ چل رہا

تھا، اس کی فائل ڈائریکٹر کے پاس approval کے
لیے جانی تھی، اور اگر ڈائریکٹر اس کی فائل پر yes کر
دیتا تو اس کا پلاٹ جس پر اسے مکان بنانا تھا، مل جاتا
ابھی وہ ایک کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا، اس کے
یہاں بیٹا کوئی نہیں تھا، صرف دو بیٹیاں تھیں، اور اب وہ
ان کی شادی کرنا چاہتا تھا، جس کے لیے اسے پلاٹ کو لیز
کرانے کی ضرورت تھی، اگر اس کی فائل approve
ہو جاتی تو وہ اپنے اس پلاٹ کو بیچ کر ان کی شادی بھی
کراتا اور جہیز بھی دیتا اور پھر بقول ان کے ان پر کچھ
قرضہ بھی تھا، جو کہ انہوں نے اتارنا تھا۔

سرفراز نے اس بوڑھے اور معذور شخص کو آفس کے
بہت چکر لگوائے، یہاں تک کہ وہ مجبور ہو گیا۔ سرفراز نے
اس بوڑھے اور معذور شخص سے اس کے کام کے لیے
رشوت کی مد میں رقم وصول کر لی، مجھے آج تک اس معذور
شخص کا چہرہ یاد ہے کہ نجانے کس طرح اس نے پیسوں کا
انتظام کیا ہوگا لیکن اگر وہ پیسے نہ دیتا تو اس کا کام بھی نہ
ہوتا۔ میں نے سرفراز کو سمجھانے کی کوشش بھی کہ یار کسی کو
تو چھوڑ دیا کرو، اگر کوئی غریب آدمی یا اس ٹائپ کا معذور
آدمی ہو تو اس کا کام بلا معاوضہ بھی کر دیا کرو۔

''او چھوڑ حسن باؤ تجھے نہیں پتا یہ دنیا فراڈیوں اور
دھوکے بازوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ بھی کوئی غریب نہیں
ہوگا صرف ہمارے سامنے دکھاوا کر رہا ہے، سالے ڈرامے
باز کہیں کے۔'' اور پھر وہ ایک زوردار قہقہہ لگاتا۔

سرفراز کی زندگی اسی طرح چل رہی تھی۔ پہلے وہ
نہایت غریب تھا، پھر اس نے ایک گاڑی خریدی پھر
دوسری، پھر تیسری، اور پھر ایک شاندار مکان بنایا، اس کے
بعد پلاٹ اور مزید پراپرٹی خریدتا چلا گیا۔ مال حرام سے اپنی
جیبیں بھرتا چلا گیا۔

سرفراز نے کئی گرل فرینڈز بھی پالی ہوئی تھیں، جن
سے ہر وقت اس کا رابطہ رہتا تھا، غرضیکہ اس کے دن و رات
عیش و آرام میں گزر رہے تھے، وہ اکثر میرے دوست
عمران کو کہتا تھا میری طرح بن جاو، تم لوگ چوہے کی طرح
ڈرپوک اور بزدل ہو، غربت زدہ زندگی گزارتے ہو، تھوڑی
ہمت کرو، میں باہر سے کیس پکڑ پکڑ کر لاؤں گا، یعنی تم لوگوں
کے لیے مرغے پھنسا پھنسا کر لاؤں گا، تمہیں کچھ نہیں
کرنا، اور پرنٹ تو میری لائن ہے نا، تمہیں ساتھ دیتے رہنا
ہے۔ بس میری صرف تعلیم تو ذرا کم ہے نہیں تو میں ڈائریکٹر کی
سیٹ پر بیٹھا ہوتا۔ خیر میرے پاس دولت کی تو کوئی کمی نہیں۔
کئی کئی حسین معشوقائیں ہیں، جن سے دل بہلاتا ہوں۔''
اور پھر وہ ایک اپنا مخصوص اسٹائل میں قہقہہ لگاتا۔ ''لیکن تم تو
میرے جیسے بن ہی نہیں سکتے، کیوں، ہمت جو نہیں ہے۔ بس
ایسے ہی زندگی گزارو۔''

عمران اس کی بات سنی ان سنی کر دیتا، ظاہر ہے کہ یہ
اس کا روز کا معمول تھا اور اس کے ڈائیلاگ ہمیں یاد ہو چکے
تھے۔

''تم غریب لوگ، غربت میں ہی پیدا ہوتے ہو اور
غربت میں ہی مر جاؤ گے، میری طرح باہمت اور بہادر بنو،
اور زندگی میں عیش کرو۔''

''لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو وہ تو حرام ہے گناہ ہے۔''

''ابے حلال و حرام کے چکر میں نہ پڑ، اپنا کام کرو تم
لوگوں کو تو سمجھانا ہی فضول ہے۔'' وہ زور سے قہقہہ لگاتا۔

سرفراز خان کہنے کو اس سرکاری آفس میں نائب
قاصد تھا لیکن اس کے ایکشن افسروں اور امیر کبیر افراد کے
سے تھے، وہ اپنے آپ کو افسر اور وی آئی پی خیال کرتا تھا۔

ہر ایک سے بدتمیزی سے بات کرنا، ہر ایک سے لڑنا
اس کا وتیرہ تھا، اور لوگ یہی کہہ کر نظر انداز کر دیتے کہ چھوڑو
بدتمیز آدمی ہے، اس کے منہ کیا لگنا۔

میرا واسطہ سرفراز خان سے زندگی میں ایک ہی
مرتبہ پڑا تھا، جب مجھے اپنے علاج کے لیے پانچ ہزار
روپے کی ضرورت پڑی تھی، ہوا یوں کہ بائیک ایکسیڈنٹ
میں میرے پیر میں فریکچر ہو گیا تھا، مہینے کا آخر تھا اور
سارے پیسے علاج اور بچوں کی فیس میں ختم ہو چکے تھے،
مجبوراً مجھے پانچ ہزار روپے اس سے سود پر ادھار لینے
پڑے جو کہ میں نے اس کی شاطر دماغی اور اپنی بے عزتی
کے ڈر سے ساڑھے سات ہزار روپے یعنی 2500
روپے فالتو ادا کیے۔ اس کے بعد میں نے توبہ کی کہ اس
شخص سے کبھی میرا کام نہ پڑے۔

جب میں صحت یاب ہو گیا، اور اس کے پیسے اسے
واپس کرنے لگا، تو اس نے نخوت اور غرور سے کہا۔ ''ابے
رکھ لے، اور چاہیے تو اور لے لے، دیتے رہنا آہستہ آہستہ
اپنا بینک اسی لیے تو ہے، لوگوں کی وقت پر مدد کرنا اور انہیں
سہولتیں دینا۔''

اب میں اس کو کیا کہتا کہ سہولت تو وہ دیتا ہے، پر
اس کے بدلے سود بھی تو لیتا ہے، اگر میں ایسا کہتا تو اس کا

اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، اور نہیں... کبھی آگے بھی اس شخص سے کام پڑ سکتا تھا۔ اس لیے ہم بظاہر اس کا احسان ماننے اور شکریہ ادا کرنے کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔

وہ ہر چلتے پھرتے آدمی کو اوے کہہ کر آواز دیتا تھا، اوئے ادھر آؤ، چل جا یہ فائل لے کر آ، صاحب بلا رہے ہیں، آتا ہے یا بتاؤں تجھے، بیچارے قریشی صاحب جو کہ پانچ بیٹیوں کے باپ تھے، کہنے کو تو آفیسر تھے لیکن ہمیشہ ہی مسائل کا شکار نظر آتے تھے، وہ بھی سرفراز کے مقروض تھے، انہوں نے پانچ لاکھ روپے کا قرضہ لیا تھا، جو کچھ وہ جائز و ناجائز ذرائع سے کماتے تھے، وہ سارا سرفراز کی قرضے کی قسط اتارنے میں چلی جاتی تھی۔ وہ ڈیلی یا ہر ہفتے ان سے پیسے لیا کرتا تھا۔ جو کہ سود کی وجہ سے بہت زیادہ بن چکا تھا اور وقت پر نہ دینے کی صورت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ قریشی صاحب کی آفس میں جو بے عزتی کرتا تھا، اسے دیکھ کر تو جیسے ایک تماشے کا سا سماں ہو جاتا تھا۔ اور کبھی کبھار تو وہ ان کی گدی پر ایک آدھ ہاتھ بھی جما دیتا تھا۔ ”ابے نکال میرا آج کا بھتہ۔“

اور قریشی صاحب کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے، جھینپ مٹانے کے لیے جو کچھ ان کے پاس ہوتا تھا، جیب جھاڑ کر دے دیتے تھے۔

اسی طرح لوگوں کو زبردستی کھانا کھلانا، اور پھر سارے زمانے میں شور کرتا کہ یہ غریب آدمی ہے، میں تو ان کی صرف مدد کرتا ہوں۔

ہر ایک کو سود پر قرضہ دیتا اس شرط پر کہ میں اوپر سے چارجز ضرور لوں گا، اور چارجز بھی میری مرضی کے مطابق ہوں گے۔

لوگ بے چارگی کے عالم میں کہتے، ہاں ہاں سرفراز بھائی، کوئی بات نہیں چارجز بھی دیں گے اور آپ کی فیس بھی، بس آپ ہماری مدد کر دو، فی الحال بہت مجبوری ہے۔

لوگوں کو گالیاں دینا، ہر آدمی سے لڑنا اس کا محبوب مشغلہ تھا، وہ انسانوں کو حقیر سمجھتا تھا۔ وہ آفس بھی کبھی کبھار آتا تھا کیونکہ وہ پیسا اوپر تک کھلاتا تھا۔

ہر ایک سے کہتا کہ قیمتی کپڑے پہنو، غریبوں سے ہاتھ نہیں ملاؤ، یہ غریب لوگ ہیں انہیں جینے کا کوئی حق نہیں، یہ حقیر کیڑوں کی طرح ہیں۔ نہ ان کے پاس عقل ہے اور نہ ہی دولت، اگر عقل ہوتی تو میری طرح آج کروڑ پتی

ہوتے۔

ایک مرتبہ اس نے آفس کے ایک شریف جونیئر کلرک اشتیاق کو چھیڑ دیا۔

اشتیاق بنیادی طور پر ایک سنجیدہ انسان تھا اسے دیکھتے ہی اس نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ”اوئے چوہے۔“

اشتیاق نے مڑ کر کہا۔ ”یار میں نے تمہیں منع بھی کیا ہے مجھ سے مذاق مت کیا کرو۔“

”ابے تو کیا ہوا، تم تو لگتے ہی چوہے ہو۔“ اشتیاق نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ لوگ بیچ بچاؤ کرانے کے لیے آگئے۔

”او یار میں تو اس سے مذاق کر رہا تھا۔ یہ ایویں میرے گلے پڑ گیا۔“

اشتیاق نے افسران بالا کو شکایت کی لیکن سرفراز بڑے افسران کا منظور نظر تھا، اس کا کچھ بھی نہ ہوا۔ کچھ آفیسرز اس لیے اس کا خیال کرتے تھے کہ وہ انہیں عیش کرواتا تھا۔

اس کا ایک بھائی بھی تھا جو جرائم کے اڈے چلاتا تھا۔ اس اڈے پر سرفراز بھی شام میں جا کر بیٹھتا تھا، وہیں جوئے کی جیتی ہوئی رقم پر لوگوں میں تکرار ہوئی اور معاملہ اتنا خراب ہوا کہ فائرنگ ہوئی، دو آدمی زخمی ہوئے اور ایک آدمی کا قتل ہو گیا، عینی شاہدین کے مطابق قتل اس کے بھائی نے کیا تھا، اور اس نے اس کی معاونت کی تھی۔

پولیس اسے بھی پکڑ کر لے گئی، اڈے کو سیل کر دیا گیا لیکن سرفراز اور اس کا بھائی انتہائی مال حرام کما چکے تھے، ان لوگوں نے مک مکا کر لیا، اور جو مقتول کے وارث تھے، انہیں قصاص کی مد میں 5 لاکھ روپے دے دیئے تو مقتول کے ورثا نے کیس واپس لے لیا۔ سرفراز جو کہ محکمانہ کارروائی کا شکار ہوا تھا، نوکری سے بھی معطل تھا۔ حیرت انگیز طور پر اسے نوکری پر بحال کر دیا گیا۔ وہ کسی فاتح کی طرح آفس میں داخل ہوا۔ لوگوں نے سمجھانا چاہا کہ تم نے بڑا سخت ٹائم گزارا ہے، اب تو سدھر جاؤ، یہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارننگ ہوتی ہے کہ راہ راست پر آجائے، ایک بوڑھے شخص مرید احمد نے جو کہ آفس میں سب سے بزرگ تھے، اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔“

اس نے بغیر کچھ سنے سینہ پھلا کر کہا۔ ”اوئے پاگلو، میرا کچھ نہیں ہوتا تھا، چند مار دیا تو کیا ہوا میں نے ہر جگہ

پیسا پانی کی طرح بہایا ہے، اور اب تمہارے سامنے بیٹھا ہوں، اس سے سمجھ لو کہ پیسے میں کتنی قوت ہوتی ہے۔" اس کی اکڑ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

اس کی نیت بہت ہی خراب تھی، ہر آدمی سے روپے نکالنے کی کوشش کرتا، اور پھر طرہ یہ کہ اس کو اپنا ٹیلنٹ قرار دیتا تھا۔ فخریہ کہتا تھا۔ "ابے یہی تو میری Tacts ہیں، تم لوگ کیا جانو" میں آفس میں عمران کے ساتھ بیٹھا سرفراز جیسے نہ بھولنے والے کردار کی کہانی میں گم تھا۔ عمران نے مجھے ٹوکا۔ "ارے بھائی کہاں گم ہو گئے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، کھانا تو کھالو۔"

"یار میرا ذہن ای فقیر میں الجھا ہوا ہے۔" میں نے پلیٹ اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ سرفراز ہی ہے، جسے تم نے صدر میں فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اب سنو کہ وہ اس حال کو کیسے پہنچا، وہ تم نے سنا ہے نا کہ اللہ ظالم کی رسی دراز تو کرتا ہے مگر جب اسے کھینچنے پر آتا ہے تو کوئی نہ کوئی ذریعہ بن جاتا ہے، ایسا ہی سرفراز کے ساتھ ہوا۔" وہ سانس لینے کو رکا پھر بولا۔

اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ اس حال کو کیسے پہنچا، شاید اس دن اس کی قسمت کی خرابی تھی، یا اس کے گناہوں کی سزا ملنے کا وقت آ گیا تھا کہ یہ ایک مجذوب سے جا ٹکرایا۔ اسے یہ سزا ایک مجذوب سے ٹکرانے پر ملی ہے۔

"لیکن کیسے؟" میں ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ اتنا امیر اور دولتمند شخص جو کہ اپنی ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتا تھا، آج اس حال کو کیسے پہنچا۔

"صدر میں ایک مجذوب گھومتے ہوئے نظر آتے تھے، سر پر صافہ، ہاتھ میں ڈنڈا، لوگ ان کا احترام کرتے تھے، آپ جہاں چاہتے بیٹھ جاتے، جس کے پاس جاتے، وہ کچھ نہ کچھ آپ کو کھانے کے لیے دیتا، آپ کا دل چاہتا تو کھاتے نہیں تو سر پر ہاتھ رکھتے اور بغیر کچھ کہے مسکراتے ہوئے آگے نکل جاتے، اکثر آپ وجد میں حق ھو کا نعرہ لگاتے۔ لوگوں نے بتایا کہ جس کسی نے بابا کا مذاق اڑانے کی کوشش کی اس کا عبرتناک انجام ہوا۔

سرفراز خان اس دن صدر کے علاقے سے گزر رہا تھا کہ اچانک مجذوب اس کے سامنے آ گئے اور وہ ان سے ٹکرا

## بلڈ پریشر ہائی کیوں ہوتا ہے؟

وجوہات کے تناظر میں ہائی بلڈ پریشر کی دو اقسام ہیں۔ ان میں سے پہلا پرائمری اور دوسرا سیکنڈری ہائپر ٹینشن ہے۔ علم الامراض میں کچھ بیماریاں یا کیفیات ایسی ہیں جن کا حتمی سبب ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا۔ تکنیکی زبان میں انہیں ایڈیو پیتھک (Idiopathic) کہتے ہیں۔ پرائمری ہائپر ٹینشن بھی انہی میں سے ایک ہے۔ اس مرض میں شریانیں سخت ہو جاتی ہیں جس کی حقیقی وجہ ابھی تک سمجھی نہیں جاسکی۔ البتہ کچھ عوامل ایسے ہیں جو ہائی بلڈ پریشر کے امکانات کو بڑھا دیتے ہیں۔ ان میں عمر کا بڑھنا، فرد کا مرد ہونا، اینگزائٹی، وزن زیادہ ہونا، شوگر کی بیماری، کچھ دواؤں کا استعمال اور کھانے میں نمک کا زیادہ ہونا شامل ہیں۔ ان عوامل کی موجودگی میں ہائی بلڈ پریشر جلدی ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ یعنی ویسے اگر کسی کو یہ مرض 40 سال کی عمر میں ہونا تھا تو اب وہ 30 سال میں ہوسکتا ہے۔ اس کی دوسری قسم سیکنڈری ہائپر ٹینشن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مریض کو ہائپر ٹینشن نہیں تھا لیکن کسی اور بیماری یا کیفیت کی وجہ سے اسے یہ مرض لاحق ہو گیا۔ کسی فرد کو ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا کر دینے والی بیماریوں میں گردوں کی بیماری، گردوں کو خون فراہم کرنے والی رگوں میں تنگی، ایسا کینسر جو ہارمونز کے زیادہ اخراج کا باعث بنے شامل ہیں۔ سیکنڈری ہائپر ٹینشن سے چھٹکارا ممکن ہے یعنی اگر اس کا باعث بننے والے مرض کا شافی علاج ہو جائے تو ہائپر ٹینشن بھی ختم ہو جائے گی اگر ہائپر ٹینشن پرائمری ہے تو پھر یہ ممکن نہیں، اس کے لیے اس کی حقیقی وجہ ہی معلوم نہیں جسے دور کیا جاسکے۔ ایسے میں عمر بھر دواؤں اور احتیاطوں کی ضرورت ہوگی۔

مرسلہ: ڈاکٹر تحسین فاطمہ۔ لاہور

گیا۔

''اے بڈھے دیکھ کر نہیں چلتا، اندھا ہے کیا؟'' سرفراز نے چیختے ہوئے کہا۔

ایک دکاندار سرفراز کی طرف لپکا۔'' او بھائی یہ مجذوب بابا ہیں، ان سے بدتمیزی مت کرو۔''

سرفراز اپنے ہوش میں کہاں تھا، اس نے ایک دھکا اس دکاندار کو دیا اور چیخنے لگا۔'' ارے میں سب جانتا ہوں، ایسے فراڈی فقیروں اور ملنگوں کو، یہ صرف بھیک مانگنے کے لیے اپنا حلیہ بدلتے ہیں۔''

مجذوب بابا نے اچانک اپنا ہاتھ سرفراز کے کاندھے پر رکھ دیا اور اسے غور سے دیکھنے لگے۔

''میں تمہیں کچھ نہیں دوں گا فراڈی بڈھے، ہٹا اپنا گندا ہاتھ میرے کاٹن کے کپڑوں پر سے، سارے کپڑے گندے کر دیے۔'' سرفراز چنگھاڑتے ہوئے بولا اور مجذوب کو دھکا دیا۔

مجذوب زمین پر گرتے گرتے بچا، اچانک مجذوب کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی کوند گئیں، اس کا ڈنڈا سرفراز کی کمر پر پڑا۔'' جا تو بھی فراڈی بن جا۔'' مجذوب نے جلال کے عالم میں کہا۔

سرفراز زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ وہ کس طرح اپنے گھر پہنچا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے بستر پر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہ گیا، اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ اس کا نچلا دھڑ کام نہیں کر رہا ہے۔ اس کی بیوی اندر داخل ہوئی، اسے دیکھتے ہی وہ چیخا۔'' مجھے اٹھاؤ، مجھے نہ جانے کیا ہوا ہے؟'' اس کی زبان بھی اس کا ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اس کی زبان میں لکنت تھی اور وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

اس کی بیوی ڈاکٹر کو بلا لائی لیکن ڈاکٹر نے اسے اسپتال ریفر کر دیا، اسے ایمبولینس میں اسپتال لے جایا گیا تو پتا چلا کہ اس کے جسم پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور اس کا نچلا دھڑ حرکت کرنے سے قاصر ہے۔ زبان میں بھی لکنت پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے اپنا بہت علاج کرایا، ایک اسپتال سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے، چوتھے ڈاکٹر سے اعلیٰ ترین ڈاکٹر تک، صرف اس کی بیوی ہی تھی جو کہ اس کے ساتھ تھی، اس کے رشتے دار تو اس سے پہلے ہی نالاں تھے، کوئی اسے دیکھنے تک نہ آیا، پھر ڈاکٹروں نے حتمی فیصلہ دے دیا کہ یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔

پھر ایک دن اس کی بیوی بھی اسے فٹ پاتھ پر ڈال کر نجانے کہاں چلی گئی، تب سے وہ اس فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔ اس کی دولت اور جایداد اس کے علاج پر خرچ ہو گئی، اور جو بچا تھا اس پر رشتہ داروں اور فراڈی لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہ رہا۔

اس کا گھر ہمارے گھر سے قریب ہی تھا جب اس کا گھر فروخت ہو رہا تھا اسی دن ایک سرکاری کام کے سلسلے میں اس کے پاس گیا تو پتا چلا کہ وہ تو اسپتال میں ہے، مجھے اپنی ایک ضروری فائل ان سے لینی تھی۔ جو کہ اس کے گھر میں ہی موجود تھی۔ اس کی بیوی نے مجھ سے بھی مدد کی درخواست کی تھی، میں نے اپنے بالا افسران سے کہا کہ اس کی مدد کریں لیکن تم جانتے ہی ہو کہ یہاں تو سب چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ کیا کر سکتے ہیں۔ یہ بیماری پریشانی تو اللہ کی طرف سے ہے، اور ہمیں آفس کا کام بھی تو چلانا ہے، اسے نوکری سے برخاست کر دیا گیا، اس کی جگہ دوسرا نائب قاصد آ گیا۔

اب وہ بھیک مانگ رہا ہے اور لوگ ترس کھا کر اسے کچھ نہ کچھ دے جاتے ہیں تو وہ اپنا پیٹ بھر لیتا ہے، اس مجذوب کو اس دن کے بعد دوبارہ کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کہاں چلے گئے، البتہ اس اللہ والے کا مذاق اڑانے والا شخص خود نشان عبرت بن گیا، یہ اس کے غرور، تکبر کی سزا تھی جو کہ اسے ملی۔

میں سرفراز کی عبرتناک کہانی کو سن کر دنگ رہ گیا۔ عمران سے بولا۔'' اسے بے جا غرور، تکبر، اور سود خوری کی سزا ملی ہے، یہ سزا ہر ایسے گناہ گار شخص کو ملتی ہے، مگر اس کا ٹائم مختلف ہوتا ہے، کیوں کہ ایسے کردار ہمیں اپنے اطراف دکھائی دیں گے، اور آج کل ایسے لوگوں کا پایا جانا کوئی مشکل نہیں جو کہ غرور و تکبر، انا پرستی اور خود پرستی میں مبتلا ہیں، ان لوگوں نے حلال و حرام کی تفریق ختم کر دی ہے۔ بہ ظاہر ان کا حال بہت بہتر نظر آتا ہے لیکن ان کا ماضی کیا تھا، اور خاص طور پر ان کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے، کیونکہ جو انسان بوتا ہے، آخر میں وہی کاٹتا ہے، سرفراز خان بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جس کا عبرتناک انجام لرزا دینے والا ہے۔

# رنگِ دوستی

قابلِ احترام معراج رسول
السلام علیکم
گو کہ راجا جس کی یہ آپ بیتی ہے اس نے جرم کیا ہے۔ بہت بڑا جرم، قانون کی نظروں میں اس جرم کی معافی نہیں لیکن اس نے ایسا کیوں کیا یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

آصفہ ضیاء احمد
(حیدر آباد)



بادشاہ اور شہزادی صغیر سنی میں ہی باپ کی سایہ شفقت سے محروم ہو گئے۔ دونوں بچوں کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اچانک ان کا چاہنے والا بابا کہاں چلا گیا۔ رحیم چاچا کافی عرصے سے بیمار تھا۔ ممتاز پور میں طبی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس لیے شہر جا کر علاج کروانا خالہ سلیمن کے بس سے باہر تھا۔ اس لیے ہمیشہ کی طرح وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ رحیمو چاچا ملکِ عدم سدھارا اور جاتے جاتے بیوی کے سر پر لاتعداد ذمہ داریوں کا بوجھ لاد گیا۔

خالہ کے لیے زندگی پہلے ہی کون سی خوش گوار تھی لیکن پھر بھی اپنے آپ کو سہاگن سمجھ کر خوش ہو لیتی تھی لیکن چاچا کے مرتے ہی وہ اپنی سدھ بدھ ہی کھو بیٹھی۔ ہنسنا تو درکنار وہ مسکرانا بھی بھول گئی تھی۔ بادشاہ اور شہزادی ٹکر ٹکر ماں کی طرف دیکھتے لیکن ان کے معصوم ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آناً فاناً یہ کیا ہو گیا۔ بادشاہ ابھی ابتدائی کلاسز میں ہی تھا اور شہزادی نے تو اسکول جانا شروع بھی نہیں کیا تھا کہ اچانک یہ سانحہ پیش آیا۔ عدت تک تو خالہ کے میکے والوں نے سنبھالا، اس کے بعد خالہ نے حوصلے اور ہمت سے کام لے کر خود زمین دار سے بات کی اور مردانہ وار اپنی اور اپنے بچوں کی روزی کمانے نکل کھڑی ہوئیں۔ بادشاہ بھی ماں کا ہاتھ بٹانا چاہتا تھا لیکن ماں کے دل نے گوارا نہیں کیا کہ اتنی ننھی سی جان کو محنت مشقت کے دوزخ میں دھکیل دے۔ اس لیے بیٹے کا نام اسکول سے نہیں کٹوایا اور وہ بدستور اسکول جاتا رہا۔ کچھ عرصے بعد شہزادی بھی اسکول جانے کے لائق ہو گئی تھی۔ دونوں قدرتی طور پر ذہین تھے اور کچھ حالات نے بھی وقت سے پہلے انہیں بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

ماں کی گرتی ہوئی صحت، تنگدستی اور بھوک پیاس نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ اب تعلیم کو خیرباد کہہ کر ماں کے ساتھ زمیندار کے کھیتوں میں کام کر کے دہاڑی اٹھائے اور گھر کی آمدنی میں اضافہ کرے۔ خالہ سلیمن کو جب بیٹے کی اس سوچ کا پتا چلا تو اس نے اپنے طور پر بھرپور مخالفت کی مگر بادشاہ نے ماں کو اپنا اٹل فیصلہ سنا دیا اور وہ دوسرے ہی دن سے ماں کے ساتھ کام پر جانے لگا۔

زمیندار کی زمینوں پر کام کرتے ہوئے بادشاہ کا رنگ بھی کھیتوں کی مٹی کی طرح مٹیالا ہو گیا تھا۔ اب اپنے اسکول کے ساتھیوں سے بھی اس کی ملاقات کبھی کبھی ہی ہوتی۔ ہاں البتہ اس کا لنگوٹیا یار ریاض عرف راجا سے اس کی ابھی بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ راجا میٹرک میں تھا اور اسکول میں ہونے والی تمام سرگرمیوں سے وہ اسے آگاہ کرتا رہتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں کی دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی رہی۔ راجا نے جب گرتے پڑتے میٹرک پاس کر لیا تو اس نے شہر جانے کی ٹھان لی۔ ماں باپ کو الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر انہیں بھی راضی کر لیا۔ بادشاہ کو ساتھ چلنے کا کہا۔

بادشاہ سلیمن کے سر ہو گیا۔ شہزادی بھی بھائی کی حمایتی بن گئی لیکن سلیمن نے صاف انکار کر دیا وہ بولی۔ ”نہ پتر نہ زمیندار کے کھیتوں سے اللہ سائیں ہمارا حلق گیلا کر رہا ہے۔ ٹوٹا پھوٹا ہی سہی ہمارا اپنا گھر ہے۔ کسی کا جھگڑا ٹنٹا نہیں ہے۔ پھر کیوں لالچ کریں۔ ارے میرے بچے اللہ بس باقی ہوس۔“

بادشاہ کو ماں کی یہ نصیحت ایک آنکھ نہ بھائی۔ ماں کی باتوں پر وہ سلگ گیا اور زہرخند لہجے میں جواباً کہا۔ ”اماں یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ کیا اسے جینا کہتے ہیں۔ کھیتوں کی مٹی سے تیرا اور میرا رنگ سیاہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی ہر مہینے آٹھ دس دن چولہا ٹھنڈا ہی رہتا ہے۔ اماں لڑکیوں کو بڑھتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ تیرے پاس ہے اتنی جمع پونجی کہ کل کو شہزادی کی ڈولی اٹھ سکے۔“

خالہ سلیمن نے جب حقیقت کی عینک لگا کر گھر کے مسائل پر غور کیا تو انہیں بادشاہ کی ہر بات سچ لگی۔ اور اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔ سلیمن کے ذہن میں کئی سال پہلے کا ایک منظر آ گیا تھا۔ اس کی دوست بھولی کا بیٹا گھر سے بھاگ کر کراچی چلا گیا تھا۔ ماں کے انتقال پر جب وہ گاؤں آیا تو سب اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ لوگوں سے پتا چلا تھا کہ واحدی شہر میں رہ کر خوب دولت کما رہا ہے۔ بادشاہ بھی شہر پہنچ گیا تو واحدی کی طرح دولت میں کھیلنے لگے گا۔ اسی وجہ سے اس نے بادشاہ کو اجازت دے دی۔ بادشاہ اور شہزادی نہال ہو گئے۔

ممتاز پور سے کراچی تک کا سفر بس اور ٹرین سے دونوں نے ہنستے کھیلتے طے کیا۔ آنکھوں میں مستقبل کے رنگ برنگے خواب سجے ہوئے تھے۔ دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ کراچی شہر میں قدم رکھتے ہی وارے نیارے ہو جائیں گے۔ راجا تو لڑکپن میں اپنے والدین کے ساتھ ایک بار کراچی جا چکا تھا لیکن بادشاہ نے پہلی بار گھر سے قدم نکالا تھا۔ وقتِ رخصت ماں نے جو نصیحتیں کی تھیں۔ وہ اس نے گرہ میں باندھ لی تھیں۔ ماں اور بہن نے دانتوں کا رس پی کر جو جمع پونجی اکٹھا کی تھی۔ وہ بھی اس کی جیب میں رکھ دی تھی۔ سلیمن کو اچھی طرح علم تھا کہ راجا تو دس جماعتیں پڑھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی میں اس کے عزیز و اقارب بھی رہتے ہیں لیکن بادشاہ کا تو نہ باپ کا سگا تھا نہ ماں کا۔ اس لیے وہ خائف تھی کہ اگر راجا نے اس کے بیٹے کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ اس اجنبی شہر میں کہاں بھٹکتا پھرے گا۔

دونوں نے جیسے ہی اسٹیشن پر قدم رکھا وہاں کی بھیڑ بھاڑ اور ہنگامہ دیکھ کر دونوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ بادشاہ

نے مضبوطی سے راجا کی کلائی تھام لی۔ راجا نے ایک جھٹکے سے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اپنی کلائی بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ اس کی کلائی پر انگلیوں کا پرنٹ صاف نظر آرہا تھا۔ بادشاہ نے شرمندہ سی ہنستے ہوئے معذرت خواہانہ نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ''معاف کرنا یار میں بری طرح گھبرا گیا تھا۔ دراصل کبھی گاؤں سے باہر قدم ہی نہیں نکالا......''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے راجا غرایا۔ ''اب یہ بات ہر ایک کے سامنے مت دہرانا۔ یہ ممتاز پور نہیں کراچی ہے۔ اپنا حال نہیں بلکہ چال بھی تجھے بدلنی ہوگی اگر یہاں کے لوگوں کو پتا چل گیا کہ ہم گاؤں کے گنوار ہیں تو ابھی چٹنی بنا کر کھا جائیں گے۔''

بادشاہ نے تھوک نگلتے ہوئے گردن ہلائی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جیسا تو کہے گا ویسا ہی کروں گا۔''

اب وہ اس بھیڑ بھاڑ میں قدم جما کر چل رہا تھا۔ اسٹیشن کی عمارت سے نکلتے ہی اس کی گھبراہٹ میں قدرے کمی آگئی۔ پھر بھی وہ حواس باختہ سا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس عجیب و غریب نگری کو دیکھ رہا تھا۔ راجا اسے ایک ہوٹل میں لے کر گھسا۔ دونوں نے وہاں شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور جب بل آیا تو بادشاہ کی روح فنا ہو گئی اگر وہ اس رفتار سے یہاں چٹخارے لے لے کر کھاتا پیتا رہا اور اپنی جیب ڈھیلی کرتا رہا تو گانٹھ کا پیسا بمشکل ایک ماہ کا تھا۔ ان ہی سوچوں میں گم وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا راجا کے ساتھ ہوٹل سے باہر آیا۔ دونوں تھکے ہوئے تھے اور سونے کے لیے جگہ تلاش کر رہے تھے لیکن ہر طرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ زمین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ کمر سیدھی کرتے۔ کافی تلاش و بسیار کے بعد دونوں ایک پارک میں گھس گئے۔ یہاں بھی لوگوں کی چہل پہل بہت زیادہ تھی۔ دونوں ایک سنگی بینچ پر بیٹھ کر ادھر اُدھر نظریں دوڑاتے رہے کہ کوئی گوشہ عافیت مل جائے اور وہ لمبی تان کر سو جائیں کیونکہ نیند کے مارے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

سردیوں کے دن تھے۔ اس لیے اب لوگوں کی واپسی شروع ہو چکی تھی۔ جیسے ہی سناٹا ہوا دونوں نے اپنے اپنے کمبل نکالے اور ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال دیا۔ اس رات دونوں نے بھرپور نیند لی اور یہ سوچا کہ شب گزاری کے لیے اس سے بہتر جگہ ملنا ناممکن ہے لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی کیونکہ تیسرے ہی دن ایک گشتی پولیس والے نے انہیں پارک سے باہر نکال دیا۔ دونوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں اس کی سات پشتوں کو ایسی ایسی گالیوں سے نوازا کہ اگر وہ سن لیتا تو شاید دونوں کو قتل ہی کر دیتا۔ وہ رات انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی ادھ پکی نیند کا خمار نہ کہیں ٹھور نہ ٹھکانا۔ جو جمع پونجی گھر سے لے کر چلے تھے اسے بھی پر لگ گئے تھے۔ نوکری کہاں تلاش کریں کس کے پاس جائیں۔ کس سے کہیں کچھ عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ راجا کی چڑچڑاہٹ میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ بادشاہ اس سے بات کرتے ہوئے گھبرانے لگا تھا۔ اس لیے وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتا۔ اس کی خاموشی بھی راجا کو کھلتی اور وہ خود ہی کوئی نہ کوئی موضوع نکال کر بات شروع کرتا اور بادشاہ جواب دیتا تو پھر اس غریب کی شامت آجاتی۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ دونوں نے کارپوریشن کے لگائے ہوئے نلکے پر جا کر اچھی طرح اپنے ہاتھ منہ دھوئے اور ساری سستی اتاری۔ اس کے بعد راجا نے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''بادشاہ تو بھی اپنا حلیہ درست کر، چل کر ناشتا کرتے ہیں۔''

بادشاہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں میں ناشتا نہیں کروں گا۔ آج صرف چائے پر ہی اکتفا کروں گا کیونکہ جیب اب تین وقت کے کھانے کا بوجھ نہیں برداشت کر سکتی۔''

راجا کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے درشت لہجے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''ابے تو اتنا کم پیسا لے کر کیوں چلا تھا گھر سے۔ مجھے دیکھ میرے ابا نے الگ مٹھی گرم کی اور اماں کو بے وقوف بنا کر الگ رقم اینٹھی تو تو بڑا گھامڑ ہے۔''

بادشاہ نے راجا کی ساری کڑوی کسیلی سنی لیکن جواب نہ دیا۔ چار دن راجا کے ساتھ گزارتے ہی اسے اس کی اصلیت کا پتا چل گیا تھا اور اس وقت تو سارا ملمع اتر گیا جب وہ اور راجا ایک ہی ٹیبل پر بیٹھتے۔ راجا ڈٹ کر کھاتا، پیتا اور وہ آہستہ آہستہ ایک کپ چائے سپ کرتا۔ اس وقت اسے ماں کی کہی ہوئی باتیں یاد آتیں۔ اس وقت اس کا دل چاہتا اڑ کر اپنے گاؤں واپس چلا جائے لیکن پھر اٹھتے ہوئے قدم رک جاتے۔ مسائل میں گھری ماں کا چہرہ اور بہن کی امید اور آس بھری نگاہیں آنکھوں کے سامنے آجاتیں اور وہ پھر ایک بار اپنے آپ کو طفل تسلیاں دیتا اور اچھے دنوں کے خواب بننے میں مصروف ہو جاتا۔ راجا نے اس پر ایک

احساس یہ کیا تھا کہ ایک نسبتاً سستے ہوٹل کا راستہ دکھا دیا تھا۔ بلکہ اب خود بھی اسی ہوٹل میں کھانے لگا تھا۔ بس فرق اتنا تھا کہ وہ خود تو سیر ہو کر تین وقت کھاتا پیتا جب کہ بادشاہ نے اپنے معدے کو سکڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار تناول طعام کرتا اور پیر پسار کر فٹ پاتھ پر سوتا۔ دونوں باقاعدہ فٹ پاتھ کا کرایہ بھی دے رہے تھے۔ اس لیے جیب روز بروز ہلکی سے ہلکی ہوتی جا رہی تھی۔ اب راجا کو بھی آنے والے دنوں کا خوف کھائے جا رہا تھا۔ کیونکہ انسان کے پیٹ کے لیے تو ندی سمندر کا پانی بھی کم ہے۔ دونوں نے کام کے لیے ایک دو جگہ ہاتھ پیر مارے لیکن کوئی امید افزا جواب نہیں ملا۔

ہر نیا سورج ان کی پریشانیوں اور تفکرات میں اضافہ کر رہا تھا۔ کہیں کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔ اب تو دونوں کی راتوں کی نیندیں بھی اڑ گئی تھیں۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ آج بھی ذرا سی بات پر دونوں میں تو تو میں میں ہو گئی تھی اور حسب معمول راجا نے اپنا سارا غصہ بادشاہ پر نکالا۔ کچھ دیر تو بادشاہ برداشت کرتا رہا پھر اسے بھی غصہ آ گیا اور اس نے بھی تیز و تند لہجے میں راجا کو اچھی طرح سنا دی۔ راجا نے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ”بس آج سے ہم دونوں کے راستے جدا جدا ہیں۔ یہاں میری ایک رشتے کی پھوپھو رہتی ہیں۔ میرے ابا نے مجھے پتا دیا تھا میں وہاں جا رہا ہوں۔ اب تو جانے اور تیرا کام جانے۔ میں تو چلا۔“

بادشاہ کو یوں محسوس ہوا جیسے راجا نے بندوق کی گولی داغ دی ہو۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور راجا سے لپٹ کر باقاعدہ گڑگڑانے لگا۔ اس کا لہجہ التجائیہ اور اشکوں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ راجا کو اپنی دوستی کا واسطہ دے رہا تھا۔ اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا لیکن راجا نے پوری قوت سے اسے دھکیلا، اپنا بیگ اٹھایا اور تیز تیز قدموں سے نکل گیا۔ بادشاہ کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی لق دق صحرا میں وہ تنہا کھڑا ہے اور ہر طرف آندھیوں کے جھکڑ چل رہے ہیں۔ بمشکل اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور گاؤں لوٹنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اسے لگا جیسے یہ شہر اسے راس نہیں آیا۔ اس شہر نے اسے دیا کچھ نہیں بلکہ اس کی دوستی کو بھی نگل گیا۔ اپنی بچی کھچی رقم کو گن کر رکھی تو دل کو یک گونہ سکون نصیب ہوا کیونکہ اتنی رقم تو تھی کہ اپنے گاؤں واپس جا سکتا تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ اطمینان سے فٹ پاتھ پر لیٹ گیا۔ راجا کے بغیر وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کر رہا تھا۔ راجا کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ کروٹیں لیتے لیتے تھک گیا مگر نیند روٹھی رہی لیکن پو پھٹنے سے پہلے اچانک آنکھ لگی اور وہ گہری نیند سو گیا اور پھر دن چڑھے تک سوتا رہا۔ سڑک پر چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور ہوٹل کی راہ لی۔ راستے میں ایک سیاسی ریلی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ بدقت تمام بچتا بچاتا راستہ بناتا ہوا وہ ہوٹل تک پہنچا اور چائے کا آرڈر دیا۔ دل ہی دل میں پیسوں کا حساب لگایا تو اسے محسوس ہوا کہ ابھی اتنی جمع پونجی تو ہے کہ وہ ناشتا کر سکتا ہے۔ بس پھر کیا تھا اس نے فوراً اچھے سے ناشتے کا آرڈر دے ڈالا۔ ناشتا کرتے ہوئے وہ واپسی کا لائحہ عمل ترتیب دیتا رہا۔ ایک ڈکار لیتے ہوئے اس نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو چکرا کر رہ گیا۔ جیب ندارد اور رقم بھی غائب۔ چند لمحوں کے لیے وہ ہوش و حواس سے ہی بیگانا ہو گیا۔ سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا حلق خشک ہو گیا۔ کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی تو ڈگمگا گیا۔ قریب کی کرسی پر بیٹھا ہوا ایک شخص اس کی جانب دوڑا اور اسے سہارا دیا۔ بادشاہ نے اپنے تھرتھراتے وجود کو سنبھالا اور چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”ارے کچھ نہیں بھائی بخار کی وجہ سے نقاہت ہو گئی تھی اس لیے چکرا گیا تھا۔“

اجنبی شخص نے ہمدردانہ انداز میں اس کی پشت تھپتھپائی اور واپس اپنی نشست پر چلا گیا۔

بادشاہ تقریباً گھسٹتا ہوا ریسپشن کاؤنٹر پر پہنچا اور کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو نہایت مدھم آواز میں پکارا۔ ”سر جی ذرا سنیے۔“ ریسپشنسٹ نے پہلی دفعہ اس کی آواز پر توجہ ہی نہیں دی لیکن بادشاہ نے ہلکا سا اپنا ساؤنڈ والیوم تیز کیا تو اس نے ٹھیٹ کاروباری انداز میں آنکھیں گھماتے ہوئے استفسار کیا۔ ”ابے کیا ہے بول بھی دے۔ کیوں میرا اور اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔“ بادشاہ نے ہکلاتے گھبراتے وحشت زدہ لہجے میں لڑکھڑاتی زبان سے ساری روداد اسے سنا دی۔ ریسپشنسٹ کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اشتعال انگیز لہجے میں اس نے ایک ویٹر کو آواز دی اور گھن گرج آواز میں حکم دیا۔ ”صاحب خان اس دولہے راجا کو کچن کا راستہ دکھا اور سنک پر لے جا کر کھڑا کر دے۔ ایک گھنٹے میں جھوٹے برتنوں کے ڈھیر کو ٹھکانے نہیں لگاتا ہے تو پھر شاسو پہلوان کے حوالے کر دے۔ وہ اس کا ایسا تھوبڑا سجائے گا کہ پیا بھی اسے نہ پہچانے گی۔“

بادشاہ بہت صبر اور برداشت سے کام لے رہا تھا۔ کیونکہ غلطی اس کی اپنی تھی۔ ناشتا کرنے سے پہلے اگر وہ اپنی جیب ٹٹول لیتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ عجلت میں وہ یہ کام کر بیٹھا اور اب متوحش اور خوفزدہ نظروں سے ان سب لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو دائرے کی شکل میں اسے گھیرے کھڑے تھے۔ بادشاہ کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور اس میں سما جائے۔ بھیڑ میں وہ شخص بھی شامل تھا جس نے کچھ دیر قبل اسے گرنے سے بچایا تھا۔ وہ شخص آگے بڑھا اور ریسپشنسٹ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”سر تو وارد لگتا ہے غریب، مجھے لگتا ہے حقیقتاً کوئی اسے چوٹ دے گیا ہے۔“

ریسپشنسٹ نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ”تو جناب کیا یہاں لنگر بٹ رہا ہے اور آپ کی محبت ایسے ہی پھٹے پڑ رہی ہے تو اس کا بل پے کریں اور لے جائیں اپنے گھر اور اٹھائیں اس کے ناز نخرے، میں خود یہاں پر ملازمت کر رہا ہوں، کوئی میرے پرکھوں نے ورثے میں نہیں دیا یہ ہوٹل۔“

ریسپشنسٹ کی گل افشانیاں شاید ابھی اور جاری رہتیں لیکن بادشاہ کے حمایتی اور ہمدرد نے فوراً بادشاہ کا بل ادا کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مجمع میں سے نکل گیا۔ باہر آ کر بادشاہ کو یوں محسوس ہوا جیسے برسوں کی اسیری کے بعد آزادی نصیب ہوئی ہو۔ ہر قسم کے خوف و ہراس سے نجات پا کر کھلی ہوا میں گہری طویل سانس لی۔ پھیپھڑوں میں رکی ہوئی ساری کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کی اور آکسیجن کا بڑا سا ڈوز لیا اور پھر اپنے نجات دہندہ کو غور سے دیکھا۔ جواب میں اس شخص کے ہونٹوں پر بھی ایک دوستانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

بادشاہ تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس شخص کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا لیکن زبان اور الفاظ آپس میں ہم آہنگ نہیں ہو پا رہے تھے۔ پھر بھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا اور جھجکتے ہوئے اس کا نام دریافت کیا۔ اس نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بادشاہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ بادشاہ کو اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ اس لیے اس نے اپنا سوال پھر دہرایا اور ساتھ ہی دوسرے سوال کا اضافہ اور کر دیا۔ ”کیا یہ کار آپ کی ہے؟“

کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس شخص نے ایک معنی خیز

## یمن میں بہار انقلاب کی سرخیل توکل کرمان

1901ء سے لے کر (جب نوبل انعام کا آغاز ہوا) اب تک 853 نوبل انعامات میں سے مختلف شعبہ جات میں 165 نوبل انعام یہودیوں کے حصے میں آئے ہیں جب کہ مسلمانوں کو صرف نو انعامات کا مستحق گردانا گیا ہے۔ نوبل انعام کی طرح سعودی عرب ہر سال مختلف شعبہ ہائے حیات میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں میں بھاری مالیت کے انعامات شاہ فیصل ایوارڈ کے نام سے تقسیم کرتا ہے ان میں سائنس کے شعبے میں اکثر عیسائی اور غیر مسلم شامل ہوتے ہیں (یہ بھی تمام مسلمانوں کے لیے عبرت کا مقام ہے) نوبل انعام حاصل کرنے والے مسلمان۔ (1) مصر کے سابق صدر انوار السادات (1979ء)، (2) مصر ہی کے نجیب محفوظ کو (1988ء)، (3) فلسطین کے صدر یاسر عرفات (1992)، (4) ڈاکٹر احمد زویل مصری (1999) (5) ایران کی شیریں عبادی (2003) (6) محمد البرادعی مصری (2005)، (7) بنگلہ دیش کے محمد یونس گرامین بینک (2006)، (8) ترکی کے اورہان پاموک (2006)، (9) 2011 میں یمن کی خاتون توکل کرمان (یہ ایک اشاریہ چار ب) مسلمانوں کے لیے عبرت کا مقام ہے۔

2011ء کا نوبل امن انعام تین خواتین کو مشترکہ طور پر دیا گیا ہے جن میں سے دو لائبیریا کی ہیں ایک موجودہ صدر ایلن جانسن سرلیف ہے۔ دوسری حقوق انسانی کے لیے دوان لیما گیبووی تیسری توکل کرمان۔ توکل عبدالسلام خالد کرمان معروف بہ توکل کرمان یمن کے صوبے تعز (Taiz) واقع مخلاف میں 7 فروری 1979ء کو پیدا ہوئیں۔ تعز یمن کا تیسرا بڑا شہر ہے اور یمن جیسے قدامت پسند ملک میں علم و ہنر کا گہوارہ ہے۔ توکل کرمان کے والد عبدالسلام کرمان ایک وکیل ہیں اور علی عبداللہ صالح حکومت میں وزیر قانون بھی رہے ہیں پھر انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ توکل کرمان کا تعلق ایک پڑھے لکھے خاندان سے ہے۔ ان کا بھائی کرمان شاعر ہے اور توکل بھی شعر کہتی ہیں۔ آپ کے شوہر کا نام محمد اسماعیل النہمی ہے جن سے آپ کے تین بچے ہیں۔

تعلیم و تربیت: توکل نے یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سے بی کام کیا، پھر صنعاء یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کیا۔ تعلیم و تربیت میں ڈپلومہ بھی لیا اور پھر امریکا سے صحافت میں ڈپلومہ کیا۔ 2005ء میں انجمن صحافی خواتین بلا قیود Women journalists without chains کی بنیاد رکھی جو یمن میں نہ صرف حقوق نسواں بلکہ انسانی حقوق کے لیے بھی کوشاں ہے جن میں اظہار رائے کی آزادی، پریس کی آزادی اور احتجاج کی آزادی شامل ہیں۔ توکل 2005ء سے اخبار الشورة (انقلاب) سے منسلک ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر [illegible] ترمذی

مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور نہایت مدھم لہجے میں بولا۔ "ارے بھائی پریشان کیوں ہوتے ہو۔ بس کچھ دیر اور صبر کرلو۔"

بادشاہ نے چپکی سادھ لی۔ کار ایک خوب صورت بنگلے کے پورچ میں جا کر ٹھہر گئی۔ اس شخص کا اور بادشاہ کا تعلق بغیر کسی روایتی تعارف کے ہوا تھا جب کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی اور انجان تھے۔ بادشاہ کے دل و دماغ میں ان گنت سوالات شور مچا رہے تھے۔ خوب صورت لان اور پُرشوکت بنگلے کی سج دھج دیکھ کر یکبارگی بادشاہ کا دل زور سے دھڑکا کہ کہیں وہ غلط لوگوں میں تو نہیں پھنس رہا ہے۔ اس کا ساتھی چوروں اور اسمگلرز کا آلۂ کار تو نہیں ہے۔ چور نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا۔ وہ بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکلخت آنکھیں چار ہوئیں۔ بادشاہ کی گھبراہٹ دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک ٹھٹھک کر رک گیا۔ گھر میں سے شاہانہ انداز میں چلتی ہوئی ایک نوجوان خاتون برآمد ہوئیں۔ سنہری زلفیں، دراز قامت، زعفرانی رنگ کے سوٹ میں ملبوس، انتہائی جاذب نظر چہرہ لیکن چہرے پر حاکمانہ کرختگی عیاں تھی۔ ان دونوں کے قریب آتے ہی اس نے جارحانہ انداز میں تیکھے تیور کے ساتھ بادشاہ کے ساتھی کو گھورا اور تنتناتے لہجے میں بولی۔ "نادر تمہیں علم ہے ناں کہ آج میرا کتنا اہم وزٹ ہے۔ اس کے باوجود تم اتنی تاخیر سے آرہے ہو اور اپنے ساتھ یہ کس رنگروٹ کو لے آئے ہو۔"

بادشاہ نے اپنے حلیے پر نظر ثانی کی تو اسے محسوس ہوا کہ حقیقتاً وہ اس بنگلے میں اور ان لوگوں کے درمیان کسی اور ہی جہاں کی مخلوق لگ رہا تھا۔ عورت اسے تشکیک آمیز انداز میں بغور دیکھ رہی تھی۔ عورت نے جسے نادر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میڈم جی صاحب نے کہا تھا کہ گھر کے کام کاج اور سودا سلف لانے کے لیے کوئی محنتی اور دیانت دار لڑکا نظر آئے تو ضرور بتانا، سو یہ لڑکا بھلا مانس لگا تو ساتھ لے آیا اور اب......"

نادر کی بات درمیان میں ہی میڈم نے قطع کردی اور پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے مشتعل لہجے میں بولی۔ "بس اب بس بھی کرو۔ میں ویسے ہی کافی لیٹ ہوچکی ہوں۔ جاؤ اسے اپنے کوارٹر میں چھوڑ کر آؤ۔ صاحب ابھی آرام کررہے ہیں۔"

"جی بس ابھی آیا۔" نادر نے کہا اور بجلی کی سی سرعت سے بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر بنگلے کے عقبی حصے میں جہاں اس کا ڈبیہ نما کوارٹر تھا۔ لے کر آیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی کھاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "دوست فی الحال تو تم آرام کرو۔ میں بس بیگم صاحبہ کو چھوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بھرم اور اعتماد مت توڑنا۔ بنگلے میں گھس کر تانکا جھانکی کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میں بھی نوکری سے نکالا جاؤں گا۔"

بادشاہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا بس معصوم نظروں سے اپنے محسن کو دیکھا اور آہستہ اثبات میں گردن ہلادی۔ نادر نے پھر دوڑ لگادی۔ کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ بادشاہ نے ایک طویل سانس خارج کی اور اطراف میں نظریں دوڑائیں۔

نادر کا کوارٹر دو چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ گھر میں بادشاہ کے علاوہ اور کوئی ذی روح نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نادر اکیلا ہی یہاں رہتا تھا۔ کمرے کے کونے میں پانی کا گھڑا اور گلاس رکھا تھا۔ بادشاہ کو شدید پیاس کا احساس ہوا لیکن نادر کی اجازت کے بغیر اسے گھڑے کو ہاتھ لگاتے ہوئے اچھا نہیں لگا۔ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس روم کو نادر نے کچن بنا رکھا تھا۔ ایک ٹیبل پر گیس کا چولہا اور نیچے کی جانب گیس سلینڈر رکھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک جالی دار کیبنٹ میں کچن کا روزمرہ کا سامان شکر اور پتی کے پیکٹ رکھے ہوئے تھے۔

کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس نے بھرپور نظروں سے بنگلے کا جائزہ لیا۔ بنگلا کافی وسیع، کشادہ اور ہوادار تھا۔ سرسبز لان نے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ صرف مکان حسین ہے بلکہ مالکن اس سے زیادہ حسین ہے اور یقیناً مالک بھی ہینڈسم اور اسمارٹ ہوگا۔ اپنی سوچوں میں غرق وہ کافی دیر بت بنا کھڑا رہا۔ معاً نادر کی آمد نے اسے چونکا دیا۔ نادر دروازے میں کھڑا مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بادشاہ بوکھلا گیا۔ نادر ہنستے ہوئے بولا۔ "میرے گھر کو دیکھ کر تو مایوسی ہوئی ہوگی تمہیں۔"

بادشاہ نے اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے خفت آمیز لہجے میں کہا۔ "نہیں نادر بھائی! آپ کے گھر آکر تو مجھے ایک عجیب سی اپنائیت کا احساس ہوا۔ لگتا ہے جیسے میں اپنے ہی گھر میں بیٹھا ہوں۔ میں تو دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ انسان

اور اس کے ارادوں کی کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔ رب جو چاہتا ہے وہ ہم سے کروالیتا ہے۔ آج صبح تک میں سوچ رہا تھا کہ ریزرویشن تو ملنے سے رہا۔ اس لیے بہاولپور تک ٹرین کا سفر طے کر کے پھر ٹرک پکڑ کا ممتاز پور کی راہ لوں گا لیکن ہم لوگ اوپر والے کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ہیں۔ میرا سوچا ہوا سب دھرا کا دھرا رہ گیا اور میں کہاں سے کہاں آگیا۔"

نادر نے اپنا بڑا سا سر تائیدی انداز میں زور زور سے ہلایا اور بولا۔ "ہاں یار کہتے تو تم صحیح ہو۔ میں بھی اس گھر میں اتفاقاً ہی آگیا تھا اور صاحب جی سے ٹکرا گیا۔ ڈرائیونگ کا ہنر جانتا تھا۔ بس انہوں نے پیشکش کی۔ میں بھی ضرورت مند تھا۔ فوراً ہاں کردی اور بس یہیں کا ہو رہا۔ تمہاری ملاقات شام میں کرواؤں گا صاحب جی سے۔ فی الحال تم اپنے بارے میں بتاؤ تب تک میں تمہارے لیے اچھی سی چائے بناتا ہوں۔"

بادشاہ کے چہرے اور آنکھوں میں تذبذب نمودار ہوا۔ اس کی ہچکچاہٹ نادر نے بھانپ لی۔ اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ترنت کہا۔ "بھلا ہی اپنے ماضی کے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ کوئی مضائقہ نہیں لیکن کم از کم اپنا نام اور مسکن تو بتا دو تا کہ صاحب جی سے متعارف کرواتے وقت کوئی مسئلہ نہ ہے۔"

چند لمحوں کے لیے اس نے توقف کیا اور الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "ارے یار میں اپنی ہی ہانکے جا رہا ہوں۔ بذات خود تم نے ابھی تک ایک بار بھی نوکری چاکری کا نہیں کہا اور میں نے میڈم کے سامنے بھی بک دیا کہ تمہیں کام دلوانے لایا ہوں۔"

بادشاہ نے ممنون اور احسان بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور بے ساختہ بولا۔ "ارے..... ارے نادر بھائی آپ نے کچھ غلط نہیں کہا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ چہرہ شناس ہیں۔ آپ نے ہوٹل میں بھی میرے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ سو فیصد درست تھا۔ میں نووارد ہوں اس شہر میں اور کوئی مجھے چوٹ دے گیا اور کام کاج کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔" بادشاہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر دھیمے انداز میں ممتاز پور سے لے کر کراچی تک کی روداد نادر کے گوش گزار کردی۔ اپنی ماں اور بہن کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

نادر نے فوراً چائے کی پیالی اس کے ہاتھوں میں پکڑا دی اور بادشاہ کی توجہ بٹ گئی۔ چائے کے دوران دبی دبی زبان میں اپنے یار کی کارستانیاں اور مہربانیاں بھی اگل دیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ یہاں تک لانے کا محرک راجا ہی تھا۔ ورنہ میں تو ممتاز پور سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ساری واقعاتی تفصیل نادر نے پوری توجہ سے سنی۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار تھے۔ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "کراچی آنے والے زیادہ تر نوجوانوں کے سامنے بس ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ انہیں کام مل جائے اور یہاں وہ اپنے قدم جمالیں۔"

مزید پندرہ بیس منٹ تک دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر نادر نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اب دونوں کے چہروں پر اطمینان کی جھلک تھی۔ بات چیت سے پہلے جو اجنبیت کا تاثر تھا۔ وہ ختم ہو گیا تھا بلکہ اب دونوں دوستانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ کم و بیش شام چار بجے دونوں کی واپسی ہوئی تو بادشاہ کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہیئر کٹنگ سیلون اور حمام سے گزرنے کے بعد بادشاہ کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے گہرے قرمزی رنگ کے شلوار کرتے کی بجائے اب اس نے نادر کا دیا ہوا۔ ریڈی میڈ شرٹ اور پتلون زیب تن کر رکھی تھی۔ تیل سے چپڑے ہوئے بالوں کو باربر نے نئی تراش خراش بخشی تھی۔ اس لیے چہرہ بھی نکھر گیا تھا۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر اسے ایک خوشگوار کیفیت کا احساس ہوا۔ بہت دیر تک وہ نادر کے ٹوٹے پھوٹے آئینے میں اپنے آپ کو نہارتا رہا۔ کیونکہ نادر آتے ہی کار لے کر بیگم صاحبہ کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔"

جب اپنے آپ کو جی بھر کر دیکھ لیا تو یہ سوچ کر سہم گیا کہ کہیں خود کی ہی نظر نہ لگ جائے۔ قریب ہی رکھی خستہ حال کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک ایک کر کے تمام واقعات اسے یاد آنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے تمام مناظر رقصاں تھے۔ یکایک آواز گونجی۔ کیا ہو رہا ہے۔ نادر سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔

بادشاہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور پھر کھسیانی آواز میں بولا۔ "ارے نادر بھائی آپ تو اچانک جن کی طرح غائب بھی ہو جاتے ہو اور اچانک وارد بھی ہو جاتے ہو۔"

نادر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "میرے آقا مجھے جن ہی سمجھیے لیکن حکم میں دوں گا عمل کریں گے آپ۔ بس جلدی سے چلیے صاحب جی کے سامنے آپ کی پیشی ہے

جناب۔"

"اچ.....اچھا۔" بادشاہ کا لہجہ خوف زدہ تھا۔ نادر سمجھ گیا کہ بادشاہ گھبرایا ہوا ہے اور بری طرح نروس ہے۔

نادر نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اور تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ "ارے میرے یار، صاحب جی بہت ہی سوہنے انسان ہیں۔ گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اصل میں تیری ملاقات پہلے بیگم صاحبہ سے ہو گئی اس لیے تو نے اپنے طور پر رائے قائم کرلی کہ صاحب جی بھی ایسے ہی ہوں گے۔ کیوں ہے ناں یہی بات؟" اس نے تصدیق طلب نگاہوں سے بادشاہ کو دیکھا۔

بادشاہ نے فوراً "ہاں" کہنے کے انداز میں اپنا سر ہلا دیا۔ نادر نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے دلاسا دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں تم چلو تو سہی۔" بنگلے کی طویل کوریڈور عبور کر کے بادشاہ، نادر کی سنگت میں جب ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا تو نادر نے بھنوئیں اچکاتے ہوئے بادشاہ کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ "یہ ہیں صاحب جی!"

بادشاہ نے اپنے اپنے گول دیدے گھمائے اور صوفے پر براجمان شخص کو بغور دیکھا تو اسے چار سو چالیس والٹ کا کرنٹ لگا۔ بمشکل اس نے حلق سے نکلنے والی تحیر زدہ آواز کو روکا لیکن زبان سے پھسلنے والے الفاظ کو نہیں روک سکا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "واحدی بھائی آپ"

صوفے پر بیٹھا ہوا شخص مشینی انداز میں مڑا اور استفسارانہ انداز میں بادشاہ کو دیکھتا ہوا صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قریب آکر اپنے چشمے کا زاویہ درست کیا اور پھر نہایت حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ "اوہ تم..... تم بادشاہ ہونا، ممتاز پور والی سلیمن کے بیٹے، یہاں تک کیسے پہنچ گئے۔ تمہیں کس نے دیا تھا میرا ایڈریس۔"

ان دونوں کے درمیان جو مکالمہ بازی ہو رہی تھی اس سے نادر اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کے صاحب جی اور بادشاہ پرانے شناسا ہیں۔ اس لیے متعارف کرواتے کی جھنجٹ سے وہ بچ گیا۔ بادشاہ کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے طوفان میں کنارہ مل گیا ہو۔ اس نے ہکلاتے ہوئے بے ترتیب اور بے ربط جملوں کے مابین اپنی آمد اور یہاں تک پہنچنے کا قصہ مختصراً بیان کیا۔ صاحب جی نے بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مقابل بٹھایا اور نادر کو ہاتھ کے اشارے سے واپس جانے کے لیے کہا۔

ریموٹ سے لے کر ٹی وی کا والیوم کم کیا اور پھر اپنی بھاری بھر کم آواز میں پکارا۔ "ریشم دیکھو تو سہی میرا ہم وطن آیا ہے تم ملو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔"

بادشاہ اضطراب کے عالم میں پہلو بدلنے لگا۔ کچھ توقف سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "واحدی بھائی صبح میری ملاقات ہو چکی ہے بیگم صاحبہ سے۔"

واحدی نے جواب میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے میں اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ ریشم واحدی نمودار ہوئیں۔ ایک نگاہ غلط انداز بادشاہ کی جانب پھینکی اور سرکش انداز میں گویا ہوئی۔ "مجھے تو کوئی نظر نہیں آرہا۔ پھر کس سے ملوا رہے تھے۔"

واحدی بیوی کے موڈ کو فوراً بھانپ گیا۔ بجائے الجھنے کے اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور نہایت متانت سے دھیمے لہجے میں بولا۔ "تم جاؤ..... اپنا کام کرو میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔"

ریشم منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ بیوی کے قدموں کی آہٹ سے واحدی نے اندازہ لگایا کہ ریشم وہاں سے جا چکی ہے تو پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بادشاہ سے مخاطب ہوا۔ "کافی طویل عرصے بعد تجھے دیکھا ہے۔ اب تجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں مستقل طور پر یہیں رہنا ہے۔ گھریلو کام کاج کے لیے ریشم کو ایک ملازم درکار تھا۔ ہر ایرے غیرے پر یہاں بھروسا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ تیرے آنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ میں اپنے گھر کا ہی ایک کمرا رہائش کے لیے تجھے دے دیتا لیکن ریشم تجھے جینے نہیں دے گی۔ بس میری بیوی کے غصے کو اگر تو نے جھیل لیا تو سمجھو کراچی تجھے راس آ گیا۔ کیونکہ وہ غضب ناک سمندر ہے۔ اس کے تھپیڑے سہنے کی اگر تجھ میں طاقت ہے تو پھر تجھے اس شہر سے واپس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

واحدی کی باتیں سن کر بادشاہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ گھر میں ریشم کی چلتی ہے اور واحدی بیوی سے دبتا ہے۔ اسے ان دونوں سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ممنونیت بھری نگاہوں سے واحدی کو دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "واحدی بھائی آپ فکر ہی نہ کریں۔"

واحدی نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تمہیں یہاں اچانک اپنے گھر دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ بہرحال ابھی تو کچھ عرصہ نادر

کے کمرے ہی میں گزارہ کرو۔ تمہاری گزر اوقات کے لیے
جو اشیاء درکار ہیں۔ تمہیں فراہم کردے گا۔ گھبرانا نہیں نادر
بہت اچھا آدمی ہے۔''

بادشاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واحدی کی
بات سے اتفاق کیا اور کہا۔ ''جی مجھے علم ہے نادر بھائی واقعی
بہت اچھے آدمی ہیں۔'' دونوں کا موضوع گفتگو بدل کر اب
ماضی کی جانب رواں تھا۔

بہاولپور اور ممتاز پور کی باتیں کرتے ہوئے دونوں کو
وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا لیکن ریشم کی تڑختی
ہوئی آواز نے ان دونوں کو حال میں لا کھڑا کیا۔ ٹی وی ابھی
تک آن تھا۔ ایک جھٹکے سے واحدی نے فوری ٹی وی آف کیا
اور بیوی کی جانب استفسارانہ انداز میں دیکھنے لگا۔ ریشم نے
سپاٹ لہجے میں اپنی بات دہرائی۔ میں نے کہا۔ ''کیا آج
کھانا نہیں کھاؤ گے۔ کب سے انتظار کر رہی ہوں لیکن آپ
کی تو باتیں ہی ختم نہیں ہو رہی ہیں۔''

واحدی ہوش میں آیا اور انگڑائی لینے والے انداز میں
اٹھ کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے بھی اجازت طلب نگاہوں سے
واحدی کو دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر وہاں سے کھسک گیا
لیکن چلتے چلتے اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ ریشم میاں کو کرید
رہی تھی۔ ''کون تھا یہ لڑکا جس سے آپ کی اتنی گھٹ رہی
تھی۔''

بادشاہ کی سماعت چوکنا ہو گئی اور چال دھیمی ہو گئی۔
واحدی کی بھاری آواز گونجی۔ ''میرے گاؤں سے
کچھ دوری پر ایک گاؤں ہے وہیں کا لڑکا ہے۔ نادر لے کر آیا
ہے۔''

ریشم کا تحیر آمیز جملہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ ''اوہ
نادر لے کر آیا ہے لیکن صبح تو اس کا حلیہ کچھ اور تھا۔ بالکل
گاؤدی اور ہونق سا لگ رہا تھا مگر اب تو بالکل شہری لگ رہا
ہے۔'' پھر اس نے اپنی آواز میں استحکام پیدا کرتے ہوئے
شکایتی انداز میں کہا۔ ''آپ اپنا اسٹینڈرڈ بھی نہیں دیکھتے۔
نچلے طبقے کے لونڈے لپاٹوں کو منہ لگانا کوئی اچھی بات ہے
کیا۔''

جواب میں واحدی نے پھبتی کسی۔ ''تم صحیح کہہ رہی
ہو۔ نچلے طبقے والوں کو منہ لگانے کی عادت نہ ہوتی تو تم بھی
اس گھر میں نہ ہوتیں۔''

اس جملے پر ریشم کے پتنگے لگ گئے۔ اور پھر ایسا
گھمسان کا رن پڑا کہ بادشاہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا اور نادر
کے کمرے میں ہی آ کر دم لیا۔

اس رات بادشاہ اور نادر بہت تاخیر سے سوئے کیونکہ
بادشاہ کے آتے ہی نادر نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔
دونوں کا محور گفتگو واحدی ہی تھا۔ بادشاہ نے نہایت تفصیل
سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ ''واحدی بھائی کا اصلی نام
عبدالواحد ہے اور نانا کے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔
گاؤں کے صاحب حیثیت اور تعلیم یافتہ لوگوں میں ان کا شمار
ہوتا ہے لیکن والد کے فوت ہونے کے بعد ان کا بڑا بھائی اور
چھوٹا بھائی باہر چلے گئے اور واحدی بھائی نے کراچی بسا لیا۔
اکثر میرا وہاں آنا جانا رہتا ہے۔ میرے نانا اور ماموں
واحدی بھائی کے والد عبدالمالک کی زمینوں پر کام کرتے
تھے۔ میں جب بھی راج گڑھ جاتا تو ان کے ہاں بھی جاتا
تھا کیونکہ واحدی کی ماں اور میری امی بچپن میں ساتھ کھیلتی
تھیں۔ بس تب ہی سے عبدالمالک صاحب کا خاندان مجھے
جاننے لگا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ لوگ مجھے بھول گئے ہوں
گے لیکن واحدی بھائی نے نہ صرف مجھے فوری پہچان لیا بلکہ
جس اپنائیت اور محبت سے پیش آئے وہ تو میں زندگی بھر
فراموش نہیں کر سکتا۔''

نادر نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ''ہاں یار
خاندانی لوگ خاندانی ہی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ناں کہ پھل
دار درخت ہمیشہ جھکے ہوئے رہتے ہیں۔ ویسے ہی اپنے
صاحب جی ہیں۔ اتنے خدا ترس اور محبت کرنے والے
انسان ہیں کہ دل سے بے ساختہ دعا نکلتی ہے۔''

بادشاہ نے تائیدی انداز میں گردن کو جنبش دی اور
بولا۔ ''ارے نادر بھائی کی والدہ اور والد بھی بڑے سوہنے
تھے۔ ان کے دونوں بھائی بھی ان ہی کی طرح نیک اور
شریف ہیں۔ میں تو اپنے لڑکپن سے جانتا ہوں ان لوگوں
کو۔''

''ہوں۔'' نادر نے ایک لمبی ہنکاری بھری اور پھر
بولا۔ ''چل یار یہ پرانی شناسائی سے ایک فائدہ تو ہوا کہ
تیری نوکری پکی ہو گئی۔''

بادشاہ نے خوشی سے لبریز آواز میں کہا۔ ''ہاں نادر
بھائی اللہ واقعی مسبب الاسباب ہے۔ ورنہ یقین کرو آج
جیب نہ کٹتی اور ہوٹل میں وہ پھڈا نہ ہوتا تو میں یہاں سے نکل
چکا ہوتا۔ اتنا دل برداشتہ ہو گیا تھا میں اس کراچی سے۔''

نادر نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے محبت بھرے انداز
میں کہا۔ ''ارے میرے یار اللہ جو کرتا ہے اچھے کے لیے ہی

کرتا ہے۔ پہلے پہل تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ اس نے ہم سے آنکھیں پھیر لیں۔ اس لیے آزمائشوں کی چکی میں پیس رہا ہے لیکن وقت مقررہ پر نتائج سامنے آتے ہیں تو اس کی حکمت اور مصلحت سمجھ میں آتی ہے۔"

بادشاہ مسلسل اس کی باتوں پر سر ہلاتا رہا۔ جب نادر نے اپنی بات ختم کی تو بادشاہ نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ "سب کچھ تو ٹھیک ہے نادر بھائی لیکن بیگم صاحبہ سے پتا نہیں مجھے کیوں خوف محسوس ہوتا ہے۔ ابھی میری وجہ سے ہی دونوں میاں بیوی کے درمیان جنگ ہو گئی۔ میں تو سرپٹ بھاگا وہاں سے۔"

بادشاہ لفظ بہ لفظ تو اس ہنگامے کی تفصیل نہیں سنا سکا لیکن اس جھگڑے کا جو بھی لب لباب تھا وہ نادر کے گوش گزار کر دیا۔ جو پوری توجہ وانہماک سے ساری روداد سن رہا تھا۔ پھر سوچتے ہوئے بولا۔ "بادشاہ یہ سمجھ لے کہ اب یہ عورت تیری دشمن بن گئی جو بھی شخص صاحب جی کا ہمدرد یا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اس سے اس عورت کو کانٹے کا بیر ہوتا ہے۔ تجھے یہاں سے نکلوانے کی کوشش وہ ضرور کرے گی۔ ذرا ہوشیاری سے کام کرنا۔"

بادشاہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ میں بیگم صاحبہ سے خوف محسوس کر رہا ہوں۔" پھر متوقف ہوا چند لمحوں کے لیے اور ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات آگے بڑھائی۔ "رب نے جب تک یہاں کا آب ودانہ لکھا ہے، رہوں گا ورنہ بہت لمبی ہے خدا کی دنیا۔"

نادر نے اس کی بات پر گردن ہلائی اور کہا۔ "یہ تو تم صحیح کہہ رہے ہو۔ ایک در بند ہوتا ہے تو مالک ہزار در کھول دیتا ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ فی الحال تو اپنے کام پر توجہ دینا۔ ہو سکتا ہے لوہا پگھل جائے۔ بس اب چلو اٹھو آرام کریں گے۔ نیند پوری نہیں ہوئی تو سویرے......"

اس کا جملہ نامکمل رہا۔ اچانک بادشاہ نے اس کی بات کاٹ کر استفسار کیا۔ "نادر بھائی کیا بیگم صاحبہ کا تعلق غریب گھرانے سے ہے جو واحدی بھائی نے انہیں نچلے طبقے کا طعنہ دیا۔"

نادر نے ایک لمبی جمائی لی اور لائٹ آف کرتے ہوئے کہا۔ "اب تیرے اس سوال کا جواب کل دوں گا۔ غریب مفلس ہونا کوئی عیب نہیں لیکن اس عورت کا سارا ایک فراڈ یا ہے۔ ان کی ہسٹری سنے گا تو دنگ رہ جائے گا لیکن اب میں سو رہا ہوں۔ باقی باتیں کل۔" یہ کہہ کر نادر نے لمبی تان لی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے بھاری خراٹوں کی آواز سے کمرا گونجنے لگا۔ بادشاہ البتہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس رنگ بدلتی بستی میں جو حالات اور واقعات پے در پے اسے پیش آئے تھے، ان کے متعلق سوچتا رہا۔ اچانک خیالات کی رو ماں اور بہن کی جانب سرایت کر گئی اور اپنوں کو یاد کرتے کرتے وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

دوسرے دن گھر کے ایک سینئر ملازم نے اچھی طرح بادشاہ کو ذہن نشین کروا دیا کہ کون سا کام کب اور کس طرح انجام دینا ہے۔ بیگم صاحبہ کے عتاب سے کس طرح بچا جا سکتا ہے اور انہیں خوش رکھنے کے لیے بھی بے شمار ٹپس از بر کروا دیں۔ بادشاہ نے چند گھنٹوں میں اچھی طرح بھانپ لیا کہ گھر کے سارے ملازمین واحدی کا نہ صرف دل سے احترام کرتے ہیں بلکہ اپنے دلوں میں اس کے لیے نرم گوشہ بھی رکھتے ہیں جب کہ ریشم سے سب اس طرح خوف زدہ رہتے ہیں جیسے کہ وہ کوئی جن بھوت ہو۔ اپنے چند جاسوس بھی اس نے گھر میں چھوڑ رکھے تھے اور وقتاً فوقتاً ان کی مٹھی گرم کرتی رہتی تھی۔ اس لیے واحدی کا گھر، گھر نہیں بلکہ سیاسی اکھاڑا بن گیا تھا۔ میاں بیوی کے درمیان آئے دن جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی درجہ حرارت کافی بلند ہو جاتا اور کبھی فوراً ہی نیچے اتر جاتا۔ نوکر چاکر بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے جنہیں بھتہ ملتا وہ بظاہر تو ریشم کے گلے میں گلا ملا کر اس کا سُر الاپتے لیکن دل ہی دل میں سہمے ہوئے بھی رہتے کہ یہ دو دھاری تلوار کب سر کے دو ٹکڑے کرتی ہے۔

گھر کا ماحول انتہائی کشیدہ اور تناؤ سے بھرا رہتا۔ ایسی مسموم فضا میں جو لوگ جی رہے تھے انہیں اچھی طرح علم تھا کہ وہ کس طرح سانس لے رہے ہیں لیکن تمام ملازمین ریشم کے سامنے مستعد رہتے تھے۔ بادشاہ نے فرسٹ ڈے اپنی ڈیوٹی انجام دی اور نادر کے کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد نادر بھی آ گیا۔ وہ بیگم صاحبہ کو آج کسی جیولر کے یہاں لے گیا تھا جہاں انہوں نے لاکھوں کی خریداری کی تھی۔

دوسری رات پھر گزشتہ رات کا موضوع چھڑ گیا۔ نادر نے اپنی معلومات کے مطابق جو کچھ بادشاہ کو بتایا وہ کچھ اس طرح تھا کہ واحدی نے والدین کی طرف سے ملنے والے پیسے اور اپنی محنت کی جمع پونجی سے خسارے میں چلنے والا ایک بوسیدہ حال ٹیکسٹائل مل اپنے دوست کی شراکت سے فیصل آباد میں خریدا۔ اس کی اپنی رہائش کراچی میں تھی اس لیے

مہینے دو مہینے میں ہی فیصل آباد کا چکر لگاتا۔ ان ہی دنوں فیصل آباد میں میرا ٹکراؤ صاحب جی سے ہوا۔ میں بے سروسامانی کی حالت میں فیصل آباد کی گلیوں میں بھٹک رہا تھا۔ وہاں سے کچھ کلو میٹر کے فاصلے پر میرا آبائی گاؤں ہے، جہاں میرے ضعیف والدین رہائش پذیر ہیں۔ کبھی موقع ملا تو تجھے لے چلوں گا ملوانے۔

بادشاہ پوری دلچسپی کے ساتھ یہ سرگزشت سن رہا تھا۔

نادر نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ اتفاق محض اتفاق جیسے اچانک تجھ سے ملاقات ہوگئی۔ دراصل صاحب جی کی کار ایک ویران راستے میں دغا دے گئی۔ خود ہی ڈرائیو کررہے تھے۔ اس لیے گھبراہٹ طاری تھی۔ متلاشی نگاہوں سے اپنے قرب و جوار میں دیکھ رہے تھے کہ اچانک میں انہیں نظر آیا۔ صاحب جی نے کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا کہ کیا میں اس سلسلے میں ان کی مدد کرسکتا ہوں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اوزاروں کے بارے میں پوچھا تو صاحب جی نے ڈگی کی جانب اشارہ کیا۔

ڈگی میں سے اوزاروں کا تھیلا نکالا اور پون گھنٹے کی محنت کے بعد کار کا انجن جاگ اٹھا۔ صاحب جی کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ شاباشی کے طور پر کہا۔ ”تم تو بڑے کام کے آدمی ہو۔“ اور ساتھ ہی سوال بھی داغ دیا۔ ”کیا نام ہے، کہاں کے رہنے والے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟“

میں نے اپنی ہسٹری بتاتے ہوئے یہ بات بھی آشکارا کردی کہ کاریں ٹھیک کرنا اور فارغ وقت میں ڈرائیونگ کرنا میرا پیشہ ہے۔ برسوں سے فیصل آباد میں ایک کارخانے میں کام کررہا تھا لیکن ایک دن اس نے مجھے گالی دی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس خبیث کا گریبان پکڑ لیا۔ اکھڑی ہڈی کا تھا۔ فوراً ہی میں، میں کرنے لگا۔ کارخانے کے دوسرے کاریگروں نے بیچ بچاؤ کروایا۔ ایک ورکر نے پولیس کو فون بھی کردیا تھا۔ پولیس فوراً مجھے اپنے ساتھ لے گئی لیکن ایک دوست نے ضمانت پر رہا کروالیا۔ اپنے گھر میں پناہ بھی دی اور اب روزگار کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔

صاحب جی نے میری آپ بیتی سن کر سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولے۔ ”نادر مجھے ایک مشاق ڈرائیور کی سخت ضرورت ہے لیکن میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا۔ میں فوراً تیار ہوگیا۔ صاحب جی مجھے ساتھ لے کر سب سے پہلے میرے والدین کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اتنی خوش اخلاقی اور انکساری کے ساتھ میرے والدین سے گفتگو کی کہ وہ فوراً مجھے کراچی بھیجنے کے لیے تیار ہوگئے۔

بس اس طرح میں صاب جی کے ساتھ کراچی آگیا۔

صاب جی مجھے جو تنخواہ دیتے ہیں تو سنے گا تو حیران رہ جائے گا۔ بس یہ سمجھ لے کہ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے۔ میں نے گاؤں میں اپنا گھر بھی پختہ بنوالیا ہے۔ ماں اور بابا میرے لیے لڑکی تلاش کررہے ہیں اور میں یہاں چھوٹا موٹا گھر تلاش کررہا ہوں تاکہ بیوی کو ساتھ رکھ سکوں۔“

نادر کے خاموش ہوتے ہی بادشاہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ”نادر بھائی میری تشنگی تو اور بڑھ گئی۔ تمہارا انداز بیاں بھی اتنا خوب صورت ہے کہ ساری رات بیت جائے گی مگر سننے والا بور نہ ہوگا۔“

نادر ہنس کر بولا۔ ”ابے چند دنوں میں ہی بمبئی کا رنگ چڑھ گیا مکھن مار رہا ہے۔“

”نہیں..... نہیں نادر بھائی، میں تو بخدا حقیقت بیان کررہا ہوں۔ میں تو لطف اندوز ہورہا ہوں۔ آپ اس کہانی کو جاری و ساری رکھیے۔“

”ہوں“ نادر نے پرخیال انداز میں سر ہلا کر ہنکارا بھرا۔

پھر جذباتی انداز میں بولا۔ ”بادشاہ صاب جی ایسے انسان ہیں کہ ان کے لیے جان بھی دی جائے تو شاید حق ادا نہ ہو۔ سونے کا دل رکھتا ہے یہ شخص فیصل آباد میں جو مل خریدی تھی اس میں بھی پارٹنر نے ایسی بددیانتی دکھائی کہ سب ختم ہوگیا۔ صاحب نے اونے پونے اس کو فروخت کیا اور یہاں اسی طرح کا ایک مل خرید لیا لیکن اس میں انہوں نے کسی کی شراکت نہیں رکھی۔ صاب نے اپنی ٹوٹل پونجی اس پر لگادی اور نہ صرف پورا پورا ٹائم دیا بلکہ اپنے ورکرز کے ساتھ مل کر ایسی جان لیوا مشقت کی کہ بہت قلیل عرصے میں یہ سوکھا ہوا درخت سرسبز اور شاداب ہوکر تیز سانسیں لینے لگا۔ اپنے مل مزدوروں کو بے شمار سہولیات اور مراعات سے نوازا۔ اسی درمیان شامتِ اعمال ریشم کے بھائی سے صاب جی کی دوستی ہوگئی۔ وہ ایک نمبر کا کائیاں تھا وہ فوراً تاڑ گیا کہ سادہ لوح اور دل والا بندہ ہے۔ اس نے اور اس کے خاندان والوں نے صاب جی کو ایسا جکڑا کہ بالآخر انہیں ریشم سے شادی کرنی ہی پڑی۔ اس کی شکل و صورت پر تو وہ

ویسے ہی دل و جان سے فدا تھے۔ جیسے ہی ریشم سے شادی ہوئی، کچی آبادی میں رہائش پذیر یہ خاندان لگژری فلیٹ میں شفٹ ہوگیا۔ اب یہ سمجھو کہ وارے نیارے ہوگئے، اس خاندان کے۔ صاب جی کا تو یہ حال ہے ”تو پیارا تیرا کتا پیارا“ سسر اور سالے کی فرمائش پر انہیں پراپرٹی ایجنٹ بنا کر اپنے پیسے سے ایک آفس کھلوا دیا جہاں بیٹھ کر دونوں سیدھے سادے لوگوں کو جھانسے دیتے ہیں جھوٹے اور جعلی کاغذات دکھا کر پراپرٹی فروخت کرتے ہیں۔ کئی بار پولیس اس سلسلے میں صاب جی کے پاس بھی پہنچ چکی ہے۔ وہ شخص بیوی کی خاطر پیسا دے دلا کر معاملہ رفع دفع کرواتے ہیں۔ اب سسرال والوں کو منہ لگانا کم کر دیا ہے۔

صاب جی بھی چاہتے ہیں کہ زیادہ تو تو میں میں نہ ہو اس لیے بھی وہ دانستہ ہر بات کو اگنور کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی شدید اشتعال میں میڈم کو اس کی اوقات یاد دلا دیتے ہیں تو وہ جل کر کوئلہ ہو جاتی ہے اور پھر سارا نزلہ ہم جیسے کمزوروں پر گرتا ہے۔ سارے ملازموں کی اس روز شامت آجاتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نادر ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور بوجھل آواز میں بولا۔ ”اب یار بادشاہ نہ خود سوتا ہے نہ مجھے سونے دیتا ہے۔ جب سے تو آیا ہے مسلسل شب بیداری ہو رہی ہے۔ کسی روز گاڑی چلاتے ہوئے اونگھ آگئی ناں تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

دوسرے دن بادشاہ اپنے ذمے کے کئی کام نمٹا کر بازار سودا سلف لینے گیا تو وہاں اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ انتہائی میلے کچیلے حلیے میں اسے راجا نظر آیا۔ پہلی دفعہ میں تو وہ فریب نظر ہی سمجھا لیکن پھر آنکھیں مل مل کر دیکھا تو اسے یقین ہوگیا کہ وہ راجا ہی ہے۔ راجا ایک جگہ بیٹھ کر مٹی کے کلھڑ میں چائے پی رہا تھا۔ بادشاہ نے قریب جا کر پکارا ”راجا!“

راجا یوں اچھلا جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بادشاہ عین اس کے مقابل پہنچ کر بولا۔ ”راجا میں ہوں تیرا یار بادشاہ کیا بالکل نہیں پہچانا مجھے۔“

حیران پریشان راجا نے بادشاہ کو بغور دیکھا اور پھر وہ بے اختیار بادشاہ سے لپٹ گیا بادشاہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ لگتا ہے تو نے کئی دن سے روٹی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔“

دوست کے ہمدردانہ بول سن کر راجا کو اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا۔ وہ با آواز بلند رونے لگا۔ آس پاس کے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ چند ایک راہ گیر تو رک کر بادشاہ سے استفسار کرنے لگے۔ ”بھائی کیا ہوگیا۔ یہ شخص کیوں رو رہا ہے؟“

بادشاہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے راجا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور کھینچتا ہوا وہاں سے دور لے آیا۔ آج ہی واحدی نے تنخواہ کا لفافہ اسے پکڑایا تھا اس لیے جیب گرم تھی۔ راجا کو کھلانے پلانے کے بعد اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ ”یہ تم نے کیا درگت بنا رکھی ہے۔“

راجا پھر رونے کا آغاز کرنے ہی والا تھا کہ بادشاہ نے گھبرا کر کہا۔ ”ارے...... ارے یار چل چھوڑ...... بعد میں تیری کہانی سن لوں گا۔ ورنہ پھر لوگ جمع ہونا شروع ہو جائیں گے۔“

بادشاہ اسے اپنے ساتھ نادر کے کوارٹر میں لے آیا۔ راجا استعجاب انگیز نظروں سے کبھی واحدی کے عالیشان بنگلے کو دیکھتا کبھی وسیع و عریض لان کو نہارتا۔ حیرانگی کا یہ عالم تھا کہ گویائی کی سکت ہی ختم ہوگئی تھی لیکن آنکھوں میں ان گنت سوالات پوشیدہ تھے۔ بادشاہ نے اپنے ساتھ پیش آنے والے سارے واقعات من و عن راجا کے گوش گزار کر دیے۔ راجا نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ نادر داخل ہوا۔ اپنے گھر میں ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ تھوڑا سا ٹھٹکا اور پھر استفسارانہ نگاہوں سے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ اپنی جگہ چور سا بن گیا۔ خجل اور نادم نظروں سے اس نے نادر کو دیکھا اور اٹک اٹک کر بے ربط بے ترتیب انداز میں راجا کا تعارف کروانے لگا۔ نادر نے ایک بھاری بھرکم ”ہوں“ کی اور پھر اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ بادشاہ یہ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکا کہ نادر راجا کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا بلکہ اس کے دوست کی آمد اسے گراں گزری ہے۔

راجا کی بدحالی دیکھ کر جذبات کی رو میں بہہ کر اس نے یہ قدم اٹھا تو لیا تھا لیکن اب وہ خود دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا کہ اسے ابھی فی الحال راجا کو یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔ پہلے نادر سے اجازت لینی چاہیے تھی لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ راجا اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً سوال کیا۔ ”کیا بات ہے بادشاہ اس شخص کے آنے سے تم پریشان کیوں ہوگئے؟“

بادشاہ نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لیا پھر راجا کے اصرار پر حقیقت بتا دی کہ یہ دو کمروں کا مختصر کوارٹر دراصل

واحدی بھائی نے نادر کو دیا تھا۔ میں نادر بھائی کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں۔''

راجا نے سب کچھ سننے کے بعد دکھی لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ''ہاں یار بن بلایا مہمان ہوں مجھے کون برداشت کرے گا۔''

ابھی بادشاہ کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ نادر دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور دونوں کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم غلط سمجھ رہے ہو دوست۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس گھر میں ہم لوگ بیٹھے ہیں یہ نہ میرا ہے اور نہ بادشاہ کا۔ یہ گھر واحدی صاحب کی ملکیت ہے۔ اس لیے اصولاً بادشاہ کو ان سے ضرور پرمیشن لینا چاہیے تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ واحدی صاحب ہم ملازموں کے ساتھ بھی دوستانہ رویہ رکھتے ہیں لیکن پھر بھی ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہیں تو آخر ہم نوکر۔''

بادشاہ فوراً بولا۔ ''دراصل نادر بھائی باتوں میں مجھے خیال ہی نہیں رہا حالانکہ میں راجا کو یہی سوچ کر لایا تھا کہ اسے فوراً واحدی بھائی سے ملواؤں گا اور سفارش کروں گا کہ یا تو اپنے مل میں یا گھر میں اسے کوئی چھوٹی موٹی ملازمت ضرور دے دیں۔ آپ کہیں تو ابھی راجا کو ان سے ملوا دیتا ہوں۔''

نادر نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں یہ وقت مناسب نہیں۔ اس وقت وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہیں اس لیے اب صبح ہی ملاقات صحیح رہے گی۔''

بادشاہ نے تائیدی انداز میں سر کو جھٹکا دیا اور کہا۔ ''بہتر ہے صبح ہی ملوا دوں گا۔''

بادشاہ نے راجا کی عدم موجودگی میں واحدی سے اس کا غائبانہ تعارف کرواتے ہوئے اس کے لیے کسی مناسب کام کی مانگ کی تو واحدی نے جواباً کہا۔ ''ٹھیک ہے پہلے تم مجھے اس لڑکے سے ملواؤ۔ میرا ایک فارم ہاؤس ہے۔ اس کی دیکھ ریکھ کے لیے مجھے ایک آدمی چاہیے اگر یہ بندہ قابل اعتماد ہوا تو میں اسے وہیں بھیج دوں گا۔''

''جی بہتر۔'' کہتے ہوئے بادشاہ فوراً الٹے قدموں کوارٹر کی طرف دوڑا اور راجا کو واحدی کے مقابل لا کر کھڑا کر دیا۔ اس دوران وہاں ریشم بھی آکر براجمان ہو گئی تھی۔ اس نے نظر بھر کر راجا کو دیکھا اور شوہر سے مخاطب ہو کر اپنا قطعی فیصلہ سنایا۔ ''واحدی آپ فارم ہاؤس کے لیے کسی اور شخص کو ہائر کر لیجیے آپ کو شاید علم نہیں بخشی ہمارے یہاں کی نوکری چھوڑ گیا ہے۔'' بادشاہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بادشاہ آج سے یہ لڑکا یہیں رہے گا، گھر اور لان کی صفائی ستھرائی کے بارے میں اسے اچھی طرح سمجھا دو اور..... ہاں جھاڑو، پونچھا اور ڈسٹنگ کے بارے میں بھی بتا دینا کہ دن میں دو مرتبہ انجام دینا ہے۔''

بادشاہ نے خوش ہو کر فوراً کہا۔ ''جی میڈم جی آپ فکر نہ کریں۔ میرا دوست سب کر لے گا۔''

ریشم نے ایک پُرسکون سانس لی اور بولی۔ ''بس تو پھر ٹھیک ہے فوراً اس کے ہاتھ میں جھاڑو پکڑا دو تا کہ گھر تو لگے۔''

ان دونوں کی باتیں سن کر راجا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایسی کڑی محنت اور مشقت طلب کام اس نے زندگی میں نہیں کیے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ ماں باپ نے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔ وہ تو گھر سے صاحب بننے کے خواب لے کر چلا تھا لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ کراچی میں اس کی اوقات دو پیسے کی بھی نہیں ہے۔ دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اس نے سرگوشیانہ انداز میں بادشاہ سے کہا۔ ''نہیں یار بادشاہ یہ کام میں نہیں کر سکوں گا۔''

بادشاہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کرتے ہوئے کڑی اور سخت نگاہوں سے اسے گھورا اور اسے وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ ایک طرف لے جا کر پھاڑ کھانے والے انداز میں غرایا۔ ''ہاں بول اب کیا مسئلہ ہے تیرا۔ کیوں نہیں کرے گا یہ کام، بتا کیا حرج ہے اس میں۔''

اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر راجا سہم گیا اور گھبرا کر بولا۔ ''ارے یار کام کی نوعیت تو دیکھ کیا میں ایسے گرے پڑے کام کے لیے بنا ہوں۔''

بادشاہ نے دانت کچکچاتے ہوئے ایک طنزیہ تبسم کے ساتھ کہا۔ ''ابے ہوش کے ناخن لے ہم دونوں نام کے راجا اور بادشاہ ہیں۔ حقیقتاً ہم بے آسرا اور بے روزگار نوجوان ہیں جنہیں اپنی چھت بھی نصیب نہیں اور اگر تو یہاں بغیر کام کے ٹکنے کی کوشش کرے گا تو نہ تجھے واحدی بھائی برداشت کریں گے اور نہ نادر تجھے سانس لینے دے گا۔ یا پھر ایسا کر میں تجھے کرایہ دیتا ہوں تو واپس بیرا گوٹھ چلا جا۔''

راجا پھر لڑکیوں کی طرح ٹسوے بہانے بیٹھ گیا اور اشکبار آواز میں بولا۔ ''وہاں بھی تو نہیں جا سکتا۔ جس پھوپی کے گھر پناہ لینے گیا تھا ان کی بیٹی پر میرا دل آ گیا تھا۔ پھوپی

اور پھوپا کو پتا چلا تو انہوں نے نکال دیا۔ فون کر کے ابو کو بھی بتا دیا۔ ابو نے بھی تڑی لگادی کہ گاؤں کی دہلیز نہ پھلانگنا ورنہ ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

''ہم......م......م......'' ایک طویل ہنکارا بادشاہ نے بھرا اور بولا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ اب آئی بات سمجھ میں۔ تو پھر میرے دوست میرے بھائی میں تجھے یہی مشورہ دوں گا کہ پکڑ لے یہ نوکری اور بسم اللہ کر۔''

راجا نے بے بس اور مجبور نظروں سے بادشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس کا دل اور دماغ الگ الگ سمتوں میں سفر کر رہے ہیں۔

ڈیوٹی آورز ختم ہوتے ہی راجا، بادشاہ کے سامنے چھما چھم رو دیا۔ بادشاہ نے بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ کوئی اور جائے پناہ اس کے پاس تھی نہیں اس لیے چار و ناچار وہ یہاں کام کرنے پر مجبور تھا۔ کام کے دوران وہ خود کلامی کے انداز میں کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ جب واحدی اور ریشم قریب ہوتے تو بادشاہ فوراً چوکنا ہو کر اسے آنکھ کے اشارے سے منہ بند کرنے کے لیے کہتا۔

وہ بحالت مجبوری کام کر رہا تھا اس لیے کام بھی تسلی بخش نہیں تھا۔ ریشم کو تو باہر کے سیر سپاٹوں سے فرصت نہیں تھی لیکن واحدی نے بارہا بادشاہ کو تنبیہ کی کہ تمہارا ساتھی کام بہتر طور پر انجام نہیں دے رہا ہے۔ پہلے پہل تو بادشاہ نے راجا کو دبی دبی زبان سے وارننگ دی لیکن ایک دن اس نے طیش آمیز لہجے میں راجا سے کہا۔ ''راجا تو نے دیکھا ہے ڈرائنگ روم میں ہر چیز پر کتنی دھول جمی ہے اگر اس گرد و غبار پر ہم اپنا نام بھی لکھ لیں تو آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔''

راجا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''جتنا تنخواہ ملتا ہے اس سے زیادہ ہی کرتا ہوں۔'' پھر بے پروائی سے بولا۔ ''کوئی چھت میسر آجائے اور کوئی اچھا سا روزگار مل جائے تو میں خود پہلی فرصت میں اس نوکری کو لات مار دوں گا۔''

نادر ان دونوں کے درمیان ہوتے والی گفتگو سن رہا تھا اس نے مداخلت کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''سنو مسٹر راجا، صاحب جی بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ تمہارے جیسے نوکر ان کے دروازے پر قطار باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ وہ تو بادشاہ سے پرانی واقفیت کی بناء پر انہوں نے تمہیں ہائر کر لیا ورنہ وہ ہم تم جیسے لوگوں کو گھاس بھی نہیں ڈالتے۔ بادشاہ نے اور میں نے محنت سے ہی اپنی جگہ بنائی ہے۔ اسی طرح تم بھی اپنا مقام بنا سکتے ہو۔''

راجا نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''بس بہت کر لی محنت مشقت، کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے تابڑ توڑ اپنے سر پر جوتے ماروں۔ دس جماعتیں پڑھا ہوں پوری دس جماعتیں۔ تم لوگوں کی طرح جاہل نہیں ہوں۔''

اب نادر کو بھی غصہ آگیا لیکن اس نے اشتعال کو لگام دی اور بولا۔ ''میں اپنے گریجویشن کی ڈگری ساتھ لے کر نہیں پھرتا، ورنہ تجھے دکھاتا۔''

چند لمحوں کے لیے یکدم سکوت چھا گیا۔ راجا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ نادر کی سلجھی ہوئی گفتگو اور طور طریقوں سے ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ ان پڑھ نہیں ہے لیکن وہ گریجویٹ ہوگا۔ اسے علم نہیں تھا۔ نادر کے اس انکشاف پر اس کی بولتی بند ہوگئی تھی۔ اپنی برتری کا رعب وہ بادشاہ پر ڈال کر ہمیشہ اسے مرعوب اور شرمندہ کرتا تھا لیکن آج اس کا سارا گھمنڈ نادر نے ایک ہی جھٹکے میں پاش پاش کر دیا۔ راجا نے فوراً پینترا بدلا اور ایک کھسیانی ہوئی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''ارے نادر بھائی آپ تو برا مان گئے میں تو یونہی آپ دونوں سے مذاق کر رہا تھا۔ اب سب باتوں کو بھول کر مجھے کوئی بہتر مشورہ دیجیے تاکہ میں صاحب جی اور بیگم صاحب کی نظروں میں سرخرو ہو سکوں۔''

بادشاہ نے آہستہ سے زیر لب کہا۔ ''اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔''

نادر بادشاہ کی بات پر مسکرائے بنا نہیں رہ سکا۔ راجا کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ ہونق بنا دونوں کو تک رہا تھا۔ نادر اپنی نشست چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''بددلی سے کام کرنے کی عادت چھوڑ دو۔ دلچسپی اور لگن سے کام کرو گے تو مالکوں کی ضرورت بن جاؤ گے اگر ملازمت چھوڑنا بھی چاہو گے تو وہ خود تمہیں روکنے کی کوشش کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے نادر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے بادشاہ بھی نکل گیا لیکن راجا اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔ وہ نادر کی کہی ہوئی نصیحت پر غور کر رہا تھا کہ واقعی اس نے محنت سے اپنا کام انجام دیا تو وہ دونوں میاں بیوی کے دل میں گھر کر سکتا ہے اور جب مالکان کے دلوں پر راج کرے گا تو پھر نادر اور بادشاہ کو دیکھ لے گا۔ دونوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دے گا۔

نادر کی کہی ہوئی بات اس کے دل پر نقش کر گئی تھی۔ اس کی اس تبدیلی کو واحدی اور ریشم دونوں نے نوٹ کیا۔ وہ نہ صرف اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دے رہا تھا بلکہ

واحدی اور ریشم کے آگے پیچھے پھر کر دوڑ دوڑ کر یوں سارے کام نمٹاتا کہ دونوں بے اختیار اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ ریشم تو اب اسے اپنے ساتھ باہر بھی لے جانے لگی تھی۔

واحدی کی تو اپنی دفتری مصروفیات تھیں لیکن ریشم کا وہ مصاحب بنا ہوا تھا۔ اس تبدیلی کو گھر کے سارے ملازمین نے محسوس کیا۔ سب کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ راجا کا طوطی بول رہا ہے۔

اس دن صبح سے بادشاہ کو کمزوری محسوس ہو رہی تھی اسی لیے وہ لیٹا ہوا تھا۔ نادر کمرے میں داخل ہوا تو اسے لیٹا دیکھ کر بولا۔ ''کیوں کیا بات ہے یہ بے وقت بستر کیوں توڑ رہے ہو؟''

بادشاہ نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ارے کچھ نہیں نادر بھائی، بس ہلکا سا بخار ہو گیا ہے۔ ابھی اٹھتا ہوں اور اپنے کام دھندے سے لگتا ہوں کیونکہ آج تو راجا بھی نہیں ہے اس لیے گھر کی صفائی بھی مجھے ہی کرنی ہے۔''

نادر نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور فکر مندانہ انداز میں بولا۔ ''تمہیں تو اچھا خاصا بخار ہے۔ بستر سے اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے حصے کے کام میں دوسرے ملازمین سے کروا لوں گا اور باہر کا سودا سلف میں خود لے کر آ جاؤں گا۔ آج میرے پاس گاڑی ہے۔''

نادر کو بادشاہ نے احسان مندانہ نظروں سے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''نادر بھائی! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ کتنا اچھا دل پایا ہے آپ نے۔ ایک وہ ہے میرا لنگوٹیا یار یقین کریں میڈم جی جب اسے اپنے ساتھ لے کر جاتی ہیں تو مجھے طنزیہ انداز میں دیکھ کر ہنستا ہے جیسے کہہ رہا ہو کولہو کے بیل اب تو لگا رہ کام دھندے میں۔''

بادشاہ کی بات پر نادر بولا۔ ''کہہ تو رہے ہو تم بالکل درست۔'' پھر سوچتے ہوئے طویل توقف کیا اور پُرخیال انداز میں بولا۔ ''بادشاہ یار! میڈم اور راجا کا رویہ اپنی سمجھ سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ مالکن اور نوکر کا رشتہ تو ختم ہی ہو گیا دونوں کے درمیان، بلکہ اب وہ آپس میں یوں باتیں کرتے ہیں جیسے کہ دو دوست یا سہیلیاں۔ اور تم نے ایک اور بات پر غور کیا۔'' بادشاہ نے بستر سے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''کون سی بات نادر بھائی؟''

نادر نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ''راجا کے رنگ ڈھنگ نہیں دیکھ رہے ہو تم، گھنٹوں بننے سنورنے میں مصروف رہتا ہے۔ اب تو ڈریسنگ بھی کوالٹی والی ہوتی ہے۔''

بادشاہ نے پانی سے چین کلیر نگلی اور بڑے بڑے گھونٹ لے کر گلاس ختم کر کے میز پر رکھا اور بولا۔ ''آپ سو فیصد صحیح کہہ رہے ہیں۔ میں بھی غائر نظروں سے اس کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ آیا تھا تو کیسا مرمٹا اور مرا چرا تھا اور اب دیکھو نہ صرف مجھ پر بلکہ آپ پر بھی غرانے لگا ہے کتوں کی طرح۔''

نادر نے انکار کے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہ...... نہ...... کتوں کی توہین مت کر یار۔ کتا تو بڑا وفادار ہوتا ہے جس کا نمک کھاتا ہے جس کی روٹی توڑتا ہے اس کے لیے جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہ تو ناگ ہے ناگ پانچ پھن والا۔ کون سے پھن سے کس کو ڈسے گا اور کب ڈسے گا کچھ پتا نہیں۔''

فکر اور پریشانی کے تاثرات بادشاہ کے چہرے پر بھی منڈلانے لگے۔ اس نے تردد بھرے لہجے میں کہا۔ ''نادر بھائی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پتا نہیں دونوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔''

نادر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم فی الحال آرام کرو۔ میں شام میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ بس ہوشیار اور چوکنا رہنا راجا سے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے نکل گیا۔

بادشاہ ٹکٹکی لگائے خالی دروازے کو گھورتا رہا۔ ذہن میں نادر کی کہی ہوئی باتیں گونج رہی تھیں۔ چین کلیر سے ہلکا سا سر درد کم ہوا تھا لیکن سوچوں کی یلغار سے پھر کنپٹیوں میں دھمک ہونے لگی تھی۔ اس نے ایک کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆

رات کے کھانے کے دوران واحدی ایک ضروری کال سن کر فوراً کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی لمحے ریشم ہانپتی کانپتی گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے عقب میں راجا تھا جو شاپنگ بیگز سنبھالے ہوئے تھا۔ ریشم نے آتے ہی شوہر کو سوالیہ انداز میں دیکھا اور فوراً سوال داغ دیا۔ ''اس وقت کہاں جا رہے ہو؟'' واحدی جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے تیکھی آواز میں بولا۔ ''تم آئی ہو میں جا رہا ہوں۔ ہم دونوں کے ساتھ تو برسوں سے یہی ہو رہا ہے۔ پھر

"پوچھ پچھ کیسی۔"

ریشم نے ناک سکیڑی پیشانی پر بل ڈالے اور پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔ راجا نے بھی تمام سامان میز پر رکھا اور تو دو گیارہ ہوگیا۔ بادشاہ بھی سمجھ گیا کہ مطلع کافی ابرآلود ہے۔

اس نے جلدی جلدی اپنے تمام کام نمٹائے اور ڈرتا سہمتا ریشم کے کمرے میں داخل ہوا۔ ریشم اپنے پُرتعیش بیڈ پر لیٹی موبائل پر کسی سے باتیں کررہی تھی۔ ہاتھ سے اس نے بادشاہ کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور پھر رابطہ ختم کرکے بولی۔ "تم یقیناً کھانے کے لیے پوچھنے آئے ہو لیکن آج باہر ہی اتنا کچھ کھالیا ہے کہ اب رغبت نہیں ہورہی ہے۔ اس لیے تم میرے لیے ایک گلاس دودھ لے آؤ۔"

"جی بہتر" کہتے ہوئے وہ فوراً پلٹا اور کھانے کی میز سے تمام ڈشز سمیٹ کر کھانا محفوظ کیا اور پھر دودھ گرم کر کے تیز قدموں سے چل کر بیڈروم کے دروازے پر دستک دی۔

جواب ندارد۔ بادشاہ نے ہلکے سے دروازے کو دھکا دیا تو باتھ روم سے شاور سے گرتے ہوئے پانی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ میڈم جی شاور لے رہی ہیں آگے بڑھ کر وہ جھکا اور سائیڈ ٹیبل پر گلاس رکھنا چاہا کہ معاً باتھ روم کا دروازہ کھلا اور ریشم نے کمرے کی قیمتی اور دبیز قالین پر قدم رکھا لیکن اچانک پیروں میں لغزش ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر بادشاہ کے اوپر آگری۔ بادشاہ کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس چھوٹ گیا۔ ریشم کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز اور کامیابی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔ کافی دیر تک وہ ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی اور پھر ایک انگڑائی لے کر بستر پر دراز ہوگئی۔

وہ ساری رات بادشاہ نے جاگ کر گزاری۔ اس کی اپنی بانہیں ریشم کے جسم کا ریشمی لمس، چندن اور گلابوں کی خوشبوؤں سے بسے گیسوؤں کی سرسراہٹیں اسے اپنے آس پاس محسوس ہورہے تھے۔ کسی کروٹ چین تھا نہ قرار، سورج کی کرنیں کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ ایک بوجھل سانس لے کر اٹھ بیٹھا۔ چہرہ مضمحل تھا اور آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ دن بھی یونہی گزر گیا نہ بے چینی ختم ہوئی نہ اضمحلال میں کمی آئی۔ اس وقت بھی وہ نڈھال اور پژمردہ سا اپنے کمرے میں داخل ہوا تو نادر اس کو دیکھ کر ٹھٹکا اور تفکر آمیز لہجے میں استفسار کیا۔ "تم تو کہہ رہے تھے ڈاکٹر کی دوا سے تمہیں فائدہ ہے لیکن تمہاری حالت تو اور بھی ابتر نظر آرہی ہے۔ مجھے لگتا ہے تم رات سوئے بھی نہیں ہو۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟"

بادشاہ نے ایک اداس اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی آنکھیں جھپکائیں اور بے جان لہجے میں بولا۔ "ارے نادر بھائی آپ خوامخواہ میری فکر میں دبلے ہورہے ہیں۔ بس ذرا بخار کی وجہ سے نقاہت......" اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے راجا تولیے سے ہاتھ منہ پونچھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور زور زور سے گنگنانے لگا۔ جاگیں گے اب تو نیناں بیتے گی۔ رین ساری وہ لے گئے ہیں اپنے سنگ نیند بھی ہماری۔ گیت کے بول سن کر بادشاہ بری طرح سٹپٹا گیا۔ تنفس تیز ہوگیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے راجا کو دیکھنے لگا۔ راجا کن انکھیوں سے اسے دیکھ بھی رہا تھا اور لہک لہک کر گا بھی رہا تھا۔ نادر تیز آواز میں چلایا۔ "ابے او بے سرے اب بس بھی کر۔ یوں گلا پھاڑنا ہے تو باہر سڑک پر چلا جا وہاں دو چار ٹکھوتے جمع ہوکر تیرا ساتھ دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور بادشاہ کی پشت تھپکتے ہوئے بولا۔ "اپنا خیال رکھو۔ الٹے سیدھے خیالات سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی راجا کے چہرے پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ بادشاہ کے قریب آکر بیٹھا اور جھک کر رازدارانہ انداز میں سرگوشی کی۔ "مجھے علم ہے میرے دوست آج کل تو تجھے ستارہا ہے۔ وہ حسین حادثہ جو تیرے اور میڈم کے درمیان ہوا ہے تو بھلانا بھی چاہتا ہے تو بھول نہیں پارہا ہے۔" اس کی بات سن کر راجا یوں اپنی نشست پر اچھلا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ آنکھیں شدت حیرت سے حلقوں سے باہر آگئی تھیں۔ لرزیدہ آواز میں بولا۔

"ک...... کک...... کون سا حادثہ...... مجھے تو کچھ علم نہیں۔" اس کی زبان میں لکنت اور لڑکھڑاہٹ تھی۔

اس کی گھبراہٹ اور بدحواسی دیکھ کر راجا کھلکھلا کر ہنس پڑا اور دیر تک ہنستا رہا اور پھر استہزائیہ انداز میں بولا۔ "ارے یار ہم سے کیا پردہ۔ میڈم سارا راز اگل چکی ہے ہمارے سامنے اور سچ، ایک پتے کی بتاتاؤں دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔"

بادشاہ گھبرا کر بے یقینی سے بولا۔ "نہیں...... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ میری نظروں میں میڈم ایک قابل احترام ہستی ہے وہ اپنے اور میرے متعلق کیوں ایسا ویسا سوچے گی۔"

بادشاہ اب سوچنے اور بولنے کے قابل ہوگیا تھا۔

بتدریج اس کے اعصاب اس کے قابو میں آچکے تھے۔ اس لیے اپنی دانست میں اس نے راجا کو بالکل صحیح جواب دیا تھا لیکن راجا اس کی ہر بات کی نفی کرتا رہا اور اسے یہ باور کروا کے ہی اٹھا کہ ریشم اس پر دل و جان سے فدا ہے۔

اس کے بعد تو بادشاہ کے ہونٹ بات بے بات مسکراہٹوں کے پھول بکھیرنے لگے۔ قدم متوازن پڑنے لگے، چال میں اعتماد آگیا۔ تن پہ سرور کی کیفیت چھا گئی۔ دو چار دن کے وقفے سے جیسے ہی دونوں کو تنہائی نصیب ہوئی راجا نے پھر شعلوں کو ہوا دی اور اپنا سرخ مفلر اپنے گلے سے نکال کر بادشاہ کی گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا۔ ''اوئے میرے یاراں! میڈم جی تجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔ انہیں کسی کل چین نہیں آرہا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آج واحدی صاحب کی کوئی اہم میٹنگ ہے اس لیے وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوں گی۔ وہ آج رات کی اپنی تمام تنہائیاں تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتی ہیں۔''

بادشاہ کے دل کی دھڑکنیں پھر تیز ہو گئیں۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اپنی تیز تیز سانسوں پر قابو پاتے ہوئے وہ بمشکل بولا۔ ''لیکن راجا یہ کس طرح ممکن ہے؟''

راجا ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ''میری جان اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ بس تجھے ذرا سی ہمت کرنی ہوگی۔ صاحب جی اپنے ڈرائیور کو لے کر تقریباً پونے دس بجے گھر سے جا چکے ہوں گے۔ نوکر چاکر بھی اپنے کوارٹرز میں پڑ کر سو رہے ہوں گے اور نادر کا تو تجھے پتا ہے وہ تو ایسے گھوڑے بیچ کر سوتا ہے کہ اس کے سرہانے ڈھول بھی پیٹا جائے تو اسے ہوش نہیں آتا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بادشاہ کے سر پر ایک چپت لگائی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اب بتا میڈم کو کیا جواب دوں۔ ہاں یا ناں۔''

بادشاہ نے تھوک کا بڑا سا گولہ نگلتے ہوئے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ راجا اس کے جواب کا منتظر تھا لیکن بادشاہ خالی خالی نظروں سے اسے تکتا رہا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔ راجا چند لمحے انتظار کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا لیکن بادشاہ اپنی نشست پر یوں بیٹھا رہا جیسے سنگی مورت ہو۔ وہ ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ دل کی دھکڑ پکڑ کا شور جب حد سے تجاوز کر گیا تو وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ بدقت تمام اس نے اس روز اپنے ضروری کام نمٹائے اور نادر کے سامنے خرابی طبیعت کا بہانا کر کے کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ اس اثناء میں راجا کمرے میں داخل ہوا۔ نادر نے راجا کو دیکھا تو قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''راجا میں تو کھانے کے بعد پڑ کے سو رہوں گا۔ ذرا تو اسے ڈاکٹر سعد کے کلینک تک لے کر جانا اور ڈاکٹر صاحب کیا کہتے ہیں مجھے بتانا۔''

''جی بہتر۔'' کہتے ہوئے اس نے بادشاہ کا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں تھاما اور اسے کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس وقت اس کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا۔ دونوں نے باہر نکل کر ایک پرسکون سانس لیا اور پیدل ہی کلینک کی راہ لی۔ موضوع وہی تھا جس نے بادشاہ کی زندگی کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا تھا۔ راجا آہستہ آہستہ نپے تلے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''بادشاہ میں نے میڈم کو بتا دیا کہ بادشاہ نہ اقرار کر رہا ہے اور نہ انکار۔''

بادشاہ فوراً متفکر ہوا۔ ''پھر میڈم نے کیا کہا؟''

راجا نے ایک سرد آہ بھری اور اداس لہجے میں بولا۔ ''کہتیں کیا وہ پریم دیوانی خود دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔''

بادشاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔

راجا نے چلتے چلتے بادشاہ کا ہاتھ دبایا اور آواز دبا کر بولا۔ ''چل چھوڑ پیا ملن کے لیے تو فی الحال تیار نہیں تو جانے دے لیکن میڈم جس برہا کی آگ میں جل رہی ہے اسے تو بجھانا ہی ہے ناں۔ اس کے لیے میں نے اور میڈم نے بڑا زبردست منصوبہ تیار کیا ہے۔ بس تیری مدد درکار ہے۔''

بادشاہ نے سادہ لوحی سے نہایت معصومانہ انداز میں سوال کیا۔ ''کون سا منصوبہ؟ کیسی مدد میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔''

راجا نے ایک قہقہہ بلند کیا اور ہاتھ نچا کر بولا۔ ''ارے بھولے ناتھ ذرا صبر پکڑ اور غور سے سن۔ تو صاحب جی کو روزانہ دودھ دیتا ہے ناں، اس میں تیز بے ہوشی کی دوا ڈالنی ہو گی اور جب وہ گہری نیند سو رہے ہوں گے تب تکیہ رکھ کر انہیں اس دنیا سے اس دنیا میں پہنچانا ہوگا۔ اس کام کے عوض میڈم تجھے بہت بڑی رقم دیں گی۔ اتنا دیں گی جس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

بادشاہ کو زوردار کی ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے بچا۔ شاید تیورا کر زمین بوس ہی ہو جاتا اگر راجا اسے نہ سنبھالتا۔ کتنی ہی دیر دونوں گم صم رہے۔ راجا نے دوبارہ اسٹارٹ لیا اور منصوبے کے دیگر پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے اسے واضح

الفاظ میں پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ''نامعقول آدمی تیرے بھلے ہی کے لیے کہہ رہا ہوں۔ ایسی حسین وجمیل اور دولت مند بیوی تجھے مل سکتی ہے۔ ابے سات جنم لے کر بھی پیدا ہوا تو میڈم کے پیروں کو بھی نہیں چھو سکتا۔ تو تو مقدر کا سکندر ہے جو میڈم کا دل تجھ پر آ گیا۔ اچھی طرح سوچ لے تجھے مہلت دے رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور بادشاہ کو سڑک پر تنہا چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلا گیا۔

بادشاہ کے اعصاب چیخ رہے تھے۔ جسم بے جان ہو چکا تھا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ بمشکل اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا وہ کوارٹر تک پہنچا اور کٹی پتنگ کی طرح اپنے بستر پر گر گیا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ نادر گہری نیند سو رہا تھا ورنہ فوراً کوئز پروگرام اسٹارٹ ہو جاتا۔ لیٹ تو گیا تھا لیکن آنکھیں چھت پر مرکوز تھیں۔ دیوار گیر گھڑی کی سوئیاں مسلسل حرکت میں تھیں لیکن وہ دم بخود پلنگ پر لیٹا تھا۔ نیند کا پتا نہ تھا۔ راجا کا کہا ہوا ایک ایک لفظ ذہن میں گونج رہا تھا۔ سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے کی چار دیواری میں اس کا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ عجیب سی بے کلی اور بے قراری تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ اٹھا اور تیز رفتاری سے چلتا ہوا لان میں آ کر سنگی بنچ پر بیٹھ گیا۔ شدید اضطرابی حالت میں خلاء میں گھورتا رہا۔ خیالوں کے گھوڑے اسے بہت دور تک لے گئے جہاں ایک طرف ریشم کا مرمریں جسم تھا اور اس کی بے پناہ دولت دونوں اس کی راہوں میں پڑے اس کے ایک اشارے کی منتظر تھے جب کہ دوسری جانب غربت، بھوک، پیاس اور بے شمار ذمہ داریوں کا عفریت منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ فیصلہ اس کے اپنے ہاتھ میں تھا۔ اسے کس چیز کا انتخاب کرنا چاہیے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کر لیا کہ اسے اپنے دل کی بات مان لینا چاہیے۔ ''لیکن واحدی بھائی......!'' اس کا سانس حلق میں ہی اٹک گیا۔ اپنی پیشانی رگڑتا ہوا چہل قدمی کے انداز میں ٹہلنے لگا۔ دل کے نہاں خانوں میں رقصِ ابلیس شروع ہو چکا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی اس نے سوچ لیا کہ وہ یہ کام کسی اجرتی قاتل سے بھی کروا سکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اب وہ پہلے کی طرح مضطرب نہیں تھا بلکہ مکمل طور پر پُرسکون اور خوش تھا۔ اچانک فون کی کالنگ ٹون اسے پکارنے لگی۔ جیب سے موبائل نکال کر دیکھا تو شہزادی کی کال آ رہی تھی۔ کچھ ماہ پیشتر جب وہ گاؤں گیا تھا تو بہن کے لیے موبائل لے کر گیا تھا تاکہ ماں بہن کی خیریت بھی معلوم ہوتی رہے اور ان سے بات چیت کر کے ملنے جلنے والوں کا حال احوال بھی معلوم ہو جائے۔

اس نے فوراً موبائل آن کیا اور زوردار انداز میں ''ہیلو'' کہا۔ دوسری جانب اس کی ماں تھی۔ اس نے لپک کر ماں کو سلام کیا اور خیریت دریافت کی۔ ماں نے بے شمار دعاؤں کے بعد اس کی خیریت پوچھی اور ساتھ ساتھ واحدی کے بارے میں پوچھا۔ بادشاہ نے بات ٹالتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''ہاں...... ہاں ٹھیک ہے۔ وہ بھی۔''

ماں نے مشفقانہ انداز میں واحدی کو بھی دعاؤں سے نوازا اور پھر گلوگیر آواز میں بولی۔ ''بادشاہ میرا بڑا بیٹا تو نہیں بلکہ واحدی ہے۔ ارے ہم غریب لوگ، اللہ کے بعد ہمیں کون پوچھنے والا مگر بھلا ہو واحدی کا۔ پچھلی میٹھی عید پر اس نے تیرے ہاتھ سے جو لفافہ مجھے بھجوایا تھا ناں، اس میں اتنی بڑی رقم تھی کہ میں نے اپنا کچا چھوٹا سا گھر توڑ کر پکا مکان بنوالیا ہے۔ پچھلی بارشوں میں تو چھت بالکل ہی ختم ہو گئی تھی لیکن اب ماشاء اللہ گھر اتنا اچھا بن گیا ہے کہ تو حیران رہ جائے گا۔ اللہ کرے واحدی کو میری بھی عمر لگ جائے۔ بادشاہ میرے بچے میری طرف سے واحدی کو لاتعداد دعائیں کہنا۔ میں بارگاہِ الٰہی میں پہلے واحدی کے لیے ہاتھ پھیلاتی ہوں بعد میں تیرے لیے۔ اچھا بیٹا رات بہت ہو گئی ہے اب تو آرام کر۔'' یہ کہہ کر ماں نے رابطہ ختم کر دیا۔

فون سننے کے بعد بادشاہ اپنی جگہ پتھر کا بت بن گیا۔ ہلنے جلنے کی سکت ہی ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر پہلے کا سکون اور اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ ماں نے اس کے مصمم ارادے کو متزلزل کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے کی چادر اور دبیز ہو گئی۔ ذہن بری طرح منتشر ہو گیا۔ اس کا دل چاہا اپنے ہی بال نوچنا شروع کر دے۔ بدقت تمام بیڈ تک پہنچا اور حواس باختگی کے عالم میں نادر کو گہری نیند سے جگا دیا۔ نادر نے بہت مشکل سے آنکھیں کھولیں اور غنودگی بھری آواز میں بولا۔ ''کیا ہے بادشاہ؟ کیوں اٹھا دیا مجھے؟'' لیکن پھر جیسے ہی بادشاہ کے چہرے پر نظر پڑی اس کی نیند اڑن چھو ہو گئی۔ گھبرا کر اس نے پوچھا۔ ''ابے کیا ہوا ہے یہ تیرے چہرے پر دہشت کیوں برس رہی ہے۔ ابے بول تو سہی کیا ہوا ہے۔ تو ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ اللہ نہ کرے کیا اس نے کوئی بڑی بیماری تشخیص کی ہے؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''آپ ذرا میری بات غور

سے سنو۔ ڈاکٹر، بیماری، دوا اور دارو سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ......" وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "دراصل نادر بھائی میں ایک طوفان میں گھر گیا ہوں۔ چاروں طرف آندھیوں کے جھکڑ چل رہے ہیں۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے کیونکہ کنارہ میری پہنچ سے بہت دور ہے۔"

نادر نے اس کے پُرتشویش چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اصل مطلب کی طرف فوراً آجا اور یہ ساری لن ترانیاں ختم کر۔"

بادشاہ نے بلاکسی تاخیر کے سارا واقعہ من وعن نادر کے سامنے پیش کر دیا۔ بولتے ہوئے اس کی آواز بری طرح کپکپا رہی تھی۔ سب کچھ سننے کے بعد نادر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین اپنے محور پر گھم سی گئی ہے اور اسی لمحے قیامت برپا ہونے والی ہے۔

اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر بادشاہ بری طرح ڈر گیا اور اسے جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "نادر بھائی کچھ تو بولو کیا ہو گیا آپ کو۔"

نادر نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور بولا۔ "جس بات کا مجھے اندیشہ تھا وہی ہوا۔ میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا کہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ خیر ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا شیطانی قوت اگر اس سنہری ناگن اور اس احسان فراموش راجا کے ساتھ ہے تو رب کی مدد ہمارے شامل حال ہے۔ بروقت تیری اماں کا فون اس کی زندہ مثال ہے۔ صاب جی کے ساتھ صرف ہماری تمہاری نہیں بلکہ تیری اماں جیسی ہزاروں عورتوں کی دعائیں ہیں۔" نادر بڑے اعتماد سے بولا۔ "اب تجھے بس ایک کام کرنا ہے، میں جو کہوں گا۔ اس پر عمل کرنا ہوگا۔"

بادشاہ نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نادر نے نہایت گمبھیرتا سے کہا۔ "سب سے پہلے تو تجھے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ راجا......" پھر اچانک اس نے توقف کیا اور پوچھا۔ "راجا ابھی تک نہیں آیا۔"

بادشاہ نے فوراً کہا۔ "مجھے چھوڑ کر جو گیا تو آیا ہی نہیں اور اچھا ہی ہوا جو نہیں آیا۔ ورنہ ہم آزادانہ گفتگو تھوڑی ہی کر سکتے تھے۔"

نادر نے ہاں میں ہاں ملاتے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی حفاظت کے لیے کچھ لوگوں کو چن لیتا ہے۔ شاید ہم دونوں بھی ان ہی میں شامل

## ذرا مسکرائیے

ایک شخص نے اپنے بیٹے کو اتنا پیٹا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ خبر اس کے دوست تک پہنچی تو وہ سرزنش کرنے آیا اور بیٹے کو پیٹنے کی وجہ پوچھی۔ دوست نے جواب دیا۔ "وہ نشے میں تھا۔" دوست نے کہا۔

"اگر وہ نشے میں تھا تو اسے ذرا سی سزا دیتے۔ تم نے اسے اندھادھند کیوں پیٹا؟"

وہ بولا۔ "میں بھی نشے میں تھا۔"

......

جمال صاحب ایک روز اپنے کمسن بیٹے کو بھی اپنے ساتھ دفتر لے گئے اور تمام ساتھی کارکنوں سے ملوایا۔ گھر واپسی پر انہوں نے محسوس کیا کہ بچہ کچھ مایوس مایوس سا نظر آرہا تھا۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو بچہ بولا۔ "ابو! آپ تو کہہ رہے تھے مجھے دن بھر گدھوں کے ساتھ مغز کھپانا پڑتا ہے۔"

مرسلہ: محمد فیض۔ راولپنڈی

......

جگر مراد آبادی کی رنگت بہت کالی تھی۔ ایک مرتبہ وہ لکھنو کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھ رہے تھے۔ ان کے قریبی دوست ان کی تصویر کھینچنے لگے تو جگر صاحب بولے۔ "میری تصویر ایسی نہیں آتی کہ تم گھر میں سجا سکو۔"

دوست نے جواب دیا۔ "تصویر سجانے کے لیے نہیں، بچوں کو ڈرانے کے لیے لے جا رہا ہوں۔"

......

ایک سپاہی میدان جنگ میں اپنے افسر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو افسر نے خوش ہو کر سپاہی کو شاباش دی۔

"جوان! تم بڑے وفادار سپاہی ہو۔ جنگ کی حالت میں بھی میرے ساتھ ساتھ رہے۔"

سپاہی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "سر! میری ماں کی نصیحت تھی کہ افسر کے ساتھ ساتھ رہنا کیونکہ جنگ میں افسر بہت کم مارے جاتے ہیں۔"

مرسلہ: زیبا الیاس۔ شیخوپورہ

ہیں۔"

بادشاہ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور استفسار کیا۔"میں سمجھا نہیں۔آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

وہ وضاحت طلب نظروں سے نادر کو دیکھ رہا تھا۔نادر پُرجوش لہجے میں بولا۔"مجھے ایک بات بتا، ذرا غور سے سننا کیا دریائے نیل کا پانی موسیٰ علیہ السلام کا کچھ بگاڑ سکا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے شعلے کچھ اثر سکے۔ طوفان حضرت نوح علیہ السلام کا بال بیکا کرسکا۔اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے دشمن کچھ بگاڑ سکے۔چھری اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرسکی، مچھلی یونس علیہ السلام کو کھا سکی۔"

بادشاہ زور زور سے نفی میں گردن ہلا رہا تھا اور نادر بولے جا رہا تھا۔"بس اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور اچھے بندوں کے بازو کر ایک حفاظتی حصار بنا دیتا ہے۔اسی طرح ہمارے صاب جی کو بھی اس نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اور ہم دونوں سے وہ بہت اہم کام کروانا چاہتا ہے۔اب میری ہدایات ذرا غور سے سن۔"

بادشاہ اس کے قریب سرک کر بیٹھ گیا۔دونوں آہستہ آہستہ سرگوشیانہ انداز میں باتیں کرتے رہے۔جب دونوں کی خفیہ میٹنگ ختم ہوئی تو نصف شب بیت چکی تھی لیکن اب بادشاہ کا دل مسرور اور مطمئن تھا۔نادر کے چہرے پر بھی اطمینان اور سکون تھا۔

اگلی صبح جب دونوں ناشتا کر رہے تھے تو راجا کی آمد ہوئی۔چہرہ خشونت بھرا اور انداز روٹھا روٹھا سا تھا۔اسے دیکھتے ہی نادر نے اسے ناشتے کے لیے مدعو کیا۔راجا نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔"نہیں نادر بھائی میں دراصل رات اپنے دوست کے گھر چلا گیا تھا۔رات بھر وہیں قیام کیا اور اب ناشتا کر کے آرہا ہوں۔"

بادشاہ نے فوراً چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"چلو ناشتے کو مارو گولی مگر میرا یار میرے ہاتھ کی چائے تو پیے گا ناں۔"

راجا نے خفگی بھرے انداز میں دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔بادشاہ نے فوراً پشت سے اس کا کالر پکڑا اور بولا۔"میرے ہیرلن اب غصہ تھوک بھی دو۔تمہارا ہر مشورہ ہر بات ہمارے سر آنکھوں پر۔"

یہ سنتے ہی راجا کی باچھیں کھل گئیں اور وہ اپنی بتیسی چمکاتے ہوئے بولا۔"ارے میں تو یونہی تجھے ستا رہا تھا، ورنہ اپنوں سے کوئی ناراض ہوتا ہے۔"یہ کہتے ہوئے اس نے چائے کا کپ تھام لیا۔

نادر نے مداخلت کرتے ہوئے بھنویں اچکاتے ہوئے کہا۔"بھئی ایسی کون سی بات ہے اور کون سا مشورہ ہے جس کی وجہ سے دو بچپن کے دوستوں میں روٹھا پھولی ہو گئی تھی۔"

راجا بری طرح گھبرا گیا اور خوفزدہ نظروں سے بادشاہ کو دیکھنے لگا۔اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا لیکن بادشاہ نے مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔"ارے نادر بھائی آپ بھی ایک نمبر کے بھلکڑ ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ راجا ڈرائیونگ سیکھ رہا ہے۔ایک ڈرائیونگ اسکول سے اور بضد ہے کہ میں بھی ایڈمیشن لے لوں لیکن فی الحال میری جیب اجازت نہیں دے رہی ہے۔اس لیے میں مسلسل انکار کر رہا ہوں۔یہ ہے دراصل ناراضی کی وجہ۔بہر حال میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ایڈجسٹ کرلوں گا لیکن اپنے دوست کا دل نہیں توڑوں گا۔"

نادر نے ہنستے ہوئے کہا۔"واہ بھئی یارانہ ہو تو ایسا، میری دعا ہے دوستی کے رنگ یونہی ہرے بھرے رہیں۔"یہ کہتا ہوا وہ اپنی نشست سے اٹھا اور اللہ حافظ بولتا ہوا باہر نکل گیا۔بادشاہ اور راجا پھر سے شیر و شکر ہو گئے تھے۔دونوں سر جوڑے انتہائی دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔

☆......☆

واخدی کی گاڑی جوں ہی بنگلے کے گیٹ سے باہر نکلی راجا بادشاہ کے سر پر آدھمکا اور آہستہ سے گنگنایا۔"بادشاہ میڈم جی تجھے یاد کر رہی ہیں۔بالکل تنہا ہیں اپنے کمرے میں۔"اس کی شرارت بھری مسکراہٹ میں مکاری اور عیاری کا عنصر غالب تھا۔

جواباً بادشاہ بھی شوخ و شنگ انداز میں مسکرایا اور بولا۔"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں لیکن ذرا دوسرے ملازمین پر نظر رکھنا۔کوئی اور کمرے میں داخل نہ ہونے پائے۔"

راجا بے حیائی سے ہنسنے لگا۔

بادشاہ اسے ہنستا چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔جوں ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، ریشم کو اپنا منتظر پایا۔آئینے کے مقابل بیٹھ کر ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہہ جما رہی تھی۔اس لیے رخسار قندھاری انار بنے ہوئے تھے۔اس

جیتی جاگتی جوالا مکھی کو دیکھ کر بادشاہ نادر کی تمام ہدایتوں اور نصیحتوں کو بھول گیا۔ ایمان پھر ڈانواڈول ہونے لگا لیکن بے اختیار ماں کی فون کال یاد آگئی اور وہ فوراً سنبھل گیا۔
ریشم نے اپنی مترنم آواز میں نہایت ملائمت سے کہا۔ ''کیسے ہو بادشاہ۔''

بادشاہ نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''جی میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''بس ہم دو پیار کرنے والوں کے درمیان جو مزاحمت اور رکاوٹ ہے۔ اسے فوری دور کرنا، اب تمہارا کام ہے۔''

بادشاہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ راجا نے مجھے سارا پلان سمجھا دیا ہے۔ میں نے ہر زاویے سے اسے پرکھ لیا ہے، بہت جلد اسے عملی جامہ پہنا کر......''

فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ریشم مسرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''بادشاہ تم نے تو میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم مجھ سے سچا پیار کرتے ہو لیکن رازداری بہت ضروری ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا۔''

بادشاہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''میں آپ سے کہہ رہا ہوں ناں کہ سب ہم پر چھوڑ دیں۔''

ریشم کی سریلی ہنسی کمرے میں گونجی اور اس نے بادشاہ کو واپس جانے کا اشارہ دیا جوں ہی وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ عقب سے ریشم کی آواز آئی۔ ''ذرا راجا کو بھیج دینا۔''

بادشاہ نے ''جی'' کہا اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔ راجا کچن کی صفائی کر رہا تھا۔ ماسی اس کی مدد کر رہی تھی۔ بادشاہ نے آنکھوں کی زبان استعمال کرتے ہوئے اسے بھیج دے دیا۔ وہ فوراً ہاتھ دھو کر ریشم کے کمرے کی طرف لپکا۔ اس کے جاتے ہی بادشاہ نے ماسی سے کہا۔ ''ماسی میرے پیر میں موچ آگئی ہے آج میں سبزی نہیں لا سکوں گا۔ ذرا بازار جا کر تم بھاجی ترکاری لے آؤ۔ لیکن فوراً۔''

ماسی نے پیسے لیے سبزی کا تھیلا اٹھایا اور جلدی سے کچن سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی بادشاہ نے ایک طویل سانس خارج کی اور چوکنا نظروں سے اپنے گرد و پیش میں دیکھا اور بلی کی سی چال چلتے ہوئے ریشم کے کمرے کے قریب پہنچ کر بھڑے ہوئے دروازے کی جھری سے اپنے کان لگا دیئے۔ سماعت اس کی کافی تیز تھی اور جو کچھ اس نے سنا وہ دھماکے سے کم نہیں تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے تو چکرا کر رہ گیا۔ راجا، ریشم سے کہہ رہا تھا۔ ''صبح تک آپ ہر چیز کی اکلوتی مالکن بن جائیں گی۔ مجھے رقم دیں گی وہ لے کر میں کراچی چھوڑ دوں گا۔ اگر گواہی کی ضرورت پڑی تو دے دوں گا۔''

''یاد رکھنا میں نے تمہارے مشورے پر بہت بڑا قدم اٹھایا ہے۔ اگر بادشاہ نے کچھ بک دیا تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔''

''آپ بے فکر رہیے بادشاہ انتہائی بے وقوف ہے۔ وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔ پھر ہم پولیس والوں کو بھی تو پچاس ساٹھ ہزار دیں گے۔ وہ ہمارے پسند کا کیس بنائے گی۔''

اتنا سننے کے بعد بادشاہ نے فوراً اپنے آپ پر قابو پایا اور وہاں سے کھسک گیا۔ چند منٹ بعد راجا بھی آگیا اور آتے ہی دھاڑا۔ ''یہ ماسی کہاں غائب ہو گئی۔''

بادشاہ نے لجاجت آمیز آواز میں کہا۔ ''راجا بھیا ناراض مت ہو پیر کی تکلیف کی وجہ سے میں نے اسے سبزی مارکیٹ تک بھیجا ہے۔''

راجا نے ایک شگفتہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ارے یار کوئی بات نہیں۔ اب تو تمہاری ہر بات پر سر تسلیم خم ہے کیونکہ عنقریب تم ہمارے صاحب بننے والے ہو۔ پھر تو ہمیں ہر حکم پر سر ہی جھکانا ہے۔''

بادشاہ نے بناوٹی قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ارے تو تو میرا یار ہے۔ میں تیرے اور اپنے درمیان مالک اور نوکر کا رشتہ تھوڑی رکھوں گا۔''

راجا دل کھول کر ہنس رہا تھا۔ کافی دیر تک اس کی ہی ہی جاری رہی۔

اس رات کھانے کے بعد بادشاہ نے ایک لمبی ڈکار لی اور بولا۔ ''آج کھانا کچھ زیادہ ہی کھا لیا ہے۔ چلیں باہر تھوڑی سی چہل قدمی کر لیں۔''

راجا نے فوراً کانوں پر ہاتھ رکھے اور بولا۔ ''نہ بابا نہ مجھے تو زوردار نیند آرہی ہے۔ اس لیے مجھے تو بخشو۔''

بادشاہ نے معنی خیز نگاہوں سے نادر کی طرف دیکھا۔ نادر جھٹ سے بولا۔ ''چل چلتے ہیں آج سردی بھی ہو رہی ہے۔ چائے باہر ہی پئیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے نادر اور بادشاہ باہر نکلے اور راجا اپنا لحاف کھینچ کر بستر میں دبک گیا۔

باہر آتے ہی نادر نے سوال کیا۔ ''اب بتا کیا بات

ہے؟"

بادشاہ نے عقابی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر آہستگی سے بولا۔ "ایک سنسنی خیز انکشاف ہے۔"

نادر چلتے چلتے مزید اس کے قریب آگیا۔ بادشاہ نے سلسلہ کلام جوڑا اور بولا۔ "اس حرافہ اور اس کے آلہ کار کے درمیان ہونے والی باتیں بہت قریب سے سنی ہیں۔ دونوں مجھے گھامڑ اور بے وقوف سمجھ کر استعمال کر رہے ہیں۔ وہ واحدی بھائی کا پتا صاف کرنے کے فراق میں ہے۔ میرا نام راجا نے تجویز کیا ہے۔ اسکیم بھی اس کی ہی بنائی ہوئی ہے۔ مجھ سے کام لینے کے بعد دونوں سب کچھ میرے سر تھوپ کر مجھے ہمیشہ کے لیے جیل میں سڑا دیں گے۔ یہ بھی ان کے منصوبے کا حصہ ہے۔"

نادر کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ دانت پیستے ہوئے بولا۔ "بادشاہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں جو بھی کرنا ہے بہت جلد کرنا ہے۔ میری ایک بات مان ریشم اور راجا کے سامنے اس بات کا مظاہرہ کر کہ جدائی کی گھڑیاں تجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہیں۔ ریشم کا قرب حاصل کرنے کے لیے تو ماہی بے آب کی طرح بے قرار ہے۔ ایکٹنگ اس طرح کرنا کہ انہیں شک نہ ہو۔" راجا نے نادر کا ہاتھ دبا کر اسے اپنی مدد کا یقین دلایا اور پھر دونوں نے واپسی کی راہ لی۔

دونوں کی اندیشوں بھری رات سوتے جاگتے کٹی۔

دونوں واحدی کے جاں نثار اور وفادار ملازم، واحدی کے دشمن اب ان کے دشمن تھے۔ دونوں کے عزائم خطرناک تھے۔

ہر گزرنے والا دن بادشاہ اور ریشم کو قریب سے قریب کر رہا تھا۔ بادشاہ اور راجا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جو کچھ کرنا ہے فوراً ہی کرنا ہے۔ تاخیر مناسب نہیں۔

وہ ایک اعصاب شکن اور لرزہ خیز رات تھی۔ چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ واحدی نے جیسے ہی کھانا کھا کر اپنے بیڈ روم کی راہ لی۔ اس کے عقب میں بادشاہ بھی دودھ کا گلاس اٹھائے چل پڑا۔ راجا اور ریشم اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ چند منٹ بعد بادشاہ خالی گلاس لے کر نکلا اور ہاتھ کے انگوٹھے سے "ڈن" کا اشارہ کیا۔ تینوں کے چہروں پر جیت کی خوشی نمایاں تھی۔ بادشاہ دونوں کے قریب آکر گنگنایا۔ "واحدی بھائی کو گہری نیند سلا دیا ہے۔ بس چند لمحوں بعد انہیں زندگی سے آزاد کر دوں گا۔"

ریشم نے تائیدی انداز میں سر ہلایا لیکن راجا کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ بادشاہ نے راجا کو غور سے دیکھا اور تشویش ناک لہجے میں بولا۔ "راجا تمہارا چہرہ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا ہے۔ وحشت اور گھبراہٹ چہرے سے عیاں ہے۔ اس طرح تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ میرے خیال میں تمہارے لیے تو پولیس کے دو ڈنڈے ہی کافی ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ تم یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ میں اور میڈم یہاں کے معاملات سنبھال لیں گے۔"

بادشاہ کے مشورے پر راجا کے دل کی کلی کھل گئی۔ وہ فوراً رضامند ہو گیا۔ دونوں چلتے ہوئے بیرون برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔ سرد ہوا برمے کی طرح جسم کو چھید رہی تھی۔ راجا نے اپنے اردگرد شال لپیٹی اور رخصتی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ بادشاہ نے فوراً کہا۔ "راجا آج غضب کی سردی ہے۔ رکشا ٹیکسی بھی مشکل سے ملے گی۔ تم ذرا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ مڑا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد جب بادشاہ واپس ہوا تو اس کے ہاتھ میں واحدی کی کار کی چابی تھی۔ اس نے چابی راجا کو تھماتے ہوئے کہا۔ "اب اس کار کا مالک میں ہوں۔ اس لیے یہ کار ہمیشہ کے لیے تمہیں دے رہا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کس تخی سے پالا پڑا تھا۔"

راجا گھبرا کر بولا۔ "ارے یار میں تو ابھی ڈرائیونگ سیکھ رہا ہوں۔ ابھی اتنا مشاق ڈرائیور نہیں ہوں۔"

بادشاہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اب جھوٹ مت بولو۔ کل میں نے تمہیں ٹھیک ٹھاک ڈرائیونگ کرتے دیکھا ہے۔ راجا اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا۔ پھر بھی وہ نہیں نہیں کرتا رہا لیکن بادشاہ نے اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا کر دم لیا۔

بادشاہ دور جاتی ہوئی کار کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اچانک اسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ گھبرا کر پلٹا، پیچھے نادر کھڑا تھا۔ نادر بادشاہ کے کان میں گنگنایا۔

نگاہ قاتل ادا قاتل زباں قاتل بیاں قاتل
تمہارا سلسلہ شاید کسی قاتل سے ملتا ہے۔

بادشاہ نے ایک جاندار قہقہہ لگایا۔ پھر بولا۔ "آپ نے اپنا کام تو ٹھیک ٹھاک کیا تھا ناں؟"

نادر کامیابی سے سرشار لہجے میں بولا۔ ''بالکل جناب یہ سڑک اسے سیدھی ملک عدم لے جائے گی۔ ویسے تم ایک بات بتاؤ؟'' بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' نادر نے مدھم لہجے میں سوال کیا۔

''تم نے صاب جی کے دودھ میں کیا ملایا ہے؟''

بادشاہ نے اپنی ہنسی دباتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی سی بادام اور خشخاش پیس کر دودھ میں حل کر دی تھی۔ اماں کہتی تھیں اس سے گہری اور میٹھی نیند آتی ہے۔''

دونوں کا ملا جلا قہقہہ لان میں گونجا۔ دونوں نے اپنی ہتھیلیوں سے ایک زوردار تالی دی اور پھر نادر کوارٹر کی طرف بڑھ گیا اور بادشاہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو لاؤنج میں ریشم صوفے پر نیم دراز تھی۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔ سردی کا موسم تھا۔ اس کے باوجود پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ بادشاہ نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور جذباتی انداز میں محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے کہا ناں سب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔''

ریشم نے اپنے گلابی ہونٹوں پر زبان پھیری اور پریشان کن لہجے میں بولی۔ ''بادشاہ مجھے پتا نہیں کیوں گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے ہمارا یہ پلان فیل ہو جائے گا۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

بادشاہ نے ایک بھرپور ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ فضول ہی گھبرا رہی ہیں۔ ارے بھئی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''میری مانیں تو ایک کام کریں۔''

ریشم نے سوالیہ انداز میں پلکوں کی جھالر اٹھائی اور ہولے سے پوچھا۔ ''کیا۔''

بادشاہ قریب کھسک کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''مجھے جب بھی سردیوں میں ذہنی پریشانی یا کسی بات کی ٹینشن ہوتی ہے تو ہلکے نیم گرم پانی سے غسل کر لیتا ہوں۔ آپ بھی یہی کریں، باتھ ٹب میں کنکنا پانی کر کے اس میں تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جائیے۔ تھکن اور گھبراہٹ دور ہو جائے گی۔ ہیئر ڈرائیر سے اپنی زلفیں خشک کر لیجیے گا۔ چند ہی لمحوں میں اپنے آپ کو بالکل تازہ دم پرسکون فریش اور خوش و خرم محسوس کریں گی۔''

ریشم ایک کھنک دار ہنسی کے جلوے بکھیرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر بولی۔ ''صحیح وقت پر صحیح مشورہ دیا ہے لیکن ٹب میں پانی گرم ہونے میں وقت لگے گا۔''

بادشاہ فوراً بولا۔ ''آپ اپنے کمرے کا باتھ روم نہ استعمال کریں۔ بنگلے کے عقبی حصے میں جو نیا باتھ روم ہے وہاں ٹب بھی کشادہ ہے اور الیکٹرک راڈ کی بھی سہولت ہے۔ اس سے فوراً پانی گرم ہو جاتا ہے۔ آپ کہیں تو میں پانی گرم کیے دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ ریشم اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر زیرِلب سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ''احمق کہیں کا۔ بے وقوف کو پتا ہی نہیں ہے کہ میں نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ بہت چاہتا تھا ناں واحدی کو اب تو ہی اس کی جان لے گا اور ساری عمر جیل کی ہوا کھائے گا۔'' اس وقت اس کے چہرے پر عیارانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں مکاری کی چمک تھی۔

چند منٹ بعد ہی بادشاہ تیزی سے چلتا ہوا واپس آیا اور تعظیمی انداز میں جھک کر سر کو خم دیتے ہوئے بولا۔ ''ملکہ عالیہ لیجیے خادم نے غسل کا پانی تیار کر دیا ہے۔ جلدی سے تشریف لے جائیے۔''

ریشم نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور عقبی غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ بند کرنے کی آواز کے ساتھ ہی بادشاہ کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی لیکن دل کی دھڑکنیں زیروزبر ہو گئیں۔ غسل خانے کی نیلگوں روشنی میں ریشم نے یہ بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ راڈ کا سوئچ آن ہے۔ وہ کھولتے ہوئے پانی میں اتر گئی اور اسی لمحے اس کی لرزہ خیز چیخوں سے سارا بنگلا گونج اٹھا۔

دوسری صبح تمام اخبارات اور نیوز چینلز پر یہ خبر زور و شور سے گردش کر رہی تھی کہ شہر کے ممتاز صنعت کار عبدالواحد کی حسین و جمیل بیوی ریشم واحدی کرنٹ لگنے کی وجہ سے موقع پر ہی ہلاک ہو گئیں۔ عبدالواحد کو دوسرا شدید دھچکا یہ بھی پہنچا ہے کہ ان کا ایک گھریلو ملازم جس کا نام راجا تھا ان کی کار چرا کر بھاگ رہا تھا لیکن اتفاقیہ طور پر کار کے بریک فیل ہونے کی وجہ سے ایک خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا اور راجا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

واحدی کے بنگلے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ نادر اور بادشاہ اپنے آپ پر رنج و الم کا خول چڑھائے مصنوعی آنسو بہا رہے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ ہم نے نمک کا حق ادا کر دیا۔